

اکیسویں صدی میں اردو
کا
سماجی و ثقافتی فروغ

مرتب
پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اکیسویں صدی میں اردو کا

سماجی و ثقافتی فروغ

مرتب

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2014
تعداد	:	550
قیمت	:	-/235روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1202

EKISWEEN SADI MEIN URDU KA

SAMAJI VA SAQAFATI FAROGH

Compiled by: Prof. Khwaja Md. Ekramuddin

ISBN :978-93-5160-061-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسارا مچنگ سسٹمس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

ترتیب

• پیش لفظ	پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین	vii
• کلیدی خطبہ	پروفیسر شمیم حنفی	xi

اردو کا سماجی و ثقافتی تناظر

1.	اکیسویں صدی کے عالمی ادب کے تناظر میں اردو ادب کی سماجی اور تہذیبی قدروں کی ترقی کے امکانات	ڈاکٹر سید تقی عابدی	3
2.	اردو کی تہذیبی معنویت اور مستقبل کے امکانات	پروفیسر عبدالستار دلوی	10
3.	اردو کا لسانی، ادبی اور ثقافتی کردار	پروفیسر عتیق اللہ	20
4.	اردو کی سماجی و ثقافتی ترقی	امین حیدر	34
5.	اردو کا سماجی اور ثقافتی ڈسکورس	پروفیسر قدوس جاوید	38
6.	اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی ثقافتی فروغ	سید فیصل علی	44
7.	اردو شاعری اپنے لسانی و تہذیبی تناظر میں	ڈاکٹر مختار شمیم	51
8.	سماجی و ثقافتی سرگرمیاں اور خواتین	ڈاکٹر سیما صغیر	65

9. اکیسویں صدی میں اردو ادب کا تاریخی و تہذیبی سیاق ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی 72

اردو زبان: ماضی، حال اور مستقبل

10. اردو زبان اور نسلِ نو محمد نعمان وحید بخاری 87
11. اردو زبان کا فروغ: ماضی اور حال سید اقبال حیدر 94
12. بیسویں صدی کے شروع میں طلوع ہونے
والا اردو کا سورج مائل بہ غریب کیوں؟ پروفیسر خلیل طوق آر 100
13. ایک غیر ملکی کی نظر میں ہندوستان میں اردو کو درپیش چیلنج ڈاکٹر احمد القاضی 120
14. اردو زبان کا فروغ: ماضی، حال اور مستقبل ڈاکٹر محمد آصف اعوان 127
15. اردو زبان: حال اور مستقبل علیم صبا نویدی 133
16. اردو زبان کا سماجی فروغ: ماضی اور حال کے آئینے میں پروفیسر اعجاز علی ارشد 138
17. اردو زبان حال اور مستقبل پروفیسر محمد نعمان خان 145
18. ریاست جموں و کشمیر میں اردو
ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں پروفیسر شہاب عنایت ملک 158
19. اردو زبان: حال اور مستقبل ڈاکٹر مشتاق احمد 173
20. عالمی تغیرات اور تحفظ اردو شاہد لطیف 181
21. اکیسویں صدی میں اردو طنز و مزاح نصرت ظہیر 190

اردو زبان و ادب کا قومی و بین الاقوامی منظر نامہ

22. اردو میں لسانی تحقیق: ایک جائزہ پروفیسر نصیر احمد خان 201
23. عالمی ادب کے رجحانات سے اردو ادب کی اثر پذیری پروفیسر ابوالکلام قاسمی 212
24. اکیسویں صدی میں اردو تنقید ڈاکٹر ناصر عباس نیر 215
25. اقبال کی اردو شاعری اکیسویں صدی کے تناظر میں ڈاکٹر جمیل اصغر 232

26. ایران میں اردو کے ثقافتی فروغ کی صورتِ حال	پروفیسر وفا یزدان منش	245
27. اردو جاب مارکیٹ (بازار اور روزگار)	ناظم الدین مقبول	259
28. اردو زبان اور اردو شاعری کا فروغ ماضی اور حال: ایرانی ذہن و تہذیب	ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی	265
29. اردو سے فارسی ترجمے کی ضرورت ایک مطالعہ	پروفیسر علی بیات	275
30. اردو کی عالمی مقبولیت وسعت اور دقت	پروفیسر علی احمد فاطمی	289
31. ازبکستان میں اردو تدریسی اور تحقیقی سرگرمیاں	ڈاکٹر سراج الدین نور متوف	298
32. اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر سماجی اقدار	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	302
33. سعودی عرب میں اردو زبان اور اس کا مستقبل	ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی	317
34. پیمانۂ اردو..... نصف خالی یا نصف پُر؟	پروین شیر	326

اردو صحافت اور ترجمہ

35. اردو تراجم: ضرورت و امکان	پروفیسر مرزا حامد بیگ	337
36. اطلاع اساس معاشرہ کا تصور اور اردو زبان	پروفیسر شافع قدوائی	354
37. اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اردو تراجم کا رول	پروفیسر سید سجاد حسین	362
38. ہندوستان میں اردو صحافت آئینہ ایام میں	معصوم عزیز کاظمی	373
39. جاپان میں آن لائن اردو میڈیا کی صورتِ حال	ناصر ناکاگاوا	414
40. ماریشس میں الیکٹرانک میڈیا اور اردو	عنایت حسین عیدن	421
41. اردو صحافت	روبینہ فیصل	429
42. اردو زبان اور برقی میڈیا	پروفیسر محمد زماں آزردہ	432
43. اردو ذرائع ابلاغ	رضا علی عابدی	439
44. دیارِ مغرب میں اردو: اکیسویں صدی کے تناظر میں	صدف مرزا	442

45. اکیسویں صدی میں اردو اور صحافت	ڈاکٹر ثوبان سعید	451
46. ادارہ نویسی کے فنی اور ثقافتی عوامل	پروفیسر صغیر افراہیم	458
47. اردو میں ترجمہ نگاری کی ادارہ سازی: ضرورت اور مسائل	سہیل احمد فاروقی	468

اردو کا تعلیمی اور انفوٹینمنٹ شعبوں میں رول

48. اکیسویں صدی میں اردو تعلیم کی صورت حال	پروفیسر ابن کنول	481
49. ہندوستان میں اردو تعلیم کے احیا کے لیے وسیع تر جولان گاہوں کی تلاش	ڈاکٹر اطہر فاروقی	487
50. فاصلاتی تعلیم بذریعہ اردو میڈیم	ڈاکٹر محمد احسن	491
51. مشترکہ آندھراپردیش میں اردو ڈراما اور فلم کا فروغ	پروفیسر مظفر شہ میری	500
52. اکیسویں صدی میں ہندوستانی اسٹیج اور اردو ڈراما	ڈاکٹر محمد کاظم	524

پیش لفظ

گزشتہ کم و بیش دس صدیوں پر پھیلی ہوئی ہندوستانی تاریخ کے مختلف ارتقائی مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہماری اور آپ کی پیاری زبان اردو اکیسویں صدی کے آتے آتے، کسی جغرافیائی وحدت تک محدود نہ رہ کر بلا شبہ ایک عالمی زبان بن چکی تھی اور آج یہ تمام دنیا میں تقریباً ہر سطح پر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہے۔ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ یہ شیریں زبان دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں بلکہ ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ جس طرح ہندوستان نے اس دنیا کو صفر دیا، پوری دنیا کو ایک خاندان سمجھنے کا ویدوں اور پرانوں کا نظریہ عطا کیا، تاج محل کی تخلیق سے عالمی ذوقِ جمالیات کو وسعت و گیرائی بخشی، عدم تشدد اور مذہبی رواداری کی تعلیم دے کر دنیا کو شرافت سے جینے کا راستہ دکھایا، اسی طرح اردو بھی اس دنیا کو ہندوستان کی ہی دین ہے جو صرف زبان نہیں بلکہ اپنے آپ میں تہذیبی و ثقافتی حسنِ اشتراک کا ایک بے مثل نمونہ بھی ہے۔

دنیا کی سبھی زبانیں اپنی تہذیبی وراثت کی امین و محافظ مانی جاتی ہیں۔ مگر اردو، دنیا کی ان قلیل ترین زبانوں میں سے ایک ہے جو تکثیری قومیت Inclusive Nationalism اور مختلف تہذیبی رویوں کے اشتراک سے عالم وجود میں آئی ہیں اور جنھیں کسی ایک تہذیب،

ایک مذہب، ایک ملک، ایک قوم یا ایک ثقافت سے جوڑ کر نہیں دیکھا جاسکتا اور جو مختلف تہذیبی و ثقافتی ورثوں، رویّوں اور روایتوں کی حفاظت و ترجمانی کرتی ہیں۔ حضرت امیر خسرو کے زمانے سے بغیر کسی تعطل کے جاری رہنے والے اس تہذیبی ۔لسانی دھارے نے تقریباً ایک ملینیم کا سفر طے کرلیا ہے اور اب جبکہ اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ اپنے نصف النہار پر ہے، یہ دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اس صدی میں جو کہ انسانی تاریخ کی سب سے تیز رفتار صدی متوقع ہے، اردو زبان، اس کے ادب، اس کے فروغ اور سماجی و ثقافتی منظر نامے پر مرتب ہونے والے اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ دنیا کے اس عظیم تہذیبی ورثے کی حفاظت و ترویج کا اس نئی صدی میں کیا نقشہ بن رہا ہے، اسے کس طرح کے مسئلے درپیش ہیں، اور کن سمتوں میں کن سطحوں پر اس کے فروغ کی زیادہ ضرورت ہے۔

ان ہی مقاصد کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے جو کہ دنیا میں اردو زبان وادب کے فروغ کا سب سے بڑا ادارہ ہے، پچھلے سال عالمی اردو کانفرنسوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ گزشتہ برس کونسل نے 4 سے 6 ستمبر تک جس سہ روزہ عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا اس میں قومی و عالمی سطح پر اردو زبان و ادب کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا تھا اور اس سلسلے میں ایک مربوط لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں پیش کیے گئے مقالات پر ایک مجلّہ اردو کونسل نے الگ سے شائع کیا ہے۔

اس مرتبہ قومی اردو کونسل کی سہ روزہ کانفرنس کا بنیادی موضوع ہے 'اکیسویں صدی میں اردو کا سیاسی و ثقافتی فروغ'۔ اس میں کونسل کی پہلی عالمی کانفرنس کی ہی طرح دنیا کے مختلف براعظموں سے 13 ملکوں کے 25 مندوبین نے حصہ لیا اور اہم موضوعات پر اپنے مقالے پیش کیے۔ ان مقالات میں ادیبوں اور قلم کاروں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اردو کی موجودگی و ضرورت، اس کی تعلیم و تدریس کے مسئلوں، مختلف اصناف سخن و اسالیب میں اردو کی پیش رفت، جنوبی ایشیا سے باہر کے ملکوں میں اردو زبان کے پھیلاؤ اور اردو بولنے والوں کے تہذیبی و لسانی رویوں اور مسئلوں کی نشان دہی اور ان سبھی علاقوں میں اردو

کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کی ہے۔ عام دستور یہ ہے کہ ایسی کانفرنسوں کے مقالات کو مرتب کر کے متعلقہ ادارہ ، کانفرنس ختم ہونے کے بعد شائع کرتا ہے۔ لیکن قومی اردو کونسل نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ جو مقالات کانفرنس کو موصول ہوں گے انھیں کانفرنس ختم ہونے تک ایک مجلّے کی صورت میں شائع کر دیا جائے گا تا کہ وہ اردو نواز قارئین بھی اس طور پر عالمی کانفرنس کے شرکا میں شامل ہو جائیں جو بہ نفس نفیس اس میں شرکت نہیں کر سکے۔

اس مجلّے میں شامل مقالات کو پڑھ کر اردو کی عالمی تصویر بڑی حد تک آپ کے سامنے واضح ہو جائے گی اور قارئین اندازہ کر سکیں گے کہ کہاں کہاں تک راہیں روشن ہو چکی ہیں اور کن راستوں پر ہمیں مزید چراغ جلانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے وزرا، شعرا، ناقدین، دانش ور اور صحافی اردو کے معاملات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اس کا بھی بڑی حد تک اندازہ ہو سکے گا۔

پہلی کانفرنس کی طرح یہ دوسری عالمی کانفرنس بھی ہمارے لیے ایک بڑا چیلنج تھی۔ اسے کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے میں قومی اردو کونسل کے سبھی افسروں اور کارکنوں کا بے حد شکر گزار ہوں۔ علاوہ ازیں اس مجلّے کی تیاری اور بروقت اشاعت میں ہمارے شعبۂ ادارت اور شعبۂ طباعت کے متعلقین نے جس طرح ذاتی دل چسپی لی اس کا شکریہ ادا کرنا بھی خاص طور پر ضروری ہے۔ امید ہے آپ اور ہم سب کے اشتراک و تعاون سے اردو کا یہ کارواں اسی طرح آگے بڑھتا رہے گا۔

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)
ڈائرکٹر

نئی دہلی
1 نومبر 2014

کلیدی خطبہ

پروفیسر شمیم حنفی
ذاکر باغ، نئی دہلی

زبانیں بھی انسانوں کی طرح سفر کرتی ہیں۔ اور اس وقت جب ہم اکیسویں صدی کے دوران اردو کے سماجی اور ثقافتی فروغ سے وابستہ سوالوں کا جائزہ لینے کے لیے یکجا ہوئے ہیں، ہمیں سب سے پہلے اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا کہ بیسویں صدی کے خاتمے تک اردو نے کون سی منزلیں سر کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اکیسویں صدی خلا میں نہیں پیدا ہوئی۔ اسے بیسویں صدی نے جنم دیا ہے اور اپنے لگ بھگ ہزار برس کے سفر میں اردو زبان اور ادب کی روایت ہماری مشترکہ تہذیب اور تاریخ کے ایک پر پیچ مرحلے سے گزر کر موجودہ دور کی دہلیز تک پہنچی ہے۔

ہمارے لیے بیسویں صدی تاریخ کی سب سے پر تشدد اور پریشان کن صدی تھی۔ اس صدی کے دوران ہم نے بہت خواب دیکھے اور خوابوں کی پامالی کا ایک ہولناک تماشہ بھی دیکھا۔ اس صدی کے دوران ہم نے بہت کچھ کھویا اور شاید بہت کم پایا۔ ہمیں آزادی بھی ملی

تو خون میں نہائی ہوئی۔انسانی تاریخ کی ہجرتوں میں ایک سب سے بڑی اجتماعی ہجرت کا تجربہ بھی ہمارے حصے میں آیا۔ اس تجربے نے بھی اردو کے لیے ایک نئی مشکل اور کئی سوالات پیدا کیے۔ اکیسویں صدی کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد بھی ان سوالوں کی آنچ برقرار ہے۔ اس کانفرنس کے کانسیپٹ نوٹ کا یہ جملہ مجھے بے چین کرتا ہے کہ ''اردو بولنے والوں کو ہندوستان کے قومی دھارے میں لانے اور ان کی سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی خواہشات کے لیے اردو میں نئے پروگرام کا آغاز کیا جائے۔''

اس غلط فہمی پیدا کرنے والے مسئلے پر تفصیل سے کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے۔ پھر بھی دو باتوں کی نشاندہی ضروری ہے۔ پہلی تو یہ کہ ہندی کی طرح اردو کا علاقہ بھی بڑی حد تک مبہم ہے اور بنیادی طور پر اس مسئلے کو شمالی ہندوستان کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جانا چاہیے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اردو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ ویکرم محمد بشیر کی زبان ملیالم تھی۔ قاضی نذر الاسلام کی زبان بنگالی۔ غلام محمد شیخ گجراتی میں لکھتے ہیں۔ شاہ عبد اللطیف کی زبان سندھی تھی۔ بلھے شاہ اور وارث شاہ نے اپنے اظہار کا وسیلہ پنجابی کو بنایا تھا۔ سلمیٰ تمل میں لکھتی ہیں۔ ہمارا یہ رنگا رنگی ملک اور معاشرہ تو تقریباً دو درجن زبان اور بے شمار بولیوں کی ملی جلی فضا میں سانس لیتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور سچائی جسے بھلانے کا کوئی جواز نہیں اردو کی ہندوستانیت یا 'قومی دھارے' سے متعلق ہے۔ 1947 کی تقسیم سے پیدا ہونے والی کڑواہٹ اور شدید جذباتیت کے دور میں ایک پاکستانی دانشور نے بہت صاف لفظوں میں کہا تھا:

> ''اردو زبان سے عظیم تر کوئی چیز ہم نے ہندوستان کو نہیں دی۔ اس کی قیمت تاج محل سے بھی ہزاروں گنی زیادہ ہے۔ ہمیں اس زبان پر فخر ہے۔ ہمیں اس کی ہندوستانیت پر فخر ہے اور ہم اس ہندوستانیت کو عربیت یا ایرانیت سے بدلنے کو قطعاً تیار نہیں ہیں، اس زبان کے لب و لہجہ میں اس کے الفاظ اور جملوں کی ساخت میں ہماری بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں اور ہم نے مانجھ مانجھ کر اس زبان کی ہندوستانیت کو چمکایا ہے۔'' محمد حسن عسکری (جھلکیاں)

لیکن یہ 'ہندوستانیت' بھی کسی بندھے ٹکے مفہوم کی پابند نہیں ہے۔ زندہ، متحرک اور طاقتور تصورات بہتے ہوئے پانی کی طرح کسی ایک دائرے میں گردش نہیں کرتے۔ جس طرح کوئی بھی شخص ایک ندی میں دو بار نہیں نہا سکتا، اسی طرح ہر آن بدلتی ہوئی، بکھرتی اور بنتی ہوئی دنیا کے ساتھ چیزوں کی طرح خیالات کی حقیقت بھی کبھی یکساں نہیں رہتی۔ ہماری 'ہندوستانیت' کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ ہے کہ اجتماعی زندگی اور تاریخ کی تجربہ گاہ میں اس نے کبھی صداقت اور سچائی کی ایک شکل پر اصرار نہیں ہے۔ پراچین بھارت کی ہندوستانیت، اس کے بعد ہماری سرزمین پر بیرونی تصورات اور تہذیب کی آمد کے ساتھ نئے سرے سے رونما ہونے والی ہندوستانیت اور پھر انیسویں صدی کے نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ایک جدید، حقیقت پسندانہ اور سائنسی ہندوستانیت کے فروغ نے ہمارے اجتماعی کلچر کو اور ہمارے خیالوں اور قدروں کے موسم کو کبھی ایک دائرے کا قیدی نہیں رہنے دیا۔ ہماری ہندوستانیت کا لیداس اور کبیر اور میر اور نظیر اور غالب اور اقبال اور ٹیگور سے ہوتی ہوئی ہماری زندگی اور تجربے اور پہچان کا حصہ بنی ہے۔ اس کے کئی روپ ہیں اور کئی رنگ جو صبح سے شام تک، دھوپ چھاؤں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا منظر نامہ ترتیب دیتے رہتے ہیں۔ مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی تاریخ پندرہویں صدی عیسوی کے ساتھ شروع ہوئی۔ مگر ذہنی بیداری اور نشاۃ ثانیہ کا سلسلہ اس سے بہت پہلے لکھی ہوئی یا Recorded تاریخ سے بھی یہ پہلے شروع ہو چکا تھا۔ البیرونی اور امیر خسرو، اشوک اور اکبر، نانک اور کبیر اور میر اور غالب یہ سب اسی ذہنی بیداری، اسی جاندار اور حرکت پذیر ذہنی بیداری کی نت نئی صورتیں ہیں۔ یہ سفر اور سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

بیسویں صدی سائنس کے نازِ بے جا کی صدی تھی، جب جدید سائنس نے ہمارے صدیوں کے تربیت یافتہ معاشرے میں ایک نیا ارتعاش پیدا کیا۔ اسی صدی کے دوران سائنس کا غرور بھی ٹوٹا اور ہمارے بہت سے خواب بکھرے۔ دو عالمی جنگیں اور ہمالیہ سے کنیا کماری تک پھیلی ہوئی سرزمین کی عجلت پسندانہ تقسیم ہماری اجتماعی تاریخ اور زندگی کے لیے بہت بڑے سانحے تھے۔ چیزیں کتنی نیک نیتی کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے

بدلنے کے ساتھ ساتھ بگڑ بھی جاتی ہیں اس بھید کو سمجھنے کے لیے ہمیں زمانے کی ہر کروٹ کے بعد اپنی سرخوشی اور اپنی اداسی کو ذرا غور سے دیکھنا ہوگا، اپنے اندیشوں اور اپنے امکانات کا پھر سے جائزہ لینا ہوگا، اپنے باہر کی دنیا کو صاف کرنے کے ساتھ اپنے اندر کی دنیا کو بھی صاف کرنا ہوگا۔ زندگی کی صفائی کا دارو مدار ذہن کی صفائی پر ہے اور اس عمل کے دوران ہم طرح طرح کے تجربوں سے دو چار ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ٹھٹھک کر اور ٹھہر کر رہ تو نہیں جاتے۔ ہم اپنے مسئلوں اور مشکلات کا حل اپنے سفر کی سرکردہ منزلوں کے بجائے دراصل اپنے آئندہ اور اگلے قدموں کے ساتھ آنے والی زندگی کے امکانات اور وسوسوں میں، خوابوں میں اور ارادوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ اب ہمارے سامنے بیسویں صدی کی سائنس کے علاوہ اکیسویں صدی کی ٹکنالوجی کا سیلاب بھی ہے۔ ہمیں اسی موجودہ زندگی اور آنے والی زندگی، دونوں کے چیلنجز کا سامنا ہے۔

شام لال کے لفظوں میں:

> "Preparing for the twenty first century therefore, means little apart from coming to grips with the current challenges. *(The Future is Bad News)*

اس سطح پر اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کا معاملہ لگ بھگ ایک جیسا ہے، ایک سانجھا درد جس کی آنچ کہیں ہلکی ہے کہیں تیز، مگر اس کے آزار سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ Infotech Society کے مسئلے ہمارے ملک میں مغربی ملکوں کی بہ نسبت مختلف ہیں۔ میں اطلاعاتی انقلاب یا انفارمیشن انقلاب کو محض فریبِ نظر، محض سراب یا Mirage یا عہدِ حاضر میں انسان کے ٹکنالوجیکل کامرانی اور اخلاقی بے حسی یا روحانی زوال کا اعلانیہ نہیں سمجھتا۔ خبر رساں اور عوامی تفریح کے شعبے میں اس ٹکنالوجی کی افادیت تسلیم، گرچہ سماجی مفکروں کا ایک حلقہ خبر رساں کے پھیلتے ہوئے جال اور اس پورے انفارمیشن نیٹ ورک (Network) کو Garbage information کا سادھن بھی سمجھتا ہے۔ ہم اس حد تک نہ جائیں، پھر بھی اس سچائی سے انکار تو نہیں کر سکتے کہ سامراجی اور سرمایہ دارانہ سیاست کے پھیر میں انفارمیشن

ٹکنالوجی Mis information کی ترویج اور ترقی کا ایک ذریعہ بھی بن گئی ہے۔ ہمارے زمانے کے تمام سوچنے والے ذہن اس ترقی سے بہت خوش اور مطمئن نہیں ہیں۔ کیونکہ انسانی تہذیب اور ثقافت کی تعمیر کے وسیلے صرف مادی اور ٹکنالوجیکل نہیں ہوتے۔ ڈیوڈ لیونس (David Lyons) کا خیال ہے The information Soceity, Polity Press (1990) کہ ایک سچائی جو ہمیشہ یاد رکھی جانی چاہیے یہ ہے کہ کمپیوٹر کی تشکیل بھی ایٹم بم اور میزائل کی طرح فوجی اسٹیب لشمنٹ کی تحریک پر ہوئی تھی۔ اسی لیے سائنس پر مبنی فلاحی ریاست (Science-based War fare State) نے بہت جلد ایک سائنس پر مبنی جنگی ریاست (Science-based Welfare State) کی حیثیت اختیار کر لی۔ بقول شخصے انفارمیشن ٹکنالوجی کا لایا ہوا ذہنی انقلاب ایک مہیب ڈیٹا بینک تو تیار کر سکتا ہے، لیکن اس کے توسط سے کیا انسان یہ بھی جان سکے گا کہ اپنے اجتماعی سفر میں اس سے بھول کہاں ہوئی اور چیزیں مسلسل بگڑتی کیوں جا رہی ہیں؟ یہ سوالات ہماری اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور صرف اردو زبان کے مسئلوں پر بات چیت میں ان پر سوچ بچار کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہے۔ لیکن جب ہم اردو کو ایک تہذیبی علامیے کے طور پر دیکھتے ہیں تو ہمیں ان تبدیلیوں کے سلسلے میں بھی محتاط اور چوکنا رہنا چاہیے جو ایک نئی زندگی سے وابستہ ہیں اور ہمارے چاروں طرف رفتہ رفتہ اپنا اثر پھیلا رہی ہیں۔

یہ داستان طولانی ہے، مگر اسے ختم تو کرنا ہی ہے اس لیے میں یہاں اپنے ایک مرحوم دوست اور ہندی کے مشہور سم کالین کوی (समकालीन कवि) سرویشور دیال سکسینہ کی ایک نظم کے ان تین مصرعوں پر اپنی بات ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

نڈر آگے بڑھو
تمھاری راہ میں چھوٹا سا
بانس کا پُل ہے۔۔
بانس کے اس پُل کا ایک نام اردو بھی ہے!

○

اردو کا سماجی و ثقافتی تناظر

اکیسویں صدی کے عالمی ادب کے تناظر میں اردو ادب کی سماجی اور تہذیبی قدروں کی ترقی کے امکانات

ڈاکٹر سید تقی عابدی، کناڈا

بقول علامہ اقبال:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند کے ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کی عالمی سہ روزہ کانفرنس جو ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی سرپرستی میں زیر عنوان اکیسویں صدی میں اُردو کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی قدروں کی ترقی کے امکانات پر منعقد ہو رہی ہے ایک ضروری اور ترقی یافتہ اقدام تصور کیا جا رہا ہے۔ ہماری اس مختصر تحریر میں اُردو زبان و ادب کے سماجی، ثقافتی اور تہذیبی قدروں کے ارتقا سے مربوط مسائل، وسائل، امکانات، تشکیلات، مشکلات اور ان کے حل کے تجربات اور تجویزات پر اجمالی طور پر روشنی ڈالی جائے

گی جس کا زیادہ تر تعلق گہوارۂ اُردو برصغیر سے نہیں بلکہ یورپ اور شمالی امریکہ سے ہوگا۔

یونیسکو کے اعداد و شمار شمار کے مطابق اُردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے جس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد پانچ سو ملین افراد پر مشتمل ہے۔ اُردو زبان دنیا کے تقریباً (70) ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے جہاں اُردو دنیا کے کئی ممالک میں اپنی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کے ساتھ زندہ رہے گی لیکن اس کی زندگی کے لیے ان ممالک کے کلچر کے ساتھ ہم آہنگی بھی ضروری ہوگی۔ اُردو کی تعلیم اور تدریسی تربیت کے لیے ہندوستان سے واپسی پر جان گل کریسٹ نے 1816 میں انگلینڈ میں اُردو تعلیم کا مدرسہ کھولا چنانچہ مغربی دنیا میں باقاعدہ اُردو تعلیم کا آغاز تقریباً دو سو سال قبل شروع ہو چکا تھا اگر چہ یورپ کے کئی دوسرے ملکوں میں اُردو شناسی تین سو سال سے کم نظر آتی ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق اُردو بحیثیت زبان پھیل رہی ہے۔ لندن میں 1960 میں رالف رسل نے پیشین گوئی کی تھی کہ آئندہ پچاس سال میں انگلینڈ میں اُردو ختم ہو جائے گی۔ یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی اور آج انگلینڈ میں اُردو بولنے والوں کی تعداد پانچ گنا ہو گئی ہے اسی لیے حکومت برطانیہ نے اُردو کو انگلینڈ کی چوتھی بڑی زبان قرار دیا ہے۔

یورپ اور امریکہ میں پہلے تقریباً تمام وہ لوگ اُردو سمجھتے اور بولتے تھے جو برصغیر میں پیدا ہو کر مہاجروں کی شکل میں ان ملکوں میں آباد ہوئے تھے۔ لیکن آج اُردو بولنے اور سمجھنے والوں کی ایک بڑی تعداد وہ بھی ہے جو انہی ملکوں میں پیدا ہوئے ہیں ان کے مسائل میں لہجہ کے علاوہ پڑھنے اور لکھنے سے ناواقفیت بھی شامل ہے۔ برصغیر کی نئی نسل کی طرح یہاں بھی اُردو صرف کانوں کی زبان بن رہی ہے یہ اب آنکھوں کی زبان یعنی لکھنے پڑھنے سے واقفیت کی زبان نہیں رہی ہے جس کا حل اردو کی بنیادی تعلیم جدید فونٹکس کے اصولوں کے تحت، املا میں سہولت اور آسانیوں کا عمل، بچوں کی اُردو تعلیم پر والدین کی توجہ اور تدریسی تربیت، درسی کتابوں کی فراہمی، جدید ٹکنالوجی وسائل سے بنیادی تعلیم کا کورس، سنڈے اسکولوں مذہبی مکتبوں محافل اور مجالس میں اُردو کی تعلیم و تربیت موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ مغربی ملکوں میں جو مشکلات فارسی اور ہندی زبان کی بنیادی تعلیم کو پیش آئیں وہی مسائل اُردو کے دامن گیر ہیں۔

ہم نے دیکھا ہے کہ فارسی اور ہندی زبان کے ادارے جو ایران اور بھارت سے جڑے ہوئے ہیں کامیابی سے ان زبانوں کی بنیادی تعلیم میں سرگرم ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہندی زبان کے بنائے ہوئے بنیادی تعلیم کے پروگراموں سے استفادہ کر کے اُردو زبان کے رسم الخط کی لکھائی اور پڑھائی کے پروگرامس بنائیں جو اُردو کی تہذیبی اور ثقافتی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اُردو کا رسم الخط صرف شناخت ہی نہیں بلکہ یہ اُردو کی آن بان شان اور جان بھی ہے۔

زبانیں قوموں کے ایک دوسرے کو سمجھنے اور جاننے کا ذریعہ ہیں۔ اُردو تہذیب اور ثقافت جو اکیسویں صدی میں عالمگیر حیثیت کی حامل ہے دوسری زبانوں کی نسبت پیچھے نظر آتی ہے۔ اُردو شعر و ادب کے جواہر پارے ابھی اُردو صحیفوں میں قید ہیں۔ ہم نے حُسن یوسف کو بازار مصر میں پیش نہیں کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا غالب کی غزلیں اور میر انیس کے مرثیے اُردو ادب کی جانب سے دنیائے ادب کو تحفہ میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ہم اِسے غنیمت سمجھتے ہیں کہ آٹے میں نمک کی طرح کچھ توجہ غالب کے کلام پر ہوئی لیکن انیس کی عظمت آج تک اُردو شیدائیوں سے باہر نہ جاسکی۔ روسی زبان میں غالب پر ڈاکٹر Nataliya Prigarina نے عمدہ کام کیا۔ وہ فارسی اور اُردو کی ماہر ہونے کی وجہ سے اقبال کے کلام کو بھی روسی زبان میں ترجمہ کر کے دونوں زبانوں کی خدمت کی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی ڈاکٹر Brian Silver نے عمدہ مقالہ غالب کی تشبیہات اور استعارات پر لکھا۔ کولمبیا یونیورسٹی نیو یارک کی ڈاکٹر Frances Pritchett نے غالب کے علاوہ امیر حمزہ کے قصے، انتظار حسین کے ناول ''بستی'' کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس سے غالب شناسی اور اُردو ادب کے مشاہیر دنیائے ادب کے ادیبوں سے متعارف ہوئے۔ روسی زبان میں Alexey Sukhochov نے مخدوم کے کلام، Mariam Salganik نے فیض احمد فیض انگلینڈ میں رالف رسل نے غالب Life and Letters کے علاوہ Three Mughal Poets کے عنوان سے سودا، میر حسن اور میر تقی میر کو انگریزی دنیا سے متعارف کروایا۔

یورپ میں اگرچہ اٹھارویں صدی کے اوائل ہی سے اُردو لغات، قواعد اور زبان سیکھنے کی کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی جانے لگیں جن کا ذکر یہاں طوالت کا باعث ہے لیکن ادب

عالیہ اور فن پاروں کے تراجم انیسویں صدی کے اوسط میں نظر آنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ آہستہ آہستہ تراجم، تشہیر اور تحقیق کے لیے مختلف یورپ اور شمالی امریکہ کے ملکوں میں اداروں اور یونیورسٹیوں میں شعبے بنائے گئے جن میں 1917 کا لندن میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز، روس میں ماسکو یونیورسٹی، لینن گراڈ یونیورسٹی کے علوم شرقیہ کے شعبے جات، رادوگا اشاعت گھر، اطالیہ کی اورینٹل یونیورسٹی جرمنی کی ہمبرگ، بون، میونخ، ہائیڈل برگ، گوٹنگن، ہمبولڈ یونیورسٹی، کینڈا میں مانٹریال کی مے گل یونیورسٹی، ٹورنٹو یونیورسٹی امریکہ میں شکاگو یونیورسٹی، وس کان سن یونیورسٹی، برکلے یونیورسٹی اور as Austin Tex کے ساؤتھ ایشین اُردو ہندی پروگرام شامل ہیں۔

اس مقام پر اُردو کے ان محسنوں کا تذکرہ خارج از محل نہیں جنھوں نے اُردو کو دنیائے ادب سے متعارف کروایا اگرچہ ان افراد کی تعداد بڑی ہے لیکن اشپرنگر، کلنٹ، اور گارساں دتاسی کا ذکر نہ کرنا احسان فراموشی ہوگا۔ اشپرنگر تقریباً تیرہ سال ہندوستان میں رہا۔ دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہوا۔ اس نے ہندوستان میں مقصدی اُردو صحافت کی بنیاد ڈالی۔ کالج سے ایک رسالہ ''قران السعدین'' جاری کیا۔ دہلی کالج میں اشپرنگر سے پہلے ایک کمیٹی موجود تھی جس کا کام سائنسی کتب کو اُردو میں منتقل کرنا تھا۔ یہ سوسائٹی جو ترجمے کا کام کر رہی تھی 1857 میں کالج کے ساتھ ختم ہوگئی۔ کلنٹ نامی ایک انگریز نے انشا کی تصنیف رانی کیتکی کی کہانی کا انگریزی میں ترجمہ کر کے یورپ میں عام کیا۔ گارساں دتاسی نے خطبات، تاریخ ادبیات اور ولی دکنی کے دیوان کی ترتیب و تدوین کا کام کیا۔ جب 1932 میں علامہ اقبال اطالیہ گئے تو مجلہ مشرق Oriente Moderno نے اقبال کی فکر و شاعری کو اطالوی زبان دانوں سے متعارف کروایا۔

جہاں تک اُردو شعر و ادب کا تعلق اور اس کا ادبی، ذوقی اور ثقافتی اثر دنیائے ادب کی مختلف چھوٹی اور بڑی زبانوں سے مربوط ہے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہم اس میدان میں ایشیا کی دوسری زبانوں کے مقابل بہت پیچھے ہیں۔ آج فارسی ادب کے عظیم شعرا جن میں مولانا روم، عمر خیام، حافظ اور فردوسی دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پڑھے جاتے ہیں لیکن برصغیر کے عظیم شعرا میر اور اقبال و فیض تک صرف چند ملکوں کے ادیبوں دانشوروں اور شاعروں میں مقبول ہیں۔

اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہمیں ترجمے، تجزیے، پرنٹ اور ڈیجیٹل میڈیا کے جدید تجربوں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

راقم نے غالب کے فارسی کلام کو دو ضخیم جلدوں میں پیش کیا جس میں ایک پُرمغز مقدمہ غالب کی فارسی شاعری پر تھا جسے فارسی زبان میں ترجمہ کرکے ایرانی پبلشر امیری نے ساری فارسی دنیا میں پہنچا کر غالب شناسی اور غالب کی عظمت کا سکّہ منوادیا۔ آج بعض ملکوں میں اقبال شناسی کا راز یہی ہے کہ علامہ اقبال کا تمام تر کلام دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ قومی کونسل اُردو شعر و ادب کے مشاہیر کے فن پاروں کے ترجمے تشریح اور تجزیے کے لیے دنیائے ادب کے اُن علما دانشور اور ادیبوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں جو ترجمے کے فن سے واقفیت کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں پر مہارت رکھتے ہوں۔

اُردو کو روٹی اور روزگار سے جوڑنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ کوئی بھی زبان صرف ذوق اور شوق کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اردو ایک ایسی مکمل اور توانا زبان ہے جس میں ایک صدی قبل جامعہ عثمانیہ کے پروفیشنل کورس طب، انجینئرنگ، قانون اور اقتصاد اُردو میڈیم ہی میں پڑھائے جاتے تھے۔ اُردو کی بلند پایہ شاعری دنیائے شعر و ادب میں اُردو کا مقام تعین کر چکی ہے لیکن اکیسویں صدی میں اُردو کو تمام جدید علوم اور فنون سے آراستہ کرکے اس کے پڑھنے والوں کو عالمی روزگار کی منڈی میں ایک گراں قدر جنس بنا کر پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ بھارت میں مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو دوسری دانشگاہوں اور اداروں کی رہبری اور رہنمائی کرکے اُردو کو ضروریات زندگی سے جوڑنے کی دامے سخنے درمے اور قدمے قیادت کر رہے ہیں۔ جب تک ہم اُردو کی کمزوری کی تشخیص نہ کریں اس کا علاج ممکن نہیں اس لیے ضروری ہے کہ اُردو کے پرستاروں، ادیبوں، دانشوروں سے ارتباطی مراسلوں، جلسوں اور کانفرسوں کے ذریعے اُردو کے مسائل، مشکلات اور ان کے حل پر بات چیت کریں تاکہ ضروری تعمیری کام بھی ہو سکے۔

جہاں تک اُردو کی نئی بستیوں کا تعلق ہے یہ بستیاں بستے بستے بس رہی ہیں جن کی تاریخ بھی کم از کم دو صدیوں پر بکھری پڑی ہے۔ یورپ کے کئی ممالک جن میں برطانیہ، فرانس،

جرمنی، اطالیہ، اسٹریا، روس، پرتگال، ہالینڈ کے ساتھ ساتھ شمالی امریکہ کے کینڈا اور یونائٹیڈ اسٹیٹ آف امریکہ کے مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں، انجمنوں، اداروں کے ادبی اور ثقافتی حلقوں میں اُردو پلی اور بڑھی لیکن اس کی حیثیت ایک خوش نما اُس پودے کی طرح رہی جو باغ کے باہر کسی سنگلاخ زمین میں یکہ وتنہا زندگی کے دن کاٹ رہا ہو۔ ضرورت یہ ہے کہ اُردو کی بستیوں کو گہوارۂ اُردو سے منسلک کر دیا جائے، یہ سچ ہے کہ اُردو کی نئی بستیوں میں اُردو کی نشوونما اور اس کی پرستاری ذوقی اور شوقی جذبات سے جڑی ہوئی ہے کیوں کہ بغیر کسی سماجی ثقافتی اور اقتصادی دشواری کے بغیر مغربی ممالک میں زندگی گذاری جاسکتی ہے اس لیے صرف جذبات ہی مسئلہ کا حل نہیں بلکہ صدیوں کے تجربات جو گہوارے اُردو کے مراکز نے حاصل کیے ہیں ان سے مدد ضروری ہے ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہ نہالِ اردو خشک نہ ہو جائے اُردو بستیوں کی بقا اور ترقی اور ان کے مسائل کا حل اُردو کی قدیم اور کلاسیک مراکز سے وابستگی ہے۔

اُردو شعر و ادب کا ایک بڑا المیہ اس زبان میں ریڈرشپ یا مطالعہ کرنے والوں کی کمی ہے۔ اُردو کی بنیادی تعلیم کا مسئلہ رسم الخط سے ناواقفیت، مطالعہ سے دوری، اچھے لٹریچر کی کمی، مطبوعات کی گرانی، جدید ٹکنالوجی کی وقت ضائع کرنے والی سرگرمی، وغیرہ اس کا باعث ہیں۔ اُردو کی ریڈرشپ کا مسئلہ اُردو کا پرانا المیہ ہے، ہمارے مطالعے کی دوڑ صرف صبح کے اخبار تک محدود ہو کر رہ گئی، علامہ اقبال کی شاہکار تصنیف جاوید نامہ ایڈیشن اول کے پانچ ہزار نسخے پندرہ سال میں فروخت نہ ہو سکے۔ خواتین کے میگزین اور بچوں کے ادب کی کتابیں مدت کے بعد پھر کچھ کچھ نظر آرہی ہیں لیکن جب تک اُردو والے قومی کونسل اور دوسرے اداروں کے ساتھ ہمکاری اور تعاون نہ کریں یہ کام عمدگی کے ساتھ انجام نہیں دیا جاسکتا۔ انگریزی روسی اور فارسی زبان میں اکیسویں صدی کے ریڈرشپ کے مسائل پر کامیاب تجربے اور راستے نظر آتے ہیں جن پر چل کر ہم بھی اُردو کو عوامی بنا سکتے ہیں۔

مغربی ممالک میں اُردو ٹی وی چینل، اُردو ریڈیو پروگرام، اُردو ہفتہ وار اخبارات اُردو میگزین کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ مشاعروں کی کثرت اُردو ادب کے آموزشی جہت سے زیادہ تفریحی حیثیت کی حامل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف شمالی امریکہ میں

سالانہ تین سو سے زیادہ شعری محافل منعقد ہوتی ہیں۔ شمالی امریکہ میں عموماً شعری مجموعوں کی پذیرائی کا رواج ہے۔ بعض افراد جن میں راقم بھی شامل ہے جو تصنیف اور تالیف میں ادب عالیہ سے منسلک ہے اور چالیس سے زیادہ کتابیں اُردو شعر و ادب کو پیش کر چکا ہے۔ بعض حضرات کے ذاتی کتب خانوں میں عمدہ کتابیں ہیں۔ کنیڈا میں ڈاکٹر بیدار بخت کے ذاتی کتب خانہ میں چار ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں راقم کے کتب خانہ میں 12 ہزار سے زیادہ کتابیں اور ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مخطوطات ہیں جو سب سے بڑا شخصی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ یونی ورسٹیوں اور بعض پبلک لائبریریوں میں اُردو کتابیں موجود ہیں جن سے اسکالرس کبھی کبھار استفادہ کرتے ہیں۔

اُردو شعر و زبان کی تشہیر اور ترویج میں اُردو ہندی فلمیں، اُردو ہندی گیت اُردو دینی مکتب، اُردو سنڈے تعلیمی مدرسے، جمعہ کی نماز کے خطبے، میلاد اور مجالس عزا مثبت رول ادا کررہے ہیں۔

اس تحریر کے آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ ہم کو اُردو کے شاندار مستقبل اور اس کی ترقی کے راستے تلاش کرنے ہوں گے اور جو لوگ مایوسی کی باتیں کرتے ہیں وہ بھی جان لیں۔

ع۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

؎ تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

○

اردو کی تہذیبی معنویت اور مستقبل کے امکانات

پروفیسر عبدالستار دلوی

ڈائرکٹر، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، 92، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی 1

ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے جس میں آریائی اور دراوڑی خاندان سب سے زیادہ اہم ہیں۔ جدید ہند آریائی زبانوں کا تعلق سنسکرت سے ہے، جس کا لسانی رشتہ اوستا اور پہلوی اور پھر قدیم یا کلاسیکی فارسی سے بھی گہرا ہے۔ رگ وید اور ژند اوستا کے درمیان جو لسانی رشتہ ہے اس سے ماہرین نے دونوں زبانوں کو متحد الاصل مانا ہے۔ برہمنوں اور پارسیوں کے مقدس نغمے ایک ہی آلۂ موسیقی سے نکلے ہوئے دو سُر ہیں، جنھیں ایک ہی زبان کی دو بولیوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مارٹن ہانگ (Martin Hong) نے اپنی تصنیف Essays on the Sacred Language Writing and Religion of Parsees، مطبوعہ 1882 میں لکھا ہے کہ:

> "The Language of the Sacred songs of the Brahmas and that Parsees are nothing but two dialects of two or three tribes of one and the same nation".

اردو ہند آریائی زبانوں میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں سنسکرت اور فارسی دونوں

رچی بسی ہوئی ہیں، اس کے برعکس دیگر ہند آریائی زبانیں مثلاً ہندی، مراٹھی، گجراتی، اڑیا، بنگالی وغیرہ اپنے مزاج کے لحاظ سے اردو سے مختلف ہوجاتی ہیں جن کا آزادانہ ارتقا ہوا۔ اردو اس کے برعکس سنسکرت الاصل ہونے کے باوجود فارسی کے لسانی ارتباط سے بنی اور سنوری۔ گیان چند جین کا یہ کہنا کہ لسانی ارتباط سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوتی، کلیتاً نا قابل قبول ہے۔ جس کا علم و آگہی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دو لسانیات (Bilingualism) کے مشہور ماہر Uriel Weinreich نے اپنی مشہور کتاب Languages is contact میں لکھا ہے کہ دو زبانوں کے آپسی ربط سے کبھی کبھی تیسری زبان بھی وجود میں آتی ہے۔ سنسکرت الاصل پراکرتوں اور فارسی کے ربط سے اردو پیدا ہوئی، یہ قصہ صدیوں پر محیط ہے، دو چار برس کی بات نہیں ہے۔ ہندوستان کی مختلف ہند آریائی زبانیں جو سنسکرت کی بنیاد ہیں، الگ الگ جغرافیائی ماحول اور علاقوں میں ترقی کرتی رہیں۔ لیکن اردو نے جو سنسکرت کے بطن سے اور فارسی کے زیر اثر پیدا ہوئی وہ کسی ایک علاقے میں محصور نہ ہوکر، ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ایک رابطے کی زبان بنی۔ پاس پڑوس کے گھروں میں بھی اس کا آنا جانا شروع ہوا۔ لہٰذا ترسیل و ابلاغ میں اردو کو کل ہند سطح پر عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اردو ابتدا سے عوام الناس کی زبان رہی ہے۔ جب جدید ہند آریائی زبانیں ترقی کر کے اپنی شناخت بنا رہی تھیں، تو اردو نے جو ہندوی، ہندی اور ہندوستانی بھی کہلاتی تھی، مختلف علاقوں اور زبانوں کے درمیان ایک رابطہ کی زبان یا Link Language کے طور پر اپنی شناخت قائم کی، چنانچہ شمالی ہندوستان کے علاوہ بنگال، مہاراشٹر، گجرات، پنجاب وغیرہ میں یہ عام بول چال کی حیثیت سے اور ادبی اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ مہاراشٹر کی زبان مراٹھی ہے۔ مراٹھی کے صوفی اور سنت شاعروں نے اپنے بھگتی گیتوں کو اپنی مادری زبان مراٹھی ہی میں استعمال کیا۔ لیکن ان کا پیغام کل ہند ضروریات کا حامل تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا پیغام صرف مہاراشٹر کی علاقائی سرحدوں تک ہی محدود نہ رہے بلکہ دور دور تک پہنچے، تو اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے اردو یا ہندوستانی میں بھی شاعری کی تاکہ غیر مہاراشٹری علاقوں میں بھی ان کا پیغام پہنچے۔ گیانیشور، مکتابائی، ایکناتھ، نام دیو اور دیگر مراٹھی شاعروں نے اس مقصد کی خاطر اردو میں شاعری کی۔

یہی حال گجرات کے شاعروں کا بھی رہا ہے۔ مسلم صوفیا نے بھی اسی زبان کو استعمال کیا اور تصوف کی سنسکرت اصطلاحیں استعمال کر کے صوفیانہ دوستی، امن، بھائی چارہ کا پیغام دور دور پہنچاتے رہے۔ اردو دراصل ابتدا ہی سے مشترکہ تہذیبی زبان (Common Cultural Language) کے طور پر پروان چڑھتی رہی۔ یہ کوئی منصوبہ بند پروگرام نہیں تھا بلکہ عصری ملکی اور تاریخی ضروریات کے تقاضے کے طور پر ہوتا رہا۔ یہاں تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ ابتدا سے تا حال اردو ایک مشترکہ تہذیبی Composite Indian Culture کی زبان تھی اور آج بھی یہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی علامت ہے۔ اور یہ خصوصیت اردو زبان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

جنوبی ہندوستان کی زبانیں کنڑ، تلگو، ملیالم اور تامل ہیں۔ اگرچہ لسانی اعتبار سے اردو اور ان علاقائی زبانوں میں بڑا بُعد ہے، تاہم سیاسی اور تجارتی ضروریات اور تبلیغی جوئے رواں کے تحت یہ زبان جنوبی ہندوستان میں بھی پھیلی اور بیدر، گلبرگہ، حیدرآباد، بیجاپور، ترچناپلی جیسے مقامات پر بھی اس نے ترقی کی اور وہاں صوفیوں کے آستانوں میں پرورش پاتی رہی۔ اس نے یہاں کی علاقائی زبانوں کو متاثر بھی کیا اور متاثر بھی ہوتی رہی۔ اگرچہ تفصیل سے کام ہونا باقی ہے تاہم سینٹ جارج کالج میں جو اردو کا کام ہوا وہ ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔ دیگر علاقوں کی طرح جنوبی ہندوستان کے شاعر چاہے مسلم ہوں یا ہندو، ایک دوسرے کے خیالات اور تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کی خواہش کرتے تھے۔ اس ضمن میں میں بطور خاص دو شاعروں کا ذکر کرنا چاہوں گا، ایک شاہ تراب چشتی، جن کا تعلق چناپلی سے تھا اور جنھوں نے گیان سروپ، ظہورِ کلی اور من سمجھاون جیسی اعلیٰ پایہ کی شعری تخلیقات یادگار چھوڑی ہیں، بھگتی تحریک اور اسلامی تصوف کا سنگم ہے۔ دوسرے شاعر جن کا میں ذکر کرنا چاہوں گا وہ حسین عنبر ہیں۔ انھوں نے سنت گیا نیشور کی گیا نیشوری کے طرز پر حسین عنبری لکھی جو بھگوت گیتا کی تفسیر ہے اور جس کا واحد مخطوطہ پنجاور میں سرفوجی لائبریری میں محفوظ ہے، ان اشاروں سے آپ اردو زبان و ادب کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے لسانی نقشے میں یہ زبان آپسی میل ملاپ اور دوستی کی زبان ہے جو دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے، جس سے واقف ہونا ضروری ہے۔

اردو زبان و ادب ہمیشہ غیر مذہبی اور سیکولر رہے ہیں جو ہمارے ملک کا مزاج ہے، اس میں

ناقوس اور اذان دونوں کی آواز ہے۔اس میں پیر پیغمبر بھی ہیں اور سادھو اور سنت بھی۔ اس میں قرآن اور حدیث بھی ہے اور رامائن بھی، مہابھارت اور گیتا بھی۔حمد ونعت کے ساتھ رام لکشمن، کرشن سبھی اس کے فکری دھارے کے اجزا ہیں۔ اردو زبان و ادب میں فکر کا یہ وسیع و بسیط دائرہ اسے ہندوستان کی اہم تہذیبی زبان قرار دیتا ہے۔ زبانیں اور ادب سبھی اہم ہوتے ہیں، بقول پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی یہ سارے سرسوتی کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے نغمے ہیں۔قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا کی مختلف زبانیں اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی زبانیں ہیں تا کہ لوگ ان کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ اس پس منظر میں سبھی زبانیں برابر کا درجہ رکھتی ہیں۔ کسی زبان کو کسی زبان پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ سب کی افادیت اور اہمیت مسلم ہے۔ زبانیں بنیادی طور پر ابلاغ اور ترسیل کا ذریعہ ہیں، کوئی محدود علاقوں اور ذاتوں میں تو کوئی وسیع و عریض خطۂ زمیں پر۔ اردو کی یہ اہمیت ہے کہ یہ ایک وسیع علاقے میں ابلاغ و ترسیل کا ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی اور قرب و جوار کے ملکوں میں بھی، اس طرح اس نے ایشیائی براعظم کے علاوہ دیگر یورپی ممالک میں بھی مقبولیت حاصل کر لی ہے، اردو سارک ممالک (SAARC Countries) میں باہم تعاون کی زبان ہے۔ علاقائی زبانوں کے مقابلہ میں اس کی یہ حیثیت اسے دیگر ہندوستانی زبانوں سے الگ کرتی ہے۔ میں نے ابتدا میں فارسی اور اردو کے رشتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اردو کا رسم الخط بھی اختلاف کے باوجود فارسی رسم الخط ہے۔ فارسی الفاظ بھی اس میں بڑی تعداد میں استعمال ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ خصوصیات اسے ہندوستان کے پاس پڑوس میں، ایران، افغانستان اور وسطی ایشیا میں ایک لسانی پل Lingustic Bridge ہے، ایسی زبان کا سیکھنا ہماری قومی ضرورتوں کے پیش نظر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

اردو شاعری اور دیگر اصناف کی بھی یہی اہمیت اور افادیت ہے کہ یہ مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ مذہبی زبان نہ ہو کر ملکی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ مشہور عالم اور ودوان Dr. V.K.R.V.Rao نے اردو اور ہندی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو ایک خالص سیکولر زبان ہے۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے اسے کل ہند ابلاغ و ترسیل کی زبان قبول کرتے ہوئے اس کی سرسبزی و شادابی کا اعتراف کیا ہے۔ یہی سرسبزی اور شادابی اسے عوام و خواص میں مقبول کیے ہوئے ہے اور جو

ہندوستانی فلموں اور سیریل میں استعمال ہو رہی ہے۔ ایسی زبان کو جو عام زندگی کا حصہ بن چکی ہو اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں اور اس کی تعلیم و تدریس شخصیت سازی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

اردو زبان کا ہندوستان کی تاریخ سے جو رشتہ ہے اس پر میں نے سطور بالا میں مختصراً اظہار خیال کیا ہے۔ زبانیں صدیوں پر اپنے ارتقا کا مدار رکھتی ہیں۔ زبان اور تہذیب ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور ہمیشہ ان میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ اردو زبان و ادب کا تہذیبی رشتہ جس طرح انیسویں صدی میں قائم تھا، اسی طرح کا رشتہ بیسویں صدی میں بھی قائم تھا۔ بیسویں صدی، ہندوستان میں مغربی تہذیب کے زیر اثر آئی تو اس پر انگریزی زبان و ادب کے اثرات بھی مرتب ہونا شروع ہوئے۔ لفظیات میں تبدیلیاں آئیں اور ادب بھی اس کے زیر اثر پروان چڑھا۔ اردو زبان کے ابتدائی دو سو سال یا اس سے کچھ زائد، قدیم تہذیب کے زیر اثر رہے۔ جب انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی میں انگریزی کے زیر اثر اس میں تہذیبی اور لسانیاتی تبدیلیاں بھی پیدا ہوئیں۔ ان لسانی تبدیلیوں میں انگریزی زبان کے الفاظ، اس کی اصطلاحیں اردو کا جزو بننے لگیں اور یہ تبدیلیاں زبان کا حصہ بن گئیں۔ نہ صرف زبان بلکہ ادب میں بھی یہ تبدیلیاں رونما ہوئیں اور انگریزی ادب کے ترجموں کے ساتھ انگریزی کے اصنافِ ادب بھی اس سے متاثر ہوتی رہیں۔ جدید نظم نگاری، جدید اردو افسانہ، جدید اردو ناول اور اسی طرح دیگر اصنافِ ادب مثلاً شاعری میں سانیٹ، انگریزی ادب کی اصناف کا نتیجہ ہیں۔ اور اب یہ اصناف انگریزی تہذیب کے ساتھ اردو کی لسانی اور ادبی تہذیب کا جزو ہیں۔

زبانوں میں یہ تبدیلیاں دس بیس سال میں نہیں آتیں۔ لیکن اب ٹیکنالوجی کی وجہ سے لسانی اور ادبی و تہذیبی سیاق بدل چکا ہے۔ جس طرح اس سے قبل اردو زبان نے پاس پڑوس کی زبانوں سے اور مغربی زبانوں سے اثرات قبول کیے، اسی طرح زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اس کی تمدنی اور لسانی ضروریات میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اب نئے لسانی ماحول میں اردو کو وسیع تر بنانے کے لیے ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑے گا اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے تراجم کے ذریعے اپنے دامن کو موتیوں سے بھرنا ہوگا۔ دوسری زبانوں سے اپنا دامن وسیع تر کرتے ہوئے تاکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ ابلاغ و ترسیل

(Communication) میں وسعت پیدا کرنے کے ساتھ نئی ٹیکنالوجی جو اکیسویں صدی کی دین ہے، اس کے لیے بھی لسانی اور ادبی سطح پر اپنے دامن کو وسعت دینی ہوگی۔ نئے خیالات، نئے افکار، نئی اصطلاحات اور عالمی سطح پر ہونے والی لسانی اور ادبی تبدیلیوں کو اپنے اندر انگیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کا اپنا مزاج دوسری زبانوں کے اثرات قبول کرنے اور زمانے کو اپنے اندر انگیز کرنے کا مزاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اردو ادب میں ہائیکو، ترائیلے، ریگا جیسی اصناف کو بھی اپنانا ہوگا جس کی ابتدا ہو چکی ہے۔ یہ اردو زبان و ادب کا مستقبل ہے اور اس سے اغماز نہیں برتا جا سکتا۔

اردو زبان کے ساتھ اردو ادب کی تعلیم، مطالعہ اور تفہیم کثیر لسانی ماحول میں بہت اہم ہے۔ اردو ادب ہندوستانی تہذیب کا استعارہ ہے۔ قدیم سے لے کر جدید عہد کا اردو ادب اپنی چاشنی اور دلکشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، اگر چہ اس طرح کی گفتگو کو Relative کہا جا سکتا ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ زبانوں کے بولنے والوں کے لیے اپنی اپنی زبان میں چاشنی اور دلکشی محسوس ہوتی ہے، تاہم اردو کے حسن اور لطافت پر وہ بھی فریفتہ ہیں جو زبان جانتے ہیں اور وہ بھی فریفتہ ہیں جو زبان نہیں جانتے۔ جو زبان نہیں جانتے وہ اس کے صوتی حسن اور لسانیاتی جمالیات سے متاثر ہو کر اردو کی طرف رغبت محسوس کرتے ہیں۔ مجھے خود ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ لوگ اردو کی لسانیاتی جمالیات سے متاثر ہو کر اردو سیکھنے آتے ہیں۔ اردو زبان صرف زبان نہیں ہے، یہ ایک تہذیبی میراث ہے۔ ساری زبانیں تہذیبی میراث ہی ہوتی ہیں لیکن اس خصوص میں اردو کے اپنے امتیازی نشانات ہیں۔ یہاں میں صرف دو مثالوں سے اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

ایک گجراتی خاتون اور ایک مہاراشٹرین صاحب میرے پاس اردو سیکھنے آئے اور اردو کی لطافت کا ذکر کیا۔ شاعری کی تعریف کی، میں نے دیوناگری میں محفوظ اردو کے شعری و نثری سرمایہ کی طرف اشارکیا تو انھوں نے میری بات کو رد کرتے ہوئے اصرار کیا کہ اردو زبان و ادب کے مطالعے کا تقاضہ ہے کہ اسے اردو رسم الخط ہی میں پڑھا جائے، دیوان غالب کو دیوناگری رسم الخط میں پڑھا جا سکتا ہے لیکن اس سے دیوناگری میں لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔ ایک پارسی اعلیٰ افسر جو نہ صرف اردو بلکہ ہندی تک سے نابلد تھے، اردو صرف اس لیے سیکھی کہ انھیں TV پروگرام میں سردار جعفری کے زبان اور لب ولہجہ نے متاثر کیا تھا۔ ایک

پنجابی خاندان کی ساس، بہو اور بیٹوں نے اردو صرف اس لیے سیکھی کہ وہ اپنے تہذیبی ورثہ کو اردو رسم الخط میں پڑھنا چاہتی تھیں۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں ہیں۔

اردو ادب کی اپنی ایک جداگانہ حیثیت ہے، اس میں سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی اور یورپی اور بطور خاص انگریزی کے فکری دھارے مل گئے ہیں اور اس سے اس میں ایک وسعت اور وشالتا پیدا ہوگئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ وسعت ہندوستان کی دیگر زبانوں کو میسر نہیں ہے، اردو کا مزاج انجذاب کا مزاج ہے۔ اس میں ہندی نغمے بھی ہیں اور حجازی لے بھی ہے، کوئل کی کوک بھی اور بلبل ہزار داستان کی نغمہ ریزی بھی، اتنا بڑا کینوس، شاید ہندوستان کی دیگر زبانوں کو میسر نہیں۔ ہندوستان کی تہذیبی زندگی اس کے ادب میں سانس لے رہی ہے، خدانخواستہ اگر ہماری تہذیبی تاریخ کسی سانحہ کا شکار ہو اور نظیر اکبرآبادی کا کلیات ہی بچ جائے تو اس کی مدد سے ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کو از سر نو مرتب و مدوّن کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ بھی اردو ادب کی نظموں، میں غزلوں میں، افسانوں میں اور ناولوں میں محفوظ ہے جو ہماری سیاسی و معاشرتی تاریخ کا ایک ماخذ ہے۔

موجودہ ملک کی لسانی صورت حال جو بھی ہو، لیکن حقیقت یہ ہے اردو زبان و ادب کا ایک شاندار ماضی رہا ہے۔ اس کے مختلف صوبوں کو لسانی اعتبار سے ایک لڑی میں پرویا ہے، ہماری سرکاری زبان ہندی کو بھی غیر ہندی علاقوں میں باریابی اردو نے ہی دی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ سماجی، معاشرتی، لسانی اور تہذیبی ضروریات اپنے نئے تقاضے لے آتی ہے۔ ہندوستان جیسے ایک کثیر لسانی ملک میں ایک اقلیتی زبان ہونے کی حیثیت سے اردو کے مسائل مختلف نوعیتوں کے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں جس طرح کی تبدیلیاں آئیں اس میں اردو زبان جو بقول ڈاکٹر خوب چندانی ''Urdu is a Linguistic wonder اردو ایک لسانی عجوبہ ہے'' وہ کئی طرح کی اونچ نیچ سے گزرتی رہی۔ یہ صرف اردو زبان کی اندرونی طاقت تھی کہ وہ اب بھی زندہ ہے۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کئی طرح کی اونچ نیچ اور مشکلات سے گزرتی رہی ہے۔ ان مشکلات میں ہندوستان جیسے عظیم اور فراخ دل انجذابی مزاج میں سیاسی تعصب اور سماجی و لسانی ناانصافی کو دخل رہا ہے۔

آج جب ہم اس کانفرنس میں اکیسویں صدی میں اردو کی بات کر رہے ہیں اور کوئی لائحۂ عمل

مرتب کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں صحافت اور الیکٹرانک میڈیا اور دیگر جدید ابلاغ و ترسیل کے ذرائع کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ صحافت اور ٹیکنالوجی اردو زبان کی اشاعت اور فروغ میں ضرور معاون ہوسکتی ہے لیکن اس مسئلہ کی بنیاد اردو کی تعلیم ہے۔ اردو کی تعلیم پرائمری اور ثانوی سطح پر اعلیٰ معیار کے ساتھ ہونی چاہیے۔ جب تک ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں اردو کی تعلیم نہ ہو تو فروغ کے امکانات کہاں سے ہوں گے؟ لہٰذا اردو کے فروغ کے سلسلے میں تعلیم ہی کو اہمیت دیتے ہوئے تمام اردو والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اردو سے عشق کرنا سیکھیں۔ اور اس سے صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ ان کی تہذیبی شناخت کا رشتہ بھی جڑا ہوا ہے۔ یہاں والدین کے ساتھ اساتذہ کی بھی ذمہ داریاں ہیں کہ وہ معیار تعلیم کو بلند سے بلند تر کریں۔ اور اردو کی تدریس اور تعلیم کو تنخواہ دار ملازمین کی حیثیت سے نہیں بلکہ تہذیبی اور لسانی معمار کی حیثیت سے فروغ دیں۔ اردو کی تعلیم کے سلسلے میں ایک بات کا بار بار اظہار کیا گیا ہے کہ اس کا رسم الخط مشکل ہے یا اسے تبدیل کرنا چاہیے۔ یہ خیال خود اردو کی لسانی تہذیب کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ہمیں اردو کو اردو کے رسم الخط ہی میں سیکھنا اور سکھانا ہے اور رسم الخط کے تعلق سے جو بھی منفی گفتگو ہوتی ہے، اس کو جھٹک دینا چاہیے اور یہ کسی بھی سطح پر اردو والوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔ آج سے نصف صدی پہلے تک اردو اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے ساتھ اعلیٰ درجے کی انگریزی تعلیم اور عربی یا فارسی کی بنیادی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہوتا تھا۔ اور کچھ علاقائی زبانوں کو بھی سکھانے کا طریقہ رائج تھا۔ اردو والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشی ضروریات کے پیش نظر مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے اردو کا اپنے ''شناختی کارڈ'' کے ساتھ انگریزی اور علاقائی زبانوں پر بھی خصوصی طور پر توجہ دیں اور اردو زبان کے تحفظ کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ عملی زندگی میں پر اعتماد طریقے سے آگے بڑھیں۔ ہمارے یہاں لسانی منصوبہ بندی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ انگریزی اصطلاح کے مطابق ہم اردو والے۔ Hap-Hazard طریقے پر عموماً کام کرتے ہیں۔ ہمیں اردو کے فروغ کے لیے اور اس کا معیار قائم رکھنے کے لیے رسم الخط، املا، قواعد، علمی اصطلاحات پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کل ہند پیمانے پر ہماری زبان کا معیار معمولی اختلافات کے ساتھ قائم رہے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ریاستی

اردو اکیڈمیاں بہت مددگار ہوسکتی ہیں۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس سمت سائنسی اور ٹیکنیکل سطح پر امید افزا کام کی ابتدا کی ہے۔ اگر دیگر باتوں کے سلسلے میں منضبط طریقے سے لسانی منصوبہ بندی پر کام کریں تو اردو کی تعلیم کے چند مسائل جو مشکل معلوم ہوتے ہیں، حل ہوسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے اردو کے تمام تعلیمی اداروں کو بھی اس میں مدد کرنی ہوگی۔ میں پھر یہاں پر اپنی اس بات کو دہرانا چاہوں گا کہ اردو ایک لسانی عجوبہ ہے اور ہماری قومی زندگی کی ایک خوبصورت علامت ہے۔ اس میں ہمیں حکومت سے اپنا حق حاصل کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ اردو والے اسی ملک کے باشندے ہیں۔ اور اردو کو زندہ رکھنا اور اس کو فروغ دینا اردو والوں کے ساتھ حکومت کی بھی ذمہ داری ہے۔ یہ کام صرف اردو اکیڈمیوں کے قیام سے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ حکومتیں بھی اس زبان سے عملاً دلچسپی نہ لیں۔

یہاں پر آخر میں میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اردو ہندی تنازعہ کا مہاتما گاندھی نے ایک حل ''ہندوستانی'' نکالا تھا۔ اس ہندوستانی میں اردو اور ہندی، دونوں شامل تھیں اور دونوں رسم الخط کی حفاظت اور دونوں ادبیات کا فروغ ان کا مطمح نظر تھا۔ گاندھی جی آخر تک اردو اور ہندی کے ساتھ ہندوستانی کو اپنی قومی زبان سمجھتے تھے۔ اپنے انتقال سے صرف 19 دن پہلے انھوں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ آزادی ملنے کے بعد ہمارا ملک اردو کو نظر انداز نہ کرے اور اردو زبان کی پوری پوری حفاظت کرے۔ آج ہم کبھی کبھی سیاسی مقاصد کے لیے مہاتما گاندھی کا نام تو لے لیتے ہیں لیکن ان کی تعلیمات کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ گاندھی جی کی تعلیمات میں اردو کا فروغ اور حفاظت بھی شامل تھا۔ ہم کو اور ہمارے رہنماؤں کو اپنے دل ٹٹولنے چاہئیں کہ وہ گاندھی جی کی تعلیمات کے پیرو کتنے ہیں۔

آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ اردو زبان کی تعلیمی حیثیت جو بھی ہو، یہ آج بھی ہندوستان کے لیے ایک رابطے کی زبان ہے۔ عام ابلاغ و ترسیل میں یہی زبان استعمال ہوتی ہے۔ یہ غیر ملکی زبان نہیں ہے۔ میں یہاں اردو کے مشہور ادیب کنھیا لال کپور کے انشائیے ''برج بانو'' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ برج بانو کا لفظ کنھیا لال کپور نے علامتی طور پر اردو کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے اس انشائیے کے آخر میں لکھتے ہیں:

''برج بانو! تمھیں ہندوستان سے جانا ہوگا کیوں کہ حکومت نے یہ فیصلہ کرلیا ہے۔ یعنی حکومت نے ہندی کو قومی و سرکاری زبان مان لیا ہے۔ اب اردو کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔''

کنھیا لال کی یہ باتیں سن کر برج بانو جواب دیتی ہے:

''حکومت صرف قانون بنا سکتی ہے۔ قانونی طور پر اردو کی حیثیت ختم کرسکتی ہے لیکن اردو کے تئیں عوام کے دلوں میں جو فطری لگاؤ، ہمدردی اور دلچسپی ہے، اسے نہیں مٹا سکتی۔ ہندوستان میں جب تک قلفی بیچنے والے، ڈرائیور، اخبار والے اور چنا بیچنے والے موجود ہیں، یہ زبان بولی جاتی رہے گی۔''

چنانچہ یہ زبان آج بھی عوام الناس کے ابلاغ و ترسیل اور بول چال کی زبان ہے۔ اسے صرف تعلیمی اور تدریسی اور تحریری طور پر فروغ دینا ہے۔ اور یہ کام اردو والوں کے لیے، اردو کے تئیں عشق کی گرمی سے، لگاؤ سے کیا جانا ضروری ہے۔ اس میں خواتین بہت اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔ اس لیے کہ ہمیشہ خواتین ہی تہذیب و تمدن کی محافظ رہی ہیں۔

میں نے اس سے قبل جدید سائنسی علوم اور اصطلاحوں کا ذکر کیا۔ ہر موضوع کی اپنی الگ شناخت اور زبان ہوتی ہے۔ لسانی اصطلاح میں اسے رجسٹر (Register) کہتے ہیں۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں جدید سائنسی علوم میں، جیسے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہیں، ہمیں عربی یا فارسی میں ترجمہ کرنے کی بجائے وہی انگریزی اصطلاحیں استعمال کرنی چاہیے۔ ان اصطلاحوں کے معنیاتی افق ترجمے میں پیش نہیں کیے جاسکتے۔ اگر ایسا کیا جائے تو سائنس کی تعلیم اردو میں آسان تر ہوجائے گی۔ معنیاتی افق وا ہوجائیں گے۔ ان میں وسعت پیدا ہوگی اور اردو میں ان نئے موضوعات کے لحاظ سے ایک طرح کی قوت اظہار اور اختصار (Precision and expression) پیدا ہوگی۔ اکیسویں صدی میں اردو کا یہ ایک اہم علمی تقاضا ہے۔ سائنسی علوم کا فروغ یورپ اور امریکہ سے ہو رہا ہے لہٰذا سائنسی علوم سے لسانی سطح پر ہمارے رشتے مضبوط ہونے چاہئیں۔

○

اردو کا لسانی، ادبی اور ثقافتی کردار

پروفیسر عتیق اللہ

نئی دہلی

اپنی گفتگو کو ایک خاص معنی دینے سے پہلے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ اِدھر مغرب میں تہذیبی مطالعات نے ایک مستقل شعبۂ علم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں میتھیو آرنلڈ نے کلچر اور پاپولر کلچر کے ضمن میں جو سوال قائم کیے تھے اور بعد ازاں ایف۔ آر۔ لیوس نے آرنلڈ کے دور سے بھی زیادہ صارفی اور مسابقتی دور میں ان سوالات کو ایک نیا تناظر عطا کیا تھا، ان کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ اس سلسلے میں اسٹوارٹ ہال، گایتری چکرورتی اسپواک، اڈورنو، ارجن اپا دُرائی، ریمنڈ ولیمز اور حامد نفیسی وغیرہ نے تہذیبی مطالعات کو جو نئے معنی مہیا کیے ہیں، اس کے باعث تہذیبی مطالعے کا شعبہ پہلے سے زیادہ وسیع ہوا ہے۔

☆☆☆

تہذیبی مطالعہ یعنی ادب و شعر کا تہذیبی مطالعہ بادی النظر میں جتنا آسان اور سہل الحصول دکھائی

دیتا ہے، اتنا آسان محض اس لیے نہیں ہے کہ تہذیب یا ثقافت بقول ریمنڈ ولیمز ان دو چار لفظوں میں سے ہے جو بے حد پیچیدہ ہیں، یعنی جن کے مفہوم کے تعین میں ہمیشہ عدم اتفاق کی صورت پیدا ہوتی رہی ہے۔ خود ایلیٹ جب اپنی کتاب Notes Towards the Definition of Culture ترتیب دے رہا تھا تب اسے اس امر کا شاید احساس تھا کہ لفظ کلچر اطلاقی سطح پر علی العموم غلط معنی میں اس کثرت کے ساتھ مستعمل ہے کہ اس کی اصل دلالتیں، تعبیرات کے انبوہ میں گم ہوگئی ہیں۔ عرصۂ دراز تک ہمارے یہاں بھی تہذیب وثقافت کی حد بندی کا مسئلہ حل طلب رہا ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں کلچر اور سویلزیشن جیسے الفاظ کے لیے بالترتیب تہذیب وتمدن کی اصطلاحات وضع کی تھیں۔ یہ دونوں الفاظ ان کے نزدیک مغرب کی طرزِ زندگی، عادات واطوار نیز ایجادات وانکشافات بہ شمول سائنسی، تکنیکی و ذہنی ارتقا کی ایک منزل کے مظہر تھے۔ ہمارے ادوار میں جن تین معنی میں کلچر کا لفظ مستعمل ہے اور جو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، ریمنڈ ولیمز نے مختصر لفظوں میں انھیں اس طرح بیان کیا ہے:

1st: a general process of intellectual, spiritual and aesthetic development.

IInd: a particular way of life, of either a people, a period or a group.

IIIrd: the works and practices of intellectual, and especially artistic activity."

الف: دانش ورانہ، روحانی اور جمالیاتی فروغ کا ایک عمومی عملیہ۔

ب: کسی ایک گروہ یا کسی خاص دور کے عوام کا ایک مخصوص طرزِ زندگی۔

ج: دانش ورانہ سطح کے کارنامے بالخصوص فن کارانہ عمل۔

اگر ان تین نکات کو سامنے رکھ کر بات کی جائے تو مجموعاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ تہذیب اپنے مختلف المعانی تعبیرات اور اعمال وتفاعل میں روایتی طور پر جن خصائص سے عبارت ہے۔ ہم انھیں درج ذیل معنی میں اخذ کرسکتے ہیں۔

اس طور پر تہذیب نام ہے اس اجتماعی معاشرت کا جس میں باہمی ذہنی اور مادی شمولیتیں

اور شرکتیں انسانی احتیاجات اور ضروریات کی تشکیل و تکمیل کرتی نیز انسانی اقداری ماحول کی پرورش کرتی ہیں۔ اشتراکِ عمل کے نتیجے میں حاصل ہونے والے وہ سارے داخلی اور خارجی ممتاز اسالیب ایک دوسرے کو مربوط کرنے والے اور ایک دوسرے کی فلاح اور آسودگی کے لیے متلازم و بنیادی اصول اور رویے جن سے نہ صرف یہ کہ آئندہ نسلیں اخذ و کسب کرتی ہیں بلکہ کبھی سہولیت، کبھی ضرورت، کبھی شائستگی کی خاطر ان میں ترمیم و توسیع بھی کرتی ہیں۔ تہذیب ان کے اجتماعی اور تخصیصی افکار و تصورات، اقدار و ترجیحات، عقائد و رسومات کی عکس ریز ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کی تہذیبی تاریخ اسی باہمی تفاعل، تصادم اور انضمام کے مسلسل عمل سے عبارت ہے۔ اس طور پر تہذیب مظہر ہے معاشرتی شعور کے ارتقا کا۔ جس کے تحت ذہنی و عملی قوتوں کا اشتراک، تخلیق، ایجاد اور اختراع کے ہر پہلو سے نمایاں ہوتا ہے۔ انسان اپنے اسلاف سے حاصل کردہ آگاہیاں، ترمیم و اضافے کے بعد آئندہ نسلوں کو سونپ دیتا ہے۔ آئندہ نسلیں اپنے تجربات کے سرمایے کو اپنے اخلاف کے سپرد کر دیتی ہیں اس طرح تہذیبی اقدار جو اپنی ہر صورت میں انسانی ہیں، مسلسل توسیع کے عمل سے گزرتی ہیں۔

انسان مسلسل اپنے حیوانی عناصر اور اثرات کو کاٹنے چھانٹنے کی سعی کرتا رہا ہے۔ اس طریق عمل نے اس کے اندر جمالیاتی نظم و ضبط اور امتیازات کی فہم کی راہ روشن کی ہے۔ زبان و ادب بھی انسانی تخلیق بہ الفاظِ دیگر تہذیبی سرگرمی کا نتیجہ ہیں۔ ادبی تنقید کے نزدیک تہذیب نام ہے اقدار کے اس مجموعے کا جو بالخصوص انسانی تخیل کے تخلیق کردہ فنی شہ پاروں کے ذریعے عہد بہ عہد منتقل ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس لحاظ سے تہذیب، امتیازات کو ایک واحدے میں ڈھالنے کا کام بھی انجام دیتی ہے اور ادب اسی عمل کو ایک مختلف نہج پر جاری رکھتا ہے۔ ادب تہذیب کی اس روح کو کسب کرتا ہے جس کی شناخت اتحادِ بشریت، انسانی اخوت، باہمی بھائی چارہ، اُنس اور محبت جیسے جذبوں اور قدروں سے عبارت ہے۔ ادیب، تہذیب کے اُن بنیادی عناصر کو اپنے مفاہیم کا جز بناتا ہے جو تفریقِ بشریت کے برخلاف عالمی انسانی برادری کے تصور سے پہچانے جاتے ہیں۔ شاعر جو کچھ کہ تہذیب اور اس کے تناظر سے اخذ کرتا ہے اپنے بہترین تخلیقی اظہار کے ذریعے اسے واپس لوٹا دیتا ہے۔ کَیلے کوالزون نے اس ضمن میں لکھا ہے:

''کسی فنی تخلیق کی قدر و قیمت معلوم کرتے وقت ہماری توجہ صرف فنکار کی صلاحیت اور تخلیقی قوت پر ہی مبذول نہیں ہوتی بلکہ ہم اس کی عام پیشہ ورانہ تہذیب کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ چنانچہ گلوکار کی آواز خواہ کتنی ہی اچھی ہو اسے بھی ضروری تربیت حاصل کرنی پڑتی ہے یعنی گانے کے پیشہ ور معیار تک پہنچنا پڑتا ہے۔ فنی تخلیقات کو پسند کرنے کی تہذیب بھی ہوتی ہے یعنی پسندیدگی کا ایسا طریقہ جو دیکھنے والے کو تخلیقی عمل میں شریک کرتا ہے۔ اس کے اندر فن کار کو بیدار کرتا ہے اور اس میں وہی جذبہ ابھارتا ہے جسے تخلیق کرنے والے نے اپنے شاہ کار میں واقعات اور ظاہر کی عکاسی کرتے وقت محسوس کیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فن پارے صرف ماضی کی تہذیبی یادگاریں نہیں ہوتے بلکہ موجودہ تہذیب کے بھی ایسے عناصر ہوتے ہیں جو نئی نسلوں کے خیالات، جذبات اور تصورات کو ڈھالتے ہیں۔''

ادب، تہذیب کے تحفظ اور تہذیبی اقدار و اسالیب کو نسلاً بعد نسل منتقل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ وہ سارے اقدار و اسالیب جن کی تشکیل میں صدیاں صرف ہوئی ہیں یا ایک خاص عہد میں کسی مخصوص طبقے یا قوم کے عقائد و افکار، رسومات اور ان کی ادائیگی کے طریقوں، زندگی کے آداب و اطوار، فطرت سے رابطوں، امر و نواہی اور باہمی رفاقتوں اور رقابتوں کی نوعیت، اعتقادات میں فوق الفطری آثار اور اوہام پرستی وغیرہ کے حوالے سے ادب جس طور پر آشنا کراتا ہے وہ دستاویزی نہیں ہوتے مگر دستاویزوں کے لیے اسناد، استدلال اور معتبر حوالے کا حکم ضرور رکھتے ہیں۔

اردو زبان کی تاریخ، ہماری تہذیبی زندگی بلکہ ہمارے اجتماعی لاشعور کی تاریخ ہے جس نے ایک سطح پر لنگوا فرینکا کا ایک عظیم تہذیبی اور تاریخی کارنامہ انجام دیا تو دوسری طرف کم سے کم عرصہ میں اپنی اس تخلیقی اہلیت اور تمول کا بھی ثبوت فراہم کیا جس کی بہترین مثال ہماری شاعری اور داستانوں کا غیر معمولی سرمایہ ہے۔ میرے نزدیک کسی قوم کے تخیل کی بلندی کو ناپنے کا اگر کوئی پیمانہ ہے تو وہ سائنس ہے نہ فلسفہ بلکہ شاعری ہے۔ جس قوم کی شاعری جتنی بلند ہوگی، اتنا ہی اس کا تخیل بھی بلند ہوگا اور اتنی ہی اس میں عوام الناس کے درمیان ترسیل و ابلاغ کی صلاحیت بھی زیادہ ہوگی۔

اردو زبان نے بلاشبہ اپنے صحیح معنی میں انفراد کے پہلو بہ پہلو اجماع کے سیاسی اور سماجی شعور، ان کی جذباتی اور داخلی کشمکشوں، ان کی تہذیبی حسیت نیز ان کی آرزوؤں اور امنگوں،

کلفتوں اور ہزیمتوں کو اس طور پر رقم کیا کہ آج یہ سرمایہ ہمارے لیے اپنی تاریخ کا ایک معتبر ترین سراغ بن گیا ہے۔ اردو زبان کی اسی صلاحیت نے اسے ہر عہد میں ایک نئے معنی بھی دیے ہیں اور ادائیگی کے گوناگوں طریقوں سے بھی سرفراز کیا ہے۔ اس کے پس منظر کی تشکیل میں وسطِ ایشیا سے لے کر عرب و عجم نیز ایران کی فہم و دانش کے سانچوں اور رسومات کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ماضی بعید میں کبھی یہ سانچے سنسکرت کے ذریعہ وسطِ ایشیا اور ایران کی سرزمین سے ہوتے ہوئے ہم تک پہنچے تھے، اور کبھی تہذیبی سطح پر سمیرین آدابِ زندگی کو ہم نے اپنے طرزِ احساس سے منسلک کیا تھا، ہڑپا اور موہن جوداڑو کے آثار اس معاملت کے ٹھوس مظہر ہیں۔ جس زبان کے تہذیبی خمیر میں ہندوستانی فکر و فسوں کے علاوہ اتنی بہت سی دیگر تہذیبوں کا رنگ و آہنگ بھی شیر و شکر ہو گیا ہو، اس کی رسائی اور اس کی لطافت کے اپنے معنی ہیں۔ اردو لسانی مذاق اور ہمارے وسیع تر شعری تخیل کی تشکیل نیز اس احساسِ جمال اور ادراکِ حقیقت کی تربیت میں انھیں تمام مذکورہ بالا جغرافیائی وحدتوں نے اہم کردار ادا کیا ہے جس کے باعث ہمارا تخیل غیر معمولی بلندیوں سے ہم کنار ہوا ہے۔ غالب یا اقبال کی شاعری محض ان کے انفرادی تخیل کی بلندی کی آئینہ دار نہیں ہے۔ بلکہ وہ پورے قوم کے تخیل کی بلندی کی ایک مثال ہے کہ اپنے فکر اور اپنے وجدان کے کن عظیم الشان منازل تک ہم نے رسائی حاصل کی ہے۔

جہاں تک ہندوستانی تہذیب کے مختلف النوع تشکیلی عناصر کا سوال ہے۔ وہ ایک دوسرے سے اتنے گتھے ہوئے اور ایک دوسرے میں اتنے رچے بسے ہوئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے نہ تو الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی ایسی تہذیب کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے جو معصوم اور بے میل ہو۔ مختلف جغرافیائی وحدتوں یا کروں میں نشوونما پانے والی تہذیبیں تطبیق کے ساتھ تفریق کے بھی بعض پہلو رکھتی ضرور ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی بھی قسم کی تفریق یا ملاوٹ ان کی تہذیبی شناخت میں مانع آتی ہے۔ ہر تہذیب کا اپنا ایک وسیع تخیل ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک تہذیب دوسری تہذیب سے کچھ اخذ ہی نہیں کرتی یا نہیں کر سکتی۔ عالمی انسانیاتی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ دنیا بھر کی تہذیبیں ایک دوسرے سے اخذ بھی کرتی رہی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتی رہی ہیں۔

جن دانش وروں کا اسرار کسی خاص جغرافیائی اور لسانی تہذیب اور اس کی شعریات پر ہے اور اکثر کسی ادبی یا لسانی دعویٰ کی اوّلیت کا سرا اپنی سرزمینوں میں تلاش کرتے ہیں۔ اُن میں ایک حلقہ وہ ہے جس کی ترجیحات میں جغرافیائی عصبیت کا پہلو زیادہ شدت کے ساتھ حاوی ہے۔ اسی حلقے نے ہندوستان میں دیسی تہذیب کا نعرہ بھی بلند کیا ہے۔ دوسرا حلقہ وہ ہے جس کے تاثر میں جغرافیائی تعصبات کے بجائے علمی دعاوی کا پہلو زیادہ روشن ہے۔ اس حلقے میں عموماً ان حضرات کا شمار کیا جاتا ہے جن کی تاریخ وتہذیب کے پیچ وخم پر گہری نظر ہے اور جو مشترکہ اقدار انسانیہ کے نقیب ہیں۔

پہلے زمرے میں اسپینگلر کو شامل کیا جانا چاہیے، جس کی فکر اور دعاوی بڑی حد تک جغرافیائی تہذیبی عصبیت پر منتج ہیں۔ اس کا اسرار ہے کہ تخلیق کار تہذیب کے امکانات کو بروئے کار لاتا اور تخلیق کے ذریعے اپنے گرد وپیش سے مطابقت پیدا کرتا ہے۔ امکانات کو حقیقت میں ڈھالنے کا کام نابغوں کا ہے۔ اظہار کی بیش بہا قوت تہذیب کے عروج کی مظہر ہوتی ہے اور اس قوت میں کمی واقع ہونے کے معنی اس تہذیب کے زوال کے ہیں۔ اس مرحلے پر بقولِ اسپینگلر:

> ''فن کار زیادہ سے زیادہ تحصیلِ زر کی غرض سے اجنبی تہذیبوں کے تکنیکی سرمایے اور فنی اوضاع یا روایتی ہیئتوں کی نقل پر قانع ہو جاتا ہے۔''

اسپینگلر یہاں تک کہتا ہے کہ تخلیقی آزادی ایک بے معنی تصور ہے۔ کیوں کہ تہذیب خود ایک جبر ہے۔ وہ فن کی اظہاری ہیئتوں میں اپنے مطابق عمل کراتی نیز فنکار کو ایک آلے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اس طرح وہ فن کے عملِ ترسیل کو بھی زمان و مکان کے ایک مخصوص حصار تک محدود کر دیتا ہے کہ ترسیل فن ایک قوت ہے اور تخیل کے وسیلے سے قاری اور فن کار کی باہمی شرکت مستحکم ہوتی ہے۔ تخیلی شرکت کے بغیر فن پارہ محض ایک کاٹھ کا ٹکڑا، کاغذ کا پرزہ یا آوازوں کا جمگھٹا ہے۔ تخیل، ترسیل کے عمل کو مکمل کرتا ہے۔ مگر اسپینگلر تخیل کی صلاحیت کو بھی تہذیب کے ساتھ مشروط کر کے دیکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''کوئی اجنبی یا غیر ملکی شخص اسی لیے کسی دوسرے تہذیبی گروہ کے فن کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے تخیل کی صلاحیت اس کی اپنی تہذیب کی زائدہ و پروردہ ہوتی ہے۔''

اسی بنیاد پر اسپینگلر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ دو مختلف تہذیبی فن کاروں کے تقابلی مطالعے اور تجزیے کی کوئی بھی کوشش بے کار محض ہی ہے۔ ہر تہذیب کا اپنا ایک فنی اسلوب اور ایک نظام ہیئت و اصناف ہوتا ہے جو اسی تہذیب کے ساتھ مخصوص اور اسی تہذیب کے موافق ہوتا ہے۔ اسپینگلر کہتا ہے۔ جیسے مغربی فن پر موسیقی کا، کلاسیکی فن پر شبیہ سازی کا اور مصری فن پر عمارت سازی کا اثر ہمہ گیر ہے۔ اسی لیے اس کا اصرار ہے کہ:

''انفرادی فن کاروں پر لکھنے کے بجائے تہذیبی اسالیب کو موضوع بنا کر فن کی تاریخ لکھنا چاہیے۔''

اسی روشنی میں اسالیب فن، اصنافِ ادب اور ان کے نظامِ ہیئت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ اصناف و اسالیب جو ماضی یا ماضی بعید میں چلن کا حکم رکھتے تھے مگر اب ان کا محض ایک تاریخی تشخص ہی باقی رہ گیا ہے اس کی وجوہ اور مضمرات کیا ہو سکتے ہیں؟ وہ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ موجودہ زمانوں میں ان کا احیا کیوں ممکن نہیں ہے اسپینگلر نے اس صورتِ حال کی وجوہ بھی تہذیب کے جبر میں تلاش کی ہے جس کے باعث ایک عہد کی ساختوں کی جگہ کبھی انتہائی سرعت اور کبھی انتہائی سست رفتاری کے ساتھ دوسری ساختیں لے لیتی ہیں۔ تہذیب کے اسی عمل کی روشنی میں اوڈز، سانیٹ رومان پاروں romances قدیم رزمیوں، طلسمی کہانیوں، تمثیلی قصص، داستانوں، قصائد، واسوخت، ریختی اور شہر آشوب وغیرہ کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

وہ لسانی ساختیں جنھوں نے مختلف تہذیبی کروں میں تشکیل پائی ہے۔ انیسویں صدی ہی سے ان میں بہم دیگر ادغام و انضمام کی صورتیں بھی وضع ہو رہی ہیں اور اسی طرح ایک دوسرے کے نظام ہائے ہیئت و اسلوب نیز شعریات و قواعدیات ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور نئے جمالیاتی واحدوں میں بھی ڈھل رہے ہیں۔ اس طرح پیروی مغرب سے گریز یا پیروی مشرق سے انحراف کے رویے بھی جزوی یا مکمل طور پر بے معنی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کسی ایک لسانی تہذیب کی کوکھ سے جنم لینے والے اسالیب کا مطالعہ علمی تخصیصات قائم کرنے کے لیے تو صائب قرار دیا جاسکتا ہے اور بالخصوص کلاسیکی ادبیات کے مطالعے کے ضمن میں یہ طریق کار مناسب بھی ہے مگر انیسویں صدی کے بعد کے ادب یا ادبی متن کی تفہیم محض اسی شرط کے ساتھ نامناسب ہوگی۔

محولہ بالا مختلف تصورات کی روشنی میں ہندوستانی تہذیب اور اردو کی لسانی تہذیب اور اس کی جڑوں یا اس کے وسیع الآفاق پس منظر اور سلسلوں کا جائزہ لیں تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ہندوستانی تہذیب وحدت اندر کثرت سے مماثل ہے۔ چار پانچ ہزار سال قبلِ مسیح سے لے کر موجودہ زمانے تک اس میں چھوٹی بڑی کئی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں نیز یہ تغیرات تہذیبی وحدت پر بھی اثر انداز ہوتے رہے۔ نیگرایڈ اور پروٹو اکسٹرولائڈ کے بعد دراوڑ ہندوستان آئے جن کے ساتھ ترقی یافتہ سمیرین تہذیب کی وراثت تھی۔ ہزار ڈیڑھ ہزار قبل مسیح میں آریہ وسط ایشیا کے مختلف علاقوں سے جتھوں کی شکل میں وارد ہوئے جن کے پاس اپنا اعتقادی نظام، اساطیر اور اسلوب حیات تھا۔ ان دونوں اقوام میں زبردست نسلی اور تہذیبی تفریق تھی تاہم دو انتہاؤں کے تصادم سے انضمام کی وہ شکل بھی برآمد ہوئی جسے بعد ازاں شنکر آچاریوں نے بڑی حد تک ایک واحدے میں ڈھال دیا۔ بودھ مت، برہمنی نظام کی سخت گیری اور رسوم پرستی کے خلاف ایک بغاوت تھا۔ برہمنی اجارہ داری کو جین مت سے بھی صدمہ پہنچا مگر بالآخر یہ دونوں مذاہب، ایک طویل تہذیبی سفر کے نمایاں سنگِ ہائے میل بن کر رہ گئے۔

مسلمانوں کی باقاعدہ آمد سے قبل، عرب صدیوں سے ہندوستان کے ساحلی، بالخصوص جنوبی ساحلی علاقوں میں تجارت کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ ان کی آمد سے ویشنو تحریک میں نئی جان آ گئی جس کا ثمرہ بھگتی تحریک کی شکل میں رونما ہوا۔ بھگتی تحریک نے مذاہب کی رسمی اور خارجی حدود کو ناروا ٹھہرایا اور وحدتِ انسانی کے تصور پر اپنے فکر کی اساس رکھی۔ ہندوستان میں جو مسلمان آئے تھے ان میں عربوں کی تعداد بہت کم تھی۔ عرب سامی النسل تھے۔ جب کہ زیادہ تعداد ان مسلمانوں کی تھی جو وسطِ ایشیا اور ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ وسطِ ایشیا عربوں کی فکر کی پرداخت کا وطنِ قدیم تھا اور ایران کی فکر کی پرداخت زرتشت اور اوستا کی فضا میں ہوئی تھی خود ایران میں آریوں کی کئی نسلیں آئیں اور یہیں آباد ہوگئیں ایران آریہ ہی سے مشتق ہے۔

ہندوستان کو جن مسلمانوں نے آباد کیا وہ نسلی اعتبار سے آریہ ہی تھے، اسی لیے ہندوستان میں آنے کے بعد انھیں یہاں کے باشندوں کے ساتھ دوئی کا احساس پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے ہندوستانی فکر اور آدابِ زندگی، ادب، فنون، جنگی حکمتِ عملی، اسلحہ سازی، قانون سازی اور

تعمیر یات وغیرہ پر دور رس اثرات قائم کیے اس کے عوض میں مسلمانوں نے عام رسومات اور ہندوستانی تصوف سے جو اقدار اخذ کیں وہ ان کی زندگی اور ادب میں شیر وشکر ہو گئیں۔

ہمارے ادب میں ہندو ویدانت، تصوف اور اسلامی فکر کے اشتراک کی صورت شروع سے موجود و جاری ہے۔ وہ مشترکہ تہذیب جس کا ضمیر رواداری، وسیع المشربی، بے لوثی، خلق، استحسان، اخوت اور یگانگت جیسی قدروں سے اٹھا تھا۔ اردو اور دیگر بولیوں کے ادب نے انھیں اپنے ضمیر کا حصہ بنالیا۔ شعرا نے بالعموم وحدت الوجود کے اس تصور کو نفسِ شعر میں اُتارا جو ان کے مذہبی عقیدے سے متصادم مگر صوفیا کے توسط سے محترم تھا۔ انہی کی طرح اردو شعرا بھی بنی نوع انسان میں وحدتِ جوہر کے قائل ہیں۔

ہندوستانی فلسفہ وفکر میں ابتدا ہی سے علم وعمل کی اہمیت اور آتما پرماتما کے رشتے جیسے عنوانات پر دقیق بحثیں اٹھائی گئی ہیں۔ دنیا کو جہاں مایا جال یا فریب نظر کا نام دیا گیا ہے وہیں حقیقی عرفان کے حصول میں لذائذ وآسائش دنیا کو زبردست سدراہ بھی بتایا گیا ہے۔ ویدانت نے جو نفسِ انسانیت کے خیر کے ساتھ ضبط نفس، ارتکاز نفس نیز نفس کشی، تجرد اور فقر وفاقہ کی تعلیم دی ہے، اپنا ایک مذہبی جواز رکھتی ہے۔ شوپنہار کو اسی فلسفے نے ایک محفوظ راہِ عافیت دکھائی تھی۔

دراصل جو سرزمین فلسفہ وفکر، علم وعمل یا دھیان گیان کی اتنی بڑی تاریخ اپنے جلو میں رکھتی ہے اور تشکیک وتحقیق، تنقید وتفحص کے میلان سے جس کا خمیر اٹھا ہے اور فطرت کے وسیع تر دامن میں جہاں ذہانتوں نے جلا پائی اور فتنہ وفساد سے دور رہ کر جہاں علم وعرفان کی منزلیں طے کی جاتی رہی ہیں وہاں علم روزمرہ کی سرگرمی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور فکر روح کی اشتہا بن جاتی ہے۔ روحانی غواصی یا استغراق کے اس عمل کی پشت پر بھی وجود وعدم کی ماہیت کو سمجھنے کی للک چھپی ہوئی ہے۔ ادراکات سے پرے اٹھنے کی خواہش انسان کے ادراک ہی کی ایک کرشمہ سازی کا حکم رکھتی ہے، ہمارے عہد میں وجودیت existentialism نے جسے کئی نام دیے ہیں۔

ہندوستانی فلسفے کے اکثر نظاموں اور مکاتیب میں روحانیت اور مادّیت ہر دو میلان کا الحاق واشتراک ملتا ہے۔ جدید عہد کا انسان اسے پھر ایک نئے معنی بہم پہنچانے میں سرگرداں ہے۔ اسی کی ایک صورت کپیلا کے سانکھیہ نظام اور اس کی تعلیمات میں دکھائی دیتی ہے، جس کا

اصرار ہے کہ انسانی روح حقیقی علم کے عرفان کے ذریعہ ہی نجات حاصل کرسکتی ہے اور حقیقی علم کے عرفان کا تصور، تصور ذات باری سے عاری ہے۔ خدا کے بالمقابل فطرت کی خلاقی ہی تمام کائنات کی زائیدہ اور فطرت ہی اس کی پروردہ ہے۔ سانکھیہ کے علاوہ لوکیات جسے چارواک سے منسوب کیا جاتا ہے، بھی خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا کیوں کہ جو شئے انسان کے حواس کا تجربہ نہیں بنتی اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ دانش وبینش کی یہ آزادی اور تعقل وتجربے پر اصرار کا یہ رویہ مغرب میں وقتاً فوقتاً مختلف نظریوں کی شکل میں رونما ہوتا رہتا ہے۔ ہندی فلسفہ نے خالقِ کائنات یا کسی ہستی مطلق کے تصور سے جہاں انکار کیا ہے وہاں جوہر ربانی کے خلا کو علم کے نور سے بھر دیا ہے۔ مشاہدۂ باطن ہی سے ایک راہ اخلاقی تنظیم کی طرف بھی جاتی ہے اور حواس واشیا کے باہمی رشتے نے اثبات انا کے تصور کی بھی ترویج کی ہے جو انا اور اشیا دونوں کو ایک نئے معنی کا تناظر عطا کرتا ہے۔

ہمارے یہاں ادب وتہذیب کے رشتے کو سب سے پہلے احتشام حسین نے موضوعِ بحث بنایا تھا۔ ان کا تہذیب کا تصور، بڑی حد تک مارکسی تھا۔ انھوں نے اپنی فکر اور اپنے نتائج میں بہت زیادہ آزادیوں کو پروان نہیں چڑھنے دیا اور نہ ہی ہندوستانی فکر وفلسفہ کو انھوں نے کوئی اہمیت دی تھی جو اردو شاعری کی روح میں رچ بس کر یک جان ہوگئے ہیں اور جس نے ایک وسیع تر تخیل کی صورت اختیار کرلی ہے۔ جب ہم مشترک تہذیب اور مشترک اقداری نظام اور ایک وسیع ذہن کی بات کرتے ہیں تو ہمارا اشارہ کسی ایسی ہندوستانی تہذیب یا اس کے تصور کی طرف ہوتا ہے جس کی تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے اور جو خودگری، خودنگری اور خودشکنی کے علاوہ خودروی کے جوہر بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ وہ اثر قبول بھی کرتی ہے اور دوسری تہذیب یا تہذیبوں پر اثرانداز بھی ہوتی ہے۔ مسلمان جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کی طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں عرب و ایران اور وسطِ ایشیا میں پروان چڑھنے والی ان تہذیبی قدروں اور رویوں کا رنگ وآہنگ زیادہ کاری تھا جن کی تشکیل اور پرداخت قدرے آزادانہ سطح پر ہوئی تھی اسی لیے متصوفانہ فلسفہ وفکر کے فروغ کے لیے ہندوستان کی سرزمین ان کے لیے زیادہ موافق ثابت ہوئی۔ محمد حسن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''اردو ادب کے مزاج اور تہذیبی فضا پر ایرانی اور فارسی اثرات کی نشاندہی

کرتے وقت مشترک آریائی پس منظر کو یاد رکھنا ضروری ہے جس نے قدیم فارسی اصطلاحوں ہی کو نہیں بلکہ تصورات اور اقدار اور تہذیبی رویوں کو بھی ہندوستان میں رچا بسا دیا جسے تصوف کہا گیا وہ اس مشترک تہذیب اور ان مشترک اقدار کا فکری اظہار تھا۔ اسلامی تصوف کی نشو و نما زیادہ تر انہی علاقوں میں ہوئی جہاں بدھ وہار تھے۔ بلخ اور بخارا اس کی مثال ہیں۔ ہندوستانی اور ایرانی تصوف کے درمیان مشترک اقدار کی بنا پر آزاد خیالی، وسیع المشربی اور رواداری کی روایات نے اردو میں رواج پایا۔''

تصوف ایک علم بھی ہے، ایک فلسفہ بھی اور ایک طرزِ حیات بھی نیز طرزِ عمل بھی، جو نفس انسانی کو اخلاقی رذائل سے پاک کرنے اور روحانی سطح پر ان صداقتوں کے عرفان کی طرف مائل کرنے سے عبارت ہے جنھیں مابعدالطبیعیاتی کہا جاتا ہے۔ تزکیہ، اصلاً باطنی تطہیر کا نام ہے۔ اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنا اور رذائل سے پاک و صاف کرنا ہی تزکیے کا منصب ہے۔ اس طرح فلسفہ تصوف میں تزکیہ و تطہیر کے علاوہ استغراقِ باطنی اور عرفانِ حق جیسے روحانی اعمال کے بھی خاص معنی ہیں جسے مراقبہ اور یوگا یا گیان دھیان کا نام دیا گیا ہے اس میں بھی تفکر، محویت، سپردگی اور داخلی غواصی جیسے امور کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ ہندوستانی فکر کا ایک خاص پہلو وحدۃ الوجود کے اس تصور کے ساتھ مشروط ہے کہ خدا لامحدود اور ماورا ہے۔ وہ واحد بھی ہے مکمل بھی۔ مادہ، شر ہی شر ہے، تاریکی ہی تاریکی ہے۔ روح کا مقصد اعلیٰ حقیقت اولی یعنی آتما کا یا پرم آتما میں لین ہو جانا ہے۔ مشرقی متصوفانہ روایت میں ایک خاص حلقہ فنا فی اللہ کا مدعی بھی ہے۔ ہندو ازم میں حقیقت مطلق کا عرفان عمومی انسانی فہم سے پرے ہے۔ یوگا کی مختلف شاخوں کے ذریعے ہی معرفت کی منزل سر کی جاسکتی ہے۔ ایس۔ این داس گپتا نے یوگ کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

''یوگ کے دھیان کی غرض یہ ہے کہ نجات کے واسطے نفس، مستقل ہوکر بتدریج اعلیٰ منازل خیالات کی جانب ثابت قدم رہے یوں کہ بدمیلان آہستہ آہستہ کم زور ہوجائیں اور آخرکار بالکل فنا ہوجائیں۔ بیرونی پاکی وضو سے اور باطنی ذہن کی صفائی، نفسی قناعت، گرمی و سردی کی تکالیف کی برداشت،

جسم کو ساکت رکھنا، گفتگو میں خامشی اختیار کرنا، غور وفکر سے کام لینا، ایشور کا
دھیان کرنا یہ سب کے سب نیم کہلاتی ہیں۔''

ہم سب جانتے ہیں کہ ہندستانی فکر، فلسفے اور تہذیبی اقدار کی تشکیل میں ویدانت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ویدانت کی روشنی میں شنکر آچاریہ نے تمام مظاہر عالم کو مایا جال کہا ہے۔ غالب کی زبان میں:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دنیاوی ظاہری صورتوں کا وقوف، گیان یا علم یا معرفت کے حصول کے ساتھ ہی خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔ روح، صداقت کا ادراک اسی وقت کرسکتی ہے جب نفسِ انسانی تمام دنیاوی اور نفسانی خواہشات و آلائشوں سے پاک وصاف ہوجائے۔ اسی طرح عالمِ موجودات کسی حقیقی وجود کا حامل نہیں ہے اور انسانی انا بھی محض تخیل کی فریب کاری اور کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے اور جو تمام آلام و مصائب کی بنیاد ہے۔ اگرچہ اسلامی تصوف عالم کو معدوم نہیں مانتا کیونکہ انسان ہو یا عالم دونوں ہی عینِ حق اور مظہرِ حق ہیں۔ تاہم اردو شاعری کے بنیادی کردار نے جن تصورات سے تشکیل پائی ہے ان میں مقتدرہ اور راسخیت کا کوئی گزر نہیں بلکہ ایک راہ اس بے لوثی کی طرف جاتی ہے جہاں ساری ملتیں ایک دوسرے میں حل ہوکر اجزائے ایماں کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ اردو اور اردو شاعری کا سیکولر مزاج، مذہبی یا مسلکی تنگ نظری کو مسترد کرکے ایک ایسے وسیع تر تصور کے امکان کو روشن کرتا ہے جس کی پہچان ہی اس کے بے نیازانہ اور وسیع المشرب طرزِ عمل سے قائم ہوتی ہے:

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
(میر تقی میر)

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کر اے شیخ
جوں شمعِ حرم دنگ جھمکتا ہے بتاں کا

غرض کفر سے ہے نہ کچھ دیں سے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
(سودا)

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد ہے تجھ سے ہی گھر دیر و حرم کا
مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں، تو ہی صاحب خانہ تھا
(میر درد)

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
(غالب)

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
(غالب)

غالب کے متذکرہ بالا آخری شعر کے ضمن میں علی دانش نے لکھا ہے کہ ''غالب کی شخصیت میں اجتماعی معاشرت کا رچاؤ تھا... مرزا بہت وسیع النظر انسان تھے۔ ہندوستانی معاشرت بہت سے مذاہب کی عبادات اور نظریات، بہت سے بیرونِ ممالک سے آنے والے افراد کے رسم و رواج، پرانے قدیمی باشندوں کے طرزِ زندگی، مختلف علاقائی زبانوں کے ثقافتی اظہارات اور کثیر القومی بود و باش کے اجتماعی رنگوں میں رنگی ہوئی تھی... غالب اس شعر میں وطن کی محبت سے سرشار نظر آتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ ملک چھن جانے کے بعد انسان اس قدر بے آبرو، دربدر اور بے توقیر ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے دکھ اور اذیت ہی اذیت باقی رہ جاتی

ہے۔ میکدہ ایک استعارہ ہے خوشی کا، محبت کا، سکھ اور چین کا، آرام اور آسائش کا، شراب میکدے ہی میں لطف پہنچاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر چیز کی ایک curtural ٧aluc ثقافتی پہچان ہوتی ہے۔۔'' علی دانش ایک پاکستانی ادیب ہیں انھوں نے 'ہجرت' کے تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے مشکور حسین یاد کے مضمون 'ہجرت کا جدید ترین تصور' کے جواب میں محولہ بالا وضاحت کی ہے۔ ان کا اصرار غالب کے اس وطنیت، قومیت اور کثیر القومی ثقافتی تصور پر تھا جو اردو شاعری میں ایک مستقل عنوان کا حکم رکھتا ہے اور راست یا ناراست، استعاراتی یا مجازی زبان میں دکنی سے لے کر موجودہ عہد کے اکثر شعرا نے جسے اپنا کلمہ بنایا ہے۔

ہندوستانی تہذیب کی اساس جس فلسفہ وفکر اور مذہبی شعار پر استوار ہے۔ اس کا ایک نمایاں اور روشن پہلو دگر یت Altruism اور باہمی رفاقت اور ہم دمی togetherness سے متشکل ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں حسن وعشق اور رندی وقلندری کی طرف جو میلان ہے اور جو اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے اسے محض شاعری کے طور پر اخذ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک سطح پر پہنچ کر یہ ازخود ایک پیغام message کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر چہ اس میلان کی جڑیں ایران و عجم اور وسط ایشیا کی فکری نظامات اور شعری مضامین کی روایت میں گہری چلی گئی ہیں، تاہم ہندوستانی تہذیبی فضا میں اسے اس بنیاد پر پروان چڑھنے کا موقعہ ملا کہ یہاں پہلے ہی سے اخلاقیات کا وہ نظریہ ذہنوں میں رچا بسا ہوا تھا جس کی رو سے عمل کی اخلاقی قدر و قیمت کا معیار و میزان صرف بشر دوستی ہے۔ داخلی غواصی یا گیان دھیان میں مشغول ہونے کے معنی یہ نہیں تھے کہ انائے دیگر ہی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی خود نہادہ انا کے خول سے باہر نکل کر جو کچھ ہے وہ اپنے لیے ہے کے بجائے زندگی برائے دیگراں کے نظریے پر ترجیح دے اور دوسروں کے فلاح و بہبود کے کام آئے۔ شری رام کا انسانی رشتوں کے تحفظ اور پاس داریِ عہد کے لیے جنگل کی سخت ترین زندگی کو قبول کر لینا یا امام الشہدا حضرت امام حسین کا ایک عظیم مقصد کے لیے جانِ عزیز قربان کر دینا کوئی معمولی واقعات نہیں ہیں بلکہ ان میں archetypes اور ایلیوژن کا ایک جہان چھپا ہوا ہے۔

○

اُردو کی سماجی و ثقافتی ترقی

امین حیدر، شکاگو

بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ زبان صرف اظہار خیال کا آلہ نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کا جز ہے۔ اس میں ہمارے تمدن و شائستگی، خیالات اور مشاہدات کی تاریخ پنہاں ہے۔ ہمارے اسلاف نے کیسی کیسی محنت اور مشقت سے اسے پالا، پوسا اور اسے اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ ایک مقدس میراث ہے جو نسل در نسل ہم تک پہنچی ہے۔ ہم ناخلف ہوں گے اگر ہم نے اسے قائم نہ رکھا اور اس کی ترقی اور فروغ میں پوری کوشش نہیں کی۔

اُردو برصغیر ہندو پاک کی آج بھی ایک نمائندہ زبان ہے۔ اس نے اس خطے کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تربیت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ایک طرف اُردو میں ادبی رجحانات کی پاسداری بھی ہوئی اور دوسری طرف نئے نئے تجربات بھی کیے گئے جس نے اس ادب کو ادب عالیہ بنا دیا۔ اُردو زبان کی لسانی توانائی نے اسے اس قدر مقبول بنا دیا ہے کہ اب اس کی ترویج اور ادب کی تخلیق و تصنیف ہندو پاک کے اُردو مراکز سے باہر بھی دکھائی دے رہی ہے۔ اُردو زبان خطے اور رقبہ کے اعتبار سے دنیا کی بولی جانے والی زبانوں میں تیسری بڑی زبان ہے۔ اپنے کم وسائل کے باوجود اس کی عالمگیر ترقی اور ترویج کے روشن پہلو اجاگر ہو رہے ہیں جو ایک

خوش آئند مستقبل کی علامت تصور کیے جاسکتے ہیں۔

اُردو کی خصوصیت یہ ہے کہ دیگر عالمی زبانوں کے مقابلے میں جدید ہونے کے باوجود اسے قبول عام حاصل ہے۔ اُردو کی مقبولیت نے دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے برابر کھڑا ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے اُردو ایک زندہ زبان ہے۔ اس کی ترقی اور ترویج ہمیں یقین دلاتی ہے کہ نہ صرف اس میں آگے بڑھنے کی خوبیاں موجود ہیں بلکہ اس کا مستقبل روشن ہے۔ اُردو کی مقبولیت میں کئی عناصر نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ مثلاً رابطے کے لیے اسے بہترین ذریعے کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی سطح پر اسے بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ میڈیا، ڈرامہ اور فلموں نے اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دینی تبلیغ میں اس کا موثر کردار رہا ہے۔ شاعری نے اس کی مقبولیت کو بام عروج تک پہنچایا۔ علامہ اقبال نے غالباً اسی کیفیت کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے کہ:

گلشن دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

اُردو کی مقبولیت میں ایک اور عنصر ہے جس نے حالیہ دنوں میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ ہے ڈیجیٹل دنیا۔ جب سے اُردو کی۔ بورڈ کمپیوٹر پر دستیاب ہوا ہے اس وقت سے اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ نت نئی اُردو سوسائٹیوں، اخبارات، جرائد و رسائل، سائبر لائبریریز، ویڈیوز اور بلاگوں نے اس کی مقبولیت میں خاصہ اضافہ کیا ہے۔ برقی پیغامات اور سوشل میڈیا میں اُردو رسم الخط کا استعمال بڑھتا جارہا ہے۔ میرے نزدیک یہ سب کچھ اُردو کی۔ بورڈ کو سہل بنانے سے ممکن ہورہا ہے۔ اُردو کی۔ بورڈ نے ارتقا کے کئی مرحلے طے کیے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اس کی ابتدا کا سراغ ہمیں 1911 سے ملتا ہے جب دنیا کا پہلا اُردو ٹائپ رائٹر ایجاد ہوا تھا۔ آج کے کمپیوٹر کے کی۔ بورڈ کی ایجاد کا سہرا مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے سر جاتا ہے جس نے اس کے لسانی پہلوؤں کا ایک پیمانہ بنایا۔ جس کی وجہ سے جدید کی۔ بورڈ کی تخلیق ممکن ہوسکی ورنہ 1963 سے قبل ہر کمپنی اپنی سہولت کے مطابق کی۔ بورڈ بناتی تھی۔ 1963 میں سینٹرل لینگویج بورڈ آف پاکستان سے اس کا ایک معیار مقرر کیا یہ معیار بھی زیادہ دن

تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد 1974 اور 1980 میں بھی اس میں ردّ و بدل ہوا۔ 1998 میں نیشنل لینگویج اتھارٹی آف پاکستان کے ڈاکٹر عطش درانی کی رہنمائی میں ایک ڈیجیٹل کی۔ بورڈ کی ابتدا ہوئی جسے اُردو ضابطہ تختی (UZT) بھی کہا جاتا ہے۔ اسی سے ہی فونیٹک کی۔ بورڈ کی تخلیق ممکن ہوسکی اور آجکل ہم لوگ یہی کی۔ بورڈ استعمال کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک فی زمانہ اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں اس نئے کی۔ بورڈ کا بنیادی کردار ہے۔

اُردو پر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جب یہ بحث عام تھی کہ اُردو رسم الخط کو تبدیل کرنا اُردو کے مفاد میں ہے تاہم موجود اُردو کی۔ بورڈ کی وجہ سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ اُردو ایک زندہ زبان ہے اور یہ اپنے رسم الخط میں سانس لینے اور زندہ رہنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ علم نے انسان کو روشنی دکھائی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اُردو کو مذہبی، تاریخی، اور ادبی زبان کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ زبان بھی بنایا جائے۔ یہ ترقی یافتہ زبان اس وقت کہلائے گی جب اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کی ترجمانی ہو سکے۔ خواہ وہ ستاروں کا علم ہو یا سیاروں کا، زمین کی تنگئ داماں کا تذکرہ ہو یا آسمانوں کی وسعتوں کا۔ سائنس، کھیل، سیاست، تاریخ، فن، موسیقی، ریاضی، سیاسیات، سماجیات، غرض یہ کہ کوئی علم ایسا نہ ہو جو اُردو کی ڈیجیٹل دنیا میں دستیاب نہ ہو۔ اس وقت اُردو کی ایک معتبر انسائیکلو پیڈیا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انٹرنیٹ پر آپ کو بہت سی چیزیں مل بھی جائیں گی مگر ان میں ابھی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر یا آن لائن اُردو میں گفتگو کا اضافہ ضرور ہوا ہے خصوصاً نوجوانوں میں مگر ہم اُردو کے علمی ورثے کے تعلق سے جائزہ لیتے ہیں تو ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں اُردو ہمیں بہت پیچھے کھڑی دکھائی دیتی ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اُردو ہمیشہ سے اس طرح ایک پچھڑی ہوئی زبان نہیں رہی۔ اس نے ترقی کے وہ منازل طے کیے کہ غیر منقسم ہندوستان کے شہر حیدرآباد میں ایک جامعہ (عثمانیہ یونیورسٹی) قائم ہوئی جس کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ یہ ساتویں یونیورسٹی تھی جو اس وقت ہندوستان میں قائم کی گئی۔ اس یونیورسٹی نے یہ ثابت کردیا کہ اس زبان میں وہ وسعت ہے کہ یہ کائنات کے کسی بھی پہلو کی ترجمانی کرسکتی ہے۔ یہاں پر تمام شعبہ جات تعلیم اُردو میں قائم

کیے گئے۔اس وقت اس کے قیام میں بادشاہ وقت کی دلچسپی اور حمایت کو بڑا دخل رہا ہے۔

ہندو پاک میں اُردو کے جو مسائل ہیں اس سے آپ بہ خوبی واقف ہیں۔اس لیے میں صرف یہاں ان مسائل کا ذکر اور ان کے ممکنہ حل کی طرف اشارہ کروں گا جس کا تعلق اُردو کی نئی بستیوں سے ہے۔امریکہ میں اُردو کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہاں کی اُردو سے کوئی نہ کوئی تعلق رکھنے والی آبادی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ وہ لوگ جن کا تعلق پاکستان یا بھارت سے ہے لیکن وہ شروع ہی سے اُردو میں لکھنے پڑھنے کو عار سمجھتے ہیں۔نتیجتاً یہ خود اُردو سے نابلد ہو گئے اور ان کی نسلوں میں اب اُردو باقی نہیں رہی۔

2۔ وہ لوگ جو اُردو سے محبت کرتے ہیں اور زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی جانب سے اس کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ان کے گھروں میں اُردو کا ماحول ہے، اُردو کا تہذیبی ورثہ ان کی روزمرہ زندگی سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ اپنے بچوں تک یہ ورثہ پہنچا رہے ہیں۔

3۔ وہ لوگ جن کو اُردو سے محبت ہے اور وہ اسے ترقی بھی دینا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس وقت اور وسائل کی کمی ہے۔ یہ لوگ زندگی کی دوڑ دھوپ میں اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ یہ چاہتے ہوئے بھی اُردو کا ورثہ اپنے بچوں کو نہیں پہنچا پاتے۔زیادہ تر لوگ اسی درجہ بندی میں آتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس تیسری درجہ بندی کے افراد کے لیے ایسے مواقع پیدا کیے جائیں جہاں ان کے بچوں تک اُردو کا ورثہ پہنچ سکے۔اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ امریکہ میں اُردو کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہو۔ہندو پاک کی حکومتیں اس کو زبان کے طور پر نہیں بلکہ اپنی اپنی ثقافت کے طور پر اس کو فروغ دیں۔امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اُردو کا شعبہ قائم کرنے میں تعاون کریں۔ طالب علموں کے لیے اسکالرشپ دیں تاکہ یہ اُردو پڑھنے کی طرف راغب ہوں۔ یہاں کی بعض جامعات میں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے لیکن وہ کافی سے بھی بہت کم ہے۔اگر ان تجاویز پر عمل کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ایک دور ایسا بھی آئے گا جب امریکہ کے کئی شہر اُردو مرکز کی حیثیت سے قطعہ اراضی پر ابھر کر سامنے آئیں گے یہی اُردو کی تہذیبی اور ثقافتی ترقی کا ضامن ہوگا۔

○

اُردو کا سماجی اور ثقافتی ڈسکورس

پروفیسر قدوس جاوید
جموں وکشمیر

صدی کے بدل جانے سے کسی انسان یا زبان کا مقدر بھی بدل جائے، ضروری نہیں۔ لیکن انسان یا زبان کی جڑیں اگر اپنی ثقافت میں گہرائی سے پیوست ہوں تو پھر وقت اور حالات ساز گار نہ ہونے کے باجود اس انسان یا زبان کی بقا اور ارتقا کے سوتے خشک نہیں ہوتے۔ اپنے وطن میں اُردو زبان اور اُردو والوں کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ اُردو کے لسانی و تہذیبی تناظرات ہندوستان کی کسی بھی دوسری زبان سے کہیں زیادہ سیکولر اور وطن دوست رہے ہیں۔ اُردو کا سماجی وثقافتی کردار آج بھی بدلا نہیں ہے۔ پھر بھی ''گنگا جمنی تہذیب'' کے عنوان سے بت تراشی کر کوئی خوش فہمی پالنے کے بجائے اگر عصری اُردو ادبی سرمایہ کے اندر سے جھانکتی ان سچائیوں پر غور کریں تو بہتر ہوگا۔ جو سچائیاں انسان کی سماجی وثقافتی زندگی کو ایک عمدہ اور خوش آئند سانچے میں ڈھال سکتی ہیں۔ دراصل انسانی زندگی کے لیے ادب کی معنویت یا لایعنیت کے بارے میں ہر شخص کوئی بھی رائے قائم کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن یہ بھی

ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادیب خواہ جتنی بھی کوشش کیوں نہ کر لے اُس سماج اور تہذیب سے صد فیصد الگ ہو کر ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ جس سماج اور تہذیب کی گود میں وہ پلا بڑھا ہے۔ ادب کی تخلیق کے تجزیے کے باب میں ترقی پسند، جدید یا مابعد جدید ادبی ولسانی نظریات یا تھیوریز کو برائے کار لانے کے سوال پر اختلاف رائے فطری امر ہے لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستانی سماج ایک طبقاتی سماج (class Based) ہے۔ اور ہر طبقہ اور فرقہ کی تہذیب کئی جہتوں سے دوسرے طبقے یا فرقے کی تہذیب سے مماثلت سے زیادہ مغائرت بھی رکھتی ہے۔ اور کثرت میں وحدت کے تصور کے باوجود ملک کا ایک بڑا طبقہ، تہذیبی قومیت (cultural nationalism) کا بھی ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ کسی بھی زبان کا ادیب جب بھی کچھ لکھتا ہے تو اس کی تحریر میں شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے طبقہ یا فرقہ کی خوبیوں اور خامیوں، مسائل اور مفادات کی باتیں بالواسطہ یا بلاواسطہ آ ہی جاتی ہیں۔ عرب و عجم کے قبائلی شعرا کے یہاں اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کے ناول آنند مٹھ میں ہندو احیا پسندی اور سرسید اور حالی وغیرہ کی تحریروں کا مقصد واضح طور پر مسلمانوں کی بیداری تھا۔ آج افریقہ کے Blaclc literture اور ہندوستان کے دلت ساہتیہ میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی میں اُردو کے لسانی و تہذیبی کردار پر گفتگو کرتے ہوئے برصغیر میں مغربی تہذیب کی آمد اور اس ملک کی دو بڑی قوموں ہندو اور مسلمان کی زبان، تہذیب و تمدن اور سیاسی، سماجی اور اخلاقی روایات اور اقدار پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ آج کی تاریخ میں دوسری زبانوں کی طرح اُردو کا بھی لسانی اور تہذیبی تناظر خالص اور حتمی نہیں رہ گیا ہے، corrupt ہو چکا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے افسانہ ''اصل واقعہ کی زیراکس کاپی'' کا یہ اقتباس دیکھیے:

''ابھی تم نے جن کلچرز کا ذکر چھیڑا وہ سب دُکھ کی پیداوار ہیں... دُکھ..... جو ہم جھیلتے ہیں... یا جھیلتے رہے ہیں... مہاتما بدھ کے مہان بھشکرمن سے لے کر بھگوان کی آستھاؤں اور نئے خداؤں کی تلاش تک... پھر ہم کسی روحانی نظام کی طرف بھاگتے ہیں... کبھی اوشو کی شرن میں آتے ہیں.....

کبھی گے (GAY) بن جاتے ہیں تو کبھی لیسبین۔ قتل عام ہو رہے ہیں اور بھاگتے بھاگتے اچانک ہم شدید کھوکر کلچر میں کھو جاتے ہیں۔ ہم مر رہے ہیں۔ سموئل اور وہ جو نہیں مر رہے ہیں وہ جانے انجانے ایچ۔آئی۔وی پازیٹو (HIV Positive) کی تلاش میں بھاگ رہے ہیں۔''

(مشرف عالم ذوقی افسانوی مجموعہ نفرت کے دنوں میں 2013 ص 10)

لیکن یہاں معاملہ اُردو اور اُردو بولنے والوں کا ہے۔ اس لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اُردو اور اُردو والوں کو سماجی، تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے عبرتناک حد تک زوال آشنا کروانے کے پیچھے کیسی سوچ اور فکر کارفرما رہی ہے۔ دراصل کسی بھی دور میں حکمراں طبقہ کی سوچ اور فکر یا وچار دھارا ہی سماج ثقافت اور ادب میں Dominant کا کردار ادا کرتی ہے۔ لہٰذا ادب میں بھی حکمراں طبقوں کے نظریات کے اثبات کا عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اپنی آزاد اور غیر جانبدار فطرت کے سبب ادب اکثر طبقاتی یا فرقہ وارانہ حدود کو زیر و زبر کر کے، انسان اور انسانیت کے وسیع و عظیم تر مفادات کو بھی اپنے دائرے کے اندر لاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر تخلیق کار اپنی تخلیقی ایمانداری اور Rationality کو بروئے کار لا کر اپنی تخلیقیت کے منفرد اور عظیم ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ادب یا کسی مخصوص ادبی تخلیق کے تعین قدر میں محض'' وچار دھارا یا'' زاویہ فکر کا ہی نہیں تخلیق کار کے جذبہ و حساس، فکر و دانش اور ذوق و وجدان کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی بھی عمدہ ادبی تخلیق کا لسانی نظام صرف معنی و مفہوم ہی نہیں دیتا سماج اور ثقافت کے حوالے سے صوت اور صورتوں کا بھی اخراج کرتا ہے۔ ہم آپ آسانی کے لیے تصویر کشی، مرقع نگاری یا پیکر تراشی کا نام دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل غور رہے کہ تخلیق کار اپنی نظریاتی (Theory Based) تخلیق میں اپنے عہد کی زندگی

اور زمانہ کے سماجی و ثقافتی اور سیاسی و اخلاقی نشیب و فراز سے متعلق سچائیوں کو کتنی گہرائی اور پھیلاؤ کے ساتھ سمیٹ کر پیش کر سکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حقیقت تو یہی ہے کہ طبقاتی سماج کے زائیدہ ادب کی طبقاتی یا فرقہ وارانہ بنیادوں کے گہرے شعور کے بغیر ایسی کسی بھی ادبی تخلیق کے بارے میں کوئی بامعنی اور نتیجہ خیز ڈسکورس قائم نہیں کیا جا سکتا۔ پیغام آفاقی، سید محمد اشرف، شوکت حیات، ترنم ریاض، حسین الحق اور سلام بن رزاق وغیرہ کی مشہور و مانوس تحریروں سے ایسے ہی مکالمے کی ضرورت ہے۔

منفی سوچ رکھنے والے ہندو، مسلمان اور سکھ ہر فرقہ، ہر طبقہ میں ہیں۔ اس کے منفی اثرات دوسروں کی طرح اُردو اور اُردو والوں کے سماجی اور ثقافتی سرکاروں پر بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک آ کر بھی یہ صورت حال کیوں ہے؟ اس پر غور کرنا ہو گا۔ پریم چند نے اپنے ایک مضمون ''مہاجنی تمدن'' میں ہندوستان میں پنپنے والی ساری برائیوں کے لیے اپنے مخصوص انداز میں مغربیت کی عطا کردہ دولت پرستی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ لیکن ہر چند کہ گھیسو اور مادھو، ہوری اور دھنیا کی حالت اور ہئیت اب بدل چکی ہے لیکن گائتری دیوی اسپائیواک جس ''سلی کون سوسائٹی'' کی باتیں کرتی ہیں اس کا اثبات ممبئی، چینئی اور دہلی، حیدرآباد کے چند سو پر مالس، ملٹی پلیکس یا بگ بازاروں کے حوالے سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ کسی بھی بڑے ترقی یافتہ شہر کے عالیشان بازاروں اور پوش کالونیوں سے بیس پچیس کلو میٹر اندر چلے جائیں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ سماج کا وہ نقشہ نظر آئے گا جسے اسپائیواک نے ہی ڈارونین سماج Darvinian soacity کہا ہے: آج بھی ہندوستان گاؤں اور قصبوں پر مشتمل ایک زراعتی ملک ہے لیکن اب یہاں ادب و ثقافت کی پاسداری کرنے والے زمیندار اور جاگیردار نہیں رہے۔ اُردو زبان و ادب اور اُردو بولنے والوں یا پھر یہ کہیں کہ مسلمانوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے اس کی تفصیل قاضی عبدالستار، سید محمد اشرف اور طارق چھتاری کے افسانوں میں دیکھئے۔ آج اکیسویں صدی میں ٹورے لٹرین مارکیٹ اکانومی، صنعتی ماحول، مزدور بازار (Labour market) اور کنزیومرزم (consumerism) وغیرہ کی وجہ سے امیر

اور غریب کے درمیان فاصلہ تو بڑھ ہی رہا ہے سماج اور ثقافت میں بھی انتشار اور بحران پیدا ہو رہا ہے۔ آزادی کے بعد یہ بحران اور انتشار سب سے زیادہ ہندوستان کے مسلم سماج میں ہے۔ غریبی، بے روزگاری، تعلیم کی کمی، کثرت اولاد وغیرہ مسلم سماج کی وہ کمزوریاں ہیں جن کی طرف اُردو کے فکشن نگار اور شعرا توجہ تو دے رہے ہیں لیکن من حیث القوم ان کے سد باب کی سنجیدہ کوششیں نہ تو مسلم تنظیموں اور اداروں کی طرف سے ہو رہی ہیں ہے اور نہ حکومت کی جانب سے، یہ شکایت درست ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک اُردو اور اُردو والوں کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا ہے لیکن معاملہ'' تو وفادار نہیں، ہم بھی تو دلدار نہیں'' کا بھی ہے۔ پھر وہ آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بھی ہندوستان میں کچے پکے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد آم اور سیب کے درختوں سے زیادہ ہی ہوگی۔ اخبارات و رسائل کی شکل میں ادب و صحافت کے چھوٹے بڑے باغات بھی ہر گلی کوچے میں مل جائیں گے۔ لیکن آج کی تاریخ میں زبیر رضوی کے'' ذہن جدید'' این۔سی۔پی۔یو۔ایل'' اُردو دنیا'' اور'' راشٹریہ سہارا اور عالمی سہارا''، ''نئی دنیا''، ''سیاست'' اور ''انقلاب'' کے سوا اور کون سا رسالہ یا اخبار ہے جو عصری سماجی و ثقافتی انتشار اور امکانات کے حوالے سے اُردو والوں کو Educate کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں تک کا اُردو نصاب تشویشناک حد تک فرسودہ ہے۔ کئی جگہ دو اساتذہ کی تقرری میں مطالعہ، ذہانت اور صلاحیت کے بجائے جوڑ توڑ گروہ بازی اور سکہ رائج الوقت کا عمل دخل زیادہ اہم ثابت ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جدید ترین سماجی اور ثقافتی تقاضوں کی روشنی میں ادب کی تدریس گنے چنے شعبوں میں ہی ہو رہی ہے۔ بعض اداروں کے انعامات ادب کے دبنگوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس سماجی، سیاسی اور ثقافتی صورت حال نے اُردو والوں کو پس ماندگی اور احساس کم تری کے روگ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور یہی روگ ہے جو انھیں قومی دھارے میں پورے جوش و خروش سے شامل ہونے سے روکتا ہے۔ آج کے اس سیمینار کے کانسیپٹ نوٹ میں بھی اور باتوں کے علاوہ'' اُردو بولنے والوں کو قومی دھارے میں لانے اور ان کی سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی خواہشات کی تکمیل کے لیے اُردو میں نئے پراگرام شروع کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ یقینی طور پر قومی کونسل برائے

فروغ اُردو زبان کے اس کانسپٹ (concept) کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔لیکن یہ کام اُردو کے شاعروں اور فکشن نگاروں سے زیادہ بہتر طور پر اُردو داں، ماہرین سماجیات و معاشیات، سیاست داں اور سائنس وٹکنالوجی سے وابستہ دانشور انجام دے سکتے ہیں۔اپنے وطن میں ایسے اُردو داں دانشوروں اور ماہرین کی کمی نہیں ہے۔لیکن شرط یہ بھی ہے کہ ایسے کسی بھی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت کی جانب سے بھی این۔سی۔پی۔یو۔ایل کی ہر ممکن حصولہ افزائی ہو۔کیونکہ حکومت کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے ہی اُردو کا سماجی اور ثقافتی فروغ ہوسکتا ہے اور اُردو والوں کے لیے بھی اچھے دن آنے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

○

21ویں صدی میں اردو کا سماجی ثقافتی فروغ

سید فیصل علی

گروپ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا، عالمی سہارا ٹی وی چینل

اردو زبان و ادب کو گزشتہ 500 برسوں سے ہندوستان کی مشترکہ وراثت کا حصہ بننے کا شرف حاصل ہے۔اس زبان نے ملک کے معاشرتی، سماجی اور ثقافتی اتحاد کو برقرار رکھنے میں جو اہم کردار ادا کیا ہے۔اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اردو شاعروں نے شروع سے ہی ہندوستانیت، مذہبی رواداری اور اتحاد پسندی کو اپنی فکر میں شامل رکھا ہے۔ ہندو شعرا ہوں یا مسلمان دونوں ہی ایک دوسرے کے مذہبی شعائر کا احترام کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اردو کے شاعروں نے ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کے بارے میں عقیدت مندانہ انداز میں اشعار کہے تو غیر مسلم شعرا نے نعتیں کہیں، حمد یہ اشعار لکھے اور مرثیے کو بھی ایک خاص عقیدت کے ساتھ پیش کیا۔ کہتے ہیں کہ 'بھگوان داس ہندی' آل رسولؐ کا عقیدت مند تھا۔ اس نے سوانح النبوۃ نامی کتاب لکھی جس میں حضور اکرمؐ اور بارہ اماموں کے حالات درج کیے اور اسی نے 'قصیدۂ شعلہ بار در منقبت حیدر کرار' بھی لکھا ہے۔اسی طرح بے شمار مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو

زبان سے تعلق رکھنے والے ہندو اور مسلمان شعرا نے ایک ہی چراغ سے کعبہ اور بت خانہ کو روشن کیا ہے۔ کہتے ہیں پرانے زمانے کے ہندو مصنفین اپنی کتاب کا آغاز بسم اللہ سے کیا کرتے تھے اور بعض مسلمان اپنی کتابوں کا آغاز گنیش جی کے ذکر سے کرتے تھے۔ جدید دور میں بھی اردو شاعروں نے اسی اتحاد پسندی اور رواداری کے جذبے کو فروغ دیا۔ چند اشعار سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

سینٹ کی سلوں میں وہ جنگل کی رادھیکا
جھومر جبیں پہ، کان پہ بالا پڑا ہوا
(مصور سبزواری)

میرے بچے بہت شوخ، کنہیا کی طرح
اور گھر میں میری بیوی کسی رانی جیسی
(رزاق عادل)

مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایسے ہندو شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے مشترکہ ثقافت کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ چندر بھان برہمن، ولی رام ولی، ٹیک چند بہار، آفتاب رائے رسوا، آنند رام مخلص، سیتا رام عمدہ، منشی نوبت رائے نظر، چھنو لال دلگیر، پنڈت برج نارائن چکبست، پنڈت دیا شنکر نسیم وغیرہ وغیرہ سے لے کر فراق گورکھپوری اور پھر جگن ناتھ آزاد سے لے کر کمار پاشی، کرشن کمار طور، منچندا، بانی، گلزار دہلوی، چرن سنگھ بشر وغیرہ وغیرہ تک غیر مسلم شعرا کا ایک کارواں محو سفر ہے کہ جس کے ساتھ اور بھی لوگ جڑتے جا رہے ہیں اور اردو اپنی سلطنت کی حدیں وسیع کرتی جا رہی ہے۔

اردو کے سماجی، ثقافتی اتحاد اور فروغ کا ثبوت وہ مشاعرے اور ادبی محفلیں بھی ہیں جن میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں، پادریوں اور دیگر طبقات کے لوگ شعرا و سامعین کی شکل میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مضمون 'ہندوستانی کلچر میں کلاسیکی اردو شاعری' میں اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

'مشاعرہ ایک ایسا رابطہ رہا ہے جس نے ہندوستانی کلچر اور اردو ادب میں کبھی بیگانگی پیدا

ہونے نہیں دی..... آج جب کہ اردو کو ایک بحرانی دور سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ اردو کے مشاعرے اپنی افادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ مشاعروں کی ایک انفرادیت تو یہ ہے کہ یہ مغلیہ تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں اور دوسری طرف ہندو اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر لانے کا سبب بھی بنے۔ ہندو اور مسلمانوں میں استاد اور شاگردی کا وہ رشتہ مستحکم کر دیا جو باپ اور اولاد کے رشتے سے زیادہ مستحکم ثابت ہوا۔''

ایسا نہیں ہے کہ مشاعرے آج کے دور میں ہندو مسلم سماجی تعلقات کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے ہیں، پرانے زمانے میں مشاعروں کے ذریعہ گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کو فروغ ملتا رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنے مضمون میں عہد وسطیٰ کے حوالے سے مشاعروں کی معنویت اور افادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'فارسی اور اردو زبان کی تشکیل میں ہندوؤں کا برابر کا حصہ تھا، وہ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ لوگ مجلس مشاعرہ منعقد کرتے تھے اور مسلمان شعرا کو شرکت کے لیے مدعو کرتے تھے۔ اس طرح مسلمان شعرا بھی اپنے یہاں مشاعرہ یا شعری مجلس ترتیب دیتے تھے اور اپنے یہاں ہندو شعرا کو بلاتے تھے۔ ان کا کلام سنتے اور دل کھول کر داد دیتے تھے۔ طرز فکر اور انداز بیان میں اس حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی کہ اگر ہندو اور مسلمان شاعروں کے کلام میں سے ان کے تخلص نکال دیے جائیں تو امتیاز کرنا مشکل تھا کہ کون شعر ہندو کے قلم فکر سے نکلا تھا اور کون مسلمانوں کے قلم کا تھا۔'

گرچہ آج کے مشاعرے زبان و تہذیب کے معیار کے لحاظ سے زوال پذیر ہیں۔ پھر بھی مشاعرے آج بھی مقبول ہیں اس دور میں بھی سنجیو صراف، کامنا پرساد وغیرہ وغیرہ کچھ ایسے غیر مسلم محبان اردو موجود ہیں جو اردو کو جدید تکنیک کے ذریعہ دنیا کے ہر گوشے میں پہنچانا چاہتے ہیں اور اردو مشاعروں کے معیار کو بلند کرنے کے لیے بھی میدان میں اتر آئے ہیں۔ جشن بہار، ریختہ کے مشاعرے تہذیبی نقطہ نظر سے اردو مشاعروں کو ایک نیا تہذیبی پیکر دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ان اداروں کے زیر اہتمام عالمی مشاعروں کا انعقاد اردو کی بین الاقوامی مقبولیت کا غماز ہے۔ ریختہ، جشن بہار، انجمن وغیرہ کی خدمات ایسی ہیں جو اردو کو 21ویں صدی میں ایک اہم

مقام پر پہنچانے میں اہم رول ادا کریں گی اور اس زبان سے جڑے لوگوں کو ایک نئی سمت طے کرنے کے مواقع بھی فراہم کریں گی۔

یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مندرجہ بالا تنظیموں کے سربراہان کا تعلق اگرچہ غیر مسلم طبقہ سے ہے لیکن وہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ مخلصانہ جذبہ اور جنون کے ساتھ اردو تہذیب وثقافت کے فروغ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

یہ بات کہنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کہ اردو کے زریں دور میں بھی اردو کا اتنا سرمایہ محفوظ نہیں تھا جو آج کے ہائی ٹیک دور میں موجود ہے۔ ریختہ نے جس طرح اردو کے سرمایہ کو محفوظ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اسے اردو کا نشاۃ الثانیہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ آج ریختہ کے سائٹ پر اردو کی نادر و نایاب تقریباً 20 ہزار کتابیں دستیاب ہیں۔ ریختہ ڈاٹ کام، جہاں جہاں اردو ہے وہاں کے سرمائے کو محفوظ کرنے کے لیے جو قدم اٹھا رہا ہے، اس سے 21 ویں صدی میں اردو اپنے نئے پیکر میں نظر آئے گی۔ اردو کے نایاب عظیم سرمایہ پل بھر میں اردو والوں کو حاصل ہو جائے گا۔ یہ اردو کی 21 ویں صدی کی طرف سفر کا ہی حصہ ہے کہ آج ریختہ منشی نولکشور کے مطبع خانہ کی تمام کتب کو نیٹ پر لانے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ جب سے اردو کا رشتہ سائبر اسپیس سے جڑا ہے تب سے اردو کا سماجی وثقافتی دائرہ صرف چند علاقوں تک ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں پھیلا ہے۔ آج اردو فیس بک اور یوٹیوب کے ذریعہ بہت دور تک پھیل رہی ہے۔ سوشل سائٹس پر اردو زبان وادب کے تعلق سے جن مباحث اور موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہے اور ان مباحثوں میں جس طرح پوری دنیا کے لوگ شامل ہو رہے ہیں اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ سوشل نیٹ ورک کی وجہ سے اردو کا سوشل سرکل بھی وسیع ہوا ہے۔ آج بہت سارے ایسے ویب سائٹس موجود ہیں جو اردو کو فروغ دینے میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ ویب سائٹس بھی قابل ذکر ہیں جو اردو سرمایہ کو رومن رسم الخط کے ذریعہ بھی پوری دنیا تک پہنچا رہے ہیں۔ اردوستان ڈاٹ کام، ریختہ ڈاٹ کام، اردو پوئیٹری ڈاٹ کام وغیرہ وغیرہ سیکڑوں سائٹس ہیں جو مکمل طور پر اردو زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیجیٹلائزیشن کے ذریعہ اردو کی اہم کتابیں قارئین تک پہنچ رہی ہیں۔ بلاگ کے ذریعہ بھی

اردو سرکل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو میں ایسے ادیبوں اور تخلیق کاروں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود ہے جن کے اپنے بلاگس ہیں اور وہ اس کے ذریعہ اردو ثقافت کی ترسیل کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں سیکڑوں کی تعداد میں اردو اخبارات کے اپنے سائٹس ہیں۔ آن لائن اخبارات کے ذریعہ اردو ایک بڑے سماج سے جڑ رہی ہے۔ خاص طور سے وہ طبقہ اردو کے پرنٹ رسائل تک جن کی رسائی نہیں ہو پاتی وہ طبقہ بھی آن لائن ایڈیشن سے استفادہ کر رہا ہے۔ اردو کے مشہور اخبارات آج آن لائن ہیں۔ کشمیر سے کنیا کماری اور پھر امریکہ تک جو اہم اردو اخبارات عالمی سطح پر آن لائن موجود ہیں ان میں اردو ٹائمز ممبئی، منصف حیدرآباد، سیاست حیدرآباد، صحافت، جدید خبر، اعتماد، قومی تنظیم، ہندوستان ایکسپریس، اخبار مشرق، اورنگ آباد ٹائمز، انقلاب، الصفا کشمیر، کشمیر عظمیٰ، اودھ نامہ، خدمت جموں و کشمیر، گواہ حیدرآباد، عوام، ہندسماچار، تعمیر مراٹھا، روشنی جموں و کشمیر، روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو ٹائمز امریکہ، وائس آف امریکہ 300 سے زائد اردو اخبارات کے سائٹ کے ذریعہ ان جگہوں پر اردو پہنچ رہی ہے جہاں ان اخبارات کا سرکولیشن نہیں ہے۔ دراصل یہی جدید ٹیکنالوجی ہے جس کے ذریعہ دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی اپنے دائرے کو بڑھا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ملک کی اردو اکادمیاں اور دیگر تنظیمیں بھی اردو کے فروغ کے لیے نئی منصوبہ سازی کر رہی ہیں۔ خاص کر این سی پی یو ایل کا کردار بھی اردو کے فروغ کے سلسلہ میں تاریخ ساز ہے۔ جدید عصری تکنالوجی سے اردو کا رشتہ جوڑنے اور اس کے فروغ میں اس کی اہم خدمات رہی ہیں۔ خاص طور پر موبائل میسیج، رسم الخط، اردو کا سافٹ ویئر اور دیگر تکنیکی ماہرین کے توسط سے اردو کو انٹرنیٹ سے جوڑنا یہ سب وہ خدمات ہیں جس کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ قومی اردو قونسل نے ایک انقلابی اور تاریخی قدم اٹھا کر اردو کو پوری دنیا سے جوڑنے کی سعی کی ہے اور سماجی و ثقافتی فروغ سے اردو کا مکمل رشتہ بھی جوڑا ہے۔ اگر قومی کونسل نے یہ کام نہ کیا ہوتا تو اردو کو اعلیٰ سطح پر کامیابی نہیں مل پاتی۔ اس جدید عصری ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے والے لوگوں میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر طبقے کے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ عصری ٹیکنالوجی کی وجہ سے 21ویں صدی میں اردو کے سماجی وثقافتی فروغ کو ایک نیا زاویہ ملا

ہے۔اردو زبان کا سماجی وثقافتی ادارہ وسیع سے وسیع تر ہوا ہے۔50 سال قبل ہوئے مشاعرے کے کسی مشہور شاعر کو لوگ یوٹیوب کے ذریعہ دیکھ سکتے ہیں۔یوٹیوب کے مشاعرے یا محفلیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو زبان سے استفادہ کے لیے اردو شناسی یا اردو سے واقفیت ضروری نہیں۔جگجیت سنگھ یا دیگر کلوکاروں کی غزلیں بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ بصری اور سمعی طور پر بھی (Audio Visual) اردو کے دائرے میں کافی وسعت آئی ہے کہ غزلوں کے سامعین میں اردو سے زیادہ غیر اردو داں طبقہ شامل ہے۔

مختلف اردو چینلوں کی وجہ سے بھی اردو کا ثقافتی وسماجی اور سیاسی دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوا ہے۔عالمی سہارا، زی سلام، ای ٹی وی، منصف وغیرہ سمیت اردو چینلوں کی وجہ سے اردو عالمی سطح پر خود کو پیش کر رہی ہے۔

اردو کے تعلق سے خاص بات یہ ہوئی ہے کہ اب اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں رہ گئی ہے، بلکہ ہندی طبقہ نے بھی اس کی لفظیات کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔خاص طور پر ٹی وی چینلوں کی خبروں میں اردو الفاظ کا کثرت سے استعمال اور سنسکرت آمیز ہندی سے گریز اس کی مثال ہے۔

ہندی اخبارات بھی کچھ غلطیوں کے ساتھ اردو الفاظ کا استعمال کر رہے ہیں۔اردو کے لیے ایک وسیع تر کائنات اور ایک لامحدود افق تیار ہو رہا ہے۔اردو اب کسی خاص زمین یا جغرافیہ تک محدود نہیں رہ گئی ہے، بلکہ جہاں تک ٹی وی چینلوں اور میڈیا کی رسائی ہے اردو وہاں کسی نہ کسی شکل میں اپنی موجودگی درج کرا رہی ہے۔فلموں میں اردو زبان کا استعمال کسی سے مخفی نہیں،80 کی دہائی تک کی زیادہ تر فلموں کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا میڈیم اردو ہی رہا ہے۔مغل اعظم، پاکیزہ، میرے محبوب اور نکاح جیسی فلموں کے ڈائیلاگ اور نغموں کو غیر اردو طبقہ تو دور اردو طبقہ بھی پورے طور پر سمجھنے سے قاصر نظر آتا ہے۔

اردو واحد ایسی زبان ہے جس نے ابتدا سے ارتقا تک سماجی، ثقافتی، سرو کاروں کو سرفہرست رکھا ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ زبان سماجی اشتراک وارتباط کی وجہ سے ہی وجود میں آئی ہے۔مختلف طبقات کے میل جول کے ذریعہ ہی اس زبان نے جنم لیا ہے۔جس کی وجہ سے

اس میں زیادہ تر الفاظ مختلف زبانوں کے ہیں، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس کا بنیادی Concern سماج سے رہا ہے۔اس کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں بھی اردو زبان نے اپنے بنیادی، سماجی اور ثقافتی سروکاروں سے انحراف یا گریز نہیں کیا، بلکہ یہ وہ زبان ہے جس نے تہذیب کے ارتقا اور نشوونما اور سیکولرزم کی روح کو زندہ رکھنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔

21ویں صدی بہت سارے بحران سے دوچار ہے۔لسانی، مذہبی وقومی سطح پر بہت سارے تنازعات، تناقضات وتضادات ہیں۔ اردو نے ان تنازعات کے تصفیے کی بھی اچھی شکلیں نکالی ہیں۔ اردو صحافت کے ذریعے سماجی وثقافتی اقدار کی ترسیل کا جو کام لیا جارہا ہے وہ قابل قدر ہے۔اردو صحافت نے سماج کے ہر حصے کو متاثر کیا ہے اور سماجی بیداری میں اہم رول ادا کیا ہے۔خاص طور پر نئے سماجی موضوعات پر اردو صحافت کے ارتکاز نے بھی معاشرے پر ایک خوشگوار اور مثبت اثر ڈالا ہے۔سماج کی سمت اور رخ کے تعین میں اردو صحافت ایک اہم کردار ادا کررہی ہے۔

معروضی صحافت کی وجہ سے سماج اور ثقافت کے نئے ابواب کھلے ہیں۔بشریات کے علاوہ سماجیات، اقتصادیات، سائنس اور صحت کے مسائل بھی اردو صحافت کی ترجیحی فہرست میں شامل ہوچکے ہیں۔اس طور پر بھی اردو زبان ثقافت وسماج کے فروغ میں اپنے کلیدی کردار سے انحراف نہیں کررہی ہے بلکہ سماج اور ثقافت کے تمام بنیادی مسائل کو لے کر آگے بڑھ رہی ہے اور وہ تمام بنیادی مسئلے جو سماج وثقافت سے تعلق رکھتے ہیں انھیں پیش کرنے اور لوگوں کو اس کی جڑوں سے آشنا کرنے میں اردو زبان کسی بھی معاصر زبان سے پیچھے نہیں ہے۔

○

اردو شاعری اپنے لسانی و تہذیبی تناظر میں

ڈاکٹر مختار شمیم، بھوپال

ممتاز دانشور اور اردو کے نامور ادیب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ ''اردو والوں نے اپنا کوئی پنتھ یا مٹھ قائم نہیں کیا لیکن وہ کام کر گئے جو قوموں کے کلچرل اتحاد میں بے نظیر ہے'' 1 واقعہ یہ ہے کہ اردو مختلف قوموں، علاقائی زبانوں، وقتی، ذہنی اور تصوراتی کوششوں میں ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ اس کی تفصیل کو معلوم کرنے کے لیے پنڈت کیفی کی تقریر کا ابتدائی حصہ بھی کارآمد ہے، جس میں انھوں نے قوموں کے ذہنی مبادلہ اور کلچرل ارتباط کے لیے جغرافیائی حالات کو ذمہ دار بتایا ہے۔2 چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ اکثر سیاسی خطوط جغرافیائی حدود کو تقسیم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ سیاسی حد بندیاں قوموں اور ملکوں کی طبعی خواص جغرافیائی خصوصیات کے نتیجہ میں رونما ہونے والے تہذیبی نقوش کو کبھی مٹا نہیں سکی ہیں۔

کسی بھی ملک کی آب وہوا اور جغرافیائی ماحول اس ملک کے لوگوں کے نہ صرف عادات واطوار بلکہ ان کے مزاج اور خیالات کی نشوونما میں بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔ یہی نہیں کسی زبان کی ابتدا اور اس کی ترویج وترقی نیز اس زبان کے ادب اور تحریکات ورجحانات کے سلسلے

میں بھی جغرافیائی عناصر ایک حد تک ذمہ دار رہے ہیں۔3 غالباً یہی وجہ ہے کہ ایک ناقد کو کہنا پڑا کہ اردو کے سب سے پہلے شاعر نے پہلا شعر یقیناً غزل کا کہا ہوگا اور اردو کا سب سے آخری شاعر بھی غزل ہی کہے گا۔4 یہ جملہ معترضہ سہی لیکن اس حقیقت کو جانے بغیر بات بنتی نظر نہیں آتی کہ ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں مختلف قومیں، مختلف زبانیں مختلف سماجی روایتیں اور مختلف مذاہب آپس میں اس طرح شیروشکر ہو گئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے کے تناظر میں دیکھنا از بس ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس طرح کسی بھی ملک کی قوم مذہبی اور سماجی روایتوں کے اختلاف کے باوجود آپسی میل جول اور رواداری کے بغیر اپنے تہذیبی اور تمدنی ارتباط کو ارتقائی صورت نہیں دے سکتی۔ اسی طرح کسی بھی ملک کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں ایک دوسرے سے جب تک اخذ وقبول کا عمل نہیں دہراتیں، ترقی یافتہ شکل اختیار نہیں کر سکتیں۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ 'ہر ملک اور قوم کی زبان اس ملک کے جغرافیائی حالات کی تصویر اور اس قوم کی تہذیب ومعاشرت کا آئینہ ہوتی ہے۔5

اردو زبان چونکہ ایک مشترکہ کلچر کی ترجمان ہے اس لیے اسے ''برصغیر کی تاریخ وتہذیب کی دستاویز'' کہنا غلط نہ ہوگا۔ یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ اردو زبان کی ابتدا اسی سرزمین کی رہینِ منت ہے۔ اسی ملک کی آب وہوا میں یہ پودا نشوونما پا کر آج ایک تناور درخت کی صورت میں تہذیب وتمدن کے برگ وبار لایا ہے۔

اردو کے تہذیبی اور ثقافتی کردار کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک طرف اس زبان کا ادب ہند ایرانی کلچر کی خصوصیات سے متصف ہے تو دوسری طرف خالص ہندوستانی روایتوں کے سرچشموں سے سیراب وفیضیاب ہے۔ ایک عام رائے ہے کہ قدیم اردو شاعری، ایرانی کلچر کا پرتو ہے لیکن حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اردو کا شعری سرمایہ ہندوستانی روایتوں اور یہاں کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں سے مالا مال ہے۔ نہ صرف زبان وبیان کے اعتبار سے بلکہ تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں ہندو دیومالائی تصورات قدیم اردو شاعری کے بڑے حصے پر محیط ہیں۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کے کلام میں بھی ہندو اصنامی تصورات موجود ہیں:6

سبھی راگاں کے نمل پھل ہار بایا ہے سو طہارا
جو گاوے رام کیرے رام کز راواں ریھاتی ہے

ہندو مذہب اور ہندو اساطیر کی مثالیں اردو کی کافی صنفِ غزل میں بھی خوب ملتی ہیں۔ غزل جس کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ اس میں فقط گل وبلبل، جام و پیمانہ، دجلہ وفرات، وامق وعذرا اور شیریں وفرہاد کی ہی داستانیں دہرائی جاتی ہیں۔ لیکن لوگ بھولتے ہیں تو اور بات ہے، اسی غزل میں صنم، بت، جوگی، زنار، برہمن، نل، دامن قشقہ وغیرہ بھی مستعمل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

زلف ہے تیری موج جمنا کی
تل نزدیک اس کے اک سناسی ہے
ولی

سنا ہوگا وامق پہ جو کچھ ہوا
نل اس عشق میں کس طرح سے موا
میر

میر کے دین ومذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا
میر

کیوں سنے عرض مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا
مومن

اب ایک شعر انشا کا بھی ملاحظہ فرمائیے:

سانولے پن پر غضب ہے دھج بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھے اب جے کنہیا لال کی

اردو کی اصنافِ سخن میں مرثیہ کو جو مرتبہ ومقام حاصل ہے اس سے غالباً سبھی واقف ہوں

گے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے کہ جس کا مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ لیکن اس کے باوجود مرثیہ نگاری نے ہندوستانی فضا میں سانس لی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ممتاز اور منفرد مرثیہ نگار میر انیس کے بارے میں ناقدین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ عرب کے نقشوں میں ہندوستانی رنگ بھرتے ہیں اسی طرح 'مثنوی' میں بھی ہندوستانی معاشرت مُلکی تمدن وثقافت کی تصویریں اس طرح متحرک ہیں گویا وہ ایک جزوخاص ہیں۔ مثال کے طور پر مثنوی سحر البیان میں ملکی ثقافت کی آئینہ داری دیکھیے:

کیا پنڈتوں نے جو اپنا وچار
تو پھر انگلیوں پر کیا کچھ شمار
جنم پترا شاہ کا دیکھ کر
تُلا اور برچھیک پر کر نظر
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا
چندرماں سا بالک ترے ہوئے گا

میر حسن

اس کے علاوہ اردو کی ایک اور صنف ریختی کے بارے میں مختصر طور پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس صنف کا پس منظر خالص ہندوستانی ہے اور اس کی زبان ہندوستانی معاشرت سے لگاؤ کا نتیجہ ہے جیسے:

گو شکل مری اچھی ہے پر کیا کروں بچھی
تقدیر تو بدتر ہے مری بھاگ پھری ہے

بعض دوسری اصنافِ سخن کی طرح اردو قصیدہ بھی فارسی سے مستعار ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایرانی روایات سے یہ صنف زیادہ مانوس رہی ہے اس کی بھی وجوہات ہیں لیکن فی الحال ان وجوہات سے بحث نہیں ہے تاہم اردو قصیدے کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس خیال کو تصویر کا محض ایک رُخ قرار دیا جائے گا۔ دوسری طرف قصیدے کی زبان اور تشبیہات واستعارات کے پردے میں ایسے اشارے بھی موجود ہیں جو ہندوستانی کلچر اور ثقافت کی دین

ہیں اور اس ملک کی طبعی خصوصیات سے متاثر ہیں:

ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ کے ہاتھوں سے زنار سلیمانی

سودا

جوش روئیدگی خاک سے اب دور نہیں
شاخ میں گاؤزمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل

سودا

زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی مانگیں تھیں دل
جس طرح ایک کھلونے پہ بٹیں دو بالک
ناگنی بیچ میں آ ان کے نہ مانگے پانی
کھیل جاوے وہیں کالا جوڑ سے ان کی لٹک

سودا

کفر، زنار، گاؤزمیں، بالک ہٹ، ناگنی کالا، وہ الفاظ وتراکیب ہیں جو دراصل سرزمین ہند کی گہری روایتوں سے ماخوذ ہیں اور جن کو اردو قصیدے میں جغرافیائی عناصر کی عدم موجودگی کا شکوہ ہے تو سودا کا یہ شعر ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے

جُعد وہ قہر کہ گھنے میں ہو جس کے ہر لہر
گھر ڈبادینے کو عشاق کے دریائے انک

یہ سچ ہے کہ اردو قصیدے میں بالعموم ایرانی رسم، جشنِ نوروز کی بڑی دھوم رہتی ہے۔ لیکن قطب شاہ کا قصیدہ، بسنت کے عنوان سے ہی موسوم ہے۔ جسے ہم مُلکی ثقافت کا ایک عمدہ نمونہ کہہ سکتے ہیں

بسنت کا پھول کھلیا ہے سوجیوں یا قوت رُتانی
کروہل کر سہلیاں سب بسنت کے تائیں مہمانی

دکنی قصیدوں میں تو ہندوستانی تہواروں اور رواجوں کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ ذوقؔ

کے ایک قصیدہ میں مختلف علوم وفنون کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک شعر میں جہاں انھوں نے ایرانی موسیقی کے بارہ راگوں کی نشاندہی کی ہے، وہیں ہندوستانی سنگیت کی چار مت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے:

ماہر موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا
کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت

یہ چاروں مت ہیں سمیر مت، بھرت مت، ہنومنت مت اور کلی ناتھ مت جو دراصل خاندانی ناموں سے موسوم ہیں۔ اردو قصیدے میں ہندوستانی رنگ کی بات چھڑے اور محمد محسن کاکوروی کا نعتیہ قصیدہ زیر بحث نہ آئے ممکن نہیں۔ اُن کے مذکورہ قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور ایمان وانصاف سے کہیئے کیا اردو شاعری کے دامن میں ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی لہریں موجود نہیں ہیں۔ اور درج ذیل اشعار کیا ہمارے مشترکہ کلچر کی دین نہیں ہیں؟

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سروقدانِ گوکل
جاکے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ اَمل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
بند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

جس طرح اکثر مسلمان شعرا کی جولانی طبع ہندو دیومالائی عناصر اور ہندو مذہب وفکر کا طواف کرتی نظر آتی ہے، اسی طرح اردو کے ہندو شعرا نے بھی اسلامی طرزِ فکر، حمد، نعت،

منقبت اور سلام وغیرہ میں اپنے تخیل کی پرواز کو بلندی پر پہنچانے کی سعی کی ہے۔ نانک لکھنوی، دیا شنکر نسیم، پنڈت لبھو رام جوش، عرش ملسیانی، تلک چند محروم، کرشن بہار نور، آنند نرائن مُلّا، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، جگن ناتھ آزاد، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور ایسے کتنے ہی نام ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں قومی یکانگت اور رواداری کو اپنایا ہے۔

اردو کی تمام اصنافِ سخن میں نعت ایک مشکل صنف تسلیم کی گئی ہے۔ نعت نگاری کے لیے شاعرانہ کمال کے ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ درجہ کی دینی معلومات اور صحیح اسلامی تصورات سے کماحقہٗ واقفیت ناگزیر ہے۔

کمال بشریت کے ساتھ اُلوہیت اور نبوت کے مراتب میں لحاظ رکھنا آسان کام نہیں ہے، مگر بعض ہندو شعرا نے نعت نگاری میں حسن عقیدت کے ساتھ ساتھ ان لوازم کو ملحوظ رکھا ہے مندرجہ ذیل اشعار سے میری اس بات کو مزید تقویت ملتی ہے:

ہو شوق نہ کیوں نعت رسول دوسرا کا
مضموں ہوں عیاں دل میں جو لولاک لما کا
یوں روشنی ایمان کی دے دل میں کہ جس سے
ہے حامی و ممدوح مرا شافع عالم
کیفی مجھے اب خوف ہے کیا روز جزا کا

پنڈت برج موہن کیفی

وائے واماندگی و وسعتِ دامان صراط
المدد المدد اے خضر بیابان صراط
ہر قدم پر نگہ یاس ہے یاران صراط
دیکھتے ہیں تجھے پھر پھر کے ضعیفان صراط
ڈگمگاتے ہیں قدم کون سنبھالے آجا

درگا سہائے سرور جہاں آبادی

در اقدس پر حسرت کھینچ لائی ہے محمد کی
کہ مشہور جہاں حاجت روائی ہے محمد کی
ہوئے اک چاند کے دو ٹکڑے انگلی کے اشارے سے
منور کتنی یہ معجز نمائی ہے محمدؐ کی
منشی سکھ دیو پرساد بسمل

عرش ملسیانی کا مجموعہ نعت آہنگ حجاز کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے والد پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کے ایک سلام میں سے دو شعر ملاحظہ فرمایئے:

لو آ گئے عباس دلاور لب دریا
لو تیغ عدو رہ گئی کٹ کر لب دریا
پانی بھی کسی کو نہ دیا اہلِ ستم نے
پیاسے تھے بہتر کے بہتر لب دریا

اصل میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اردو شاعری کی تہذیبی اور متصوفانہ روایات نے بھی ہمارے مشترکہ کلچر اور یگانگت کے جذبے کو پروان چڑھایا ہے یگانگت کی یہی روایتیں غالب اور اقبال کے یہاں بالترتیب اس طرح ظاہر ہوئیں:

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

نظیر اکبر آبادی اس اعتبار سے اردو کے منفرد اور بڑے شاعر ہیں کہ ان کا کلام ہندوستانی تہذیب وثقافت کی رنگارنگی لیے ہوئے ہے۔ ہندو دیومالائی عناصر، ہندو تہوار، ہندوستانی موسم اور ہندوستانی معاشرت کے سینکڑوں پہلو اتنی تفصیل اور جزرسی کے ساتھ نظیر کی شاعری میں نظم ہوئے ہیں کہ وہ بجائے خود ہندو مسلم کلچر کی ایک روشن علامت بن گئے ہیں۔ نظیر کی شاعری دراصل ہماری گنگا جمنی تہذیب کی شاعری ہے۔

اردو کے فلسفی شاعر اقبال کی پہلی نظم ہمالہ سے ہی ان کے عروج کی داستان شروع ہوتی ہے۔

ان کی خودی و بیخودی کے رنگ ہندوستانی دیومالائی تصورات کو چھوکر پیر رومی تک ان کی رسائی کراتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک طرف ملکی تصورات اور ملکی علامات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے تو دوسری طرف ہندوستانی مفکروں، دانشوروں اور مذہبی رہنماؤں کو خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ جن میں گوتم، گرونانک، سوامی رام تیرتھ رام چندر جی، خواجہ معین الدین چشتی کے متبرک نام شامل ہیں۔

دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو زبان اور اردو ادب کا دائرہ ہر ہر مرحلہ پر وسعت کا طلبگار رہا اور چونکہ اس زبان میں اخذ وقبول کا مادہ ابتدا ہی سے موجود تھا اس لیے کوئی تحریک، کوئی رجحان اور کوئی تجربہ ایسا نہیں جو اُس کے خمیر میں شامل نہ ہو۔ ہندوستان کی آزادی کے وقت حبِ وطن کے راگ اسی زبان میں گائے گئے بلکہ یوں کہئے کہ 1857 سے 1947 تک کے سفر میں اردو شاعری نے قومی وحدت اور وطن سے محبت کے نغموں کو ملک کے کونے کونے میں پھیلایا اور لوگوں کے دلوں کو اپنے ترانوں سے برمایا۔ حالی، چکبست اردو شاعری کی اسی قاتل ادا کے شہید ہوئے اور ان کی شاعری بھی حبِ قوم اور حبِ وطن کی روشن علامت ہے۔ اردو کی وسیع النظری اور عالی مشربی نے اپنے دامن میں مختلف تحریکات ورجحانات اور تجربات کے پھول چُنے ہیں لیکن اُس کے اپنے خمیر اور مزاج نے اپنی مہک کو ماند نہیں ہونے دیا۔ اس کا ثبوت ترقی پسند اور اشتراکی نظریات کے حامل شعرا کے یہاں بخوبی مل سکتا ہے۔ مخدوم، جوش، فیض، سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، اختر سعید خاں اور جاں نثار اختر کے کلام میں ہندو اساطیری تصورات اور ہندوستانی معاشرت کی جگمگاتی ہوئی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً:

آج پھر کاشی کی پیشانی پہ رقصاں نور ہے
آج پھر تُلسی کے نغموں سے فضا معمور ہے
سردار جعفری

آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے ماتھے پہ سیندور ملے

کیفی

اُجڑی اُجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے

جاں نثار اختر

رومانوی شاعروں میں خاص طور سے اختر شیرانی کی شاعر میں فطرت سے لگاؤ محض اس لیے نہیں کہ شاعر فرار چاہتا ہے بلکہ یہ جغرافیائی حقیقتوں کی قبولیت کا جذبہ ہے جو انھیں مناظر فطرت سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ اُن کی مشہور نظم اودیس سے آنے والے بتا اس کا بین ثبوت ہے۔

ہم عصر اردو شاعری میں جدید ذہن کے شعرا کے یہاں مشترکہ کلچر سے دلچسپی، اپنی مٹی سے لگاؤ اور ایکتا کا رنگ کچھ اتنا تیز ہے کہ فرقہ واریت کی دوئی مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ مذہبی آنچ بھی کم نرم ہوئی ہے۔ گو کہ فسادات نے اس آنچ کو ہوا ضرور دی ہے لیکن ہمارے شاعروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے قومی یکجہتی کے جذبہ کو عام کیا ہے۔ اور ملکی تہذیب وثقافت کے رنگوں سے ایک خوبصورت دنیا سجائی ہے۔ ہندوستانی کلچر ان کے یہاں ایک علامت ایک استعارہ بن کر ابھرا ہے جسے شعروادب کا یقیناً قابلِ فخر سرمایہ کہا جائے گا۔ ذیل میں ہم عصر اردو شاعری کے کچھ نمونے درج ہیں:

آنکھیں میچے سوچ میں گم
دھونی رمائے کوئی سادھو جیسے بیٹھا ہو
(برگد کا پیڑ/منیب الرحمن)

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں

کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بیٹھوں گا
ایک دن مجھے بھی کوئی گیان ہوگا

(میں گوتم نہیں ہوں؟/خلیل الرحمن اعظمی)

نیلے بھورے پربت تجھ پر برکھا موسم موسم برسی
تجھ کو بہا نہیں پائی
آندھی ٹکرائی پر اڑا نہیں پائی
دھوپیں پگھلانے کو بڑھیں
تب بدلی چھتر بنی
یا شیتل شام آئی
نیلے بھورے پربت

(رت مالا/شفیق فاطمہ شعریٰ)

مسجد کا گنبد سونا ہے
مندر کی گھنٹی خاموش
جز دانوں میں لپٹے
سارے آدرشوں کو
دیمک کب کی چاٹ چکی ہے

(لفظوں کا پل/ندا فاضلی)

سب رشی منی، انبیا، اولیا
خیر کے دیوتا، حسن، نیکی، خدا
آج سب پر مجھے
اعتبار آ گیا، اعتبار آ گیا

(لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا/فہمیدہ ریاض)

پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم کس کے ہاتھ کا مانجھا کھرا تھا اور کس کی ڈور ہلکی تھی
انھیں اس سے غرض کیا پیچ لڑتے وقت کن ہاتھوں میں لرزہ آ گیا تھا اور کس کی کھینچ اچھی تھی
(قصہ ایک بسنت کا/افتخار عارف)

لپٹا ہوا بے داغ کپاسی چادر میں
ایک ٹانگ پر کھڑا ہوا ہے ایک پرندہ
جانے کب سے دھیان لگائے، موج موج پر آنکھ جمائے
دل میں ایک ایک پاپ جواں ہے
وردز باں ہے
بدھم شرنم گچھامی
دھرم شرنم گچھامی
گیانم شرنم گچھامی

(پرندوں کے نام/شاہد میر)

میں پرتھوی الانگھ کے تیری پکار پر
پھر آ کھڑا ہوا ہوں سفر کے کگار پر
(صادق)

خشک پیڑوں کی کتھائیں سن لو
ان میں پھر آگ لگا دو لوگو
(صادق)

وقت آکاش کوئی اور نہ چھور
عمر ٹوٹا ہوا تارا مٹی!
(صادق)

مخمور ہم کو سایۂ ابرِ رواں سے کیا
سورج مکھی کے پھول ہی ملتے ہیں دھوپ میں
(مخمور سعیدی)

جب پت جھڑوں نے اپنی تباہی سمیٹ لی
تھی بادلوں کے ہاتھ میں ساون کی پھلجھڑی
(علیم صبا نویدی)

اکثر خواہش نے ضد کی ہے تانڈو ناچ رچاؤں
اکثر دل یہ کہتا ہے کہ گوتم بدھ بن جاؤں
(مختار شمیم)

آگ میں جلتا ہوا ساون ملے
سبز جنگل سے گزر کر دیکھیے
(مختار شمیم)

ہندو سے پوچھیے نہ مسلماں سے پوچھیے
انسانیت کا غم کسی انساں سے پوچھیے
(ابو محمد سحر)

ان مثالوں کے علاوہ ناصر کاظمی، ناصر شہزاد، عتیق اللہ، شہاب جعفری، فضل تابش وغیرہ کی شاعری میں برصغیر کی تہذیب و معاشرت ہندو اصنامی روایات، سیکولر قدروں اور جمہوری روایتوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اس کے علاوہ ہم عصر ادب میں گیت، ماہیے اور دوہے کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور وہ اس لیے کہ اس میں ہمارے مشترکہ کلچر کی نمائندگی کچھ بہتر انداز میں ہوئی ہے۔ خواہ پاکستان کے اسد محمد خاں کے گیت ہوں یا جمیل الدین عالی کے دوہے۔ ہندوستانی سبھیتا کے سوتر میں کچھ ایسے بندھے ہوئے ہیں کہ بہت سے ہندوستانی شعرا کے مقابلے میں ان کا رنگ چوکھا نظر آتا ہے۔

اسی طرح رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی رباعیات کا بھرپور روپ اور جاں نثار اختر کا گھر آنگن، ہندوستانی ثقافت و معاشرت کے آئینہ دار ہیں۔ ندا فاضلی کی شاعری ہندوستانی مٹی کی مہک سے معمور ہے اور ہندوستانی تہذیب کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

اردو شاعری میں سہرا نگاری ایک شاندار روایت بن چکی ہے۔ شاہ معین الدین ندوی کا

خیال ہے کہ 'سہرا' خالص ہندوستانی رسم ہے ندوی صاحب کا یہ خیال بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے لیے اگرچہ عربی و فارسی کی بحروں کو ناگزیر سمجھا گیا ہے لیکن ان میں تصرف کو ناجائز نہیں سمجھا گیا اور اس طرح عربی و فارسی اوزان کو ہندی اوزان کے قریب لانے کی کوششیں جاری ہیں چنانچہ ماترا اور پنگل، اب ہمارے یہاں اجنبی نہیں ہیں۔ غرض یہ کہ اردو شاعری نے جب ملکی ثقافت و تہذیبی زبان و بیان اور افکار و خیالات کو اپنا جزو خاص بنالیا تو اسے اظہار کمال کا وہ مرتبہ ملا ہے کہ جس پر آئندہ نسلیں ہمیشہ فخر کرتی رہیں گی۔ بات یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی ارتباط نے جس مشترکہ کلچر کی بنیاد رکھی ہے اسے نہ تو محدود نظریے سے دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی اردو زبان کے سرمایے کو اس مشترکہ کلچر سے علاحدہ متصور کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ قوموں کے میل جول کے نتیجہ میں نہ صرف مذہب و رسوم بلکہ نسلی و موروثی اثرات بھی اس زبان کے (خصوصاً شعری) سرمایہ میں اس حد تک کارفرما ہیں کہ ان کو تہذیبی قدروں کا روپ اور سروپ کہنا ہی مناسب ہوگا۔

○

حواشی:

1. ہندو مسلم کلچر، ص....
2. خمسۂ کیفی، مصنف: برج موہن دتاتریہ کیفی
3.4. بحوالہ ریاست ٹونک اور اردو شاعری، از مختار شمیم
5. ادبی نقوش، شاہ معین الدین ندوی، ص 13
6. بحوالہ تیشۂ نظر، ابوالفیض سحر، ص 18

سماجی و ثقافتی سرگرمیاں اور خواتین

ڈاکٹر سیما صغیر

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی

ساری دنیا مختلف سماجوں کی اکائی ہے۔ مختلف رنگ، نسل، ذات پات اور فرقوں کے علاوہ مذاہب اور تہذیبوں سے وابستہ افراد مل جل کر رہنے کا ڈول ڈالتے ہیں تو سماج وجود میں آتا ہے، ہر قوم، ہر مذہب اور ہر فرقوں کے رسم و رواج دوسرے فرقوں سے مختلف ہوتے ہیں لیکن کسی بھی سماج میں یہ تمام مذاہب اور فرقوں کے لوگ بقائے باہمی کے اصول کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ ہندوستانی سماج مختلف مذاہب جیسے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور مختلف رسم و رواج کے آپسی اتحاد سے وجود میں آیا ہے اور اس ملک میں بسنے والے باشندے بلا تخصیص ملک و قوم، مذہب و ملت ایک دوسرے کا احترام کرتے اور اس کی ہمہ جہت ترقی میں حصہ لیتے ہیں تو بلا شبہ ہندوستان کے سماج کی ترقی ہمہ گیر ہوگی۔ سماجی سرگرمیوں سے مراد کسی سماج کے رسم و رواج اور آپسی بندھن کو مضبوط کرنے کے لیے اختیار کیے جانے والے وہ تمام اقدامات ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ کسی ملک میں مل جل کر رہنے والی جن قوموں نے اپنے جو

تاریخی آثار چھوڑے ہیں ان تاریخی آثار اور ان کے ورثا کا تحفظ ثقافتی سرگرمیوں میں داخل ہے۔ ہندوستان جیسے دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے طور طریقوں کو قبول کیا۔ اس قسم کے لین دین کو بلا شبہ اس ملک کی سماجی خصوصیات میں شمار کیا جائے گا۔ ہندوستان جیسے ملک میں بسنے والی قوموں کی اپنی اپنی بیش بہا خدمات ہیں جن سے ہندوستان کی مجموعی تہذیب کی تشکیل ہوئی جو اپنی کثرت سے پہچانی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں نے اس ملک کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے بے شمار نشانیاں چھوڑی ہیں جن میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارتوں میں موتی مسجد، تاج محل۔ قطب مینار، چار مینار، جامع مسجد دہلی، مکہ مسجد حیدرآباد، کئی قلعے، محل اور نادر و نایاب عمارتیں مسلم ثقافت کی یادگار ہیں۔ اسی طرح ہندو تہذیب کی علامتوں میں موہن جو دارو، ہڑپا، بھیم کے کھنڈرات، گوالیار کے محلات، دولت آباد کے قلعہ کے علاوہ اس ملک کی صنعت کاری کے نادر نمونے ہندوستانی ثقافت کی عظیم وراثت ہے۔ سکھوں کا سنہری گردوارہ ہو یا ایلورہ و اجنتا کے غاروں کی نقاشی، سالار جنگ میوزیم ہو یا اسمبلی کی عمارتیں یا پارلیمنٹ کی عمارت یہ تمام ہندوستان کے ثقافتی ورثے ہیں جو کسی بھی ہندوستانی کے دل میں اپنے ملک کی عظمت اور اس کے وقار کو بلند کرنے کا ذریعہ ہیں جنھیں اس ملک کے سماج اور ثقافت سے تعبیر کیا جائے گا۔ سماج اور سماجی سرگرمیوں کا تعلق انسانی رویوں سے قائم ہوتا ہے جبکہ ثقافت اور ثقافتی رویے کا تعلق کسی ملک کے تہذیب و تمدن کی مناسبت سے تیار شدہ یادگاروں پر قائم ہوتا ہے۔ سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں سے وابستگی اور اس کے فروغ کے معاملہ میں صرف مرد ہی اپنی حصہ داری نہیں نبھاتے بلکہ ملک میں بسنے والی خواتین بھی اپنی برابری کی حصہ داری نبھاتی ہیں۔

ایک دور تھا جب ہندوستانی معاشرے پر مرد کا تسلط تھا اور عورت کو گھر کی زینت بنا کر رکھا جاتا تھا جبکہ مرد کو محنت مزدوری کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ہندوستانی سماج زیادہ تر پدری سماج رہا ہے جہاں عورت پر مرد کو سبقت حاصل رہی ہے۔ اس کے باوجود بھی ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک میں دیکھا گیا کہ جب بھی معاشرہ میں مرد کمزور

ثابت ہوئے عورتوں نے آگے بڑھ کر سماج سدھار کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس خصوص میں بادشاہ باپ کے مرجانے پر دو بہنوں جلوہ دیوی اور بہرہ دیوی کی رتناگری پہ حکمرانی اور علی عادل شاہ ثانی کی فوجوں کو شکست دینے کا کارنامہ اس ملک کی تاریخ میں اس حیثیت سے یادگار درجہ رکھتا ہے کہ وقتِ ضرورت عورتوں نے بھی اس ملک میں اقتدار سنبھال کر ملک کی سماجی ساکھ کو متاثر ہونے نہیں دیا۔ مسلم خاتون حکمراں رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی کے کارنامے جس قدر اہمیت کے حامل ہیں اسی قدر ہندو سماج میں مہارانی جھانسی، اہلیہ بائی ہولکر اور ایسی ہی بے شمار خواتین دکھائی دیتی ہیں جنھوں نے ہندوستان جیسے مختلف ثقافتوں والے ملک میں سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے جو سنہرے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ ہندوستان کی آزادی سے قبل اور آزادی کے دوران اور اس کے بعد خواتین کی تعلیمی ترقی، پسماندہ معاشرہ کو سربلندی عطا کرنے سے لے کر شودر طبقہ میں تعلیمی اور فنی شعور بیدار کرنے کے سلسلے میں خواتین کی ہمہ جہت سرگرمیاں لائقِ تحسین ہیں۔ آزادی کے بعد تعلیم و تدریس اور کھیل کود کے میدان سے لے کر پائلیٹ بننے تک اور مریخ کی سرزمین کی سیر کرنے کے کارنامے تک خواتین نے انجام دیے ہیں۔ اس خصوص میں ہمارے ملک کی خواتین کی ہمہ جہت سرگرمیوں نے ایک بہت عمدہ مثال قائم کی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے آزادی کے بعد سے اب تک بے شمار خواتین نے اپنی ذاتی محنت سے کئی تعلیمی ادارے قائم کیے، ٹیکنیکل اسکولوں کا جال پھیلایا، خواتین کی بھلائی کے کارنامے انجام دیے، کم عمر لڑکیوں کی شادیوں کے خلاف تحریک چلائی، لڑکے اور لڑکی کے ساتھ مساویانہ سلوک برقرار رکھنے کے لیے ماحول سازی کی۔ غریب لڑکوں اور لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم سے لے کر ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے مدارس کا اہتمام کیا۔ حکومت نے خود لڑکیوں کو بااختیار بنانے اور ان کی سماجی نابرابری اور ناانصافی ختم کرنے کے لیے ملازمتوں میں 33 فی صد تحفظات کا اعلان کیا تاکہ ہندوستان کے مرد اساس معاشرے میں خواتین کو سماجی اور ثقافتی اعتبار سے خودمختار بنایا جائے۔ ہندوستانی معاشرہ میں

خواتین کے سماجی موقف کو بلند کرنے اور ان کے ثقافتی معیار میں تبدیلی لانے کے لیے حکومتی سطح پر ہندوستان میں کئی اقدامات کیے گئے ہیں اس کی مثالیں دنیا کے کسی ملک میں دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی خواتین کو سماجی اور ثقافتی اعتبار سے سربلندی عطا کرنے کے لیے خود اس ملک کی حکومت نے مناسب اقدامات کا سہارا لیا ہے۔ خواتین کی آبادی کو کم سے کم کرنے کے لیے پدری سماج نے ماں کے پیٹ ہی میں لڑکی کی پیدائش کے وجود پر حمل ساقط کرانے کا آغاز کیا تو اس کے خلاف اقدام کرتے ہوئے ہندوستانی حکومت نے بچہ کی جنس معلوم کرنے کے عمل کو قانونی جرم قرار دیا تاکہ خواتین کو اس غیر فطری جبر سے نجات مل سکے اور خواتین اپنی ہم جنس کو جنم دینے میں مرد کی زیادتی سے نجات پا سکیں۔ حکومتی سطح پر سماجی اور ثقافتی دھارے میں مساویانہ سہولتیں فراہم کرنے کے لیے خواتین ہر قسم کے قانونی چارہ جوئی کے لیے کمر بستہ ہیں۔ خواتین کی معصومیت اور انھیں اپنے جال میں پھنسانے کے لیے مرد کے اختیار کردہ رویّوں کی وجہ سے خواتین کو سماجی اور ثقافتی فروغ کے سلسلے میں دشواری کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے جسے دور کرنے کی کوششیں بھی کی جا رہی ہیں۔

خواتین کی جانب سے سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے معاملے میں پسماندگی کا شکار ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستانی خواتین نے اپنی مشرقی تہذیب اور مذہب کے اصولوں کو نظر انداز کر کے یوروپی یا مغربی تہذیب کو گلے لگانا شروع کر دیا ہے۔ نئی نسل کی خواتین میں بڑھتا ہوا ہندوستانیت کا فقدان اور مشرقی تہذیب اور اخلاق سے دُوری کے احساس علاوہ حد درجہ یوروپی فیشن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے باعث ہندوستان کی خواتین میں ہندوستانی سماج و معاشرت سے ہی نہیں بلکہ ثقافت سے بھی دور کرنے کی تمام تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ جسے روکنے کے لیے حکومت کے اقدامات بھی کامیابی سے ہمکنار ہونے نہیں پا رہے ہیں۔ اس کام کی تکمیل کے لیے مزید ایک انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔

گو کہ ہندوستان جیسے آزاد اور فلاحی مملکت میں یہ دیکھا گیا ہے کہ خواتین میں بیداری

ی لہر دوڑ رہی ہے لیکن ماہرین معاشیات کے خیال کے مطابق ہر وہ ملک جس کی آبادی کثیر ہوتی ہے اس ملک میں ترقی کی رفتار انتہائی سست ہوتی ہے۔ ہندوستان کو دنیا کے کثیر آبادی والے ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ملک میں مردوں کے مقابلے میں، عورتوں کا تعلیمی اوسط کم رہا ہے لیکن گزشتہ دس پندرہ سالوں میں حکومتی اقدامات کی ترقی کی وجہ سے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دسویں، بارہویں میں اور گریجویشن کے علاوہ پوسٹ گریجویشن میں کامیابی حاصل کرنے والے طبقہ میں خواتین پیش رفت کر رہی ہیں۔ سماجی اور ثقافتی سطح پر خواتین کی اس کامیابی کے امید افزا نتائج برآمد ہونے کے امکانات قوی ہیں۔ اب بھی ہندوستان میں بسنے والی دیہاتی خواتین سماجی نابرابری، چھوت چھات، حسد جلن اور مسابقتی دوڑ میں پچھڑی ہوئی یا پسماندہ قرار پانے کی سب سے بڑی وجہ مذہبی ٹھیکیداروں اور سماجی بندھنوں کے علاوہ فرسودہ رسم و رواج کی پابندی ہے، جس نے انھیں اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ شہری علاقوں اور اس کے اطراف و اکناف میں سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ سے خواتین کو جوڑنے کے لیے مختلف اقدامات کا سلسلہ جاری ہے۔ خواتین کی تعلیم میں جنسی تعلیم اور مساوی جنس کے تصور کی وجہ سے ان کے ذہن کی گرہوں کو کھولنے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ صفائی، نفاست اور پاکیزگی کے گر سکھانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اب بھی ہندوستانی خواتین ازکار رفتہ خیالات سے وابستہ اور غلط فہمیوں کی شکار ہیں جنھیں فرسودہ رسومات سے دور کرنے کے لیے مزید اقدامات ضروری ہیں۔

ہندوستان کے مسلم طبقے میں سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں خواتین کی حصہ داری کے لیے اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ خواتین کے سماجی اور ثقافتی شعور کی سربلندی کے لیے سب سے پہلے خواجہ الطاف حسین حالی نے شاعری میں ''چپ کی داد'' اور ''بیوہ کی مناجات'' لکھ کر اس ملک میں بیوگی کے بوجھ سے عورتوں میں پیدا ہونے والی سماجی کمزوری اور ثقافتی دوری کی طرف نشاندہی کی۔ انھوں نے عورت کی تعلیمی اور اخلاقی پسماندگی کی کے لیے ''مجالس النساء'' جیسی کتاب لکھ کر اس دور کی خواتین میں سماجی احساس جگانے کا کام کیا تاکہ وہ ثقافتی سرگرمیوں سے وابستہ ہوسکیں۔ ہندوستانی معاشرے میں مسلم

طبقہ کی زبان اردو ہے اور آزادی کے 68 سال بعد بھی مردوں کے مقابلے میں خواتین میں اردو ذریعہ تعلیم سے اعلیٰ درجوں تک پہنچنے کا جذبہ زیادہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ مسلم طبقہ کی خواتین میں ہر قسم کی بیداری اس زبان سے وابستہ مرد قلم کاروں کے ذریعہ شروع ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اور علامہ راشد الخیری کے اخلاقی قصے، خاص طور پر خواتین کے لیے ان کا جاری کردہ رسالہ ''عصمت'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم طبقہ میں سماجی اور ثقافتی سطح پر سرگرمیوں کو پروان چڑھانے میں آزادی سے قبل کی اردو مرد قلم کاروں نے پوری طرح جدو جہد کو جاری رکھا آزادی سے قبل کی خواتین میں حجاب امتیاز علی اور نذر سجاد حیدر کی تحریریں ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں خواتین کی حصہ داری کو آزادی سے قبل اور پھر آزادی کے بعد کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ہندوستان جیسے جمہوری ملک اردو زبان و ادب کے حوالے سے دو اہم خواتین نے اپنی سماجی اور ثقافتی خدمات کے ذریعہ بڑی شہرت حاصل کی۔ حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی نہرو ایوارڈ اور پدم شری اعزاز یافتہ جیلانی بانو جیسی فکشن کی ادیب اور عالمی شہرت کی حامل قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان خواتین نے ہندوستانیت اور اس ملک کی سماجی و ثقافتی خصوصیات کو منظر عام پر لاکر یہ ثابت کر دیا کہ ملک میں دستوری طور پر قبول شدہ (18) زبانوں میں اردو کا ادب ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کو اجاگر کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

ہندوستان کی فلمی دنیا اور ٹیلی ویژن سیریل کی وجہ سے بھی اس ملک کے سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے اور اس ملک میں بسنے والی خواتین میں سماجی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سماج کے سوچنے اور زندگی گزارنے کے دھارے تبدیل ہونے لگے ہیں۔ ساس بہو کے روایتی جھگڑوں کے بجائے اس رشتہ میں پیدا ہونے والے سدھار کے علاوہ ساس بہو میں پیدا ہونے والے خلوص سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کے سماجی ڈھانچہ میں خواتین کی سوچ و فکر میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ خواتین کی خودداری کو ٹھیس نہ پہنچے اور ان کو خودمختار بنانے کے لیے جوڈو کراٹے میں ان کی مہارت حاصل کرنے

کے جذبے نے خود یہ ثابت کر دیا ہے کہ آج کے ہندوستانی معاشرے میں خواتین کو ''اپنی حفاظت آپ'' کرنے کے احساسات سے مالا مال کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نہ صرف اپنے ملک کی سرزمین اور یہاں کے باشندوں سے ہی نہیں بلکہ اس ملک کے مذاہب اور رسم و رواج سے حد درجہ محبت کرنے لگی ہیں۔ یہ تمام صورتیں اس امر پر گواہ ہیں کہ ہندوستان جیسے آزاد ملک میں سماجی و ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ میں خواتین کی حصہ داری اٹوٹ ہے اور ان کے اقدامات اور حکومت کی جانب سے اختیار کردہ رویے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ عصر حاضر میں خواتین کو سماجی و ثقافتی اساس پر ہر قسم کی سرگرمیوں کو منظر عام پر لانے کی آزادی حاصل ہے۔ اس خصوص میں گذشتہ دس سالوں کے اندر خواتین کی ملکی سطح کی انجمنوں، خواتین کی میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں کے علاوہ خواتین کی غیر سرکاری آرگنائیزیشنوں کا قیام خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ملک ہندوستانی جمہوریہ میں عصری تناظر میں خواتین کو سماجی و ثقافتی سرگرمیوں میں شامل کر کے اُن کے معیار اور وقار میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس کا فیض مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔

○

اکیسویں صدی میں اردو ادب کا تاریخی و تہذیبی سیاق

(فکشن کے حوالے سے)

آفتاب احمد آفاقی

بی۔ایچ۔یو۔وارانسی

انسان کو حیوان ناطق کہا گیا ہے۔ اسے قدرت نے نطق کی صلاحیت عطا کی ہے، جو اسے جانوروں سے ممتاز بناتی اور ایک مہذب وجود عطا کرتی ہے۔ انسانی آوازوں کے استعمال کا بامعنی اور پیچیدہ نظام اسی بنیاد پر عمل میں آیا جسے ہم زبان سے تعبیر کرتے ہیں۔ زبان اصلاً ترسیل و ابلاغ کا وسیلہ ہے اور انسانی معاشرے میں اس لحاظ سے اس کا رول، بڑا اہم اور کلیدی ہے۔ یہ وسیع تر معنوں میں ہمارے تہذیبی و تمدنی ورثے کا تحفظ کرتی ہے اور انسانی افکار و خیالات کے سرمایے کو نسل در نسل منتقل کرتی رہتی ہے۔ زبان کے بارے میں کہا گیا ہے:

> ''زبان تحریری اور غیر تحریری علامات کا ایک روایتی نظام ہے جس کے ذریعے انسان ایک سماجی گروہ کے رکن اور اس کے تہذیبی عمل میں شریک ہونے والے فرد کی حیثیت سے اپنا اظہار کرتا ہے۔ زبان کی تعریف یوں بھی

ی جا سکتی ہے کہ یہ انسان کی ایک مخصوص صلاحیت ہے جس کے ذریعے ایک
انسان دوسرے انسان کے تجربات اور واقعات سے اس صورت روشناس ہوتے
ہوں، اس کے علاوہ ان تمام پیچیدہ تہذیبی مظاہر کے بارے میں بات کرنا
سیکھتا ہے جن سے اس کا سابقہ بعد میں ہوتا ہے۔''

انسان اپنے خیالات کو لفظی پیکر میں ڈھال کر یا غیر لفظی طریقوں کی مدد سے ظاہر کر سکتا ہے۔ مثلاً رنگوں اور اشاروں کے توسط سے، مگر یہ الفاظ کا بدل نہیں ہو سکتے جس کی کارفرمائی زیادہ وسیع تر دائرے میں بروئے کار آتی ہے۔ الفاظ تحریری صورت میں خیالات کو ٹھوس اور پائیدار شکل عطا کر دیتے ہیں اور یہ زمان و مکان کی حدود میں مقید نہیں رہتے۔ ان خصائص کی بنیاد پر مولوی عبدالحق الفاظ کو تہذیب و معاشرت کا محافظ قرار دیتے ہیں:

'' الفاظ بھی ایک انسان کی طرح جاندار ہیں۔ وہ بھی انسان کی طرح پیدا
ہوتے، مرتے، بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے جو
خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ وہ گزشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرت کی
یادگار ہے، وہ قومی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا اور قومی تنزل کے ساتھ تنزل کرتا
ہے۔ یہ بھی انقلاب زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنیٰ سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے
ادنیٰ، شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے لیکن ہر لفظ زبان
میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو
اس کی سیرت سے آگاہ ہے، یہ انشا پردازی کا بڑا گر ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ انسانی جذبات کی صورت گری الفاظ کے پیکروں سے ہوتی ہے۔ یہ الفاظ شعر بھی ڈھالتے ہیں اور نثر کی عبارتیں بھی تراشتے ہیں۔ کائنات کی خوب صورتی اور بدصورتی کا دارومدار بڑی حد تک ہماری کیفیتوں پر منحصر ہوتا ہے۔ ہم مختلف چیزوں سے مختلف اثر قبول کرتے ہیں۔ مختلف وقفوں میں ہمارا یہ تاثر بدلتا رہتا ہے۔ اس طرح اشیا کا حسن ثابت ہے لیکن ہماری جسمانی اور ذہنی کیفیتوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔

کسی بھی متمدن ملک اور قوم کے معیار کے تعین، اس کی نیک نامی اور شہرت میں زبان کا

رول ان معنوں میں ناقابل فراموش ہے کہ زبانیں نہ صرف انسانوں کے ذریعہ اظہار کا وسیلہ ہیں بلکہ یہ انسانوں کو تہذیب اور شعور بخشتی ہیں اور بصارت و بصیرت عطا کرتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں ملک میں امن و امان کی بحالی اور باہمی اتحاد و اتفاق کو پروان چڑھانے میں اور رواداری کو فروغ دینے میں زبانیں غیر معمولی کردار ادا کرتی ہیں۔

ہندوستان میں اردو زبان نے دوسری زبانوں کے مقابلے ملک کی تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی شناخت کے تعین قدر میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ ہندوستان ایک عظیم ملک ہے جس میں مختلف نسل، علاحدہ رنگ اور متفرق مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں۔ ان اختلافات کے باوجود آپسی اتحاد و یگانگت کی ایک قدیم روایت موجود ہے۔ اس مشترکہ روایت کو فروغ دینے اور ہمہ رنگی میں یک رنگی اور ہمہ جہتی میں یک جہتی کو پروان چڑھانے میں اردو زبان و ادب کا کردار تاریخی رہا ہے۔

اردو کی جائے پیدائش کے متعلق نظریات میں بھلے ہی اختلافات رہے ہوں لیکن محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے۔ ماہرین لسانیات کے نزدیک اردو کا رشتہ اپ بھرنش سے بے حد گہرا اور اٹوٹ ہے۔ اس لیے کہ کھڑی بولی کا اردو کے ساتھ ماں اور بیٹی کا رشتہ ہے۔ جبکہ کھڑی بولی شورسینی واپ بھرنش سے پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا اس رشتے کی بنیاد پر اردو ایک ہندوستانی زبان قرار پاتی ہے۔ کھڑی بولی کا ارتقا دہلی اور دہلی کے شمال مشرقی علاقے یعنی مغربی اتر پردیش میں ہوا جس نے بعد میں نکھر کر ایک نیا روپ اختیار کر لیا۔ کھڑی بولی کا یہی نکھرا روپ ہندی، ہندوی، ریختہ کہلایا جو آج کی ''اردو'' کے قدیم نام ہیں۔ تاہم ہندوستانی یا کھڑی بولی کو ادبی زبان بنانے اور اس کی نشو و نما میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ حتیٰ کہ ہندی کے فروغ میں مسلمانوں کی خدمات سے صرف نظر ممکن نہیں۔ یہاں محمد حسن کی یہ توجیح قابل توجہ ہے:

> ''کھڑی بولی کی ابتدائی تخلیقات خواہ وہ نظم ہو یا نثر اردو اور ہندی کا مشترکہ ترکہ کہی جا سکتی ہے۔ کبیر اور خسرو کی کھڑی بولی اردو کی پیش رو ہے اور ہندی کی روایت کا بھی ایک بیش بہا حصہ۔ اس کے بعد کھڑی بولی کے اس نشو و نما کو اردو نے اپنا لیا جو شمالی ہند کے صوفیا اور سیاسی اثرات کے تحت دکن میں ہوا۔''

ویسے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ محمد بن قاسم سے قبل شروع ہو چکا تھا۔ پروفیسر آرنلڈ ہندوستان میں مسلمانوں کا ورود، آٹھویں صدی عیسوی میں تسلیم کرتے ہیں۔ پھر محمود غزنوی کی آمد اور فتح پنجاب کے بعد لاہور کو اپنا مرکز بنانے کے نتیجے میں اس خطے میں ترکی، فارسی اور ہندوی کے فروغ کی راہیں آسان ہوئیں۔ ان زبانوں کے ایک شاعر مسعود سعد سلمان کے ''ہندوی'' زبان میں تخلیقات کا تذکرہ تو تاریخ میں ملتا ہے لیکن اس زبان کے نمونے کی عدم دستیابی کے باعث حتمی طور پر اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مسعود سعد سلمان کے بعد خواجہ فرید الدین گنج شکر کے یہاں اردو کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ گرو گرنتھ صاحب میں درج ''اشلوک شیخ فرید کے'' انہی کی تخلیق بتائی جاتی ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئی اور اپنے ساتھ عربی، ایرانی اور ترکی جیسی متمول زبانیں ہی ساتھ نہ لائی بلکہ ان کے پاس تہذیب و تمدن کی بیش بہا دولت بھی تھی۔ زبان کے نئے لہجے اور تلفظ نے نئی آوازوں کو جنم دیا۔ نرمی، شائستگی اور قوت اظہار کے بدولت ان زبانوں نے ان گڑھ، ثقیل اور قدیم آوازوں والے علاقائی بھاشا اور بولی پر شب خون مارا۔ نتیجتاً نئی تہذیبی و معاشرتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے نت نئے الفاظ داخل ہونے لگے۔ بہ قول تارا چند ''بظاہر تو سیاسی فتح کے ساتھ تمدنی موت نظر آتی ہے مگر بنیادی طور پر اس فتح کا مختلف اثر ہوا۔'' فاتحین کے پاس جاندار زبانیں تھیں اور ان کے خیالات و عقائد میں توانائی، جس نے بکھرے اور کمزور قومی کلچر کے ساتھ علاقائی زبان پر بھی ایسا تاثر قائم کیا کہ بہ قول جمیل جالبی ''زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے اور منجمد پتھر پگھلنے لگے۔''

شمالی ہند میں اردو کی ابتدا و ارتقا میں صوفیا اکرام کے ملفوظات کی حیثیت بے حد اہم ہیں۔ حضرت مخدوم علاء الدین کلیری، شیخ شرف الدین بوعلی قلندری پانی پتی، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین باجن، شیخ اشرف الدین یحیٰ منیری وغیرہ جیسے بزرگوں نے اردو کی ابتدائی نشوونما میں ناقابل فراموش حصہ لیا ہے۔

شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی نمونے واضح طور پر امیر خسرو (1325-1355) کے یہاں نظر آتے ہیں۔ خسرو بیک وقت فارسی، عربی اور ہندی (اردو) تینوں زبانوں کے شاعر

ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کو جس قدر مالا مال کیا ہے اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ متعدد امور کی ایجاد انھیں سے منسوب ہے۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کی تدوین کر کے اسے ہندوستانی طرز موسیقی میں ڈھال کر اس فن میں ایک نئی ایجاد کرنے کا سہرا امیر خسرو کے سر ہے۔ صوفیوں کے علاوہ ہندو سادھو، سنتوں اور بھگتوں کی خدمات بھی لائق تحسین ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنے ہندی کلام اور نغموں کے ذریعہ عوام کے دلوں کو جیتا۔ اس سلسلے میں بھگتی تحریک سے وابستہ شعرا مثلاً سوامی نام دیو کے علاوہ نرسن واد کے اہم شاعر کبیر داس کے منظوم کلام ''بیجک'' میں کھڑی بولی، راجستھانی اور برج بھاشا کے پہلو بہ پہلو عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کبیر اور خسرو نے بہ قول محمد حسن'' اسلامی اور ہندو طرز ہائے فکر کو ملا کر ایک ہمہ گیر اور انسانیت دوست فلسفہ تشکیل دیے''

17 ویں اور 18 ویں صدی میں اردو زبان نے جب ادب سے رشتہ قائم کیا تو اس کی ترقی و ترویج کے نئے دروازے کھلے۔ دکن کے متعدد سلاطین، رؤسا و امرا نے اردو زبان و ادب کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ عملی سطح پر حصہ بھی لیا۔ بہمنی حکمرانوں، عادل شاہی سلطنت اور قطب شاہی دور میں اردو زبان و ادب کی جو ترویج و ترقی ہوئی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان امرا و ادبا نے محض شعر و ادب کی اشاعت میں دلچسپی نہ لی بلکہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کو بھی وسعت بخشی۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام بھلے ہی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر عمل میں آیا ہو لیکن ہندوستانی زبان کو اس سے بے حد فائدہ پہنچا۔ داستانیں ادب کا حصہ بنیں اور اس کی مستحکم روایت قائم ہوئی، ان میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت سانس لیتی ہیں۔ 19 ویں صدی کے اردو شعرا مثلاً میر، سودا، درد، غالب، مومن، نظیر وغیرہ نے اردو شاعری کی ایک متمول روایت قائم کی۔ بیسویں صدی میں تاریخ اور تہذیب کو جن باکمال ادبا و شعرا نے عروج پر پہنچایا ان میں پریم چند، اقبال، جوش، مولوی عبدالحق، جذبی، حسرت، عابد حسین، فراق، رشید احمد صدیقی، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، عبدالصمد، حسین الحق، ساجد رشید، سید محمد اشرف ناقدین میں احتشام حسین، آلِ احمد سرور، محمد حسن، سید عقیل رضوی، شمس الرحمٰن فاروقی، اور گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، قاضی افضال حسین، ابواکلام قاسمی کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی

تخلیقات ،اور تنقیدی نگارشات پر مغربی اثرات کے باوجود ان کی فکری تہذیب و تنظیم ہندوستان کی سوندھی مٹی سے تشکیل پاتی ہیں اور ان میں یہاں کی قدیم روایات، تصورات و عقائد پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

واضح رہے کہ تہذیب کی مختلف المعنی تعبیر و تفہیم پیش کی گئی ہے اور اس کی متعدد شقیں قائم ہیں۔ مختصراً اسے کسی قوم یا فرد کی کلّی روحانی، عملی و معاشرتی ورثہ عقائد و افکار کا مجموعہ بھی قرار دیا جاتا ہے، پروفیسر عتیق اللہ کے نزدیک ''تہذیب نام ہے اس اجتماعی معاشرت کا جس میں باہمی ذہنی اور مادی شمولیتیں انسانی احتیاجات اور ضروریات کی تشکیل و تکمیل کرتی نیز انسانی اقدار کی پرورش کرتی ہیں'' اسی طرح ایمنڈ ولیمز تہذیبی مطالعے کو سماجی تبدیلی کے تجزیے سے تعبیر کرتا ہے۔

ادب تہذیب کی اس روح کو کسب کرتا ہے جس کی شناخت اتحادِ بشریت، انسانی اخوت و محبت، بھائی چارہ اور سب کے لیے ہمدردی و دلسوزی جیسے جذبوں اور قدروں سے عبارت ہے۔ ادیب و شاعر تہذیب کے ان بنیادی عناصر کو اپنے مفاہیم کا جز بناتا ہے جو تفریق انسانی کے برخلاف عالمی انسانی برادری کے تصور سے پہچانے جاتے ہیں۔

اردو شعر و ادب کا وہ خاصہ جو ہندوستان کے دوسرے ادبیات پر اسے تفوق عطا کرتا ہے وہ اس کی تاریخی و تہذیب وابستگی ہی ہے، جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے قدیم تہذیب کے تحفظ اور تہذیبی اقدار و اسالیب کو اثاثے کے طور پر نہ صرف اپنے سینے سے لگایا بلکہ بعد کی نسلوں کو منتقل بھی کیا ہے۔

آج اکیسویں صدی کو سائنس و ٹکنالوجی کی صدی تسلیم کیا جا رہا ہے۔ موجودہ انفارمیشن ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی جس طرح تہذیبی اکائیوں کو تباہ کرنے کے درپے ہے وہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ سے کم نہیں۔ اردو بھی جدید تقاضوں کے تحت اس تکنیک سے استفادہ کی سعی میں مصروف ہے۔ ہر چند کہ اس عہد میں ظاہری طور پر اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کو کئی چیلنج درپیش ہیں اس کے باوجود اردو شاعری، فکشن اور تنقید و تحقیق میں تاریخی و تہذیبی تصادمات اور تہذیبی ردّ و قبول کا سلسلہ کسی نہ کسی طور پر جاری و ساری ہے۔ اور اس دور میں بھی اردو قلمکاروں

نے ملک وقوم کے عقائد وافکار، رسومات اور ان کی ادائیگی کے طریقوں، زندگی کے آداب واطوار، فطرت سے رابطوں، باہمی رفاقتوں اور رقابتوں اس کی نوعیت اور نتائج کو جس طرح شعر وادب کے سانچے میں ڈھالا ہے اس کی حیثیت دستاویزی ہے۔

اس اعتراف میں کوئی حرج نہیں کہ ادب کے موجودہ ادبی منظر نامے پر وہی قلمکار فعال ہیں جو گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی کے بعد ابھرے البتہ ان میں اکثریت اسی کے بعد کے ادیبوں کی ہے۔ یہ نسل نہ ترقی پسند ہے نہ جدید، بلکہ یہ کسی خاص نظریے کے حصار سے ایک حد تک آزاد، تغیر وتبدل پذیر معاشرے کے تقاضوں کے تحت تخلیقی عمل میں مصروف ہے۔ اس کی بڑی وجہ گذشتہ دو تین دہائی میں کوئی بڑا حادثہ ہوا نہ کوئی آئیڈولوجی کا وجود ہی عمل میں آیا، جیسے ترقی پسند یا جدیدیت کی تحریک پیدا ہوئی تھی۔ البتہ سائنسی ترقی اور گلوبلائزیشن نے ہماری زندگی کے سامنے کئی مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ صارفی کلچر کا جنم ہوا ہے اور، سیاست، اقتدار اور دولت ایک پاور کا روپ دھار گئے ہیں، جو اخلاقیات واقدار کو تہس نہس کر رہے ہیں۔ امریکہ جیسی بڑی طاقتیں دنیا کی تمام توانائی پر اپنا غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ بازار پر اس کا کنٹرول ہے، اس کی ہر چیز معیاری، وہ جس ملک پر ہاتھ رکھے وہ سونا بن جائے۔ جس کو چاہے آتنکوادی بنادے، اس کے بنے جال میں صرف امیر ہی نہیں غریب بھی پھنسا ہے۔ سائبر کلچر اور نی بی کیبل نے تمام لوگوں کے فکر پر پہرے بٹھا دیے ہیں۔ میڈیا کی یلغار، ذرائع ترسیل کی برق رفتاری، فلموں کی چکا چوندھ اور عریانی اور مادی اقدار کی غیر مشروط بالادستی۔ یہ ایک شخص، ایک خطے یا ایک کلاس کا نہیں بلکہ ہمارے عہد کا اضطراب ہے، ہمہ گیر المیہ ہے۔

ایسے ناموافق حالات میں اردو تخلیق کاروں نے اپنی فہم و بساط کی حد تک ظلم و جبر و ناانصافی، نو سامراجی استحصال کے خلاف موثر احتجاج کر کے قلب وذہن میں ایک ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو اپنی قدیم تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی بازیافت کی بدولت اپنے درخشندہ ماضی سے روشن مستقبل کی آس جگانے کی ایک مبہم پہل ہی سہی ضرور کی ہے۔ اس کی روشن مثال ہمارے عہد کے ممتاز نقاد شمس الرحمن فاروقی کے یہاں ملتی ہے۔ ہر چند کہ فاروقی نے اپنی بنائے ترجیح جدیدیت پر رکھی لیکن ان کے اہم کاموں کا تعلق

کلاسیکی شعرو ادب کی تنقید اور اپنی تاریخ و تہذیب سے وابستگی سے ہی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ از سرِ نو تاریخ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ورنہ میر، غالب اور داستانوں کی تنقید و تعبیر کے بعد تخلیقی سطح پر بھی اسی تلاش و جستجو کو روا نہ رکھتے۔اس صدی کے شروع میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''سوار اور دوسرے افسانے'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس سے ان کی پرانی ادبی تہذیب سے غایت محبت اور میرے خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے:

> ''اچانک مجھے خیال آیا کہ غالب کے بارے میں افسانے اور حقیقت پر مبنی ایک بیانیہ کیوں نہ لکھوں جس میں کچھ غالب سے متعلق ادب کے معاملات، کچھ اس زمانے کی ادبی تہذیب اور کچھ تاریخ سب حل ہو کر یکجا ہو جائیں مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ہماری پرانی ادبی تہذیب ہمارے حافظے اور علم سے تقریباً غائب ہو چکی ہے۔اگر یہ وقت کی سطح کے نیچے اتر کر ڈوب گئی تو ہمارا نقصان عظیم ہوگا، اور اس کی بازیافت تو خیر ممکن ہی نہ ہو گی۔جن تہذیبوں کا ماضی نہیں، ان کا مستقبل بھی نہیں۔اردو ادب و تہذیب کو فراموش کر دینے، اسے پایہ اعتبار سے ساقط تصور کرنے یا ساقط قرار دینے کی جو کوششیں ملک میں جگہ جگہ ہو رہی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے تاریخی حافظے کو زندہ رکھیں اور اپنی ادبی تہذیب کو جاندار، قائم رہنے والی، اور آج بھی بامعنی حقیقت کے طور پر پیش کریں۔''

اتنا ہی نہیں ان افسانوں کی پذیرائی کو اپنی کامیابی سے زیادہ اہلِ اردو کی کامیابی ان معنوں میں تصور کرتے ہیں کہ ''انھیں اپنی ادبی تہذب کے مظاہر سے لگاؤ ہے اور وہ اپنے تاریخی اور ثقافتی حافظے کو گنوانا نہیں چاہتے'' فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' ان کی اسی مقصد کی غمازی کرتا ہے، یہ ایک تاریخی ناول ہے جس میں اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔اردو کے معروف فکشن نگار عبدالصمد کی متعدد کہانیوں کے مجموعے اور ناول کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ

اپنی تاریخ اور تہذیب کے نہ صرف دلدادہ ہیں بلکہ اپنی نگارشات کے ذریعے اسے محفوظ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ 'بکھرے اوراق' اور 'شکست کی آواز' کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ بکھرے اوراق ان کے دوسرے ناولوں سے ان معنوں میں الگ ہے کہ اس میں سیاسی جبر کے اعلامیہ کے بجائے بابری مسجد کی شہادت کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات نے جس طرح مسلمانوں کے ذہن ودماغ پر منفی اثرات ثبت کیے اس سے نہ صرف یہ کہ وہ خوف ودہشت کے ماحول میں جی رہے ہیں بلکہ اپنے بزرگوں کی تباہ ہوتی ہوئی نشانیوں کے ذرنے، انھیں ایک نفسیاتی مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔ حالیہ دنوں میں منظرِ عام پر آنے والا ناول 'شکست کی آواز' پہلی نظر میں نوجوانوں کے جنسی مسائل پر مبنی نظر آتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس کا تعلق بھی اقدارِ حیات اور اس کے گم ہوجانے کے خطرے کے درمیان ایک مبہم سی امید باقی رہتی ہے۔ اس کا مرکزی کردار ندیم جب بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے تو اس کا ضمیر لعنت و ملامت کرتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

> ''ندیم بھٹک کر انجانے راستے پر دور تو نکل گیا لیکن۔۔ اچانک اسے اتھاہ تاریکی میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ مذہب، مزید اسے تذبذب اور بے یقینی کی صورتِ حال سے نکال سکتا ہے۔۔ وہ دیر تک ان اعمال میں مشغول رہا۔ اسے کافی سکون محسوس ہوا۔۔۔ ندامت کے سمندر میں ڈوبکی لگانے کے بعد اسے بیش قیمتی موتی ہاتھ لگا تو یہ قبول کرنے والے کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ اس کے جسم میں ایک برقی قوت پیدا ہوگئی اور وہ انگڑائی لے کر اس سمندر سے باہر نکل گیا۔''

وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ لاشعوری طور پر اس کے قدم بہک گئے، اس کی روح اور جسم آپسی کشاکش کا اکھاڑا بن گئے ہیں۔ وہ اسلاف کی نفس کشی کے قصے پڑھتا تو اسے رشک آتا، آخر اسی کی طرح وہ انسان تھے۔ انھوں نے کس طرح ان دونوں چیزوں پر حکمرانی کی۔ یہ احساس روح اور ضمیر کے زندہ ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ ماضی کی تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی بازیافت اور اپنے اسلاف کے ان کارناموں پر فخر کرنا جس سے ہمیں طمانیت کا احساس ہو اصلاً ماضی کے

بھولے سبق یاد کر کے زندگی کو بامعنی بنانے اور مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے سے عبارت ہے۔ شفیع مشہدی کو اپنی روایتیں بے حد عزیز ہیں وہ موقع اور ضرورت کے لحاظ سے تہذیب کے ان دھاروں کو اپنی تخلیقات کا حوالہ بنا دیتے ہیں جن سے زندگی کی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جبکہ جابر حسین اپنی ڈائری نما افسانوں کے وسیلے سے اپنی تہذیبی وثقافتی میراث کے تحفظ کی سعی کرتے ہیں 'ڈولا بی بی کا مزار' اور حویلی اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ جبکہ شوکت حیات کے یہاں تہذیبی تصادم کا کرب اور بدلتے سماج کا عکس واضح طور پر نمایاں ہے؛ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''تم جس علاقے میں بستی ڈھونڈ رہے ہو، اسے عرصہ پہلے بلڈوزروں نے چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا۔۔۔ میں چند ہفتوں اسی طرح پورے شہر میں دیوانہ وار پاگلوں کی طرح چکر کاٹتا ہوا بار بار اسی میدان تک پہنچتا، بلڈوزروں نے سب کچھ اجاڑ دیا۔۔۔ میری دکان، میرا گھر اور تمام اہل وعیال زندہ در گور ہو گئے'' (گھونسلا)

مشرف عالم ذوقی فی الوقت سب سے زود نویس فنکار ہیں۔ ادھر ان کے کئی ناول اور افسانے اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کے داخلی کرب کی اصل وجہ ملک میں سیاسی اور سماجی سطح پر غیر یقینی اور گلوبلائزیشن کے نتیجے میں ہماری زندگی پر پڑنے والے اس کے منفی اثرات اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی ناگفتہ بہ صورت ہی ہے۔ نیز ہماری تاریخ اور تہذیب کا زیاں، اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ہماری خدمات کی ان دیکھی بھی بے چینی کا سبب رہی ہے۔ 'پو کے مان کی دنیا' اور 'آتشِ رفتہ کا سراغ' اس کی بین مثالیں ہیں۔ مصطفی کریم کا ناول ''طوفان کی آہٹ''، احمد بشیر کا 'دل بھٹکے گا'' اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آچاریہ شوکت خلیل کا ناول 'اگر تم لوٹ آتے' بنیادی طور پر ایک علاقائی ناول ہے جس میں پہلی مرتبہ میتھلی تہذیب و تمدن پوری طرح مترشح ہوئی ہے۔ جبکہ جوگیندر پال نے اپنے ناول 'پار پرے' کے وسیلے سے ہندوستانی شہریوں کو قومی خیر سگالی اور امن کا پیغام دیتے ہیں۔ اسی طرح غضنفر وشِ منتھن کے سہارے ہندو مسلم کشیدگی کو دور کرنے کی غرض سے دیو مالائی واقعات کا سہارا لیتے ہیں۔ جبکہ نورالحسن اپنے ناول 'آہنکار' کے وسیلے سے علاقائی اور دیہی ثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

حبیب حق کا ناول' جسے میر کہتے ہیں صاحبو' بیسویں صدی کے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی افادیت اور سیاسی جبر کے تحت اس میں در آئے جمود کی کہانی ہمارے تابناک ماضی کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ موجودہ صدی کی سیاسی شعبدہ بازی اور کرتب باز ابن الوقت نے جس طرح سے امن و امان کو غارت کیا ہے وہ ہماری نسلوں کے لیے کئی طرح کے سوالات چھوڑتے ہیں۔ فسادات، آپسی رنجش اور ایک دوسرے کو زیر بار کرنے کی کوششوں کو کبھی بھی جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ ایسے مسائل ہیں جو ہماری برسہا برس کی ملواں تہذیب اور ثقافت کو مسمار کرنے کو برسرِ پیکار ہیں۔ کوئی بھی مذہب تشدد کی اجازت نہیں دیتا نہ انسان سے عداوت، کدورت اور منافرت کا درس دیتا ہے۔ تاہم سیاسی، سماجی اور مذہبی ہر سطح پر یہ کھیل جاری ہے۔ ان ظالموں کو جیسے ہم اپنی زندگی کی شکل میں تاوان دے کر اپنے نہ لٹنے کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ سہیل وحید کی کہانی 'زمین' اکیسویں صدی کے ان مسئلوں کو جہاں اجاگر کرتی ہے تو دوسری طرف اس کی قبیح صورت پر ایک عمدہ طنز بھی ہے اور پروفیسٹ بھی۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''محمد بن قاسم ہزاروں شہسواروں کے ساتھ وادیٔ سندھ کو سر کرتا چلا آ رہا ہے۔ چاروں طرف قتل و غارت گری ہے۔ چیخ و پکار اور وہ سب کو روندتا ہوا بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے آتے ہی اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔ اس کے کارندے ملک بھر کے راجاؤں سے صوبے کی مناسبت سے رقم وصول رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سونے چاندی کے سکّوں اور زیورات کا انبار لگ گیا۔ محمد بن قاسم فاتحانہ نظروں سے سونے چاندی کے ڈھیروں کو دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے:

'بس ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں بچی؟'

'نہیں حضور سارے علاقوں کا نذرانہ آپ کو ادا کیا جا چکا ہے۔'

'بس اتنی ہی زمین ہندوستان میں ۔۔۔؟ ارے یہ کیا، یہ تو جہاں جاتے ہیں خرید و فروخت شروع کر دیتے ہیں۔۔ لڑکی۔۔ مہر۔۔ میں پوری قوت سے چیخا:

'نہیں قاسم نہیں یہ زمین نہیں بک سکتی۔' (زمین۔۔۔ سہیل وحید)

اتنا ہی نہیں ہمارے بزرگ فنکاروں مثلاً رتن سنگھ اور اقبال مجید کے یہاں بھی یہ خصوصیات

کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ اقبال مجید اپنی تخلیقات سے ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جو کبھی ہماری دنیا رہی تھی اور ہمارے حافظے میں اب بھی محفوظ ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت نئے کردار جنم لیتے ہیں لیکن یادیں رہ جاتی ہیں، آثار باقی رہ جاتے ہیں، نشانات ذہن و دماغ پر مرتسم رہتے ہیں اور وہ نسلا بعد نسل اجتماعی لاشعور کے تحت منتقل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ''نمک'' کا ہر کردار اپنے معاشرے میں جیتا ہے اور اس سے الگ ہونا چاہتا ہے تو اسے کشمکش سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ بہ قول وہاب اشرفی:

> ''زہرہ خانم کی بیس کہروں والی کوٹھی اپنے امنگوں اور بیتے پرسکون زندگی کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زہرہ خانم آخر تک اپنے ان بہترین کھانے کو فراموش نہیں کرتیں جن سے ان کے کام و دہن لذت آشنا رہے ہیں۔ اس کے یہی معنی ہوئے کہ نئے حالات نے اسے جتنا زبوں بنا رکھا ہے پرانی یادیں اثاثہ بنی رہتی ہیں اور بہت دنوں تک جیتے رہنے کی شاید یہی وجہ ہے۔ پھر ستم دیکھیے کہ وہ نئی قدروں کے ساتھ جیتی ہیں۔ اور اس کی نانی کے ساتھ اس کی اتعلقی بھی ایک نئی زندگی جینے کا انداز ظاہر کرتی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو اس کی بہن کے اندر اخلاقیات کے نئی پہلو اس کے ضمیر کے ساتھ ہم رشتہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کردار اپنے اپنے نمک پر زندہ ہیں۔ اگر نکلنا چاہیں تو نکل بھی نہیں سکتے اور اس کی زندگی سے اس کا اپنا نمک نکل جائے تو پھر وہ ایسی سطح آجاتی ہے جو اس کی اپنی سطح نہیں ہوتی۔''

لیکن یہ نمک ہے کیا؟ واضح جواب ہے کہ وہ معاشرہ ہے جس سے یہ کردار رشتہ رکھتے ہیں ایک آدھ اس سے نکلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو نکل نہیں سکتے۔ گویا ایک طرف نمک ثقافت کی تعبیر ہے تو دوسری طرف کردار کی تخلیق کا محرک۔ اسی طرح 'رتن سنگھ' نے سانسوں کا سنگیت کے وسیلے سے عرفان ذات کے تعین قدر کی سعی کی ہے۔ اس طرح یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ، پیغام آفاقی، سلام بن رزاق، ساجد رشید، حسین الحق، شفق، شموئل احمد ہوں یا ابن کنول، طارق چھتاری،

احمد یوسف ہوں یا مشتاق احمد نوری، انیس رفیع، انجم عثمانی یا پھر قاسم خورشید، ذکیہ مشہدی ہوں یا احمد صغیر، اسلم جمشید پوری، یا مظہر الزماں خاں ان سب کی تخلیقات کا مزاج متنوع ہے اور زندگی کا وہ قوام جو ہماری تہذیب، تاریخ اور ثقافت سے وجود پذیر ہوا تھا اس کی چاہت اور للک ہر جگہ موجود ہے۔

○

اردو زبان: ماضی حال اور مستقبل

اردو زبان اور نسلِ نو

محمد نعمان وحید بخاری

صدر، عالمی مجلس اقبال

زبان انسان کو سماج، ثقافت اور تاریخ سے جوڑنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں یہاں زبانوں کے جنگلات پائے جاتے ہیں کچھ زبانیں بیج ہیں تو کچھ تناور درخت۔ اسی جنگل کا ایک تناور درخت اردو زبان ہے جس کی جڑیں اور شاخیں دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ زبان کا کام ایک سے زیادہ افراد کے درمیان رابطہ قائم کرنا ہے اسی لیے ہر دور میں اُس دور کے مطابق تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اپنی ابتدا سے لے کر آج تک اردو زبان اپنے ارتقا کی جانب گامزن ہے، اور یہی ایک زندہ زبان کا خاصہ ہے۔ لیکن یہاں بحث اردو کی تاریخ یا اردو کی لسانیاتی تحریریں نہیں ہیں بلکہ اس مقالے میں موضوعِ بحث موجودہ دور میں نئی نسل کو اردو زبان کے حوالے سے درپیش مسائل اور ان کا حل ہے۔ اردو کس قدیم زبان کی نئی شکل ہے یا کس زبان سے مل کر بنی ہے اس بحث سے قطع نظر ضرورت اس امر کی ہے کہ جو زبان موجودہ دور میں ہمیں

بولنے، سننے اور لکھنے کے لیے دستیاب ہے اسے اس دور کے لیے اور آنے والے زمانے کے لیے کارآمد و ہم آہنگ کیسے بنایا جائے۔

ذیل میں اردو زبان کو درپیش چند مسائل کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے قطع نظر کرنا اب شاید ممکن نہیں رہا، کہا جاتا ہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جس کا حل ممکن نہ ہو، لیکن جن مسائل سے اقوام کا مستقبل وابستہ ہو ان کا حل بھی اجتماعی کاوشوں سے ہی نکالا جا سکتا ہے۔

آج کے نوجوان کو تعلیم سائنس سے جوڑتی ہے جبکہ اُس کے روزگار کا نصف سے زیادہ حصہ ٹیکنالوجی سے جڑا ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو زبان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس صدی میں دنیا کی ترقی سائنس اور ٹیکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔ اردو زبان کے معاملے میں حالات برعکس ہیں، اردو بولنے، سمجھنے اور لکھنے والے سب سے زیادہ ہندوستان اور پاکستان میں بستے ہیں لیکن ان دونوں ممالک نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں اردو کو فراموش کر دیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں کوئی ایسی قابل ذکر تخلیق سامنے نہیں آئی جس نے اردو کو بقائے دوام بخشی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان اردو سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور اردو زبان لکھنے، پڑھنے سے زیادہ سننے اور بولنے تک محدود ہوتی جا رہی ہے۔ اہل زبان اور اردو شناس اشخاص کے لیے اردو زبان محض ادب بن کر رہ گئی ہے اس زبان سے صرف نثر و نظم کا کام لیا جاتا رہا ہے اور لیا جا رہا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبان جب تک عوام کی علمی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں اپنا کردار ادا نہ کر رہی ہو محض ادب کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی۔

زبان کی ترقی اسی میں مضمر ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے مباحث، مجالس، نشست و تدریس کا اہتمام اردو میں کیا جائے لیکن اکثر بین الاقوامی علمی و ادبی مباحث و مجالس کی زبان بھی اردو نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ ان کے لیے لفظ بھی کانفرنس و سیمینار ہی استعمال ہوتا ہے۔ طلبا سے لے کر اساتذہ تک اپنی گفتگو کے دوران اردو کے ساتھ انگریزی کی ملاوٹ کرتے ہیں پہلے یہ رجحان کم تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس رجحان میں بھی تیزی آ رہی ہے۔ اسی طرح جب گوگل پر لفظ کانفرنس اور سیمینار انگریزی زبان سے اردو زبان

میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو لفظ کانفرنس وسیمینار ہی لکھا آتا ہے۔ایسے ہزاروں الفاظ ہیں جن کے اردو زبان میں متبادل موجود ہیں لیکن استعمال نہ ہونے کی وجہ سے ذہن سے محو ہوتے جارہے ہیں۔

اصطلاحات کی بات کی جائے تو عرصۂ دراز سے یا یوں کہیے کہ گذشتہ نصف صدی سے کوئی بھی نئی اصطلاح اردو زبان کا حصہ نہیں بنی جبکہ آئے دن انگریزی زبان کی تکنیکی اور پیشہ ورانہ اصطلاحات اردو زبان کا حصہ بنتی رہتی ہیں جس کے سبب اردو الفاظ کا ذخیرہ تقریباً معدوم ہوتا جارہا ہے۔یہی حال دوسری زبانوں سے اردو زبان میں ترجمہ ہونے والی کتب کا ہے اس کی ایک وجہ تو مترجم کا مقصد ترجمہ، پیغام رسانی کا ہوتا ہے یا خیال سے متاثر ہوکر وہ اس کام کو انجام دیتا ہے جس کے باعث مقصد تو پورا ہوجاتا ہے لیکن کوئی زبان سے متاثر نہیں ہو پاتا یا یوں کہیے کہ اردو زبان کی جانب نہیں آتا۔تراجم کی فہرست میں بھی موجودہ صورتحال میں دیکھا جائے تو انگریزی زبان سبقت لے گئی ہے دنیا بھر کے کلاسیکی ادب کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔اگر تخلیق کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو بھی جدید علم میں جو اضافہ ہورہا ہے وہ انگریزی میں ہورہا ہے اگر اور کسی زبان میں ہوتا بھی ہے تو اسے فوری طور پر انگریزی میں ترجمہ کردیا جاتا ہے۔

شعبۂ تعلیم وتدریس کی طرف غور کیا جائے تو جامعات میں بھی اردو کا دائرہ ادبا،شعرا اور اردو زبان کی تاریخ تک محدود ہے۔ایم۔اے تا پی۔ایچ۔ڈی تک مقالوں کے عنوان تاریخ کی ادبی شخصیات کے پہلو ہی ہوتے ہیں یا پھر اردو زبان کس زبان سے بنی اس کا زمانہ کیا ہے،عوامل کیا تھے جگہ کون سی تھی، ہم آج بھی انہی مباحث میں الجھے ہیں جبکہ اب ہماری بحث کا دائرہ اردو کی تاریخ نہیں اردو کا مستقبل ہونا چاہیے، اردو ترقی بورڈ کی طرح اب ہمیں اردو تحفظ بورڈ کی بھی ضرورت ہے۔

یقیناً اردو زبان کا مستقبل آج کے نوجوانوں سے جڑا ہے یہی نوجوان ایک کلک پر دنیا گھومتا ہے،نت نئی و رنگا رنگ تخلیقات کو سراہتا ہے جو چیز اسے بھا جائے یا جس چیز کی اسے ضرورت ہو وہی اس کے حصول،شوق اور ضرورت ہوتے ہیں۔آج کے نوجوان سے آپ دنیا

بھر کے موضوعات پر بات کر سکتے ہیں کیوں کہ اب وہ صرف کتاب نہیں پڑھتا بلکہ ایک اسکرین پر پوری دنیا دیکھتا، پڑھتا اور سنتا ہے۔ اس کی دنیا ٹیکنالوجی سے شروع ہوتی ہے اسے معلومات سے لے کر تفریح ہر چیز ایک اسکرین پر میسر ہے، اس طرزِ زندگی نے آج کے نوجوانوں کو کتابوں سے دور کر دیا ہے جبکہ اردو زبان کا تمام تر خزانہ کتابوں میں مقید ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر نوجوان نسل کو اردو زبان سے روشناس کروانے کے لیے ٹیکنالوجی کا سہارا لینا ہوگا، دورِ حاضر میں زبان کے فروغ کے حوالے سے جو کام ہو رہے ہیں ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علمِ تدریس کے جدید اصولوں کو اپنانا ہوگا اور ایسی تخلیقات کرنا ہوں گی جو آج کے نوجوان طبقے کو اردو زبان سے نا صرف منسلک کریں بلکہ اس کا ایک مضبوط تعلق بھی اردو زبان سے یقینی بنائیں۔

اسی ضمن میں یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ 1997 میں ایک سروے کہ مطابق ہندوستان کے 39 فی صد اور پاکستان کے 38 فی صد لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ترقی کرنے کے لیے انگریزی زبان لازمی ہے۔ یہ رجحان حادثاتی نہیں تھا۔ ترقی پذیر ممالک میں رہنے والوں کے رجحانات وہی بنتے چلے جاتے ہیں جو کہ ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہوتے ہیں۔ اردو کی بقا کی جنگ لڑنے والوں کو بھی یہ خبر ضرور ملی ہوگی اور یقیناً اس پر بہت سا کام کیا گیا ہوگا کہ اس خیال کی نفی کی جائے، بہر حال آج 2014 میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کام کچھ کام نہ آئے، آج بھی یہ دونوں ترقی پذیر ممالک ترقی پذیر ہی ہیں اور آج بھی ان میں بسنے والے انگریزی کو ہی ترقی کی سند سمجھتے ہیں۔ اس کی مثال یوں بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ آج دونوں ممالک میں ان نوجوانوں کو بہتر ملازمت اور تعلیم کے مواقع ملتے ہیں جو انگریزی جانتے ہوں۔ ایسے افراد نہایت کم تعداد میں ہیں جن کا ذریعہ معاش اردو زبان سے منسلک ہے اور اگر ایسا ہے بھی تو ان کے حالات اور معیارِ زندگی کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

ہمیں اردو زبان کو پروان چڑھانے کے لیے اس روش کو بھی بدلنا ہوگا اور اس کے لیے حکومتی سطح پر کام کرنا ہوگا۔ مغلیہ سلطنت میں کسی کو اس وقت تک دستارِ فضیلت نہیں ملتا تھا جب تک اسے عربی و فارسی نہ آتی ہو یہی وجہ تھی کہ سنسکرت و ہندی بولنے والے بھی فارسی و عربی سیکھنے لگے اسی بناء پر ان کے آپسی تعلقات بہتر ہوئے تھے۔

اتحاد و محبت کے اسی بیج نے کئی ہندو شعرا سے نعتیں اور نوحے لکھوائے، اسی طرح اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اور اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے ٹیکنالوجی میں تخلیقات کرنے اور زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ڈھالنے کی ضرورت ہے۔

اردو زبان اب صرف پاکستان اور ہندوستان تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ سات سمندر پار مغرب بھی لے جائی گئی ہے۔ اسے وہاں لے کر جانے والے وہ لوگ ہیں جو ہندوستان اور پاکستان میں اردو کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اردو کے بنا ان لوگوں کا گزارا نہیں تھا، (گزارا) کا لفظ اس لیے استعمال کیا تاکہ یہ جاننے میں آسانی ہو کہ مغرب میں اردو کے بغیر بھی گزارا ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے ساتھ اردو زبان لے کر گئے وہ اردو بول سکتے تھے، لکھ سکتے تھے، پڑھ سکتے تھے۔ جنھیں اردو سے بہت لگاؤ تھا انھوں نے مغرب میں جا کر بھی اپنے گھروں میں اردو پر توجہ دی، ان کے بچے صرف اردو بول سکتے ہیں جبکہ تیسری نسل اردو زبان بولنے سے بھی جاتی ہے کیوں کہ ان کے والدین انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں اور بڑے شوق سے بتاتے ہیں کہ ان کے بڑے اردو بولتے تھے، جیسے آج ہم میں سے بھی کئی یہ بتانے میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بڑے فارسی اور عربی زبانیں جانتے تھے۔ اگر کچھ لوگ آج بھی وہاں اردو لکھ پڑھ لیتے ہیں تو وہ لوگ وہ ہیں جو سخن شناس ہیں، اردو کے طرف دار نہیں۔ انھیں اپنے شوق کی تسکین کے لیے آج بھی اردو زبان پڑھنی پڑتی ہے تاکہ اساتذہ کے کاموں سے فائدہ اٹھا سکیں کیوں کہ ان کے لیے تراجم ایسے ہی ہیں جیسے کاغذ کے رنگین پھول۔

مغرب میں بسنے والے بیشتر مہاجرین کا المیہ معاشی استحکام ہوتا ہے، فکرِ معاش میں ان سے اردو زبان کا دامن اکثر چھوٹ جاتا ہے۔ آج مغرب میں دوسری زبانیں سیکھنے پر بہت زور دیا جاتا ہے، ترقی یافتہ اقوام زبانوں کی اہمیت سے واقف ہیں اور جانتی ہیں کہ ایک زبان اپنے ساتھ علوم و فنون کے خزانے ساتھ لاتی ہے مگر ترقی پذیر قوموں سے ہجرت کرنے والے شاید اس بات سے واقف نہیں ہوتے اور ایک زبان جو اُن کے خون میں رچی بسی ہوتی ہے اسے گنوا کر دوسری زبانوں کو سیکھنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو کی ان نئی بستیوں کے باسیوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ کسی بھی چیز کی حفاظت اسے کھو کر

تلاشنے سے آسان ہوتی ہے۔

مغرب میں بسنے اور پروان چڑھنے والوں کی مجبوری کو شاید سمجھا جا سکے پر ایشیائی نژاد بھی اس روش میں پیچھے نہیں ہیں ان کے لیے بھی اردو اب ایک غیر مانوس زبان بنتی جا رہی ہے۔ بہت سے طلبا بامشکل اردو پڑھ پاتے ہیں اور بولنے والوں کا حال نہ گفتہ بہ ہے اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے اکثر کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ البتہ ان کی اس روش کی ذمہ داری ماہرین تعلیم، حکومتی و تعلیمی اداروں اور معاشرتی معیار کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ عامہ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ خبروں سے لے کر ڈراموں اور فلموں میں جس قسم کی اردو بولی جاتی ہے وہ نہ تو مکمل اردو ہوتی ہے نہ مکمل انگریزی اور اگر مکمل اردو بولی بھی جائے تو جملے اور تلفظ اغلاط سے بھرپور ہوتے ہیں۔ فلموں، گانوں اور ڈراموں کے ذریعے جس طرح کی اردو زبان کو فروغ دیا جا رہا ہے اسے ابلاغ عامہ یعنی میڈیا کی زبان تو کہا جا سکتا ہے پر اردو زبان کہنے میں اہل زبان بھی تامل پیش کرتے ہیں۔

جبکہ اشتہارات میں رومن رسم الخط کے ذریعے اردو زبان کا حلیہ بگاڑا جا رہا ہے۔ رہی سہی کسر ریڈیو اور ٹیلی وژن پر غیر سرکاری اداروں کے میزبانوں نے پوری کر دی ہے۔

اپنے تئیں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کوئی بھی زبان محض ادب، مشاعروں اور تفریح (فلم، ڈراما) کی بنیادوں پر نہ زندہ رہ سکتی ہے نہ ہی زیادہ دیر کھڑی رہ سکتی ہے، زبان کی بقا اسی میں ہے کہ اس کی مضبوط بنیاد علم، روزگار اور زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ استوار کی جائے۔ 1986 میں اعلان کیا گیا تھا کہ اردو زبان کو پاکستان میں دفتری زبان کا درجہ حاصل ہو جائے گا جو آج تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اگر اب بھی ایسا ممکن ہو جائے تو اس سے نوجوان نسل خاص کر سرکاری اداروں میں پڑھنے والوں کا مسئلہ روزگار ضرور حل ہو جائے گا جو کہ اردو زبان کی مقبولیت کی طرف ایک پختہ قدم ہوگا اردو زبان جاننے والے بہت سے لوگ سائنس و ٹیکنالوجی کے شعبوں سے جڑے ہیں، انفرادی طور پر کام ہو رہے ہیں مگر حکومتی سرپرستی نہ ہونے اور تقریباً ایک ہی طرز پر کام ہونے کی وجہ سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو پا رہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے افراد جو انفرادی طور پر کام کر رہے ہیں انھیں اجتماعی طور پر کام کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے اور ان کے لیے وسائل کے انتظام کو بھی یقینی بنایا جائے۔ انٹرنیٹ لائبریری،

آن لائن تدریس، سافٹ ویئر، ایپلیکیشنز جیسی مزید تخلیقات متعارف کروائی جائیں جو پرکشش، مددگار و آسان ہونے کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانے کی ضرورتوں سے ہم آہنگ بھی ہوں، اس سے نوجوانوں کا وہ طبقہ جو ان چیزوں سے منسلک ہے اردو کی جانب قدم بڑھائے گا۔

نوجوانوں میں اردو زبان سیکھنے اور پڑھنے کے شوق کو پروان چڑھانے کے لیے ٹیکنالوجی سے بہترین کوئی آلۂ کار نہیں، اگر اردو کی مشہور و معروف تخلیقات کو آواز کی صورت (آڈیو کتب) میں فراہم کیا جائے تو اس سے بھی نوجوانوں میں ذوق پیدا ہوگا۔ نیز اردو برادری کو بھی اس بات کا ادراک ہے کہ اردو مدونہ (اردو بلاگ) لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، انٹرنیٹ پر اردو میں سائنسی و تحقیقی مواد نہ ہونے کے برابر ہے اگر اس ضمن میں کام میں تیزی لائی جائے تو خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے بعض پیشہ وارانہ اصطلاحات پر مبنی کتب شائع کیں اور متعدد کورسس متعارف کروائے ہیں مگر اب ضرورت اس امر کی ہے کہ سائنس، جدید تکنیکی ترقی و معاملات سے جدید تناظر میں پیدا ہونے والے تصورات کے متعلق معلومات پر بھی کتب کی اشاعت و فروغ میں کردار ادا کیا جائے، نیز کتب و رسائل کی مفت آن لائن فراہمی کو بھی یقینی بنایا جائے۔

اردو زبان اسی صورت میں اپنی بقا سے مقبولیت کا سفر طے کر سکتی ہے اگر اردو زبان اور جدید علوم کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کیا جائے۔ اردو زبان کو مستقبل کی زبان بنانے کے لیے بہت محنت اور بہت کام درکار ہیں اس میں اہلِ زبان اور ماہرِ لسانیات کو اپنا اپنا حصہ ڈالنا ہوگا اس زبان کو محدود کرنے کے بجائے اس کے دائرے علوم، سائنس اور ٹیکنالوجی تک لے جانے ہوں گے۔ موجودہ صورتِ حال میں ہمیں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور ایسا لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا جو دورِ جدید کے انسانوں کو اردو زبان کے قریب لانے اور منسلک رکھنے میں مددگار ثابت ہو۔ یہ آپ کی، ہماری زبان ہماری نسلوں تک تبھی پہنچے گی جب ہم اس کی حفاظت کے لیے اقدامات کو ہم اپنی اولین ترجیح بنائیں گے۔

○

اردو زبان کا فروغ: ماضی اور حال

سیّد اقبال حیدر

فرنک فرٹ۔ جرمنی

میں قومی اردو کونسل کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھ جیسے طالب علم کو سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس میں شرکت اور 'اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ' جیسے اہم موضوع پر اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا۔ اردو زبان آج جس رنگ و روپ میں نظر آتی ہے اس منزل پر پہنچنے میں اسے برسوں لگے، کئی دہائیوں کے بعد اس کی جو خوش شکل بنی وہ آج رائج ہے لیکن آج یہ بے توجہی کا شکار ہے، اس کی لفظیات سے چھیڑ چھاڑ کی جا رہی ہے۔ محاوروں کہاوتوں کا استعمال کم سے کم ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ سماجی، معاشی اور ثقافتی تبدیلی کا سبب ہے۔ اس کے باوجود یہ زبان اب بھی اپنا وجود رکھتی ہے اور وقتاً فوقتاً اپنا کرشمہ دکھاتی ہے۔

ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، اسٹیج ہر جگہ اردو کے الفاظ کا استعمال جادو جگاتا اور اپنا اثر دکھاتا ہے۔ گو کہ اس زبان کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہو رہا جس کی یہ مستحق ہے۔ اُردو کے مقامی اور عالمی مشاعروں کی مقبولیت میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اردو زبان کا جو حال ہے وہ ماضی کی دین ہے۔ اس کا مستقبل حال کا تشکیل شدہ ہو گا۔ مستقبل کے شاندار اور جاندار ہونے کی پیش گوئی کرنا قبل از وقت ہوگا کیونکہ اس زبان کے الفاظ کو موت نہیں، لیکن اس کے رسم الخط کو خطرہ ضرور ہے۔ اردو کے الفاظ ہندی زبان اور اس کے رسم الخط میں اس کا حُسن بڑھاتے رہیں گے، لیکن اردو کا رسم الخط نہیں رہے گا تو اس زبان کی روح کو موت آ جائے گی، جس طرح اور زبانوں کا حشر ہوا۔ لیکن یہ سوچ کر تقویت ملتی ہے اور اداسی، مایوسی میں بدلنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے کہ اردو جس کا نام ہے وہ ہمہ لسانی گُلوں کا سائبان ہے، خوشیوں کا مسکن ہے، اس میں اپنے آپ جینے کی صلاحیت بھی ہے اور قوت بھی کیونکہ اس کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہیں۔

اردو زبان کی ابتدا اور ماضی، اس کے فروغ اور ارتقاء کی تاریخی حقیقتیں مختلف ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دہلی، لاہور، لکھنؤ، پنجاب، گجرات، دکن کے علاوہ کراچی، بھوپال، حیدرآباد وغیرہ ایسے علاقے ہیں جہاں کے گلی کوچے گواہی دیں گے کہ ہاں یہ زبان اردو ہماری گودی میں پل کر بڑی ہوئی ہے، جوان ہوئی ہے اور ساری دنیا میں پھیل گئی ہے لیکن یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے کہ آج ان ہی علاقوں میں اردو کا چلن نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو شکستہ حالت میں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو زبان کو مدرسوں نے عزیز رکھا ہے دینی تعلیمات کا موثر ذریعہ یہی زبان ہے۔ اردو ادب کی انجمنوں کا کردار بھی مثبت کہا جا سکتا ہے۔

آج کی اس محفل میں میری شرکت اردو کی نئی بستیوں میں سے ایک بستی کے نمائندے کی حیثیت سے ہے جو ہٹلر ہی نہیں بلکہ گوئٹے اور شیلر کی سرزمین ہے۔ یورپین ممالک میں برطانیہ ایسا ملک ہے جہاں دوسرے ممالک کی نسبت سب سے زیادہ اردو بولنے والے تارکینِ وطن تقریباً پچھلی 6.5 دہائیوں سے آباد ہیں اسی وجہ سے اردو کی نئی بستیوں میں برطانیہ کو اردو دنیا کی تیسری بڑی بستی سمجھا جاتا ہے، اور برطانیہ میں زبانوں کی درجہ بندی میں اردو کو چوتھے درجے پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھنے والے ڈاکٹر گلکرائیسٹ بہت بڑے محب اردو تھے انھوں نے واپس برطانیہ آ کر اردو کے فروغ میں مثبت کردار ادا کیا۔ یورپین ممالک میں

برطانوی شہریوں کی اردو سے قربت کی وجہ ہندو پاک کے ساتھ ماضی کے روابط ہیں۔ ایک زمانے میں منشی پریم چند کو برطانیہ بلا کر ملکہء برطانیہ کو اردو سکھانے کا فریضہ سونپا گیا تھا، برطانیہ کے اہلِ علم نے اردو زبان میں دلچسپی لیتے ہوئے اردو زبان پر تحقیقی کام کیا۔ بی بی سی نے اردو سروس شروع کی، ٹی وی پر بھی اردو زبان میں پروگرام شروع ہو گئے۔ آغا حسن عابدی نے BCCI بینک کھولا اور ساتھ ساتھ اردو کے فروغ کے لیے بزمِ اردو بنائی، افتخار عارف کو اسے رواں دواں رکھنے کی ذمے داری دی۔ راجہ محمود آباد نے انجمنِ ترقی اردو بنائی ان کے علاوہ اور بہت سی انجمنیں اور تنظیمیں بنیں اور اردو زبان کے لیے بے پناہ کام بھی کیے۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں جرمنی، ہالینڈ، فرانس، سویزرلینڈ، ناروے، سویڈن، ڈنمارک اور دیگر ممالک میں بسنے والوں کی اکثریت نے اپنے معاشی مسائل اور تلاشِ روزگار کی غرض سے ہندو پاک سے ہجرت کی اور ان ممالک میں 70 اور 80 کی دہائی میں جا کر آباد ہوئے، اپنے تہذیبی ماحول اور حدود سے باہر ترکِ وطن کرنے والوں نے جب یورپ اور دیگر مغربی ممالک کی سرزمین پر بسیرا کیا تو ان کے لیے ایک بڑا مسئلہ اپنی مادری اور قومی زبانوں سے وابستگی برقرار رکھنا اور اسے اپنی آنے والی نسلوں کو منتقل کرنا تھا۔ اور جوں ہی ان کے معاشی حالات بہتر ہوئے انھیں اپنی زبان، ثقافتی اور مذہبی سرگرمیاں جنھیں وہ اس دیارِ غیر میں کبھی نہیں بھولے تھے ان کے فروغ کا خیال ستانے لگا کیونکہ اب ان کے پاس مالی وسائل بھی تھے، اس طرح مساجد، مندر، گردواروں کا قیام ہوا۔ ثقافتی و ادبی سرگرمیوں اور مشاعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

میں چونکہ پچھلے 35 برسوں سے جرمنی میں مقیم ہوں اس لیے جرمنی کی ادبی سرگرمیوں پر بھی گفتگو کرنا چاہوں گا۔ جرمنی میں اردو نشر و اشاعت کی تاریخ بھی کم و بیش 30 سال پرانی ہے۔ درجِ ذیل جرائد مختلف ادوار میں شائع ہوئے۔

80 کی دہائی میں ابھی کمپیوٹر عام نہ تھے اس لیے لوگ خود کتابت کرتے، ان صفحات کی فوٹو کاپیاں کرتے پھر اسے جریدے کی شکل دے کر اپنے اپنے شہروں کی سڑکوں پر محبانِ اردو میں ان کی تقسیم کرتے۔ مالی وسائل کی کمی اور اشاعت کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے ان کی

اشاعت جاری نہ رہ سکی۔ پچھلے کئی برسوں میں صرف جرمنی سے جو اردو جریدوں کا اجرا ہوا ان میں ماہنامہ حقیقت، نصرت، صدائے پاکستان، نیا سویرا، جمہوریت، اردو دنیا، جدید ادب، گفتگو، پیغام نجات، دستک، الاذوالفقار، جذبہ، قابلِ ذکر ہیں۔

یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں بسنے والے اور اردو بولنے والے تارکینِ وطن میں بھی یہ احساس شدت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ ان کی پہلی نسل کا تو جیسے تیسے اردو اور ملک کی دیگر زبانوں سے رابطہ برقرار رہا ہے مگر اب دوسری اور تیسری نسل اپنے ورثے اور ان زبانوں کے ادب سے ناواقف ہے، بلکہ اسے اپنی سماجی اور معاشی بقا کے لیے غیر اہم سمجھتی ہے۔

جرمنی میں برلن، ہائیڈل برگ، میونخ اور غالباً دو اور یونیورسٹیوں میں اردو سیکھنے کی سہولت موجود ہے مگر اردو سیکھنے والوں کی تعداد ہمیشہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر غور کریں تو آج پورے یورپ میں اردو کے مقابل دوسری غیر ملکی زبانوں کی تدریس و تعلیم کا رجحان زیادہ موثر نظر آتا ہے، اصل میں وجہ یہ ہے کہ زبان کی افادیت و اہمیت اقتصادیات سے مربوط ہوتی ہے اور ہم اپنی کوتاہیوں اور سماجی اعتبار سے غیر منظم ہونے کی بنا پر اردو کو اقتصادیات سے نہیں جڑوا پائے۔

ہم نے اردو کی بے کسی کے مرثیے تو پڑھے مگر اپنی بے توجہی پر کبھی غور نہیں کیا۔ جرمنی میں اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد، تو کم نہیں اردو کے لیے ادبی محفلوں اور انٹرنیٹ سائنس کی صورت میں کچھ کام ہو رہا ہے مگر کئی غیر جرمن اقلیتوں کی زبانوں کی طرح اردو کو اسکولوں کے نصاب میں شامل کرانے میں ابھی کامیابی نہیں ہو سکی بلکہ دیکھا جائے تو اس کے لیے کوشش ہی نہیں کی گئی حالانکہ اس کے لیے امکانات موجود ہیں۔ اگر ہم فیصلہ کر لیں کہ ہم اپنی زبان کو مرنے نہیں دیں گے تو زبان کی ترقی کی صورتیں پیدا ہوتی جائیں گی، لیکن ان کے لیے کام نہ کیا جائے تو یہ ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ یورپ کے مختلف مقامات کی ادبی تقریبات میں ادھیڑ عمر لوگوں کی تعداد ہی شرکت کرتی ہے نئی اور جوان نسل کہیں نظر نہیں آتی جو لمحۂ فکریہ ہے۔

آج تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد جنھیں اپنے زیرِ تعلیم بچوں کی اردو کے ساتھ مشکلات کا تجربہ ہو رہا ہے وہ رومن رسم الخط کے حق میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یورپی اور مغربی

ممالک میں بسنے والوں اور بین الاقوامی سطح پر اردو بولنے والوں کے رابطے میں آسانی کے لیے اردو میں جزوی طور پر رومن رسم الخط اختیار کر لینا چاہیے۔ ہمارے وہ بچے جو یورپین ماحول میں آنکھیں کھول رہے ہیں اور پروان چڑھ رہے ہیں، روایتی رسم الخط نہیں سیکھ سکتے۔ ماہرینِ زبان اور دانشوروں کو بہرصورت یہ بات مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ اردو بولنے والے جس ملک میں بھی رہ رہے ہیں وہاں کی زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں شامل ہوتے جا رہے ہیں، اور اس عمل کو روکا نہیں جا سکتا اس لیے الیکٹرانک رابطوں کے اس دور میں نئے انداز اور طریقے اپنانے میں کوئی قباحت نہیں۔ ایسا کیوں ہے کیا یہ ایک فطری عمل ہے جسے جوں کا توں تسلیم کر لینا چاہیے اگر نہیں تو اردو سے دلچسپی پیدا کرنے اور اسے نئی نسلوں کے لیے بھی زندہ رکھنے کے لیے کیا کیا کرنا چاہیے۔

دوسری رائے یہ بھی ہے کہ رسم الخط زبان کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی اردو کے جنازے کا اہتمام کرنے کے مترادف ہوگی۔ اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت سے مذہبی کتابوں کے بڑے اثاثے کی بھی حفاظت ہوگی۔

دوسری طرف گذشتہ صدی کے آغاز میں ترکی زبان کا رسم الخط تبدیل کرنے سے ترکی کے ادبی، لسانی اور علمی ورثے پر کیا اثرات ہوئے۔ مغربی دنیا میں دیگر لسانی اقلیتیں بھی موجود ہیں جن کے رسم الخط رومن نہیں ہیں۔۔۔ کیا ان میں بھی رسم الخط کی تبدیلی کی تحریک موجود ہے۔

ہم تارکینِ وطن بڑی شدت سے اردو کا رونا تو روتے ہیں مگر اس کے مستقبل اور بقا کے لیے وہ عمل نہیں کرتے جو ہمیں کرنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اردو برادری والے دنیا کے کسی بھی ملک میں رہیں اور وہاں کے ماحول کے تقاضے کے تحت کوئی زبان بھی بولیں مگر ہمیں اپنے گھر آنگن کی زبان اردو ہی رکھنی چاہیے۔ تاکہ ہمارے بچے اردو سے روشناس رہیں اور ہماری تہذیب زنگ آلود نہ ہونے پائے۔

برطانیہ اور یورپ میں اردو اخبارات اور ٹی وی پروگراموں کی تعداد میں مسلسل اضافہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا مستقبل یورپ میں افسوسناک نہیں بلکہ تابناک ہے۔ آج یورپ میں ہماری تیسری نسل کے ساتھ زبان کا رشتہ ہند و پاک میں بننے والی بڑی سکرین کی

فلموں نے بھی مضبوط کیا ہے۔

اردو زبان دنیا میں بولی جانے والی چوتھی سب سے بڑی زبان ہے اور اردو بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔اس زبان کے بولنے والے، اردو ثقافت اور معاشرے کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آج اس کانفرنس کی بدولت اردو کی ترویج کے لیے کام میں مزید اضافہ ہوگا۔اردو بولنے والی برادری کو اجتماعی کوششیں کرنا ہوں گی۔اس مزاج و معیار کی کانفرنسوں کا مقصد جہاں مسائل اور ان کے حل کے امکانات کی نشاندہی کرتا ہے وہیں اردو برادری کو اپنی زبان کے تحفظ اور فروغ کے کام میں رہنمائی بھی فراہم کرتا ہے۔

○

بیسویں صدی کے شروع میں طلوع ہونے والا اردو کا سورج مائل بہ غروب کیوں؟

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق آر

استنبول، ترکی

یہ امر واضح ہے کہ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ بہت سارے پہلوؤں سے قابل مذمت اور قابل اعتراض تھا کیونکہ اُنھوں نے ہندوستان کے صدیوں سے جاری نظام کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا اور اپنے نوآبادیاتی عزائم اور اپنے ملک کے مفادات کی خاطر جائز یا ناجائز جو کرنا تھا وہ کر دکھایا۔ اُن لوگوں نے سیاسی ہو یا مذہبی اور سماجی ہندوستان کے تمام اقدار میں مداخلت کرنے سے ایک پل بھی گریز نہیں کیا اور پھر اُنھوں نے اِس حسیں ملک کی مال و دولت جو اپنے لیے ضروری سمجھے وہ سب اپنے ملک میں لے گئے خواہ یہ ہندوستان کے زرعی اور معدنی ذخائر ہوں خواہ تاریخی و تہذیبی آثار، یہاں تک کہ اِس ملک کی تاریخی اور ادبی کتابوں کو بھی اپنے ملک کو پہنچا کر اپنی لائبریریوں کی زینت بنا دیا۔ مگر اُن کا سب سے بدترین عمل یہ تھا کہ اس برصغیر میں مذہبی اور لسانی فرقہ واریت کی بنیاد ڈالی جس سے ابھی تک یہاں کے لوگ برسرِ پیکار ہیں۔

برٹش ایمپائر نے ہندوستان اور ہندوستانی طرزِ زندگی پر جو منفی اثرات چھوڑے وہ اظہر من الشمس ہیں اور ہم سب کو اُن کا علم ہے لیکن ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اُن کے نوآبادیاتی نظام نے ہندوستان میں اپنے مفادات کے لیے ہی سہی کچھ اچھا کارنامہ بھی کر دکھایا۔ اُن لوگوں نے ہندوستان میں جگہ جگہ ریل وے کا جال بچھا کر سیر و سفر کی سہولتوں کے علاوہ سامانِ زندگی کی نقل و حرکت کی رفتار میں بھی اضافہ کیا۔ اُن کے زمانے میں ڈاک کا سسٹم بہتر ہوا اور اُنھوں نے تعلیمی اداروں کو بھی جدید علوم سے روشناس کرادیا۔ اُنھوں نے ہندوستان میں جو اچھے کام کیے اُن کی ایک لمبی فہرست پیش کی جاسکتی ہے لیکن اگر ایک زبان شناس کی حیثیت سے مجھ سے پوچھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ انگریزوں کے اچھے کارناموں میں سب سے دلچسپ کارنامہ اُن کی دیسی زبانوں سے دلچسپی اور ان زبانوں میں تحقیق و تدقیق کا سلسلہ شروع کرانا تھا۔ برطانوی عہد میں ان زبانوں میں سے سنسکرت، برج بھاشا جیسی دیسی زبانوں کی طرح عربی اور فارسی جیسی مشرقی زبانوں پر بھی تحقیقات کا کام شروع ہوا اور برطانوی محققوں کی ان لازوال کوششوں سے سب سے زیادہ فائدہ دو زبانوں کو ہوا، وہ زبانیں تھیں ہندی اور اردو کیونکہ اُنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں ہندی زبان کی بنیادیں مستحکم کیں اور اردو کے لیے جدید اور عام فہم ادب کے دروازے وا کیے۔

لیکن انگریزوں کی اردو سے دلچسپی کا سبب اُن کا اردو سے یا مسلمانانِ ہند سے پیار نہیں تھا۔ دراصل وہ اردو سے نباہنے پر ایک طرح سے مجبور تھے کیونکہ اُس عہد میں اردو زبان ہندوستان کے مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں کے درمیان رابطہ کی زبان کی حیثیت رکھتی تھی اور اردو اُن دنوں میں ہندوستان کی واحد زبان تھی جو انگریزوں کی دشمن مغلیہ سلطنت کی سرکاری زبان فارسی کی جگہ پُر کرنے کی استعداد اور قابلیت رکھتی تھی۔ لہٰذا اُنھوں نے ہندوستان میں اپنے پاؤں جمانے تک اردو کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس فیصلے سے اردو کو بھی کسی حد تک فائدہ ہوا اور بالخصوص فارسی کی جگہ اردو کے سرکاری اور عدالتی کارروائیوں میں استعمال نے اردو کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ یہ زمانہ اردو کے سورج کے طلوع کی جانب بڑھنے کا ابتدائی دَور تھا۔

اس ابتدائی دَور میں انگریزوں نے خود ہندوستان میں اپنے اہلکاروں کو دیسی زبانوں کو، بالخصوص اردو کو سکھانے کے لیے فورٹ ولیم کالج کو قائم کیا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے 1783 میں جان گلکرسٹ ایسٹ انڈیا کمپنی میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے ہندوستان آیا اور ہندوستان میں نئے تشکیل پذیر ہونے والے ماحول کو دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ انگلستان میں فارسی کی تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آنے والے افسران، ہندوستانی ماحول سے کماحقہ واقف نہیں ہیں اور وہ منشیوں کی توسط سے اپنی خدمات بجالانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ صورتحال بالکل تسلی بخش نتائج کی حامل نہیں ہے، لہٰذا اس مسئلہ کے لیے کوئی چارہ سوچنا چاہیے۔ 1798 میں لارڈ ویلزلی (1798 تا 1805) بھی ہندوستان آیا۔ وہ بہت باصلاحیت، زیرک اور سمجھدار قسم کا سربراہ تھا۔ 28 دسمبر 1798 کے ایک خط میں بورڈ آف ڈائرکٹرز کو یہ لکھ کر اُنھیں ایک تعلیمی ادارے کے قیام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی کہ ''کمپنی کی حکومت کا اچھی طرح چلنا اس پر منحصر ہے کہ آئندہ ذمہ دار عہدوں پر وہی لوگ مقرر کیے جائیں جو گورنر جنرل کے پاس کیے ہوئے قواعد وقوانین اور ملک کی ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں کی واقفیت رکھتے ہوں۔'' (1)

1799 میں گلکرسٹ کی سربراہی میں Oriental Seminary کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہوا جو آگے چل کر فورٹ ولیم کالج کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ اس مدرسے میں جنوری 1799 میں تعلیم وتدریس کا کام شروع ہوا اور جولائی 1800 میں اس مدرسے کے طلبا کے آخری امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد یہ مدرسہ منسوخ کرایا گیا اور 10 جولائی 1800 کو اس کی جگہ فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل پڑی۔

لارڈ ویلزلی اِس کالج کو یونیورسٹی بنا کر وسیع پیمانے پر تعلیم وتدریس کے فرائض انجام کروانے کا خواہشمند تھا مگر کورٹ آف ڈائرکٹرز کی مخالفت کی وجہ سے اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ گلکرسٹ 1804 میں استعفیٰ دے کر اپنے وطن چلا گیا اور ایڈنبرا یونیورسٹی نے ہندوستانی زبان کی خدمت کے سلسلے میں اُسے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ 1841 میں اس کا انتقال ہوگیا۔ (2)

گلکرسٹ استعفیٰ دے کر اپنے ملک چلا تو گیا مگر کالج میں تعلیم و تدریس اور اشاعت کا کام جاری رہا کیونکہ فورٹ ولیم کالج میں اور بھی برطانوی اور ہندوستانی اساتذہ، منشی اور مصنف موجود تھے اور کمپنی بہادر کو اس کالج سے فارغ التحصیل آفسروں کی ضرورت تھی۔

یہ تو تھی اس کالج کی مختصر ترین تاریخ، اب آیئے اس کالج کی بنیاد گزاری میں جو مقاصد موجود تھے اُن کی طرف۔ جیسے کہ ممتاز منگلوری نے اپنے مقالے ''فورٹ ولیم کالج کے مصنفین'' میں لکھا:

> ''اردو نثر کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کالج کا قیام اگرچہ انگریزوں کی سیاسی مصلحتوں کے تحت عمل میں آیا لیکن اس سے اردو نثر کو بہت فائدہ پہنچا۔''(3)

درحقیقت اردو سے دلچسپی کا دائرہ صرف انگریزی مستشرقوں تک محدود نہ تھا۔ اُن سے پہلے ہندوستان آکر یہاں اردو یا ہندوستانی زبان کی دوسری زبانوں پر برتری کو دیکھتے ہوئے دوسرے مغربی محققوں نے بھی اردو پر تحقیق کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ حسن وقار گل کے بقول:

> ''جب مغربی سفارت کار اور مشنری برصغیر میں داخل ہوئے تو اُنھوں نے بھی اس زبان کو جسے اُنھوں نے کبھی مور، کبھی ہندوستانی، کبھی دوسرے ناموں سے پکارا، اس ملک کی اکثریت کی زبان کی حیثیت سے اختیار کیا اور اُسے اس ملک میں تبلیغی سرگرمیوں کا ذریعہ بنایا۔ ان مشنریوں کے ذریعے سے ہی یہ زبان یورپ کے مختلف ممالک میں روشناس ہوئی۔ سولہویں صدی کے اوائل میں جیرونیموزاویر (Jeronimo Xavier) نے جس کا تعلق حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی جماعت سے تھا اور جو جہانگیر کے دربار میں پیش ہوا تھا اور آگرہ میں 1580 اور 1615 کے درمیان موجود تھا فارسی ہندوستانی لغت مرتب کی تھی۔''(4)

جیرونیموزاویر کی طرح ڈنمارک کے جان جوشوا کلیٹلر (1659 تا 1718) نے بھی ہندوستانی (اردو) زبان سے دلچسپی لی اور اِس زبان کی صرف ونحو اور لغت لکھی۔ (محمد یوسف مغل،

اخبار جہان، ص 100) پھر معروف فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی نے عربی، فارسی اور ترکی جاننے کے باوجود اردو پر خاص توجہ دی۔ اُس نے 1827 سے اپنے آپ کو اردو کے لیے وقف کر دیا اور 1838 میں پیرس یونیورسٹی کے مدرسۂ علوم شرقیہ میں اردو کی تعلیم کا آغاز کیا۔ (لئیق بابری، فرانس میں اردو، اخبار اردو، 97) اور چیکوسلواکیہ کے معروف مستشرق اوتاکر پرتولود نے 1923 میں ماسرک اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں اور اس کے بعد 1927 میں کمرشیل کالج میں اردو اور ہندی کی تعلیم دی۔ (5)

صرف یہ نہیں کہ اردو کی تعلیم و تدریس انگلینڈ اور یورپ کے تعلیمی اداروں میں جاری تھی بلکہ مختلف مشرقی ممالک میں بھی اردو کی پڑھائی کی طرف رغبت شروع ہوئی تھی اور اُن میں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام ہو رہا تھا۔

جاپان کے دارالسلطنت ٹوکیو میں 1908 میں ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجز میں شعبۂ ہندوستانی کا قیام عمل میں آیا اور 1911 میں اس شعبہ میں تین سالہ کورس شروع کرایا گیا۔ جاپان کے ایک دوسرے بڑے شہر اوساکا میں اوساکا اسکول آف فارن لینگویجز میں اُس اسکول کے 1921 میں قیام کے ایک سال بعد 1922 میں ہی اردو کی تدریس و تعلیم شروع ہوئی۔ اُس دور میں یورپی زبانوں کے علاوہ صرف چار ایشیائی زبانیں سیکھی جا رہی تھی جن میں سے ایک اردو تھی۔ (6)

جاپان کے علاوہ میرے ملک ترکی میں بھی اردو کی تعلیم کا رجحان اس سے ایک صدی قبل سے شروع ہوا تھا۔ عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری برادران، ہندوستان کے دو عظیم حریت پرست اور آزادی خواہ، ہندوستان میں برطانیہ کی حکمرانی کے سخت مخالف تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع کے دنوں میں عثمانی سلطنت کی جنگ میں شامل ہونے اور مقام خلافت کی جانب سے جہادِ مقدس کے اعلان کے بعد بہت سے ہندوستانی مسلمان نوجوانوں کی طرح یہ دونوں بھائی بھی اپنے مسلم ترک بھائیوں کے ساتھ خلافت کے دشمنوں کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے خفیہ طور پر روانہ ہوئے اور سب سے پہلے حجاز جا کر مدینہ منورہ کے مدافع فخرالدین پاشا کی فوج میں شامل ہوئے۔ مکہ مکرمہ پر عرب باغیوں کے قبضہ کے بعد جب مدینہ پر اُن کا حملہ

ہوا تو فخر الدین پاشا نے مدینہ کی حفاظت کے لیے تمام تر اقدامات کیے اور شہر سے خواتین، بچے اور بوڑھے لوگوں کے ساتھ غیر عرب اور ترک باشندوں اور رضا کاروں کو نکالا تا کہ اُن کو جنگ کے دوران نقصان نہ پہنچے۔

خیری برادران بھی مدینہ کا محاصرہ شروع ہونے سے پہلے حجاز سے جدا ہو کر استنبول آئے اور استنبول میں ان دونوں برادران نے مختلف سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ بالخصوص عبدالجبار خیری عثمانی خفیہ ایجنسی ''تشکیلاتِ مخصوصہ'' کے ایک فعال کارکن تھے اور باقاعدہ رپورٹوں سے عثمانی اہلِ حکومت اور فوج کو انگریزوں اور انگریزوں کے لیے کام کرنے والے ہندوستانی جاسوسوں کے بارے میں اطلاع فراہم کر رہے تھے۔ نہ صرف یہ ہے کہ اُن کی رپورٹوں میں خفیہ معلومات موجود تھیں، اس کے ساتھ ساتھ اُن کی رپورٹوں میں ہندی اردو تنازعہ، اردو کی اہمیت اور عثمانی سلطنت میں اُس کی تعلیم کی ضرورت، جنگ کے دوران گرفتار ہونے والے ہندوستانی فوجیوں کے لیے اردو جاننے والے مترجموں کی فراہمی کے لیے کوشش جیسے اردو زبان سے متعلق اہم موضوعات بھی شامل تھے۔

اُن کی سیاسی سرگرمیاں بے شک تاریخی لحاظ سے اہم ہیں مگر ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ترکی میں یونیورسٹی کی سطح پر اردو زبان کی تعلیم کا افتتاح تھا۔ عبدالجبار خیری نے آج سے تقریباً ایک صدی قبل 1916 میں دارالفنون (حالیہ استنبول یونیورسٹی) میں اردو کے اولین پروفیسر ہونے کا شرف حاصل کیا۔(7)

یہاں تک دی گئی معلومات سے ظاہر ہوا ہوگا کہ اردو کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ سولہویں صدی کے آخر سے شروع ہو کر یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیلتا جا رہا تھا اور اس پھیلاؤ کا سبب برصغیر پاک و ہند کی سیاسی اہمیت اور اردو کا اس سیاسی اہمیت کے مالک خطے کی واحد مشترکہ زبان ہونا تھا۔

ہندوستان میں بڑھتے ہوئے سیاسی اور سماجی شعور کی دین تھی کہ اس ملک کی واحد مشترکہ زبان اردو میں صحافت کا علَم بھی اپنی اونچائیوں تک پہنچ گیا اور 1947 میں برصغیر کو آزادی ملنے تک یہ علَم ہندوستان کے آسمان میں بلند رہا۔ اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز انیسویں

صدی عیسوی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے 1822 میں ''جامِ جہان نما'' کے عنوان سے ایک اردو اخبار کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا لیکن کچھ عرصے بعد اُس کی زبان فارسی میں تبدیل کی گئی۔ 1836 میں ''دہلی اردو اخبار'' کی اشاعت عمل میں آئی اور اس کے بعد سرسید احمد خان اور اُن کے بھائی سید محمد خان کا ''سید الاخبار''، سید جمیل الدین کا ''صادق الاخبار''، ''قران السعدین''، ''فوائد الناظرین''، ''ہمائے ہند'' اور ''خورشید پنجاب'' جیسے اردو اخبار نکلنے شروع ہوئے۔ 1857 کی جنگ آزادی کی آگ جو یکا یک بھڑک اُٹھی اور جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، سقوطِ دہلی کے بعد بجھ تو گئی۔ مگر انتقام کے جذبے سے مغلوب انگریزوں نے ہندوستان میں بالخصوص مسلمانوں کے تہذیب وتمدن کو مٹانے کی خاطر کوئی کسر اُٹھائی نہ رکھی۔ ڈاکٹر انور سدید اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''1857 میں سقوطِ دہلی نے مسلم صحافت پر ضرب کاری لگائی تھی، بیشتر اخبارات بند کر دیئے گئے۔ جنگِ آزادی کے بعد 35 میں سے صرف 12 اخبار بچے، جن میں سے صرف ایک اخبار کے مدیر مسلمان تھے۔ سرسید کے عہد میں انگریزوں نے مسلم صحافت کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا۔'' (8)

ان ناسازگار حالات کے باوجود مرتے مرتے پھر سے اردو اخبارات کی نشاۃ ثانیہ وجود میں آئی اور 1857 کے بعد انگریزی حکومت کی تلوار ہمیشہ اپنے سروں کے اوپر محسوس کرتے ہوئے بھی زندہ رہنے کی ہر ممکن راہ آزمائی گئی اور موقع ملتے ہی اردو صحافت اپنے اصلی رنگ میں آ گئی۔ اس دوران اردو صحافت کا نقشہ مسکین علی حجازی نے یوں کھینچا ہے:

> ''1857 سے 1914 تک ستاون برس میں برصغیر کی صحافت کئی انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ 1857 کے فوراً بعد کی صحافت عوام کی ترجمان نہیں تھی، اخبارات حکومت کی تعریف اور خوشامد میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ خبریں غیر سیاسی اور ہم عصر اخباروں سے نقل شدہ ہوتی تھیں۔ سر سید احمد خان نے اردو صحافت کو بامقصد اور خفیہ بنانے میں حصہ لیا۔ اُنھوں نے اعتدال اور حکومت سے مصلحت کی پالیسی پر

گامزن ہونے کے باوجود مناسب تنقید کا حق ادا کیا۔ سرسید کی تحریک نے ایک طرف لوگوں میں یہ عام سیاسی و تعلیمی شعور پیدا کیا اور دوسری طرف اردو زبان و ادب کی اصلاح کر کے اُسے زندگی سے ہم آہنگ کیا۔ سرسید مکتب فکر کی متین صحافت کے دوش بدوش مزاحیہ صحافت میں پھلی پھولی اور اُس نے 1857 کے بعد کی مایوس کن فضا میں زندہ رہنے کا حوصلہ بخشا۔ انیسویں صدی کے آخر میں روزانہ صحافت کا غلبہ ہوگیا اور اس میں کاروباری پہلو بھی در آیا، مگر بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جری اور نڈر صحافیوں نے صحافت کو دوسری انتہا پر پہنچا دیا۔ پچاس پچپن برس میں صحافت کا خوشامد سے بغاوت اور مبارزت کی حد تک پہنچ جانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ روزنامہ ''زمیندار'' کے ابتدائی دور، ''کامریڈ''، ''البلال'' اور ''ہمدرد'' نے صحافت کا معیار قائم کیا جس کے بعد کی صحافت معنوی اعتبار سے اس پر قائم نہ رہ سکی۔''(9)

مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ کی طرح اردو صحافت کی نشاۃ ثانیہ میں بھی سرسید احمد خان کو بہت بڑی اہمیت حاصل تھی۔ خالدہ ادیب خانم نے (Inside India) میں لکھا ہے کہ ''سرسید کو کسی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہے۔ اُس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں۔ خواہ اُن کی سمت ہمیشہ وہ نہ رہی ہو جو سرسید پسند کرتے تھے۔ سرسید احمد خان کے اخبارات سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق بھی گویا ایسے پتھر تھے جو برِّ صغیر کی اردو صحافت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیے گئے تھے۔''(10)

ہندوستان میں صحافت کا بڑھتا اثر و رسوخ اور پہلی جنگ عظیم کی طرف دوڑتی دنیا میں ہندوستان کی سیاسی اور عسکری اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے باہر بھی اردو اخبارات کا سلسلہ شروع ہوا اور سلطنت عثمانیہ کے دارالخلافت استنبول میں بھی اردو صحافت کی طاقت

سے فائدہ اُٹھا کر ہندوستانی قارئین تک پہنچنے اور ترکی کے حق میں مثبت رائے عامہ قائم کرنے کی کوششیں بھی ہونے لگیں۔

استنبول میں نکلنے والے اردو اخبارات کے سلسلے میں ہمارا تین ناموں سے سابقہ پڑتا ہے: ''پیک اسلام''، جہان اسلام'' اور ''الدستور''۔ علاوہ برین ان اخباروں میں ''اُخوت'' کے نام کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے جو فارسی زبان میں شائع ہونے کے باوجود ہندوستانی صحافیوں کی جانب سے نکلنے کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ ہماری تحقیقات کے دوران یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ استنبول کی لائبریریوں میں ان چاروں میں سے صرف تین اخبارات کے نسخے موجود ہیں اور وہ اخبارات ہیں: ''جہانِ اسلام''، ''الدستور'' اور ''اُخوت''۔ لیکن اب تک ''پیک اسلام'' کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔

اردو اخبارات میں پہلے نمبر پر ہونے کا شرف پیکِ اسلام کو حاصل ہے۔ 1880 میں نکلنے والے اس اخبار کے ساتھ استنبول میں اردو صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔ ''پیک اسلام'' اردو اور ترکی دونوں زبانوں میں شائع ہورہا تھا۔ اس کے مدیر مسئول نصرت علی خاں تھے جو انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں میں شرکت کرنے کی بناپر ہندوستان سے جلاوطن کردیے گئے تھے۔ مئی 1880 میں ''پیکِ اسلام'' کا اوّلین شمارہ منظر عام آیا۔

''پیکِ اسلام'' کے بعد ہمارے سامنے جو اخبار آتا ہے وہ ''الدستور'' ہے۔ اردو اور عربی دونوں زبانوں میں شائع ہونے والے اس روزنامہ اخبار کے صاحب امتیاز احمد پاشا الزہر اور رئیس تحریر ذکی بیگ تھے۔ 1327ھ بمطابق 1909 میں شائع ہونے والا ''الدستور'' مطبع عثمانی میں چھپ رہا تھا اور اسے جمعیت اتحاد وترقی کی حمایت اور سرپرستی حاصل تھی جس نے عبدالحمید ثانی کو خلع کرکے لگام حکومت سنبھال لی تھی۔ ''الدستور'' بھی چند نمبروں کی اشاعت کے بعد مذکورہ بالا اسباب پر بند ہوا تھا۔ (11)

''اخوت'' کی اشاعت، 13 ستمبر 1915 / 30 ستمبر 1331ھ رومی میں قائم ہونے والی ''انجمنِ ہند اخوتِ اسلام'' کی نگرانی میں شروع ہوئی اور ''تشکیلاتِ مخصوصہ''، جس کے بارے میں تفصیل ''اخبارِ جہان'' کے بارے میں بتاتے ہوئے پیش کی جائے گی، کی مالی امداد سے اُس کا

پہلا شمارہ تشرین اوّل 1331ھ بمطابق اکتوبر۔نومبر 1915 میں نکلا۔

اِس اخبار کی اشاعتی زندگی تین سال تک باقاعدہ طور پر جاری رہی اور اِس کی ہمراہی میں ''Brotherhood'' کے عنوان سے انگریزی اخبار کا آغاز کیا گیا اور بالخصوص اِس کو یورپ میں بانٹا گیا۔

ان اخباروں کے بعد ''جہان اسلام'' کا نام آتا ہے۔ اِس اخبار کی اشاعت ''جمعیت خیریۂ اسلامیہ'' نامی تنظیم کی امداد سے عمل میں آئی تھی۔ ''جہانِ اسلام'' کا پہلا شمارہ 13 جمادی الاولیٰ 1332ھ بمطابق 19 اپریل 1914 کو اور آخری شمارہ 1333ھ/ 1915 کو نکلا۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اردو صحافت کی اہمیت اور اُس کا ہندوستان میں رائے عامہ مرتب کرنے کے مبینہ کردار کا احساس صرف عثمانی یا بہ الفاظ دیگر ترکی کے اہل حکومت اور سیاست کو نہیں تھا۔ اس اہمیت کا بہترین احساس اُنھیں کو تھا جو ہندوستان پر قابض تھے اور اُن کو اپنی رعایا کی شہ رگ تک کا پتہ تھا۔ اِس لیے یہ بہت طبعی بات تھی کہ انگریز حکام ہندوستان سے باہر انگلستان میں بھی اردو میں دلچسپی لینے لگے۔ سب سے پہلے 87-1886 کے لگ بھگ ہندوستان کے ساتھ تجارتی روابط اور برطانیہ میں بڑھتی ہوئی ہندوستانی آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے ''آئینہ انگریزی سوداگری'' کے عنوان سے ایک سہ ماہی پرچہ نکلنے لگا۔ برطانوی فرم گلبرٹ اینڈ ریونگٹن کے زیر اہتمام ایس ٹی جونز ہاؤس کلرکن لندن سے شائع ہونے والا یہ پرچہ عام طور پر برطانیہ کے ہندوستان کے ساتھ موجود تجارتی روابط پر خبروں اور مصنوعات کے اشتہارات پر مشتمل ہوتا تھا اور یہ پرچہ 1898 کے بعد بند ہوا۔(12)

محمد اسلم الوری صاحب اپنے مضمون ''برطانیہ میں اردو پریس: ماضی، حال اور مستقبل'' میں اِس بارے میں لکھتے ہیں:

''سرکاری سرپرستی میں اردو پریس کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے تیسرے برس اُس وقت ہوا جب ہندوستان سے برطانیہ تک فضا میں ہر طرف دھوئیں، بارود اور انسانی خون کی بو رچی ہوئی تھی۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے پس منظر میں لندن سے پندرہ روزہ تصویری خبرنامے ''الحقیقۃ'' نے مارچ 1916 میں اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ برطانوی حکومت کی زیر سرپرستی

شائع ہونے والا 8 باتصویر صفحات پر مشتمل یہ پرچہ جس کے عنوانات اردو، فارسی، انگریزی اور ترکی میں لکھے جاتے تھے، زیادہ تر جنگ کے متعلق اطلاعات فراہم کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ اخبار اپنے ابتدائی انداز پر جولائی 1917 تک چھپتا رہا مگر اس کے بعد اخبار پر سے اردو متن اچانک غائب ہوگیا۔

اِس دَور میں ایک اور پرچے ''جنگی اخبار'' نے جنم لیا جو درحقیقت اپنے پیشرو ''الحقیقۃ'' کا ہی اردو اور ہندی ایڈیشن تھا۔ جس کا مقصد انگریزی فوج میں شامل فقط اردو اور ہندی جاننے والے فوجیوں کو اطلاعات فراہم کرنا تھا۔ اِس اخبار کی اشاعت 1919 میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک جاری رہی۔

''الحقیقۃ'' اور ''جنگی اخبار'' کے علاوہ ایک اور سرکاری ترجمان چودہ روزہ ''تصویری اخبار'' کا بھی سراغ ملتا ہے جو 14 صفحات پر مشتمل تھا لیکن اِس میں لڑائی کے بجائے حسین قدرتی مناظر اور برطانوی کارخانوں کی تصویر کشی کی جاتی تھی۔ اخبار میں تصاویر کے نیچے وضاحتی کیپشن اردو، ہندی، تامل اور انگریزی میں دیے جاتے تھے۔'' (13)

صرف یہ نہیں کہ اردو کی سیاسی، سماجی اور تجارتی امور میں اہمیت اور واسطہ ہونے کی وجہ سے بیرونی ممالک کے لوگ اردو کا سہارا لیتے تھے وہ اردو سے محبت بھی کرتے تھے اور اردو میں شاعری بھی کرتے تھے۔ اِن شاعروں میں بی ڈی مانٹروز تھا جو داغ دہلوی کا شاگرد تھا اور مظفر تخلص کرتا تھا۔ اے بی فیلپس صابر تھا جو نجم اور سیماب اکبرآبادی کا شاگرد تھا۔ کپتان الیگزنڈر ہیڈرے آزاد تھا جس کا دیوان 1863 میں آگرہ کے مطبع احمدی نے طبع کیا تھا اور جان اسٹیفین اور جان بال تھزار تھے۔ پھر ریاض خیرآبادی کا شاگرد آئرین جیکب ایرن گورکھپوری تھا، دانیال سقراط ناتھی گارڈر تھا جو پہلے جوزف بینسلی فنا اور پھر مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی کا شاگرد رہا۔ جونس صاحب تھا جو میر وزیر علی صبا لکھنوی کا شاگرد تھا، فرانسیسی الاصل ایلوی سَس راین ہارٹ صاحب تھا، اپنے ملکہ تھی جو ایک انگریز پولیس سُپر نٹنڈنٹ کی بیٹی تھی اور اُن جیسے مختلف یورپین تھے جو اردو میں شاعری کرتے تھے۔ (14)

پھر اِن سب خوبصورت پہلوؤں کے علاوہ ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ ملکہ وکٹوریہ کو بھی

اردو آتی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کو 1887 میں اپنے عہد کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ہندوستان سے اُن کے ذاتی خدمتگار کی حیثیت سے آگرہ سے 24 سالہ عبدالکریم کو لندن بھیجا گیا۔

عبدل سے ملکہ نے اردو بھی سیکھی اور ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کی معلومات بھی حاصل کیں۔ عبدل نے اُنھیں خالص ہندوستانی پکوانوں سے بھی روشناس کرایا۔ ہرچند کچھ لوگ ملکہ وکٹوریہ کی اردو دانی کا سبب عبدالکریم کی محبت کو ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مجھے نہیں لگتا ہے کہ اس عظیم اور باصلاحیت ملکہ نے رومانس کی بنا پر اردو سیکھی ہوگی۔ میرے نزدیک ملکہ کی اردو سے دلچسپی کی اصل وجہ اپنے تاج کے ہیرے ہندوستان کو اور ہندوستانیوں کو زیادہ قریب سے پہچاننے کی خواہش رہی ہوگی۔(15)

غرض یہ کہ انیسویں صدی کے نصف دوم سے لے کر بیسویں صدی کے نصفِ اوّل تک اردو زبان کا سورج دہلی اور لکھنؤ سے طلوع ہوکر اپنی شعائیں پہلے کل ہندستان میں اور پھر تمام دنیا میں پھیلانے لگا تھا اور نہ صرف اردو سیکھنے اور سکھانے کی انتھک سعی و کوشش ملک میں ہورہی تھی بلکہ ہندوستان میں قوت پکڑنے والی اردو صحافت کی جڑوں سے ایک ایسا مضبوط اور گھنی چھاؤں کا درخت پیدا ہوا تھا جس کی شاخیں برطانیہ اور ترکی کی طرح دیگر ممالک تک پہنچ گئی تھیں اور اردو میں شائع ہونے والے اخباروں کی سرکاری حمایت بھی ہورہی تھی۔

لیکن بیسویں صدی کے نصف دوّم کے بعد بلکہ یوں کہیے تو بہتر ہوگا 1947 میں برصغیر کی آزادی کے بعد اردو کا چمکتا دمکتا سورج غروب کی طرف مائل ہونے لگا۔

ظاہری علامت پر نظر دوڑائیں گے تو کچھ بھی نہیں ہوا، اردو زبان کا آفتاب آج بھی آسمان میں اپنی تمام تر چمک دمک سے فروزاں ہے، آج بھی اردو دنیا کی دوسری زبانوں میں نمایاں ہے۔ برصغیر کے اندر اور باہر ملکی اور غیر ملکی اردو کے بے شمار پرستار موجود ہیں اور چین کے انتخاب عالم، جاپان کے سویامانے، تاجکستان کی زیب النساء اور ترکی کے راقم الحروف جیسے اردو سے محبت کی وجہ سے اردو میں شاعری کرنے والے اصحاب مختلف ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ میرا مطلب اِتنی خوبیوں کے ہوتے ہوئے دیکھنے میں تو اردو کا مستقبل بیسویں

صدی کے نصف اوّل سے زیادہ پُر رونق اور شاندار نظر آتا ہے مگر پھر کیوں پاکستان اور ہندوستان کے باعقل و دانش اصحاب سے لے کر مغربی ملکوں میں بسے ہوئے لوگوں تک کو اردو کے مستقبل کا فکر لاحق ہے؟ لوگ کیوں اردو کی کس مپرسی کی حالت کا رونا روتے ہیں اور درد و الم کی آہیں آسمان تک پہنچتی ہیں؟

برصغیر میں اردو کی کمزوری کی وجوہات سے متعلق پچھلے پچیس سال کی شعوری جستجو کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستان اور ہندوستان میں بشمول اردو مقامی زبانوں کو پیچھے دھکیل کر انگریزی کو صف اوّل میں لانے کی وجہ سے یہ حالات پیدا ہوئے ہیں اور اس کا اصلی سبب آزادی کے بعد پیدا ہونے والا خلا تھا۔ انگریزوں کے سیاسی پردے سے ہٹ جانے کے بعد اُن کی جگہ کو اُن کے عہد کے پروردہ اور امیر کردہ لوگوں نے پُر کیا جن کی تعلیم یا انگلستان میں ہوئی تھی یا اُنھوں نے برصغیر میں ہی رہ کر برٹش ماڈل طرز زندگی اور اُن کی زبان کو اپنایا تھا۔ میں برصغیر کی جد و جہد آزادی کے علمبرداروں کے بارے میں یہ ہرگز نہیں کہتا ہوں کہ اُن لوگوں نے انگریزی کی سرپرستی کی لیکن واقعتاً ایک گروہ باقی تھا جو انگریزوں کے ہم خیال تھے وہ برصغیر کے دونوں ملکوں میں رہے اور سیاسی اور مادی طاقت اُنھیں کے ہاتھوں میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اِس گروہ نے اپنی طاقت کو اپنی آنے والی نسلوں میں منتقل کرنا چاہا جس کا ایک آلۂ کار انگریزی تھی اور انگریزی تعلیم کی سہولت اُن کے بچوں کو میسر تھی۔

مستزاد برآں بیرونی طاقت سے فراغت کے بعد قومی اور لسانی شعور کچھ ماند سا پڑ گیا کیونکہ اُن کے سروں کے اوپر لٹکنے والی اجنبی تلوار نہیں رہی تھی اور اُن کو اِس اجنبی طاقت سے برسرِ پیکار ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر آہستہ آہستہ سر سید احمد خان، ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان جیسے نڈر اور بلند حوصلہ ہستیوں کی نسل بھی ختم ہوگئی جو قوم میں یکجہتی پیدا کر سکے اور عام لوگوں میں لسانی شعور پیدا کر سکے۔

بیسویں صدی کے نصف دوم کے بعد دنیا بھی بالکل بدل گئی اور تمام دنیا اپنی تمام تر وسعتوں کو لے کر ایک گلوبل ولیج کی صورت میں آ گئی اور معنوی اور مذہبی اقدار اپنی اصلیت کھو کر مادی اور ذاتی مفادات کے دائرے میں سمٹ گئے۔ اب دنیا میں جو بھی ہوتا تھا وہ مادی

مفادات کی بنیاد پر اور بہتر زندگی کی شرائط حاصل کرنے کی آڑ سے ہونے لگا۔ برصغیر بھی مادیات کے اسی سیلاب کی زد میں رہا اور دنیا کے تمام تر ملکوں کی طرح ہندوستان اور پاکستان بھی اِسی سیلاب میں بہنے لگے۔

اِس کا طبعی نتیجہ یہ ہوا کہ ہائی سوسائٹی یا بہ الفاظ دیگر اپر کلاس کی طرز زندگی اور سہولتیں دیکھتے ہوئے مڈل کلاس کے سب طبقات زیادہ اونچی منازل تک پہنچنے کے خواہش مند ہو گئے اور اس کے حصول کے لیے زیادہ پیسے کی ضرورت تھی اور زیادہ پیسے حاصل کرنے کے لیے اچھے اسکولوں میں پڑھنے کی مجبوری تھی اور اچھے اسکولوں میں تعلیم انگریزی میں ہوتی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ اُپر کلاس کے ممتاز لوگ آپس میں اور اپنے بچوں کے ساتھ بھی انگریزی میں ہی بات کرتے تھے اور کروڑوں لوگ اِن کے طرزِ زندگی کو ہر روز ٹی وی پر دیکھنے لگے تھے۔ اور اچھی انگریزی اِس ہائی سوسائٹی سماجی رتبے کی علامت تھی۔ پھر عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اگر پیسے کما کر اپنے ماحول سے ایک قدم بھی باہر نکلنا ہے تو انگریزی سیکھنا اور بولنا ناگزیر ہے۔ ویسے بھی انگریزی بول کر مڈل کلاس کے لوگوں میں یہ خوش فہمی پیدا بھی ہوئی تھی کہ ہم اب اُس طرح سے ہائی سوسائٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔

الغرض 1950 کے بعد دنیا کے بہت سارے ملکوں کی طرح تیزی سے بدلنے والے برصغیر میں بہت سے لوگوں کی ترجیحات بدل کر کچھ یوں ہوگئیں:

اوّل میرے اپنے ذاتی مفادات اہم ہیں
پھر میری بیوی اور بچوں کے مفادات اہم ہیں
پھر میرے رشتہ داروں کے مفادات اہم ہیں
پھر میرے قریبی دوستوں کے مفادات اہم ہیں
پھر میرے فرقے کے مفادات اہم ہیں
پھر میرے مذہب کے مفادات اہم ہیں

پھر میری قوم کے مفادات اہم ہیں
پھر میرے وطن کے مفادات اہم ہیں

اور اگر اُن کے مفادات کی فہرست میں کوئی گنجائش رہی تو وہ کہیں گے کہ میری مادری یا تہذیبی زبان کے مفادات اہم ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ آج کل اکثر لوگوں کی فہرست تین اوّلین شقوں پر ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر اِس مفادات کی دنیا میں ہم جو بھی کہیں لوگوں کے ذہنوں میں انگریزی کے حق میں پیدا ہوئی غلط فہمی کو دُور نہیں کر پاتے ہیں اور نہ ہی کر پانے کی امید رکھتے ہیں اور اس سے نہ صرف اردو زبان کو بلکہ ہندی، تامل، بنگالی یا ترکی دنیا کی تمام زبانوں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اس خطرے سے نجات پانا اور اردو جیسی حسین اور کم نظیر زبان کو اس خطروں کے سمندر سے صحیح سلامت گزارنے کے لیے اس اجنبی کے ذہن میں جو تجویزات جنم لی ہیں وہ یہاں عرض کرنا چاہوں گا۔

1- مضبوط قومی اور لسانی شعور
2- مکمل یقین
3- عملِ صالح، بے باک اور باانتظام جد و جہد

یہ اصول جو علامہ اقبال کی شاعری سے پھوٹے ہوئے لگتے ہیں، حیاتِ انسانی کی ہر سطح میں بڑے لازمی ہیں جن کے تحت زبانوں کو بھی بہ آسانی شامل کر سکتے ہیں۔ اس لیے اب اردو کو مدنگاہ رکھتے ہوئے قدم بہ قدم تشریح کیے دیتے ہیں۔ دنیا کی کسی بھی زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے سب سے پہلے اُس کو بولنے والوں میں مضبوط و محکم شعور ہونا لازمی ہے بلکہ الزم لزوم ہے۔ اگر کسی زبان کو بولنے والوں میں اپنی زبان کو اپنی قومی یا ملی شناخت کی علامت ہونے کا محکم شعور ہو اور وہ اپنی قومی موجودگی کا انحصار اور بقا اُسی پر قائم کریں تو وہ ذہنی طور پر اپنی زبان کی حفاظت اور ترقی کی خاطر ہر ممکن کوشش کرنے حتیٰ کہ قربانیاں دینے تک کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ جرمنی، فرانس اور دیگر ملکوں کے تجربات میں دیکھا گیا ہے یہ قومی شعور اُن ملکوں میں اعلیٰ درجے میں موجود تھا اور ہے بھی۔ یہ شعور اکثر ملکوں کے شاعر، ادیب، مفکر اور علم پیشہ یعنی یونیورسٹی سے منسلک فکری دنیا پر کارگر ہونے والے طبقہ خواص میں شروع ہوا

ہے اور پھر سرکاری اور پھر عام لوگوں میں پھیلا اور سب سے آخر میں ملک کے اُس امیر طبقے میں پھیلا جو اپنے آپ کو ایک سونے کے فانوس میں رکھ کر ملک کے تمام عام بندوں سے الگ تھلگ رکھتا تھا اور عام لوگوں کی زبان کو گندی سی زبان سمجھتا تھا اور کسی اجنبی زبان کو اپنی مادری زبان کی طرح بولنے پر فخر کرتا تھا کیونکہ اُن کے مطابق اپنے ملک کے عام بے قیمت اور ناقص لوگوں کی زبان بولنا (میں یہاں ان لوگوں سے معذرت خواہ ہوں جو غربت و مشکلات سہتے ہوئے اپنی زندگیاں باوقار اور باعزت طریقے سے بسر کرتے ہیں۔ دراصل ملکوں کے باقی رہنے میں وہ عام لوگ آب حیات کا کام دیتے ہیں جن کو غریب غربا کہہ کر نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن کیا کیا جاسکتا ہے کہ اِن کی تعداد کم ہی سہی پھر بھی عام لوگوں کے بارے میں یوں سوچنے والے لوگ موجود ہیں۔) اِن کے لیے کوئی ناشائستہ کام کرنے کے برابر تھا!!! مثال کے طور پر ہندوستان میں آنے والے ترکوں کو لیجیے جو اکثر حکمران امرا اور فوجی تھے اور اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان میں بھی زبانی عصبیت اور شعور قوی کی کمی تھی اور جس طرح آج کل ہندو پاک کے امرا و رؤسا میں انگریزی کا بول بالا ہے، اُس زمانے کے ترک امرا و رؤسا نے ترکی زبان کو چھوڑ کر زبان فارسی کو اپنایا، پھر اُن کی قومیت اور موجودگی ناپید ہوگئی یہاں تک کہ وہ مغل کہلانے لگے حالانکہ اُن کے آبا و اجداد صدیوں سے مغلوں سے جنگ کرتے آرہے تھے۔ اس کے برعکس Moldovia میں رہنے والی مختصر سی اقلیت گوک اوگوز لوگ اور سالوں سے جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے والے کریمیا کے ترکوں کے عام لوگ جنھوں نے اپنی زبان کبھی نہیں ترک کی آج تک باقی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ شعور قوی ہو تو عوام ہو یا خواص اپنی قومی زندگی قائم و دائم رکھ سکتے ہیں۔ جب ہم اردو کی طرف آجاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اردو دانوں کی غالب اکثریت میں اپنی زبان سے متعلق شعور تو ہے لیکن اسے مضبوط اور مکمل شعور کہنا نامناسب ہے بلکہ وہ شعور کمزور ہی کہلایا جائے تو یہ بہتر ہوگا۔ جہاں تک مجھے علم ہے پاکستان اور ہندوستان کے وہ اردو دوست اصحاب جو برسوں سے اردو کے تحفظ کے لیے کوشاں ہیں وہ درکنار، اِس لسانی شعور کو نہ شعرا نہ ادبا و علما اور نہ سرکار اور نہ ہی عام لوگوں میں دیکھنا ممکن ہے۔ جہاں شعرا و ادبا جو خود اردو میں شاعری کر کے کتابیں لکھنے کے باوجود اپنے بچوں کو

انگریزی تعلیم دینے والے اسکول اور کالجوں میں بھیجنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہوں، یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذۂ کرام اپنے لیکچر دیتے ہوئے انگریزی کو ترجیح دیتے ہوں اور اُن سے اردو میں سوال پوچھنے والے طالب کو ڈانٹ ڈپٹ کر انگریزی میں سوال پوچھنے پر مجبور کرتے ہوں اور سرکار ہر سطح کی خط و کتابت انگریزی میں ہی کرنے کی شیدائی بنی ہوئی ہو تو وہاں شعور کی بات کرنا بھی محال ہو جاتا ہے۔

مضبوط شعور کی مانند کسی زبان کے تحفظ میں دوسرا قدم اپنی زبان پر مکمل یقین ہے۔ دوسرے ملکوں کے تجربات میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہاں کے باشندے قومی زبان کے شعور کے ساتھ ساتھ اپنی زبان پر پورا یقین رکھتے تھے کہ اُن کی زبان کو دوسری زبانوں پر برتری حاصل ہے اور اُن کی زبان علمی، فنی، صنعتی اور ادبی یعنی انسانی زندگی کے ہر پہلو کی ضروریات پوری کر سکتی ہے خواہ اُن کی زبان شروع میں اس کے قابل ہو یا نہ ہو۔ لیکن اِسی مکمل یقین کی بناء پر اُن کی زبان دھیرے دھیرے قوت پکڑ کے اُس اونچے مقام تک پہنچ گئی جس مقام کا وہ شروع ہی میں تصور کرتے تھے۔ اردو والوں میں مضبوط و محکم شعور کی طرح مکمل یقین کی بھی کمی دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ جہاں خود زبان کو بولنے والے اپنی زبان کی کمزوری، نامکملی اور عصری ضروریات کو پورا کرنے سے بعید ہونے کا دم مارتے رہیں گے تو وہاں یقین کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اور جب اردو کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی بحث چھڑتی ہے تو اِس کے مخالف کہنے لگتے ہیں کہ اردو سائنسی زبان نہیں ہے یا اِس میں عصری ضرورتوں کو پورا کرنے کی گنجائش نہیں تو اردو کی حفاظت کرنے والے زیادہ تر اُس کے ادبی اور عام بول چال کی زبان ہونے کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے دبی آواز میں یہ بھی کہہ لیتے ہیں کہ ٹھیک ہے آج اردو سائنسی لحاظ سے کمزور ہے لیکن اگر کوشش کی گئی تو وہ سائنسی زبان بھی بن سکتی ہے۔ جیسے اُن میں اردو کے علمی زبان ہونے پر شبہ ہے۔ اندھا یقین اکثر وصف پسندیدہ نہیں ہے لیکن بعض میدانوں میں کورانہ یقین کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اور زبان اِن میدانوں میں سے ایک ہے۔ اِس لیے اردوداں اور اردو دوستوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اپنے دِلوں میں اردو کی مکملیت اور اہلیت پر ایک مکمل یقین بلکہ کورانہ یقین پیدا کر لیں کیونکہ جب

وہ لوگ اس قسم کا یقین حاصل کریں گے تو تب وہ بہانے اور معذرتیں پیش کرنا چھوڑ کر اپنی پوری قوت چارہ جوئی میں صرف کرنے لگیں گے۔ اور اردو کی مکملیت پر کورانہ یقین پیدا کرنا اُن کے لیے ذرا مشکل نہیں ہوگا اس لیے کہ وہ بے شک و شبہ مکمل اور باصلاحیت زبان ہے ہی۔

اس سلسلے کا تیسرا مرحلہ صالح، بے باک اور باانتظام عمل کا ہے۔ مضبوط شعور اور مکمل یقین حاصل کرنے کے بعد اس کے عمل کی باری آتی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں اردو کی ترقی اور ترویج کی خاطر عمل صالح جاری ہے اور وہ لوگ جو اس عمل میں مصروف ہیں اُن کو داد دینا ہی چاہیے مگر یہ عمل مطلوبہ حد تک باانتظام ہونے سے دُور اور بے باک نہیں ہے۔ کیونکہ اردو کے حق میں برسرِ پیکار ہونے والے ادارے اور تنظیم اکثر ایک دوسرے سے جداگانہ کام و تحقیق جاری رکھتے ہیں اور باانتظام اور باتفاق، ایک جسم واحد کے عضو کے طور پر عمل نہیں کر پاتے ہیں۔ جو مقصد میں متفق ہیں اُنھیں عمل میں بھی متفق ہونا چاہیے اور آج کل کی دنیا میں یہ اردو والوں کے لیے لازمی ہے۔ اور رہی بے باکی کی بات۔ بے باک عمل کا افتتاح اس وقت ہوگا جب اردو بولنے والے اپنے ہم وطن اور ہم زبان لوگ یا استاد یا مدیر اُس کے ساتھ اردو کے بجائے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کریں گے تو تمام تحقیری اور تذلیلی نگاہوں کو برداشت کرتے ہوئے اُن سے یہ کہہ کر اُن سے اردو میں بات کرنے لگیں کہ ''جناب مجھے انگریزی آتی ہے، مگر مَیں اپنے وطن میں اپنے ہی ہم وطن سے کسی اجنبی زبان میں بات کرنا پسند نہیں کرتا!'' (16)

اتنی طویل تحریر کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ میں ایک غیر زبان اجنبی ہی سہی پھر بھی مجھے اردو زبان پر فخر ہے۔ کیونکہ یہ زبان اِتنی خود کفیل، اتنی پُرکشش اور زندہ دل ہے کہ اُس کے ساتھ ہونے والی تمام مخالفت اور اُس کے ساتھ برتی جانے والی لاپروائی کے باوجود زندہ ہے اور زندہ رہنے کا عزم رکھتی ہے۔ اس لیے اس زبان کے پروانے دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں جس کا اظہار عزیز قریشی (ورجینیا، امریکہ) کے ان تین اشعار میں بخوبی کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اتنی ہر جائی ہے پوچھو نہ کہاں ہے اردو
اس کے پروانے جہاں بھی ہیں وہاں ہے اردو
یہ زباں وہ ہے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی
سچ تو یہ ہے کہ بڑی خون نگراں ہے اردو
اک بولی ہے کہ صدیوں سے چلی آئی ہے
اتنی دلکش ہے کہ اب تک بھی جواں ہے اردو

○

حوالے وحواشی

1. راجندر ناتھ شیدا، وثائقِ فورٹ ولیم کالج: یعنی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے متعلق دستاویزیں اور مستندات، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی 2003، ص 11۔
2. ممتاز منگلوری 'فورٹ ولیم کاج کے مصنفین' تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند پنجاب یونیورسٹی لاہور، 1971، ص 67
3. ایضاً، ص 65
4. حسن وقار گل، اردو کی بین الاقوامی حیثیت، اخبار اردو (مقتدرہ قومی زبان)، اسلام آباد، خصوصی اشاعت: بیرونی ممالک میں اردو، جلد 7، شمارہ 10-11، اکتوبر۔نومبر 1990، ص 7۔6
5. آغا افتخار حسین، چیکوسلواکیہ میں اردو، اخبار اردو (مقتدرہ قومی زبان)، اسلام آباد، خصوصی اشاعت: بیرونی ممالک میں اردو، جلد 7، شمارہ 10-11، اکتوبر۔نومبر 1990، ص 95۔
6. تبسم کاشمیری، جاپان میں اردو، اخبار اردو (مقتدرہ قومی زبان)، اسلام آباد، خصوصی اشاعت: بیرونی ممالک میں اردو، جلد 7، شمارہ 10-11، اکتوبر۔نومبر 1990، ص 32۔

7. خیری برادران اور دارالفنون (حالیہ استنبول) یونیورسٹی میں اردو تعلیم کے آغاز سے متعلق میرا مضمون زیرِ تحریر ہے۔

8. انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد 1999، ص335

9. مسکین علی حجازی، ''صحافت''، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، لاہور 1972، ص552۔

10. ایضاً، ص532۔

11. Duman, Hasan, Istanbul Kutuphanelerinde Arap Harfli Sureli Yayinlar Katalogu, 1828-1928, Istanbul 1406/1986.

12. محمد اسلم الوری، برطانیہ میں اردو پریس: ماضی، حال اور مستقبل، اخبار اردو (مقتدرہ قومی زبان)، اسلام آباد، خصوصی اشاعت: بیرونی ممالک میں اردو، جلد 7، شمارہ 10-11، اکتوبر۔نومبر 1990، ص84۔

13. ایضاً، ص84۔

14. محمود بریلوی، مختصر تاریخ ادب اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور 1985، ص318-325۔

15. دیکھیے دنیا پاکستان کا تبصرہ ''ملکہ وکٹوریہ اور عبدل''،

http://dunyapakistan.com/?p=3578۔

16. ان تجویزات کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون ''اردو زبان: مستقبل سے متعلق مسائل اور اُن کے حل کی تلاش''۔

ایک غیر ملکی کی نظر میں ہندوستان میں اردو زبان کو درپیش چیلنج

ڈاکٹر احمد القاضی

کلیہ اللغات والترجمہ ازہر یونیورسٹی، قاہرہ، مصر

ہندوستان میں صرف متعدد ادیان اور مذاہب ہی نہیں بلکہ وہاں کی زبانیں بھی مختلف ہیں ہندوستان میں اگرچہ انگریزی زبان انتظامیہ، قانون اور اعلیٰ تعلیم کی ایک اہم زبان ہے تاہم وہاں دیگر اٹھارہ سے زائد بنیادی زبانیں ایسی ہیں جو تسلیم شدہ ہیں انھیں زبانوں میں ہندی اور اردو زبانیں بھی ہیں، اور درحقیقت یہ ایک ہی زبان ہیں صرف ان کی کتابت یا خط میں فرق ہے چنانچہ اردو زبان فارسی خط میں لکھی جاتی ہے جبکہ ہندی زبان دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہے صرف یہی دو زبانیں ایسی ہیں جو ہندوستان کے مختلف خطوں میں پھیلی ہوئی ہیں یعنی یہ کہ وہاں کی دیگر علاقائی زبانوں کی طرح ان کا دائرہ کسی خاص جگہ یا کسی خاص قوم تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ہندوستانی انھیں گلے لگاتے ہیں۔ خصوصاً ہندوستان کے شمالی علاقوں میں تو انھیں بے حد مقبولیت حاصل ہے۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ بیسویں صدی کے دوسرے وسط میں اور متعینہ طور پر 1947 برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں اردو زبان کمزور ہوگئی اور اسے مختلف قسم کے خطرات کا سامنا ہونے لگا اور ملک میں اس کے ساتھ بہت زیادہ بے اعتنائی برتی گئی حالانکہ یہ ضروری تھا کہ اس سے دلچسپی لی جاتی۔ کیونکہ یہ دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ اردو کے بولنے اور سمجھنے والے ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی ہیں لیکن پاکستان کی سرکاری زبان اردو قرار دیے جانے پر یہاں آبادی کی اکثریت یہ سمجھنے لگی کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے گزرتے وقت کے ساتھ مسلمان بھی اس زبان سے بے اعتنائی برتنے لگے، اردو زبان کی بدقسمتی تو یہ ہے کہ بعض اردو دان اردو زبان بولنے والوں کی تعداد بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بولی جانے والی زبان کے اعتبار سے چینی زبان کے بعد اردو زبان دوسرے نمبر پر ہے، یہی نہیں بلکہ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ عنقریب ہی اردو زبان اقوام متحدہ میں استعمال ہونے لگے گی، یہ اور دیگر ایسی باتیں کرتے ہیں جن کی نہ تو کوئی دلیل ہے اور نہ ہی یہ باتیں قابل قبول ہیں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، چنانچہ اردو زبان کو ایسے شدید حملے کا سامنا ہے جس میں مسلمان خود حصہ لے رہے ہیں، چنانچہ مسلمان اس بات پر مصر ہیں کہ اردو زبان انہی کی زبان ہے اور ان ہی کی ترجمان ہے، اور کسی دوسرے کو اس کے قریب آنے کا حق حاصل نہیں ہے، اور یوں وہ غیر مسلم کو یہ موقع دے رہے ہیں کہ وہ اس زبان کو ختم کر دیں، حالانکہ یہ مشترکہ قومیت کی نمائندہ ہے۔

اردو انشا پردازوں کی جانب سے ان علاقائی الفاظ کو ترک کر دینے سے بھی اردو زبان کو نقصان پہنچا جو بنیادی طور پر اردو زبان کی لغت کا حصہ تھے، اور اس طرح اردو زبان برصغیر ہندوستان کی دیگر زبانوں کے قافلے سے پیچھے رہ گئی حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ اردو زبان کا خمیر، عربی اور فارسی ترکی وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ علاقائی بولیوں اور زبانوں کے استعمال سے تیار ہوا ہے جو اس زمانے میں بہت زیادہ رائج تھے، ہر زبان نے اپنی قوت اور اپنے جاننے والوں کی قوت کے اعتبار سے اس زبان پر اپنا اثر ڈالا، ان تمام وجوہات کے پیش نظر اردو زبان برصغیر ہندوستان میں بہت زیادہ عام ہوگئی، اور انگریز اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنے

لگے، اس لیے نہیں کہ انھیں اس زبان سے محبت تھی بلکہ اس لیے کہ اسی زبان کے ذریعے وہ اپنے افکار وخیالات عام کر کے برصغیر ہندوستان پر کنٹرول کر سکتے تھے، کیونکہ یہ زبان مختلف فرقوں اور طبقوں کے مابین ربط اور جوڑ پیدا کرنے کا کام کر رہی تھی، اور یہی اس کا حقیقی کردار تھا۔

ہندوستان کی تقسیم اور پھر پاکستان اور بنگلہ دیش اور پاکستان کی آپسی تقسیم اردو زبان کے لیے بدشگونی ثابت ہوئی، وہ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان ایک ساتھ مل جل کر رہیں اور سیکولر روایات کو فروغ ہو ان کی اور کچھ اردو سے تعصب برتنے والے حکمرانوں کی طرف سے اسے ختم کرنے اور اس کی شکل بگاڑنے کی کوشش کی گئی، اور اب تک کی جا رہی ہے، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ ہندو پاک کی تقسیم لغوی یا نسلی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ مذہبی بنیاد پر ہوئی تھی، اس لیے یہ فطری بات ہے کہ مسلمانوں سے تعلق رکھنے والی ہر چیز جڑ سے اکھاڑ پھینکی جائے، حالانکہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد پاکستانی مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے، حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ خود پاکستان نے اب تک اردو زبان کو پوری طرح سرکاری زبان نہیں بنایا ہے، اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ پاکستانی، اردو زبان کو باہر سے آنے والی زبان سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ زبان تقسیم کے وقت ہندوستان سے پاکستان آنے والے مہاجرین کی زبان تھی، اور یوں اردو زبان ان کے نزدیک محض ایک وسیلہ کی زبان ہے، جسے وہاں کے سیاست دان اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بوقت ضرورت استعمال کرتے ہیں۔

اس سے اس بات کی یقین دہانی ہوتی ہے کہ معاشرتی یکجہتی اور اتفاق واتحاد میں مذہب کی اہمیت کے باوجود مذہب شہری اور سیاسی زندگی کے تمام حالات میں بہت زیادہ مؤثر نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اردو زبان اور بنگالی زبان کے مابین پائے جانے والی لغوی کشمکش کی وجہ سے بنگلہ دیش پاکستان سے الگ نہ ہوتا، یہیں سے اردو زبان کی دلچسپی لینے کی رغبت دلانے میں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کا کردار سامنے آتا ہے، چنانچہ اب ضروری ہے اردو زبان کا دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ ایک نیا رشتہ قائم ہو اور وہ ان زبانوں کے ساتھ ایک دوست یا سہیلی کے طور پر نظر آئے، کیونکہ مختلف جماعتوں کے مابین ربط وتعلق پیدا کرنے والی زبان کی حیثیت سے اردو زبان کی بقا کی یہ واحد ضمانت ہے، اور اردو زبان اس کردار کو ادا

کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے، کیونکہ اس کے اندر ایسی صلاحیت ہے جس کا کسی دوسری زبان کے اندر پایا جانا بہت مشکل ہے، اگر ایسا ہوا تو پھر کوئی زبان بھی اردو زبان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی خواہ اسے حکومت کی مدد ہی حاصل کیوں نہ ہو، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حکومت کی مدد کے باوجود سنسکرت زبان ہندوستان میں ترقی نہ کر سکی، اور 2001 کی اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت بولنے والوں کی تعداد آدھ فی صد سے زیادہ نہیں ہے، اسی طرح یونیورسٹیوں کے اندر ہندی زبان کی تعلیم میں اس بات کی کوشش جاری ہے کہ اس میں دخیل عربی اور فارسی الفاظ کے متبادل پیش کیے جائیں، حالانکہ کسی بھی زبان کی مقبولیت کی حقیقی ضمانت عام لوگ ہی ہوتے ہیں، چنانچہ اب بھی عام لوگ آسان اردو غزلوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، حالانکہ ان غزلوں کو عام کرنے کے لیے ان کا ہندی نام رکھا جاتا ہے، اور یہ چیز صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں بلکہ خود پاکستانی ڈیلر یورپ اور عرب ملکوں میں موجود ہندوستانی اور پاکستانی تارکین وطن میں اپنے سامان کو رائج کرنے کے لیے ریکارڈنگ کیسٹوں کے ہندی نام رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی تعداد اچھی خاصی ہے، اس کے علاوہ پوری دنیا میں ہندوستانی فلموں اور گانوں کے چاہنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

اردو زبان کو جن چیلنجز کا سامنا ہے ان میں مغربی تعلیم یافتہ طبقوں اور روایتی مذہبی جماعتوں کے مابین پائی جانے والی زبردست خلیج بھی ہے، چنانچہ پہلا گروہ زبردست لغوی دوڑ کے سامنے شکست خوردہ ہو چکا ہے، اور اس نے سائنس کے شعبے میں انگریزی زبان کے علاوہ دیگر تمام زبانوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے، اس لیے کہ اس کے نزدیک اردو کو الگ کر دینے بلکہ اسے ختم کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے بلا شبہ اردو زبان میں تنزلی آئی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان کی تعلیم کا دائرہ مدرسوں میں پڑھنے والے غریب طلبہ تک ہی محدود ہو گیا ہے، اور ان ہی لوگوں میں سے معاصر ادب کے اردو شعرا اور انشا پرداز سامنے آ رہے ہیں، چنانچہ ان کی تحریروں پر ایسی مذہبی چھاپ غالب ہے جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے جا رہے ہیں، اور اردو زبان گویا کہ ان ہی کے ہاتھوں میں منجمد ہو گئی ہے، ان لوگوں کا خیال ہے کہ انشا پرداز خود عربی دانوں اور فارسی دانوں

کی سمجھ میں نہ آنے والے قدیم عربی اور فارسی الفاظ اور تراکیب جس قدر زیادہ استعمال کرے گا اسی قدر اس کی اسلامی ثقافت کی گہرائی کا پتہ چلے گا، حالانکہ انھیں یہ معلوم نہیں کہ یہ بات اردو زبان کی طبیعت اور مزاج کے خلاف ہے، اور عربی الفاظ ایسی مقدس نصوص نہیں ہیں جن سے اردو زبان کا مربوط ہونا ضروری ہے، اور اس وقت عالم کاری کا جو مفہوم ہے وہی مفہوم اپنے لفظی سرمایے حاصل کرنے اور جمع کرنے میں اردو زبان کا بھی ہے، یہی وجہ جنھیں ہے کہ ہر زمانے میں اس زبان میں تبدیلی آئی ہے، اور قرض لینے کا عمل ایسا عمل ہے جسے زبانیں اپنی نشو ونما کے وقت سے ہی اختیار کرتی ہیں، اور اردو زبان رد وقبول کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے، کیونکہ یہ برصغیر ہندوستان کی دیگر زبانوں سے نمایاں اور ممتاز ہے، چنانچہ اس کے حروف تمام زندہ زبانوں کی آوازوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، اور یوں یہ زبان، دیگر زبانوں کے مابین توازن اور بچی تلی نرمی سے نمایاں اور ممتاز ہوگئی ہے۔ اردو زبان کو جن اہم چیلنجز کا سامنا ہے ان میں سے بیشتر آپ کے علم میں یہاں چند باتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

☆ مرکزی اور علاقائی حکومت کی جانب سے کم از کم مسلم بچوں کو ہی سہی ابتدائی تعلیم کے مرحلے میں اردو زبان سکھانے کا موقع فراہم کرنے سے گریز کرنا، اور اگر اس کا موقع فراہم ہو بھی جائے تو یہ زبان نوکری حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنے گی، اور یوں طالب علم کے لیے ہندی زبان اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا۔

☆ ہر قسم کے ذرائع ابلاغ میں اردو زبان سے بے اعتنائی، اور عالم کاری کی روشنی میں تو ان ذرائع ابلاغ کا شمار شدید ترین نظریاتی ہتھیاروں میں ہونے لگا ہے، خصوصاً ایسے وقت میں جب سیاسی طاقتوں اور مال دار طبقے نے میڈیا پر اپنا شکنجہ کس لیا ہے، اور ان میڈیائی پیغامات کی قوت توپوں کی قوت سے کم نہیں ہے، اس لیے تعلیم، لغت اور تخلیق جیسے تمام شعبوں میں اردو زبان کی اصلاح کے لیے کام کرنا اور اس کی ترقی کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری ہے، اسی طرح بذریعہ کمپیوٹر بھی اس کی اصلاح ضروری ہے، تاکہ بیرون ہندوستان، ہندستانی تارکین وطن کے لیے اپنے بچوں کو اردو زبان نہ سکھانے کا کوئی بہانہ باقی نہ رہے۔

☆ اردو کے تخلیق کاروں کی جانب سے اردو کو آسان نہ بنانے اور اسے ذرائع ابلاغ اور فلموں اور ڈراموں جیسے دیگر ثقافتی وسائل سے معلومات حاصل کرنے والوں کی زبان سے قریب نہ کرنا، چنانچہ یہ بات کسی سے بھی مخفی نہیں کہ اکثر سینمائی اور ڈرامائی کام نے اس زبان کو قریب کیا ہے، جس کے اندر مختلف قسم کے لہجے پائے جاتے ہیں، اور جو ہندوستان کی حقیقی زندگی کی عکاسی کرتی ہے، چنانچہ اگر ایسا ہوا اور یہ تمام لوگ اردو زبان کے ان تمام مفردات اور الفاظ سے قریب ہوئے تو پھر یہ زبان ایسے ملک میں اجنبی زبان بننے سے محفوظ رہے گی، جہاں اس کی نشوونما ہوئی اور جہاں یہ پلی بڑھی۔

☆ زندگی کے بہت سے شعبوں میں اردو زبان کا اصلی خط استعمال نہ کرنا، ان میں اہم تجارتی اور صنعتی گھرانوں کا شعبہ بھی شامل ہے، چنانچہ اکثر تجارتی کمپنیاں اپنی تجارتی مصنوعات کی تشہیر کے لیے انگریزی کے ساتھ دیوناگری خط استعمال کرتی ہیں، اور نشر واشاعت میں یہی خط پایا جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس سے اردو زبان کی ایک اہم شناخت یعنی اس کے اپنے رسم الخط کے وجود پر ایک سوالیہ نشان لگ سکتا ہے۔

☆ اردو زبان کی اس حالت میں دیگر علاقائی زبانوں کی موجودگی بھی اس کے لیے خطرہ ہے، اس لیے کہ یہ واحد زبان ہے جس کا تعلق کسی متعین خطے سے نہیں، اور یوں ان علاقائی زبانوں کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوتا ہے، اور بالآخر علاقائی زبان کو غلبہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اسے مختلف ادیان اور مذاھب کو ماننے والی تمام جماعتیں سمجھتی ہیں۔

☆ اردو زبان کے بڑے بڑے ادباء اور مؤلفین مارکیٹ میں پیسے اور شہرت کے لیے اپنی کتابیں دیوناگری خط میں بھی شائع کرا رہے ہیں، اور اردو ادب سے جو ادبی کام منتخب کیے جاتے ہیں، وہ سب بھی دیوناگری خط میں ہی پیش کئے جاتے ہیں۔

☆ بلا استثنا پورے پاکستان اور ہندوستان میں سائنس کی تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی ہے، اور یوں ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان بھی سائنسی شعبوں میں کی جانے والی تصنیف وتالیف میں حصہ لینے سے محروم رہتی ہے اور تخلیقی عمل میں شرکت نہیں کرسکتی۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اردو دان حضرات کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں اور پھر ان کے ساتھ مناسب معاملہ کریں، اور اطلاعاتی تعلیم وتربیت کے مطابق اس زبان کو ترقی دیں، اس طرح اردو زبان سے محبت رکھنے والے ہر شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں آنے والی نئی تبدیلیوں کے مطابق اس زبان میں بھی تبدیلی لائے، میں ہندوستان میں اپنی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ارباب حل وعقد اور ذمہ داران سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ان تمام چیزوں کا خیال رکھیں، اور اس کا دائرہ صرف شعار بلند کرنے اور قرار دادیں پاس کرنے تک محدود نہ ہو، بلکہ یہ اس کام کے عام احساس کا نتیجہ ہو، اس وقت میں متعین تجاویز اور حل پیش نہیں کر رہا ہوں کیونکہ اس کے لیے اس شعبے سے تعلق رکھنے والے تمام ماہرین سے مکالمہ کرنا، اور ان کی آرا سے استفادہ کرنا بھی ضروری ہے، میں اس وقت آپ حضرات کے سامنے صرف چند مسائل پیش کر رہا ہوں، اور پھر اس کے حل کی ضرورت پر زور دے رہا ہوں، چنانچہ اگر ہم اس زبان کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور اسے باقی رکھنا چاہتے ہیں تو فوری طور پر ان مسائل کا حل تلاش کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔

محض گفتگو کرنے اپنے اپنے گھر کی راہ لینے سے مسائل حل نہیں ہوتے اس کے لیے ٹھوس عملی اقدام کی ضرورت پیش آتی ہے میں یہاں طالب علم بھی رہا ہوں اور وقتاً فوقتاً کانفرنس وغیرہ میں بھی شریک ہوتا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ تجاویز تو بہت سامنے آتی ہیں لیکن عملی جامہ پہنانے میں ایک قدم آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں آپ کیسے کہیں گے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

○

اُردو زبان کا فروغ: ماضی، حال اور مستقبل

ڈاکٹر محمد آصف اعوان

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

آج اُردو کو دنیا کی تیسری بڑی زبان کا درجہ دیا جارہا ہے۔ اس زبان کی تاریخ اپنے سیاق، صورت واقعہ اور سیاقی تناظر کے حوالے سے خاص دل چسپی کی حامل اور قابل مطالعہ ہے۔ اس زبان کو صحیح معنوں میں کبھی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں رہی مگر مختلف اقوام کے باہمی ادغام، سماجی تعاملات اور نظریہ ضرورت کے تحت یہ زبان اس قدر تیزی سے نشو وارتقا کے مراحل سے گزری کہ مقتدر اور سرکاری زبانوں کی جگہ لینے کے لیے اپنا استحقاق جتلانے لگی تاہم عالم گیریت کے لسانی جبر اور دیگر عوامل کی وجہ سے اسے یہ حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔

آج اُردو زبان کو عالم گیریت کے تحت فروغ پانے والے یک زبانی کلچر سے شدید مشکلات کا سامنا ہے اور اس کے مستقبل پر ماہرین لسانیات کئی شدید نوعیت کے سوالات اُٹھا رہے ہیں۔ اس مضمون میں انھیں اُمور پر بحث کی گئی ہے۔

کوئی بھی زبان ایک نامیاتی وجود کی طرح پھلتی پھولتی اور شباب وشیب کے مراحل سے

گزرتی ہوئی لسانی تاریخ میں اپنا وجود منواتی ہے۔ اُردو کے حوالے سے بات کی جائے تو ہندو مسلم تہذیب کی کوکھ سے جنم لینے والی سرزمین پاک وہند کی یہ نوخیز زبان باہمی امن وآشتی، اتحاد ویگانگت اور خیر سگالی کی فضاؤں میں جنم لیتی، پھلتی پھولتی اور نشوونما ارتقا کے مراحل طے کرتی ہوئی آج دنیا کی تیسری بڑی زبان کے طور پر عالمی لسانیاتی قبائل کی اگلی صفوں میں اپنی جگہ بنا چکی ہے۔

اس زبان کی تشکیل اور ترویج وترقی کے تمام مراحل کسی بھی قسم کی سیاسی مصلحت سے پاک رہ کر صرف اور صرف مقامی اور نووارد افراد کے باہمی تعاملات سے سرانجام پائے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس زبان کو صحیح معنوں میں کبھی بھی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں رہی جو قوم بھی یہاں وارد ہوئی اس نے اپنا ہی لسانی سکہ چلانے کی کوششیں روا رکھیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہاں کے قدیم باسیوں یعنی کول، بھیل اور دراوڑ وغیرہ کی زبانیں لسانی انتداب کی ایسی ہی پالیسیوں کے باعث آج محض تاریخ کا حافظہ بن چکی ہیں۔

مسلمان فاتحین جب اس خطے میں آئے تو انھوں نے بھی عمومی بالا دست رویے اور حاکمانہ حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی مادری زبان یعنی فارسی کو سرکاری سنگھاسن پر جگہ دی اور یوں ہندوستان کے طول وعرض میں اس کی نشر واشاعت ہوتی چلی گئی۔ واضح رہے کہ حاکمانہ ذہنیت کا یہ لسانی روّیہ صرف مسلمانوں سے مخصوص نہیں بلکہ یہ طرز عمل قوموں کی مناقشاتی تاریخ کی ایک پختہ روایت ہے۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''جب ایک قوم کسی دوسری قوم پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مفتوح قوم کی زبان کو مٹا دے اور اس کے لیے وہ طرح طرح کی تدبیریں کرتی ہے کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ اگر زبان زندہ ہے تو قوم بھی زندہ ہے اور اگر زبان مرگئی تو قوم بھی مردہ ہو جائے گی۔'' (1)

ہندوستان میں مقتدر طبقے کی زبان کو ہمیشہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ درباری زبان ہی کو سرکاری زبان کا مقام ومرتبہ ملا۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اُردو زبان کی طرف توجہ نہ دی اور اُن کی درباری، سرکاری اور دفتری زبان ہمیشہ فارسی ہی رہی۔

کچھ عرصہ کے لیے جب مغل سلطنت میں اضمحلال آیا تو دکنی ریاستوں میں اُردو کو

سرکاری سرپرستی ضرور ملی مگر اس کے پس منظری محرکات میں بھی خالص اُردو دوستی کے بجائے مرکز کی مقتدر زبان یعنی فارسی سے سیاسی نوعیت کے مسابقانہ عناد ہی کارفرما تھے۔ اس دور میں اُردو زبان نے بڑی سرعت سے علمی، سائنسی اور تکنیکی حوالے سے بلوغت کے مراحل طے کیے اور اسی عہد میں ترسیل معنی ومطالب کی ہمہ جہت ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا حیران کن عملی مظاہرہ بھی ہوا۔ پھر نیرنگئ زمانہ سے حالات نے کروٹ بدلی اور عنان حکومت ایک بدیسی قوم کے ہاتھ لگی۔ ایک دفعہ پھر وہی لسانی حکمت عملی رو بہ عمل آئی اور اب کی بار فارسی کی گردن مار کر انگریزی زبان کو سرکاری دربار میں اثر ورسوخ ملا اور یوں اُردو بارِ دگر اپنے جمہوری استحقاق یعنی مقتدرانہ حقوق سے بے نصیب رہی۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ زبان تقدیر کی دھنی بھی ہے کہ اس کا اکھوا جمہوری تعاملات اور عوامی ضروریات کی شاخ صدرس سے پھوٹا تھا اور اس کی نشوونما میں کسی حاکم کی تیز دست پیوندکاری کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ نیز لطف یہ ہے کہ ماہرین لسانیات کے مطابق کسی زبان کی حقیقی تشکیل کا فطری منہاج بھی یہی ہے۔

آج ہم جس عالم گیریت کے عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس عالم گیر ساختیے کے کلیدی کارفرما عوامل میں لسانی عنصر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ موجودہ عالمی انصرام میں فلسفہ صارفیت کی مثال جسم اور روح کے معادل ہے۔ شاطرانِ عہد حاضر صارفیت کی بساط پر مختلف زبانوں کو مہروں کی طرح اُکھاڑ پچھاڑ رہے ہیں۔ ایک عالم گیر لسانی حکمت عملی (Linguistic Diplomacy) کے زاویہ فکر سے زبانوں کو کموڈٹی قرار دیا جارہا ہے۔ آج اگر مختلف علاقائی زبانوں میں ٹی وی چینل یا کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور موبائل پر سافٹ ویئر تیار کر دیے گئے ہیں تو اس کا جذبہ محرکہ لسانی احیاء نہیں بلکہ ان زبانوں کے بولنے والوں کو صارفیت کی لت (Shopping Addiction) میں پختہ تر کرنا ہے۔ اگرچہ زر پرستی کی ایسی سرگرمیوں سے بھی فروغ زبان کا پہلو نکلتا ہے تاہم ایسے میں در آنے والی لسانی آلودگی زیادہ مضرت رساں ہے، عالم گیریت کے تناظر میں یہ نکتہ بھی محل نظر رہے کہ قبل ازیں مثال کے طور پر مسلم فاتحین کے دور میں عربی زبان کا دوسری زبانوں میں ادغام وانجذاب ہوا اور وہ بھی اس قدر کہ Europe speaks Erabic جیسی کتب منظر عام پر آنے لگیں مگر امر واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام

تر لسانی ادغام باہمی سماجی تعاملات کے سادہ اُصول اور تاریخ روایات کے مطابق تھا۔ جب کہ فی زمانہ یک لسانی کلچر (Uni Lingual Culture) کی پالیسی کے تحت عالمی مقتدر زبان کا دوسری زبانوں میں ادغام انتدابی، صارفی اور سیاسی نوعیت کا ہے اور پھر خود انگریزی زبان جسے عالمی لنگوافرینکا کی حیثیت دی گئی ہے، ایک کموڈٹی بن کر رہ گئی ہے۔ آج اسے کلچرل ادبیت کے بجائے لنگوافرینکا کے طور پر اہمیت مل رہی ہے لہٰذا وقت کے ساتھ ساتھ اس کی محض فنکشنل ساخت سے سروکار رکھا جارہا ہے۔ خیر یہ تو ہونا ہی تھا جیسا کہ مرزا غالب نے فلسفہ صارفیت کے ضمن میں اشارہ کیا ہے:

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر (2)

اُردو زبان میں انگریزی کے جارحانہ ادغام کے حوالے سے دیکھیں تو Tove Skutnabb kays کے الفاظ کی رعایت سے انگریزی واقعی قاتل زبان ہے۔ آج یونیسکو کے ''اٹلس آف دا ورلڈ لینگوجز اِن ڈینجر آف ڈس اپیرنگ'' کے مطابق دنیا کی چھ ہزار زبانوں میں سے عالم گیریت کی وجہ سے پانچ ہزار زبانیں ناپید ہونے کو ہیں۔ فی زمانہ اقوام متحدہ کی چھ سرکاری زبانوں (انگریزی، فرانسیسی، جرمن، عربی اور ہسپانوی) ہیں مگر فی الواقعہ 97٪ امور میں انگریزی کا راج ہے۔

گلوبلائزیشن کے اُردو زبان پر بھی نہایت گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اپنے بولنے والوں کی کثیر تعداد کے پیش نظر اسے معدومیت کا کوئی خطرہ نہیں تاہم یہ تعداد اس کو مقتدر یا موثر حیثیت دلانے میں چنداں کارگر ثابت نہیں ہو رہی۔ گویا زبان کی طاقت کا انحصار بولنے والوں کی تعداد پر نہیں ان کی قوت تفوق پر ہے۔ اسی اُصول پر انگریزی چینی پر بالادستی رکھتی ہے اور ہمارے ملک میں انگریزی کی مقتدر حیثیت کی مثال اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

عالم گیریت کا دوسرا اثر اُردو کی فنکشنل صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ یہ محض نظریہ ضرورت کی ساخت ہے جو جمالیاتی اظہاری اقدار کے بجائے عملی کارفرمائی کے لیے معرض وجود میں لائی جارہی ہے۔ ٹی وی دیکھا تو پٹی چل رہی تھی:

Quadri Staged Thirna

ایک میزبان کہہ رہا تھا کہ پورے ایریے میں محلہ وائز کمیٹیاں اسٹیبلیش کردی گئی ہیں۔ کہیں ''منی جرگے'' لائیو دکھائے جارہے ہیں۔ FM ریڈیو تو اس سے بھی دو قدم آگے ہے۔ جدید تہذیبی اور ثقافتی ترقی کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ کی آمد مستحسن ہے مگر ایسی بے جوڑ ترکیبیں، غیر ضروری لفظیات اور مضحکہ خیز نحوی ساختیں لسانی غارت گری نہیں تو اور کیا ہے؟

جہاں تک اُردو کے مستقبل کا تعلق ہے تو اس کے لیے علم نجوم یا تخمین وظن کی ضرورت نہیں بلکہ سائنسی بصیرتوں سے اشارے بالکل واضح ہیں۔ آج اُردو کو عالم گیریت سے اس قدر خطرہ نہیں جتنا اہل زبان کی بے بضاعتی سے ہے۔ لسانی ماہرین کا کہنا ہے کہ انگریزی اکیسویں صدی کی زبان نہیں رہے گی۔ اس لنگوافرینکا کی حیثیت محض صارفیت کی ساختہ اور وسیلہ روزگار کی پرداختہ ہے اور جیسے ہی صارفین کی قوت صرف اور اس کی قوت تسکین میں توازن آیا یہ عفریت اپنی موت آپ مرجائے گا۔ تاہم ہمیں اس ساختہ استحصالی نظام کے اضمحلالی روپ کا انتظار کرنے کے بجائے اس کے مثبت پہلوؤں کو کام میں لاکر استحکام فرد وملت کی سبیل کرنی چاہیے۔ ہمیں ایک عالمی گاہک تصور کیا جارہا ہے تاہم ایسے میں ذرا سی بصیرت سے کام لیں تو عالمی شہریت کے افادی دریچے ہماری دیرینہ قنوطی حسیات کو ختم کرکے حیات نو کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

ایسی گرد آلود فضا میں علامہ اقبال کے یہ بصیرت افروز اشعار کس قدر برمحل ہیں:

مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اُٹھے
نظر میں جب تلک پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

اکیسویں صدی اُردو کے لیے روشن امکانات کی صدی ہے۔ اس صدی کی شروعات انجمن فروغ زبان اُردو، انجمن کے متعارفہ اُردو اطلاعیات کے معیاروں کی تشکیل، نوری نستعلیق

کی تیاری اور نادرا ایسے ادارے کی تشکیل سے ہوئی ہے۔ یقیناً ان عوامل کے ثمرات نہایت حوصلہ افزا ہوں گے۔ تاہم اس ضمن کی چند اہم مقتضیات یہ ہیں کہ:

1۔ ہمیں عالم گیریت کے لسانی چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے صوتوں اور مصوتوں کی بنا پر نئے حروف تہجی بھی متعارف کروانے چاہیے۔

2۔ نئے الفاظ کے ادغام کے سلسلے میں ہمارا طرز عمل مدافعتی یا مزاحمتی کے بجائے مفاہمتی ہونا چاہیے اور نو وارد الفاظ کے ہجے، املا اور طوالت جیسے اُمور تکنیکی منصوبہ بندی سے سرانجام دینے چاہئیں۔

3۔ ہر مضمون کے متعلقہ ماہرین اُردو اصطلاحات سازی کی ساخت پرداخت کریں اور ان کی ترویج و اشاعت حکومتی سرپرستی میں جاری رکھیں۔

4۔ نئے لفظوں کی شمولیت کو محض اردش کہہ کر طاقت ور زبانوں کی لسانی یلغاروں کو روکا نہیں جا سکتا۔ تاریخ کا سبق ہے کہ کبھی فارسی نے بھی اُردو پر ایسی ہی یلغار کی تھی نتیجتاً امیر خسرو کی زبان کا فارسی آمیز اسلوب سامنے آیا تھا۔ آج بھی اس بیرونی یلغار کو اُردو کی نامیاتی افزائش میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کے لیے ضابطہ بندی اور منظم دستور العمل وضع کرنے اور روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے۔

5۔ فروغ اُردو کا اہم ترین قدم اس کا سرکاری زبان کے طور پر رائج ہونا ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ محض ادارے بنانے سے اس زبان کے فروغ کا حقیقی اقتضا پورا ہو جائے گا تو

ع ایں خیال است و محال است و جنوں

○

حوالہ جات و حواشی

1۔ معین الرحمن، سید، ڈاکٹر (مرتب)، ''فرمودات عبدالحق''، نذر سنز، لاہور، 1978، ص 42

2۔ کالی داس گپتا رضا (مرتب)، ''دیوان غالب کامل''، انجمن ترقی اُردو، کراچی، طبع سوم، 97-1996، ص 277

اردو زبان - حال اور مستقبل

علیم صبا نویدی، چنئی

کسی زبان کے حال اور مستقبل پر بحث کرتے ہوئے ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ یہ زبان ماضی میں کب اور کن طریقوں سے مروج ہوئی بلکہ یہی معلوم کرنا ہے کہ کن وجوہ کی بنا پر یہ زبان وجود پذیر ہوئی اگر وہ وجوہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہوں تو پھر اس زبان کی بقا کے بارے میں ہمیں کسی طرح کا شک کرنے کی ضرورت نہیں۔

آج سے سو سال پہلے جب ہندوستان کو ملکی اتحاد حاصل ہوا تو اس کے ساتھ ہی ایک مشترکہ زبان کی ضرورت محسوس ہوئی اس وقت بھی ہمارے ملک میں بہت سی زبانیں تھیں مگر کوئی زبان آگے بڑھ کر اس بوجھ کو سنبھال نہ سکی۔ اس وقت قدیم ریختہ اور موجودہ اردو زبان نے قدم آگے بڑھائے اور بڑی خوش اسلوبی سے اس فریضہ کو ادا کیا۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ اردو زبان میں داخلی طور پر وہ جاذبیت ہے اور اس میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو ایک مشترکہ زبان کے لیے ضروری ہیں کوئی زبان محض مصنوعی ہنگاموں کی بنا پر مقبول عام نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ اس میں داخلی طور پر کچھ سکت نہ پائی جائے۔

بقول داغ دہلوی:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ نے اس شعر میں اردو زبان کی مقبولیت اور شہرت کے اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے مگر اس کے ظاہری خدوخال سے اپنی واقفیت کا برملا اظہار نہیں کیا ہے یہی تجسس اردو زبان کی رسم الخط کی انفرادیت، اس کے دامن میں مختلف زبانوں کے الفاظ کی رنگا رنگ موجودگی اور ان الفاظ کو شرفِ قبولیت بخشنے کی فطری لچک سے کئی صدیوں پر محیط تاریخی تناظر کو روشن کرتا ہے۔ 'لفظ اردو' فارسی میں ترکی کی زبان سے آیا ہے۔ اہل فارسی اور عرب تجارت کی غرض سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان دونوں کو زبان (فارسی اور عربی) کے اشتراک اور میل جول کے ساتھ ساتھ مقامی بولی کے گھل مل جانے سے اپنے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے ایک نئی صورت السان ''اردو'' بتدریج ارتقائی سفر طے کرنی لگی۔

بعض محققین کا کہنا یہ ہے کہ اردو کو عربی اور فارسی کی ایک صورت تصور کرنا بھی صحیح نہیں ہے اور اس کا اندازہ اردو کے الفاظ سے ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں وحیدالدین سلیم پانی پتی اور سید احمد دہلوی فرہنگ آصفیہ لغات نویس کا یہ بیان ہے کہ ہندی زبان کے ساتھ ساتھ پنجابی اور پوربی زبانوں کے خاص الفاظ اردو میں شامل ہیں یعنی ہندی کے ساتھ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی اور دیگر زبانیں آپس میں مل کر اردو ایک مستقل زبان بن گئی ہے۔

اردو زبان چونکہ اس ملک میں پیدا ہوئی اور اس زبان کی ترقی اور ترویج میں نہ صرف ہندو، مسلمان اور عیسائی کا ہاتھ رہا ہے بلکہ ہندوستان میں شمال ومغرب سے آنے والوں کے ساتھ ساتھ محمود غزنوی اور محمود غوری کے زمانے میں ہند میں جو حملے ہوئے ان کے فاتحین بھی اس زبان کی ابتدا کا باعث بنے۔

رام بابو سکسینہ نے بھی ''تاریخ ادب اردو'' میں یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ ہندوؤں میں بھی اردو زبان کے بڑے شاعر اور نثر نگار موجود ہیں جن کی وجہ سے اردو زبان کو عروج حاصل ہوا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو تین عظیم چیزیں دی ہیں۔(1) اردو (2) غالب (3) تاج محل..... مذکورہ تینوں چیزوں سے اردو کی تاریخی، تہذیبی اور لسانی مظاہر کی قدر و قیمت کا نہ صرف اشاریہ پیش کرتی ہیں بلکہ ہماری ماضی شاندار روایت جو اردو زبان وادب سے جڑی ہیں اس کا بھرپور احاطہ کرتی ہیں۔ اردو زبان کی لسانی تشکیل عربی زبان اور فارسی زبان سے ہوئی ہے اس لیے اس زبان کو پھولنے پھلنے میں جہاں آسانیاں تھیں وہیں بہت سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

مغلیہ سلطنت کا دور اردو زبان کا زرین دور تھا اس دور میں درباری زبان فارسی کے ہوتے ہوئے بھی اردو زبان کو بہت زیادہ فروغ ملا۔قرآن شریف کے متعدد ترجمے ہوئے نظم کے ساتھ ساتھ نثر کی بہت ساری کتابیں اردو میں لکھی جانے لگیں۔ قابل ادیبوں اور باکمال شاعروں کی بڑی قدر ومنزلت ہوئی۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اردو زبان کو فروغ دینے میں فرنگی حکومت کی کارگردگی نمایاں طور پر سامنے آئی۔ فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) اور سینٹ جان کالج (مدراس) میں قائم ہوا۔ ان دونوں کالجوں کے زیر اہتمام مختلف زبانوں کی شاہ کار تخلیقات کا اردو زبان میں ترجمہ ہوا اور ان تراجم نے بہت اہم تاریخی رول ادا کیا۔

اردو زبان نے ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں بھی اہم رول نبھایا ہے۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ اسی نے دیا ہے۔ ارباب سیاست نے اسے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اپنی متعصب ذہنیت کا ثبوت فراہم کرتے رہے ہیں۔ ہندوستانی آئین میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کو اس کی زبان وتہذیب کے انفرادی تشخص کے ساتھ زندگی گذارنے کے حقوق واختیارات دیے گئے ہیں۔ اس زبان کو فروغ دینے والوں میں غیر مسلم شعراء اور ادبا کی کثیر تعداد ہمارے سامنے موجود ہے جن میں منشی پریم چند، دیا شنکر نسیم، راجہ چندولال، سری کرشن پرشاد، ہرگوپال تفتہ، پیارے لال شاگر، برج موہن کیفی، سرشیخ بہادر سپرو، ماسٹر رام چند، للو لال کوی، رتن لال سرشار، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، تلوک چند محروم، مہندر ناتھ، مالک رام، تیرتھ رام فیروزپوری، گوپال متل، جوش ملسیانی، پشکر ناتھ، عرش ملسیانی، پریم وار برٹنی، گوپی ناتھ امن،

رام لال، فراق گورکھپوری، بانی، جگن ناتھ آزاد، کمار پاشی، گوپی چند نارنگ، سریندر پرکاش، راج نارائن راز، بلراج کومل، بلراج مینرا، بلراج بخشی، گلزار دہلوی، کرشن کمار طور، پریم کمار نظر، جینت پرمار وغیرہ نے اردو پرچم لہراتے رہے اور فلمی دنیا کا ایک بڑا قافلہ ہنوز اردو کو زندگی اور نئی روشنی دینے میں سرگرم سفر ہے۔

اردو زبان اپنی شاندار روایت کے استحکام کے ساتھ حال (Present) میں سرخروئی کی منزل سے گذر رہی ہے۔ جمہوریت کی عمارت کی پختگی کے لیے تین اہم ستون قرار دیئے گئے ہیں۔ (1) عدلیہ (2) منتظمہ (3) صحافت۔ اردو زبان ان تین ستونوں کو زندگی عطا کرنے میں دوسری زبانوں سے کہیں پیچھے نہیں ہے قانون اور عدلیہ کے فیصلے کے سیاق و سباق میں اردو زبان میں لکھی گئی تحریریں سرمۂ بصیرت کا کام کر رہی ہیں چونکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اردو دوسری سرکاری زبان کے مرتبے پر فائز ہے اس لیے سرکاری گزٹ میں اردو زبان کے استعمال ہونے سے اس کے شاندار مستقبل ہونے کی اُمید روشن ہوگئی ہے۔ انتظامیہ جسے انگریزی میں (Adminstration) کہا جاتا ہے اس ضمن میں جو بھی احکامات صادر ہوئے ہیں اردو میں بھی اسے منتقل کیا جانے لگا ہے۔ اردو زبان کی صحافت نے انگریزی اور ہندی صحافت کو براہِ راست متاثر کیا ہے۔

اردو زبان کی مقبولیت کے اسباب یہ بھی ہیں کہ اسے عالمی سطح پر ایک طرف جہاں اردو اخبارات اور رسائل و جرائد نے اسے وسیع تر ابلاغ و ذرائع سے جوڑا ہے وہیں مشاعروں کے انعقاد نے اردو کے عالمی بستیوں کے قارئین ایک ساتھ جوڑنے کا علمی فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ چونکہ اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے اس لیے اس نے اپنی فلاح و بقا کے راستے خود ہی تلاش کر لیے ہیں۔ اردو کمپیوٹر کی ایجاد نے اس کی شہرت میں حائل تمام دشواریوں کو ختم کر دیا ہے۔ اب اردو کے بڑے اخبارات اور اہم ادبی اردو رسالہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھے جانے لگے ہیں۔ اردو زبان کے فروغ میں صحافت نے بہت اہم رول نبھایا ہے۔ تخلیقی ادب اور صحافتی ادب کے درمیان واضح فرق کو ذہن میں رکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ ہر دو سطح پر اردو زبان نے اپنے معیارات بلند کئے ہیں۔ ایک طرف اردو کی اخباری صحافت

جہاں زیرہ کاری میں مینا کاری جیسے خیال کی ترویج واشاعت میں مصروف عمل ہے تو دوسری طرف خالص تخلیقی ادب کی پیش کش میں اردو کے رسائل جرائد سب سے آگے ہیں۔ اردو زبان وادب میں بین المذاہب مواد پر مشتمل لٹریچر کو منتقل کیا جارہا ہے۔ رامائن گیتا، قرآن، بائبل کے تراجم اردو زبان میں دستیاب ہیں۔ اردو زبان کے تراجم شدہ لٹریچر کی فراہمی کبھی مشکل مسئلہ نہیں بنی۔ اس کام کو اردو اکاڈمیاں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

ہندوستان کے آئین کے تحت ہندوستانی زبانوں کی ایک فہرست بھی ہمارے پیش نظر ہے جس میں اردو بھی شامل ہے۔ اقلیتوں کی زبان کی وجہ اس کے تحفظ کی ذمہ داری بھی دی گئی ہے۔ الفاظ کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے مگر جب تک اس کو عملی جامہ نہ پہنایا جائے یہ الفاظ شرمندہ معنی نہیں ہوتے کہنے کو تو سب کچھ کہا جاتا ہے مگر عملی طور پر اکثر امور میں زبان اردو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ باوجود اتنی صلاحیتوں کے یہ زبان ہندوستان کے کسی صوبے کی زبان نہ بن سکی مگر اتنا ضرور یقین کامل ہے کہ اردو زبان اپنی ترقی کے لیے کسی حکومت کی مرہون منت نہیں ہے وہ محض اپنی نجی صلاحیت زور پر بڑھتی، پھولتی اور پھلتی رہی ہے اور رہے گی۔

اردو زبان کے فروغ دینے میں حکومت کی سرپرستی ضروری ہے۔ چونکہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور یہاں ہر پانچ سال کی مدت میں انتخابات عمل میں آتے ہیں۔ اس لیے مختلف سیاسی نظریات کے حامل پارٹیوں کے برسر اقتدار ہونے پر اردو کی فلاح سے متعلق کام متاثر ہوتا ہے اس کے باوجود چونکہ ریاستی سطح پر حکومت سازی کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اس لیے اردو زبان موجودہ سیاسی پیچیدگی سے کم ہی متاثر ہوتی ہے۔

اردو زبان کا ماضی بھی شاندار رہا ہے اور حال بھی تابناک ہے۔ اب رہ گئی بات مستقبل کی ہمیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ اردو زبان کی یہ خوبی ہے کہ اس نے اپنی سخت جانی کی وجہ سے اپنی راہیں خود ہموار کر لی ہیں اور ہمیں اس کا مستقبل بھی نہایت پُرنور اور روشن نظر آرہا ہے۔

اردو زبان زندہ باد ..... اردو زبان زندہ باد

○

اردو زبان کا سماجی فروغ۔ ماضی اور حال کے آئینے میں

پروفیسر اعجاز علی ارشد

وائس چانسلر، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ

یہ بات پڑھنے، کہنے اور سننے میں بہت اچھی لگتی ہے کہ اردو زبان برصغیر ہند و پاک کے علاوہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں بولی سمجھی جاتی ہے اور خلیجی ممالک کے علاوہ، امریکہ، کناڈا، انگلینڈ اور فرانس میں بھی اردو کی ترقی ہو رہی ہے۔ لیکن بہر حال یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اردو خود برصغیر میں سمٹ رہی ہے چونکہ اس کا عوامی اور سماجی رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔ ادبی اور شعری مجلسوں کے انعقاد اور اردو کے خالص علمی، ادبی اور تخلیقی سرمایے میں اضافے کو زبان کی ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت کا معیار تسلیم کر لینا موزوں اور مناسب نہیں۔

خلیجی و یوروپی ممالک میں منتقل ہونے والی جو ہماری اگلی نسل تھی اس کی تو مادری زبان ہی اردو تھی۔ دودھ کے دانت ٹوٹ گئے پھر بھی مسوڑھوں میں اس زبان کی مٹھاس موجود رہی۔ لیکن ان کی موجودہ نسل جو وہاں ہے اسے انگریزی نے ایسا دبوچ رکھا ہے کہ اردو زبان کی لطافت و شیرینی سے محظوظ ہونا تو درکنار وہ اردو کے پیکر سے بھی نا آشنا ہے۔ یہی صورت حال

ہندوستان کی بھی ہے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرنا تو دور کی بات ہے ہماری نئی نسل اردو رسم الخط سے بھی ناواقف ہوتی جارہی ہے۔ یہ بات بڑی عجیب ہے لیکن اہل اردو کے لیے درس عبرت ہے کہ انگلش اسکولوں میں پڑھنے والے ہمارے بچے اپنے دادا کے شعری مجموعے پر شائع ان کی تصویر کو دیکھ کر مچلتے ضرور ہیں لیکن ان کے کلام کو پڑھنے سے قاصر ہیں کیونکہ انھیں اردو کے حروف تہجی بھی نہیں آتے۔ رسم الخط کی بات پر ایک بات یاد آئی جس کا تذکرہ کرتا چلوں۔ مابعد آزادی اردو زبان کئی شکست وریخت سے دو چار ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد مذہبی ولسانی عصبیتوں کے طوفان سے خود کو سنبھال بھی نہ پائی تھی کہ اردو زبان کے چند معماروں نے اس زبان کی شہ رگ پر ہی کلہاڑی مار دی۔ صرف شاعر نہیں افسانہ نگار اور ادیب بھی شانہ سے شانہ جوڑ کر کہنے لگے کہ اردو زبان کا رسم الخط دیوناگری ہو۔ فراق، سردار، چغتائی، ساحر وغیرہ سب یہی کہنے لگے۔ اور اگر ''یاروں'' نے اپنے شدید اور سخت ردعمل کا اظہار نہ کیا ہوتا تو یہ آندھی جو اردو کے پودے کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر کے آئی تھی اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب ہی ہو جاتی۔

اب اگر ہم اردو زبان کے مختلف اداروں میں استعمال اردو کی دوسری مقامی وغیرہ مقامی زبانوں سے تال میل اور خود اردو زبان کے گرامر اور تلفظ وغیرہ کے تناظر میں غور کریں تو ہمارے یہ دعوے کہ اردو کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے اور اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہے، دراصل اپنے مجرم ضمیر اور دل کا چور چھپانے کی ایک کوشش ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر کے اردو دوستوں کا ایک سہ روزہ نہیں ہفت روزہ اجتماع صرف اس غرض سے ہونا چاہیے کہ اردو کو عوامی زندہ زبان کی حیثیت سے باقی رکھنے کے لیے محبان اردو کو کیا کرنا چاہیے۔

اب میں چند نکات کچھ تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان بشمول اردو شاعری اور صحافت نے ہندوستان کی قومی سیاسی اور سماجی تحریک میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور اس کی جڑیں ہندوستانی سماج اور اس کی تہذیب و ثقافت میں اس طرح پیوست ہیں کہ کوئی بھی ہندوستانی اس کی خوشبو کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور بھلے ہی وہ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا ہو مگر اس کے صوتی رنگ و آہنگ کا دلدادہ ضرور ہے۔ اور یہی بات اہل اردو

کے لیے امید افزا اور اطمینان کا باعث ہے کہ ہزار مخالفتوں کے باوجود اردو زبان ابھی پھل پھول رہی ہے۔لیکن بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو زبان و ادب اور اردو صحافت کی اثر آفرینی میں روز بروز کمی آ رہی ہے اور اس کا سماجی رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔اس کے اسباب و علل تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں۔ایک سامنے کا پہلو دیکھیے۔ پہلے اردو اخبارات اور رسائل اپنے قارئین اور عوام کے مسائل کی ترجمانی کرتے تھے اور اپنے بل بوتے پر شائع ہوتے تھے۔اخبار کے مالکان اور مدیران کا ایک پاؤں اخبار کے دفتر اور دوسرا پاؤں جیل کی دہلیز پہ ہوتا تھا لیکن آج صورت حال بالکل برعکس ہے۔اکثر اخبارات نے اپنا صحافتی کردار کھو دیا ہے اور اب وہ یکسر تجارتی اور تشہیری ایجینڈے کے تحت شائع ہو رہے ہیں۔ظاہر ہے جب ہم اپنے زبان و قلم اور فکر و فن کو قصر شاہی کی ڈیوڑھی پر گروی رکھیں گے تو پھر اظہار رائے کی آزادی و بیباکی کا تصور ہی فضول ہے اور عوامی و سماجی سروکار کا تو مرحلہ بعد میں آتا ہے۔ جہاں تک اردو رسائل و جرائد کا سوال ہے میں نے' آج کل اور ایوان اردو' یہاں تک کہ فکر و تحقیق'' جیسے رسالوں میں بھی املا کی غلطیاں راہ پا جاتی ہیں جو خدا جانے اہل قلم کی نفرتوں کا نتیجہ ہیں یا ذمہ داران کی۔

اس لیے بہ زبان غالب بس یہی کہا جا سکتا ہے:

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اسی طرح اردو ادب کا بھی سماجی رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔کرشن چندر نے منٹو کے فکر و فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار وہ (کرشن چندر) اور منٹو چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ ایک شخص نے سامنے سے منٹو کا گریباں پکڑ لیا۔ پھر بڑے تپاک سے پوچھا ''بو'' تو نے لکھی ہے۔منٹو نے ڈرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ جا تیرے کوٹ کی سلائی معاف کیا۔ یہ تھی اردو ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی عوامی مقبولیت۔کیونکہ ان کی تحریریں شاہکار اور فلسفیانہ ہونے کے باوجود اتنی عام فہم اور دلکش ہوتی تھیں کہ عام آدمی کے دلوں کو چھو جاتی تھیں۔یہ وہ زبان تھی جو چاندنی چوک میں پلی بڑھی اور

پروان چڑھی اور آج بھی اس زبان کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ جو زبان لال قلعے کے اندر ایوان شاہی میں امراء و رؤساء کی سرپرستی میں فروغ پا رہی تھی وہ خواص کی زبان بن کر رہ گئی۔ آج اس کے سمجھنے اور بولنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی بلکہ نہیں کے برابر ہے۔ عام بول چال سے لے کر رسل و رسائل دفتری و انتظامی امور، تصنیف و تالیف ترجمہ و تدوین اور اصطلاح سازی غرض جملہ شعبہ ہائے حیات میں اسی عام فہم زبان کو رائج کرنے کی ضرورت ہے جس کی داغ بیل حضرت امیر خسرو اور ان کے ہم عصروں نے ڈالی تھی اور جو چاندنی چوک اور عام لوگوں کی زبان تھی۔ آج شعری و ادبی مجموعوں کی تعداد اشاعت میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا زبان خواص تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ تشہیر و اشاعت کے مقابلے اردو کی ترویج بالکل نہیں کے برابر ہے۔ حالانکہ سکہ وہی ہے جو رائج الوقت ہو ورنہ پھر وہ باقیات کے طور پر محفوظ تو رہتا ہے مگر اس کی کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں رہ جاتی۔

تعلیمی اداروں میں اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس اور بحیثیت نصاب تعلیم اس کی حیثیت ایک الگ موضوع ہے جس پر علیحدہ عنوان باندھنے کی ضرورت ہے۔ تاہم مختصراً اتنا بتاتا چلوں کہ پرائمری اور سکنڈری سے کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک نہ صرف یہ کہ اردو متعلمین کی تعداد میں روز بروز کمی آ رہی ہے، بلکہ جو طلباء و طالبات اردو زبان و ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کا بھی لسانی معیار اس قدر انحطاط پذیر ہے کہ بس اللہ ہی حافظ ہے۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن میں نے اردو آنرز کے طالب علم کو بھی کعبہ کی جگہ کابا (یعنی کاف الف زبر ''کا'' اور ب الف زبر ''با'') لکھتے دیکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ کو ایسے طلبا سے بھی سابقہ پڑے گا جو اردو کا لکچر ہندی رسم الخط میں تحریر کرتے ہیں۔ احباب کو یہ غلط فہمی بھی دور کر لینی چاہیے کہ مدارس میں اردو زبان کی تدریس کا معیار باقی ہے۔ معدودے چند کو چھوڑ کر مدارس کی تعلیمی صورت حال بھی نہایت مایوس کن ہے۔ فارغین مدارس بھی ایک صفحے کی درخواست میں املا کی پانچ غلطیاں کرتے ہیں۔ اس موضوع پر اردو اسکولوں اور کالجوں اور مدارس میں مامور اردو اساتذہ کا مخصوص ورکشاپ منعقد کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر اس مسئلے پر کیسے قابو پایا جائے۔ آج کے اردو متعلمین ہی کل کے مدرسین ہیں اور اگر ان کی زبان دانی کا یہی حال رہا تو

پھر مستقبل میں اردو کے فروغ کے لیے ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ میں یہاں اردو زبان کے گرامر تلفظ اور املے کے حوالے سے چند مثالیں پیش کرنا چاہتا تھا مگر مجھے ایسا لگا کہ یہ داستان دراز تر ہو جائے گی اور لذیز تر شاید نہ ہو۔ اس لیے بس اتنا اشارہ کرتے ہوئے اس بات کو یہیں چھوڑتا ہوں کہ عربی اور فارسی الفاظ کی ادائیگی اردو کے پڑھے لکھے طلبا کے لیے بھی دشوار ہوتی جا رہی ہے۔ غم کو گم اور خدا کو کھدا کہنا تو خیر عام بات ہے۔ کسی مقالہ نگار نے درست لکھا تھا کہ اس طرح کی غلطیوں کی فہرست سازی کی جائے تو ایک علیحدہ کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

مجھے احساس ہے کہ بات دل آزاری کی سرحدوں میں داخل ہو رہی ہے مگر میں ایک اور پہلو کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں چونکہ یہ خود ہمارے رویوں سے عبارت ہے۔ ممکن ہے آپ اس انگشت نمائی پر بہت چراغ پا ہوں مگر سچائی یہ بھی ہے کہ آج اردو زبان کی مقبولیت ہمہ گیری اور عوامی حیثیت کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ خود اردو زبان کے وہ شعرا ادیب اور فنکار بن رہے ہیں جو زبان کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں یا اردو کے ادبی جلسوں کو اپنی چراگاہ۔ ذوق نے تو پتہ نہیں کس جذبے کے تحت برسوں قبل یہ کہہ دیا تھا کہ :

نہیں کھیل اے ذوق یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

اور داغ نے خود اپنی زبان دانی کے اظہار میں کہا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مگر سوال یہ ہے کہ ان بیانات کی PositiveSprit کو نظر انداز کر کے آج دہلی لکھنؤ عظیم آباد یا حیدرآباد کے ادیب اور شاعر یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ اردو زبان صرف انھیں کی وراثت ہے تو دوسرے علاقوں کے اردو داں حضرات پہ کیا گزرے گی؟ یہی نہیں اردو کو عوامی رابطے کی زبان بتانے والے'' پندرہ دن میں اردو'' کی مہم چلانے والے اساتذہ اردو ادارے، انجمنیں اور ان کے ساتھ اردو تحریک سے وابستہ تمام لوگ کیا کریں گے؟ یا تو وہ حضرات ذوق کے اس خیال کے احترام میں اپنی رائے بدل ڈالیں یا پھر بہ آواز بلند یہ اعلان کریں کہ ایوان شاہی

o

سے وابستہ انھیں اساتذہ سخن نے ہمیشہ اردو کی ڈولی کو اٹھائے رکھا اور اسے عوام سے رو برو ہونے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ فی زمانہ اردو زبان کی حیثیت عرفی کا انداز مرزا غالب کے اس شعر کے تناظر میں کیجیے:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گیری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

یعنی بقول غالب شاہی سرپرستی اور نوازشات کے باوجود ایک شاعر کا درجہ ایک سپاہی کے درجے سے بھی بہت کم تر تھا اور آج جبکہ معاملہ بالکل برعکس ہے اور اردو زبان اپنے وجود کی بقا کے لیے جدو جہد کر رہی ہے ہمیں اپنی خوش فہمی کو دور کر کے حقیقی صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

مجھے احساس ہے کہ میں نے اب تک زمانہ حال کے آئینے میں اردو کے مسائل گنوائے مگر ان کو حل کرنے کے نسخے نہیں بتائے۔ ایسا کرنا شاید ضروری بھی نہیں مگر میں اپنی محدود عقل و دانش کی روشنی میں صرف چند نکات کی طرف اشارہ کروں گا۔ طلبا کے لیے گرامر تلفظ کی غلطیاں سدھارنے اور شین قاف درست کرنے کے لیے پرائمری سطح پر فارسی و عربی داں مولویوں کا اور سکنڈری سطح پر Languagc Labs کا انتظام کرنا ہوگا۔ بعض ریاستیں اس طرح کا Lab قائم کرنے کے لیے ہمت افزائی کر رہی ہیں۔ اردو اداروں کو بھی اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اردو کے مختلف مراکز سے وابستہ افراد کو اس بات پر کم سے کم زور دینا ہوگا کہ زبان صرف ہم جانتے ہیں۔ دوسری طرف ہندی اور مقامی زبانوں کے عام فہم الفاظ اپنی زبان میں داخل کرنے ہوں گے ایسا ہو بھی رہا ہے مگر تیز گامی شرط ہے۔ جہاں تک اردو شعر و ادب کا تعلق ہے اردو شاعری اور کسی حد تک فکشن میں بھی عہد حاضر کے مسائل و رجحانات کو زیادہ سے زیادہ جگہ دینی ہوگی۔ یہ کام بھی ہو رہا ہے مگر یہاں بھی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں کی جانے والی کچھ کاوشیں ایک دوسرے سے بظاہر متقابل یا متضاد نظر آئیں۔ مگر توازن اور اعتدال کی صورت پیدا کرنا حصول مقصد کے لیے ضروری ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ صرف شور غل مچانے سے کچھ نہیں ہونے والا ہے اگر ہم اپنی مادری

زبان اردو کا تحفظ اس کی بقا اور اس کا ہمہ جہت سماجی و ثقافتی فروغ چاہتے ہیں تو اس زبان کو زندگی کے ہر شعبے میں رائج کرنے کی صورتوں پر غور کرنا ہوگا اور اس کے لیے عملی کوششیں کرنی ہوں گی۔ ہم حکومت سے یہ مطالبہ تو پورے شدومد کے ساتھ کرتے ہیں کہ تعلیمی اداروں میں اردو اساتذہ کی بحالی ہو اور سرکاری دفاتر میں اردو مترجمین مامور کیے جائیں لیکن اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو مضامین پڑھنے والے طلبا و طالبات کی کیا تعداد ہے اور ایسے دفاتر جہاں اردو مترجمین پہلے سے مامور ہیں ان میں کتنی عوامی درخواستیں اردو میں موصول ہو رہی ہیں اس کا جائزہ کبھی نہیں لیتے۔ ہمیں اعداد و شمار کی بنیاد پر اس امر کا احتساب کرنا ہوگا کہ اردو کی ترویج کے لیے ہم انفرادی طور پر کیا کچھ کر رہے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایک موثر حکمت عملی تیار کر کے زمینی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو کے دوسرے اداروں کے اشتراک اور تعاون سے بحسن وخوبی کر سکتی ہے۔

○

اُردو زبان حال اور مستقبل

ڈاکٹر محمد نعمان خان

(پروفیسر ریٹائرڈ)، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

ہندوستان ایک کثیر اللسان ملک ہے۔ واحد ایسا ملک ہے جہاں پانچ خاندانو ں کی زبانیں مثلاً انڈو آرین، دراوڑ، آسٹرو ایشیاٹک، تبتی و برمن اور انڈومانی کا رواج ملتا ہے اور یہ زبانیں ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔

اردو زبان کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے۔ اس کا شمار ہندوستان کی جدید مقبول عام زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش اور اُٹھان عوامی ضرورتوں کا نتیجہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اپنے آغاز سے ہی اسے عوامی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اگرچہ ہندوستان میں اس کا اپنا کوئی مخصوص علاقہ یا صوبہ نہیں ہے لیکن کشمیر سے کنیا کماری تک یہ زبان بآسانی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ ملک کے تقریباً ہر خطے نے اس کی نگہداشت میں کچھ نہ کچھ کردار ادا کیا ہے اسی وجہ سے اُردو ادب ہندوستان گیر زبان بن گئی ہے۔ اُردو زبان نے شمالی ہند میں آنکھیں کھولیں، پنجاب میں پھلی پھولی، دکن میں فتحِ دولت آباد کے بعد اسے پروان چڑھنے کے بھرپور مواقع

میسر آئے، بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی بادشاہوں کے درباروں میں ادبی سرپرستی کے سبب اسے ادبی وقار حاصل ہوا۔ یہاں کے فنکاروں نے قدیم اصناف میں صناعی کے ایسے جوہر دکھائے کہ دوسرے علاقوں مثلاً دہلی اور اودھ کے فنکار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس زبان نے دوآبہ کے علاقے میں نہ صرف اپنی جڑیں مضبوط کیں بلکہ بہار و بنگال کے علاقوں کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا۔ راجستھان میں ٹونک اور وسط ہند میں مالوہ خصوصاً بھوپال، سرونج، جاورہ اور برہان پور نے جہاں اس کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا وہیں جنوبی ہند میں مہاراشٹر، کرناٹک، آندھرا پردیش، کونکن کے کئی شہروں اور مدراس اور آرکاٹ کو بھی اردو زبان و ادب کی خدمات کا شرف حاصل رہا ہے۔ 1947ء برصغیر کی تاریخ میں ایک نئی صبح کا آغاز ہے جو ہمیں غلامی کی طویل شب یلدا گزارنے کے بعد نصیب ہوئی تھی، دو نئے ملک تاریخ کے صفحات پر اُبھرے اور اس خطے کے جغرافیہ میں انسانی لہو سے سرحدوں کے نشانات مرتسم کئے گئے۔ تقسیمِ وطن کے اثرات سب سے زیادہ شمالی اور مشرقی ہندوستان پر مرتب ہوئے۔ سرحدوں کی دونوں جانب قتل و غارت گری اور نفرت کی گرم بازاری جب سرد ہونا شروع ہوئی تو نصابِ زندگی ازسرِ نو ترتیب دیا گیا۔ لیکن اب ملک کا لسانی منظر نامہ تبدیل ہو چکا تھا۔ آزادی سے قبل ہندوستان میں اُردو زبان کو لنگوا فرینکا کی حیثیت حاصل تھی اور کئی ریاستوں میں اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی ملا تھا۔ لیکن حصول آزادی کے بعد اس زبان کو عوامی اور ادبی حیثیت تو حاصل رہی البتہ سرکاری سطح پر اس کا رواج نہ صرف کم ہوتا گیا بلکہ رفتہ رفتہ معدوم ہی ہو گیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اُردو زبان نے اپنے وجود نیز ارتقاء کے کئی مراحل و منازل طے کیے ہیں۔ اس کی ترویج و اشاعت نیز سرپرستی کی ذمہ داری شاہی درباروں کے بجائے اب ادبی انجمنوں، اداروں اور اردو دوست حضرات کے کاندھوں پر آ گئی۔ آزادی کے فوراً بعد اس زبان کے سلسلے میں جو بے اعتنائی اور بے توجہی برتی گئی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ اس رویے میں بتدریج کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس سے متعلق بعض مفروضات اور الزامات کا ازالہ ہو رہا ہے۔ اس کی ادبی حیثیت، شیرینی اور معنویت تسلیم کی جانے لگی ہے اور یہ احساس

بھی فزوں ہو رہا ہے کہ اُردو زبان ہندی یا کسی علاقائی زبان کی حریف نہیں بلکہ حلیف ہے جو کہ اپنی ہم عصر زبانوں کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ہندی کے علاوہ کئی علاقائی زبانوں میں بھی اُردو الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا جا رہا ہے۔ ہندوستانی پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا اس کا بیّن ثبوت ہے۔ 67 سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھارت میں اُردو زبان و ادب پر بہار کا موسم ہے۔ اگرچہ برگ و بار کی شکلیں تبدیل ہو رہی ہیں۔ ذخیرۂ الفاظ، تراکیب و مصطلحات نیز لب و لہجے میں عصری تقاضوں کے بموجب تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ نئی نسل میں اُردو میں رائج نو وارد الفاظ کے استعمال کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ اخذ و قبول کی بے پناہ صلاحیتوں کے سبب اردو زبان کا دامن وسیع تر ہو رہا ہے۔

''دستور ہند کی آٹھویں فہرست میں مندرج 22 ہندوستانی زبانوں میں اُردو زبان بھی شامل ہے۔ دستور ہند کی آٹھویں شیڈول کے سترھویں حصے میں سیکشن 343 سے 351 تک زبانوں کے معاملات شامل ہیں۔ سیکشن (1)343 کے مطابق ہندوستان کی سرکاری زبان دیوناگری لپی میں ہندی تسلیم کی گئی ہے اور یہ بھی درج کیا گیا ہے کہ:

''ہندی زبان کا فروغ اس طرح کیا جائے کہ وہ بھارت کی گنگا جمنی
تہذیب کے تمام اجزا کے اظہار کا وسیلہ بن جائے۔''

1965 میں انگریزی کو معاون دفتری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ سیکشن A -350 (7ویں ترمیمی ایکٹ) میں ابتدائی سطح کی تعلیم کے لیے اقلیتی فرقے کے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دیے جانے کی بات کہی گئی ہے جس کے تحت لسانی اقلیت سے متعلق بچوں کی مادری زبان میں تعلیم کا بندوبست ہر ریاستی حکومت کا آئینی فرض ہے۔ 39ویں آئینی ترمیم کے مطابق 14 سال تک کی عمر کے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دیئے جانے کا آئینی حق حاصل ہے۔ 2009-RTE کے نفاذ کے بعد تعلیم سبھی بچوں کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے۔ 1991 کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں 4.3 کروڑ افراد کی مادری زبان اُردو تھی جب کہ 24 سال بعد بڑھتی ہوئی آبادی کے بڑھنے کے سبب ایک محتاط اندازے کے مطابق اب اُردو بولنے والوں کی تعداد دوگنی سے متجاوز ہو سکتی ہے۔

ملک وقوم کی ترقی، خوشحالی اور اقبال مندی میں تعلیم نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ زبان کی ترقی اور تونگری کا انحصار اس کی تدریس میں مضمر ہے۔ آزاد ہندوستان میں اردو زبان کا سب سے سنگین مسئلہ اس کی تدریس ہی ہے۔ ہندوستان کے اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو کی تدریس مادری زبان، ثانوی زبان اور تیسری زبان کے بطور عمل میں آتی ہے۔ سہ لسانی فارمولہ محض ایک حکمت عملی ہے، قومی اسکیم نہیں، یہ فارمولہ زبان سیکھنے کے تئیں کوئی حد یا مقصد متعین نہیں کرتا بلکہ سفر کا محض آغاز ہے کہ جس کا مقصد بھارت میں کثیر لسانیت اور قومی اتحاد کو فروغ دینا ہے۔

مرکزی حکومت ہند نیز ریاستی سرکاروں کے محکمۂ تعلیمات اس ضمن میں سرگرم عمل ہیں۔ کئی مرکزی تعلیمی اداروں اور ریاستی اسکولوں میں اردو تعلیم، تدریس، تحقیق، تربیت اور درسی کتب کی تیاری اور اشاعت کا معقول انتظام ہے۔ اسکولی تعلیم کے لیے ریاستی سطح پر تعلیمی بورڈس اور SCERTs اور قومی سطح پر NCERT اور اس کے زیرِ انتظام DMS، RIES اور CBSE سے ملحقہ کیندریہ ودیالیہ، نوودے ودیالیہ اور بعض پبلک اسکولوں میں اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے IGNOU، NIOS، MANUU دیگر مضامین نیز زبانوں کے ساتھ اردو زبان کی تدریس نیز ترویج واشاعت میں موثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ CIIL (میسور) اور اس کے زیرِ نگرانی تین اردو ٹیچرس ریسرچ اینڈ ٹریننگ سینٹرس (لکھنؤ، پٹیالہ اور سولن) اُردو اساتذہ کی تربیت میں مصروف ہیں۔

ہندوستان میں 300 یونیورسٹیز قائم ہیں جن مرکزی یونیورسٹیوں میں اردو اعلیٰ تعلیم اور معیاری تحقیق جاری ہے ان میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد ہری سنگھ گور سینٹرل یونیورسٹی، ساگر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی فاصلاتی نظام تعلیم کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی منفرد دانش گاہ ہے جس میں مختلف اسناد کے حصول کے لیے کئی کورسز ریڈیو، ٹی۔وی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے پڑھائے جاتے ہیں۔ IGNOU کے تیار کردہ

پیکیجز سے ہندوستان ہی نہیں بیرونِ ہند کے طلبا بھی مستفید ہوتے ہیں، IGNOU کے گیان وانی ریڈیو کے ذریعے ہفتہ میں ایک گھنٹہ Live تعلیمی اُردو پروگرام نشر ہوتا ہے اور ہر دن ایک گھنٹہ طے شدہ اُردو پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ یہی سلسلہ IGNOU کے گیان درشن ٹی وی پر بھی جاری رہتا ہے۔ ٹی۔ وی کے لیے اب تک 200 پروگرام اور سوا سو سے زیادہ کورسز تیار کیے جا چکے ہیں۔ کئی کورسز کا اردو ترجمہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اور بی اے، ایم اے (اردو) کے لیے درسی مواد بھی تیار کیا جا رہا ہے۔

فلم اور ٹیلی ویژن، رائٹنگ پر بشمول اُردو دیگر زبانوں میں بھی پی جی ڈپلوما کورس شروع کیا جا رہا ہے۔

IGNOU میں U.G. کی سطح پر ایک اردو فاؤنڈیشن کورس کا سلسلہ گذشتہ بیس برسوں سے جاری ہے۔

ماضی میں اُردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جو وقیع اور تاریخ ساز خدمات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے انجام دی تھیں۔ قدرے تبدیلی کے ساتھ اب وہی خدمات MANUU یعنی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد انجام دے رہی ہے۔ ہر بڑے شہر میں اس یونیورسٹی کے علاقائی اسٹڈی سینٹرس قائم ہیں جن میں بشمول بی۔ ایڈ اور ایم۔ ایڈ اور دیگر روایتی کورسز دیگر سائنسی اور سماجی اور عصری پروفیشنل علوم میں بھی معیاری تعلیم و تحقیق کا معقول بندوبست ہے۔ IGNOU اور MANUU کے علاوہ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد، بہار اوپن یونیورسٹی، کوٹا اوپن یونیورسٹی، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، مہرشی اوپن یونیورسٹی الہ آباد، ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹینس ایجوکیشن شری نگر اور بھوج اوپن یونیورسٹی، بھوپال میں بھی اردو کی اعلیٰ تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ مرکزی یونیورسٹیوں کے علاوہ کئی ریاستی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو اور ان سے ملحقہ متعدد کالجوں میں اردو تدریس اور تحقیق کا عمل جاری ہے۔ دہلی کے علاوہ مہاراشٹر، بہار، جھارکھنڈ، چھتیس گڑھ، مدھیہ پردیش، کرناٹک اور آندھرا پردیش کے کئی شہروں میں اُردو میڈیم اسکول بڑی تعداد میں اردو کی تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کئی شہروں میں قائم سرکاری اور نجی طبیہ کالجوں کا Meduim of Instruction اُردو ہے۔

اس ضمن میں جامعہ اردو علی گڑھ کی تاریخ ساز خدمات بھی محتاج تعارف نہیں ہے۔ دینی مدارس کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں ریاست بہار، مغربی بنگال، راجستھان، مدھیہ پردیش اور اتر پردیش (مدرسہ بورڈ الہ آباد) میں سرکاری طور پر مدرسہ بورڈ قائم کیے گئے ہیں۔ ان مدرسہ بورڈوں میں فاصلاتی نظام تعلیم کی طرز پر اُردو میڈیم میں نہ صرف اردو تعلیم وتدریس کا انتظام ہے بلکہ یہ مدرسہ بورڈ اپنی ریاستوں میں قائم نجی دینی مدارس کا رجسٹریشن کر کے انھیں مالی تعاون اور درسی مواد بھی فراہم کرتے ہیں۔ بورڈوں کی اسناد ریاستی تعلیمی بورڈوں کے مساوی تسلیم کی جاتی ہیں جن کی بنیاد پر ان سے فارغ التحصیل طلبا بی۔اے یا دیگر پروفیشنل کورسز میں داخلہ لینے یا سرکاری ملازمتوں میں امیدوار بننے کے مجاز تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف شہروں میں قائم پندرہ ہزار سے زیادہ دینی مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی تدریس بھی جاری ہے، اگرچہ دینی مدارس کا اصل مقصد اردو زبان کی تدریس نہیں ہے لیکن ان میں پڑھائے جانے والے بیشتر مضامین کا ذریعہ تعلیم اردو ہی ہے یہی سبب ہے کہ ان دینی مدارس کو اردو زبان کی اصل پناہ گاہ متصور کیا جاتا ہے۔

اسکولی تعلیم کے سلسلے میں ریاستی سطح پر مختلف ریاستوں کی SCERTs پہلی سے آٹھویں جماعت تک کے لیے اور بہار، مدھیہ پردیش ومہاراشٹر کی S C E R T s پہلی سے بارھویں جماعت تک کے لیے اردو درسی کتب تیار کر کے شائع کرتی ہیں۔

قومی سطح پر اسکولی تعلیم کو موثر ومعیاری بنانے نیز عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں سب سے اہم کردار NCERT یعنی نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی انجام دے رہی ہے۔

NCERT حکومت ہند کا خود مختار قومی ادارہ ہے جس کے تحت اسکولی تعلیمی نظام کی اصلاح، ترقی اور قومی تعلیمی پالیسی کے موثر نفاذ کے لیے جو بنیادی کام انجام دیئے جاتے ہیں ان میں قومی درسیات کا خاکہ National Curriculum Frame Work کی نظر ثانی، نصابات Syllabai کی ترتیب، درسی کتب کی اشاعت، اساتذہ کی تربیت اور تعلیمی امور میں تحقیق وتجزیہ وتوسیع کا عمل شامل ہے۔

مذکورہ بالا تمام کام کونسل یعنی NCERT کے ان مقاصد کو منعکس کرتے ہیں جن کے حصول کے لیے یہ ادارہ ایک تحقیقی اور تربیتی ادارے کے بطور مصروف کار ہے۔ NCF-2005 کے مسودے میں اسکولی تعلیم سے متعلق امور پر تجزیے اور مشورے شامل ہیں اور یاد دلایا گیا ہے کہ مادری زبان تعلیم کا بے حد اہم ذریعہ ہے جس کے تحت بچوں کو باصلاحیت بنانے میں سماجی، معاشی، اور تہذیبی پس منظر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ NCF-2005 میں اس امر پر خاص توجہ دی گئی ہے کہ تدریس کے ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے نصابی بوجھ کم ہو سکے اور بچوں میں سمجھ کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ اگر چہ بچوں کو آزادانہ آموزش نیز غور وفکر کا موقع دیا جائے تو نہ صرف ان کی فطری صلاحیتیں بارآور ہوتی ہیں بلکہ ان میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوتی ہے۔

اس دستاویز میں قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور تعلیم کے طفل مرکوز نظام، کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعلیم کو تخلیقیت اور تعمیریت کا حامل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئین کی پاسداری، متحدہ قومی کلچر، سیکولرزم، قومی یکجہتی، انسانی حقوق، سماجی واخلاقی اقدار، جنسی مساوات، معذوروں کے تئیں ہمدردی، حفظانِ صحت، ماحولیات، قومی ورثے کا تحفظ، آرٹ اور امن کی تعلیم، امتحانی اصلاح وغیرہ امور کو نصاب میں شامل کیے جانے پر اصرار کیا گیا ہے۔ NCF-2005 میں سفارش کی گئی ہے کہ بچوں کی باہری زندگی اسکولی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر کتابی علم کی اُس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث ہمارے نظام میں آج تک گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل ہیں۔ اس قومی درسیات کے خاکے پر مبنی نصاب نیز اس کے تحت تیار کردہ بشمول اُردو تمام درسی کتب اس بنیادی خیال پر عمل آوری کی ایک مثبت کوشش ہے جس میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی شامل ہے۔

قومی درسیات کا خاکہ 2005 میں شامل مذکورہ بالا نکات اور سفارشات اسکولی نظامِ تعلیم میں ایک نئی جہت، نئی تحریک، نئے لائحہ عمل کا آغاز ہے۔ مذکورہ امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی سبھی اسکولی سطح کے لیے بشمول اردو تمام مضامین میں درسی کتب تیار کرتی

ہے۔ NCERT واحد قومی ادارہ ہے جو اردو میں First Language یا مادری زبان میں پہلی سے بارھویں جماعت تک کی چھٹی سے دسویں جماعت کے طلبا کے لیے ثانوی زبان میں اور ساتویں سے دسویں جماعت کے طلبا کے لیے تیسری زبان کی حیثیت سے اردو درسی کتب تیار کر کے اور تمام مضامین کی درسی کتب کا اردو ترجمہ کرا کے، No Loss. No Profit کے اصول پر چار رنگوں میں باتصویر، معیاری سائز میں درسی کتب شائع کرتی ہے۔ NCERT کا NCF بشمول اُردو، بھارت کی 22 زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔

این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کی درسی کتب دراصل Model Text Book کی حیثیت رکھتی ہیں جنھیں CBSE سے ملحقہ اسکولوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے لیکن کئی ریاستوں کے تعلیمی بورڈوں اور SCERTs نے ان درسی کتب کو بعینہٖ یا قدرے تبدیلی کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ اکثر ریاستوں میں NCF کی بنیاد پر SCF اور SCERT درسی کتب کو سامنے رکھ کر، درسی کتب تیار کی جاتی ہیں۔ دیگر مضامین کی درسی کتب کے ساتھ اردو درسی کتب بھی این۔سی۔ای۔آر۔ٹی ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

آج کی سائنس و ٹیکنالوجی کی برق رفتار دور ترقی میں دیگر ترقی یافتہ ملکوں کی طرح پھیلتا ہوا ہندوستانی سماج، قدیم روایات کو خیر باد کہتے ہوئے نئے آدرشوں اور چیلنجوں کو قبول کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف زبانوں، تہذیبوں، اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والے افراد مل جل کر ایک ساتھ رہتے ہیں۔ جہاں طرح طرح کی ثقافتیں رائج ہیں۔ ایسے حالات میں یکساں درسیاتی دائرہ عمل کے تئیں قومی سطح پر اتفاق رائے ہموار کرنا، ظاہر ہے کہ ایک دشوار گزار عمل ہے لیکن NCERT یہ کام جس جمہوری اور سائنٹفک طرز پر انجام دے رہی ہے اس سے اس راہ کی دشواریاں، آسانیوں میں تبدیل ہو رہی ہیں اور سبھی مضامین خصوصاً اردو زبان کے لیے ایک سازگار فضا ہموار ہو رہی ہے۔ اہلِ اُردو کا فرض ہے کہ وہ اس نوع کی تمام تر سہولتوں سے خاطر خواہ استفادہ کر کے نہ صرف مسائل پر قابو پا سکتے ہیں بلکہ دیگر زبانوں کی طرح اپنی مادری زبان یعنی اُردو کو بھی سربلند کر سکتے ہیں۔

بھارت میں اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں قومی سطح پر NCERT اور NIOS

کے علاوہ (NCPUL) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، (NBT) نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، یو جی سی، یو این آئی، پی ٹی آئی، مولانا آزاد فاؤنڈیشن، نئی دہلی Academy for Professional Development of Urdu Teachers کے نام سے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اور مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد میں مرکزی حکومت کے وزارت فروغ انسانی وسائل کے ذریعے قائم کردہ تین مراکز، وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند کے تحت زیر کار آل انڈیا ریڈیو، پرسار بھارتی، دوردرشن کیندر، پبلی کیشنز ڈویژن، ڈی اے وی پی کے علاوہ کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز بھوپال، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ، سرسید فاؤنڈیشن نئی دہلی، مولانا آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کے علاوہ ہندوستان کی 17 ریاستوں میں قائم اُردو اکادمیوں کے نام شامل ہیں۔

ان اُردو اکادمیوں میں دہلی اردو اکادمی، آندھرا پردیش اردو اکادمی اس وجہ سے بھی قابل ذکر ہیں کہ ان دونوں اکادمیوں کے تحت ہمہ جہت اہم ادبی خدمات کے ساتھ اردو تعلیم وتدریس کا اہم کام بھی انجام دیا جارہا ہے۔

مذکورہ بالا اداروں میں ساہتیہ اکادمی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نہ صرف یہ کہ قدیم باوقار ادارے ہیں بلکہ گراں قدر ادبی خدمات کے باعث انھیں اعتبار وقدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی وقیع اور ہمہ گیر خدمات علیحدہ مضمون کی متقاضی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، وزارت فروغ انسانی وسائل حکومتِ ہند کا قومی سطح کا اردو کا سب سے بڑا اور اہم ادارہ ہے۔ اردو زبان وادب کے فروغ کے تئیں اس کی ہمہ جہت، ہمہ گیر اور وسیع تر خدمات اظہر من الشمس ہے کہ اس کے تحت اردو کے کلاسیکی، عصری اور جدید علوم وادب کی اشاعت، مختلف زبانوں کے ادب پاروں کے تراجم اور ملک گیر بلکہ عالمی سطح پر کمپیوٹر نیٹ ورکنگ اور اردو رسم خط میں 'SMS' کی سہولتیں بہم پہنچانے اور اردو زبان وادب کے فروغ کے تئیں معقول اور سازگار فضا ہموار کرنے کی خاطر تاریخ ساز خدمات انجام دی جارہی ہیں۔

ہندوستان کے نجی اور نیم سرکاری اہم ادبی اداروں میں انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، غالب

انسٹی ٹیوٹ دہلی، غالب اکادمی دہلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کی وقیع تحقیقی اور ادبی خدمات اپنا ایک معیار رکھتی ہیں۔ ان اداروں کا اپنا کتب خانہ بھی ہے اور ان کے ذریعے کتب ورسائل کی اشاعت بھی عمل میں آتی ہے۔ رسالہ 'معارف' دارالمصنفین اعظم گڑھ، 'نوائے ادب' انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی اور 'ہماری زبان' اور 'اردو ادب' انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے ترجمان ہیں۔

بھارت میں اُردو اشاعتی اداروں کی کمی بھی نہیں ہے۔ سرکاری سطح پر ساہتیہ اکادمی، این سی پی یو ایل، پبلی کیشنز ڈیویژن، NIOS.NBT.NCERT ہر سال بڑی تعداد میں معیاری اُردو کتب شائع کرتی ہیں وہیں نیم سرکاری اشاعتی اداروں میں انجمن ترقی اردو ہند دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، غالب اکادیمی نئی دہلی، ذاکر حسین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، خدا بخش اورنیٹل پبلک لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور اور مختلف ریاستی اردو اکامیوں کے علاوہ نجی اشاعتی اداروں میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، عرشیہ پبلشنگ ہاؤس، ایجوکیشنل بک ڈپو علی گڑھ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی، کتابی دنیا دہلی، فرید بک ڈپو دہلی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، نئی کتاب پبلشرز نئی دہلی، نیو پرنٹ سینٹر نئی دہلی، شب خون کتاب گھر الہ آباد، دبستان بھوپال، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ زبان وادب کی ترویج واشاعت میں کتب خانے کی اہمیت مسلّم ہے۔ بھارت میں ملک گیر شہرت کے حامل کتب خانوں میں خدا بخش اورنیٹل پبلک لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور، نیشنل لائبریری کولکاتا، ابن سینا اکادمی علی گڑھ، انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی، مولانا آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک، انجمن ترقی اردو ہند، سیفیہ کالج بھوپال، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانوں کے علاوہ اقبال لائبریری بھوپال وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ہندوستان میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں اردو اخبارات ورسائل نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ماضی میں عصری مسائل کی ترجمانی نیز جنگ آزادی میں اردو اخبارات نے جہاں تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے وہیں عصر حاضر میں بھی تعداد ومعیار دونوں اعتبار سے اردو اخبارات ورسائل کی اشاعت اطمنان بخش کہی جاسکتی ہے۔

بھارت کی راجدھانی دہلی کے علاوہ ہر بڑے شہر سے اردو اخبارات ورسائل بڑی تعداد میں شائع ہورہے ہیں۔

دہلی سے شائع ہونے والے اخبارات میں روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' اور 'انقلاب' سب سے مقبول اخبار ہیں۔

دہلی سے شائع ہونے والے دیگر اہم اخبارات میں 'ہندوستان ایکسپریس، ہمارا سماج، صحافت، عوام، دعوت' نئی دنیا، اور 'خبردار، وغیرہ کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ممبئی سے 'انقلاب' اور 'اردو ٹائمز' کولکاتا سے 'اخبار مشرق' لکھنؤ سے 'ندائے ملت' حیدرآباد سے 'منصف'، 'سیاست'، 'اعتماد'، 'رہنمائے دکن' اور نگ آباد سے 'ایکسپریس' اور 'اورنگ آباد ٹائمز' چنئی سے 'مسلمان' بھوپال سے 'ندیم'، 'اردو ایکشن' اور 'صدائے اردو' اور 'اردو ہلچل' پنجاب سے 'پرتاپ' 'ملاپ' اور 'ہند سماچار' بنگلور سے 'سالار' اور 'نشیمن' وغیرہ مقبول اخبار ہیں۔ ہفتہ وار 'روزگار سماچار' دیگر زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی شائع ہوتا ہے۔ بعض اردو اخبارات ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

ہندوستان میں شائع ہونے والے اردو ادبی رسائل میں دہلی سے 'آجکل' 'ایوان اردو'، 'کتاب نما'، 'نئی کتاب' اُردو دنیا'، 'فکر وتحقیق'، 'اردو ادب' لکھنؤ سے، 'نیا دور'، 'امکان'، 'گلبن' چنڈی گڑھ سے 'پاسبان'، 'تعمیر ہریانہ' 'جمناتٹ' شملہ سے 'جدید فکر وفن' حیدرآباد سے 'سب رس'، 'شگوفہ'، 'شعر وحکمت' ممبئی سے 'لوک راج'، 'شاعر'، 'نوائے ادب'، 'نیا ورق' 'ہندوستانی زبان' بھاگلپور سے 'کہسار' پٹنہ سے 'مرتع'، 'مباحثہ'، 'زبان وادب' اعظم گڑھ سے 'معارف' بھوپال سے 'تمثیل' 'فکر وآگہی' اور 'کاروانِ ادب' اندور سے 'شاخیں' سرونج سے 'انتساب' سری نگر سے 'شیرازہ' اور 'بازیافت' علی گڑھ سے 'تہذیب الاخلاق' 'فکر ونظر' اور 'نقد ونظر' پونہ سے 'اسباق' کولکاتا سے 'روحِ ادب' اور 'انشا' جے پور سے 'نخلستان' وغیرہ ایسے معیاری ادبی جرائد ہیں جو اردو کے تئیں سازگار فضا قائم کرنے اور زبان وادب کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہورہے ہیں۔

بھارت میں شائع ہونے والے مذہبی رسائل میں دہلی سے 'اللہ کی پکار'، 'الرسالہ'

'ترجمان'، 'رفیق منزل'، افکار ملی' 'آستانہ' 'حجاب اسلامی'، زندگی نو' بھوپال سے 'دین مبین' اور لکھنؤ سے 'ندائے ملت' کے نام شامل ہیں۔

دہلی سے شائع ہونے والے 'ہما'، 'پاکیزہ آنچل' اردو ڈائجسٹ ہیں۔ 'خاتون مشرق'، 'بیسویں صدی' مقبول عوامی رسالے ہیں۔ سائنسی رسالے میں 'سائنس کی دنیا' اور سائنس اور بچوں کی رسائل میں 'پیام تعلیم' اور 'اُمنگ'، 'بچوں کی دنیا' رام پور سے 'بلال'، 'نور'، اور بجنور سے 'اچھا ساتھی' کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ سفارت خانوں کے ترجمان رسائل میں 'اسپین'، امریکی سفارت خانے سے 'برٹش نیوز' برطانوی سفارت خانے سے اور 'راہ اسلام' ایرانی سفارت خانے سے شائع ہوتے ہیں۔

حکومتِ ہند کی وزارت خارجہ کی جانب سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'India Perspective' 'بشمول اردو' دنیا کی تمام اہم زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔

ہندوستان میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی رہی ہے کہ اردو زبان کا روزگار سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے نئی نسل اس زبان سے دور ہوتی جارہی ہے۔ بعض لوگ یہ سوچ کر کہ یہ مادری زبان ہے، اسے قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور اس کا مستقبل انھیں تاریک نظر آتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ (فلم، ریڈیو، ٹی۔وی، اخبارات وغیرہ) کے علاوہ محکمۂ تعلیمات میں اردو اساتذہ اور مختلف سرکاری دفاتر میں اردو مترجمین اور نجی طور پر ترجمہ سے متعلق کاموں کی کمی نہیں ہے۔

اردو کتب، اخبارات اور رسائل کی کتابت اب کمپیوٹر ہی پر ہوتی ہے جس کے لیے اردو کمپیوٹر آپریٹرس کی بڑی تعداد درکار رہتی ہے۔ کئی ریاستوں کی PSC's پبلک سروس کمیشن اور UPSC یونین پبلک سروس کمیشن کے مقابلہ جاتی امتحانات میں اردو کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ UPSC میں اردو میڈیم میں امتحان دیے جانے کی سہولت بھی مہیا ہے۔ کئی یونیورسٹیوں میں Correspondance Certificate Courses اور غیر اُردوداں کے لیے شبینہ کلاسز کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان کو مقبول عام اور ہردل عزیز بنانے میں فلموں، ریڈیو، ٹی۔وی

سیریل، خالص اردو چینلوں کے علاوہ مشاعروں اور غزل گائیکی کے پروگراموں کو خصوصی دخل حاصل ہے۔ ان کے ذریعے اُردو زبان غیر اُردو داں حلقوں میں بھی مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔

حکومتِ ہند کے محکمۂ ڈاک و تار نے کئی اردو شعراء کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیے ہیں۔ گیان پیٹھ اور سرسوتی سمان جیسے باوقار اعزازات دیگر ہندوستانی زبانوں کے فنکاروں کے ساتھ اردو ادیبوں کو بھی دیے جاتے رہے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو کو سرکاری زبان اور چار ریاستوں بہار، مغربی بنگال، جھارکھنڈ اور دہلی میں اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

ہندوستان میں اردو ادب کو پھلنے پھولنے کے پورے مواقع میسّر ہیں۔ یوں تو سبھی مروّجہ اور نئی شعری و نثری اصناف میں ادب تخلیق ہو رہا ہے لیکن آزادی کے بعد جن اصناف نے ترقی کے شاندار منازل طے کی ہیں ان میں غزل، نظم، گیت، دوہے، نعت، رباعی اور قطعات کے علاوہ ناول، مختصر افسانہ، تحقیق و تنقید، سفرنامے، انشائیے، خاکہ نگاری، خودنوشت سوانح، ڈراما، ریڈیو ڈراما کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ولی، میر، غالب، انیس، اقبال، پریم چند، ابوالکلام آزاد، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، سردار جعفری وغیرہ شعرا و ادبا کی شخصیت و خدمات پر خصوصاً توجہ دی گئی ہے۔

اردو زبان کا کلاسیکی اور جدید ادبی سرمایہ دیگر ہندوستانی زبانوں میں منتقل ہو رہا ہے اور علاقائی زبانوں کے شہہ پارے اردو زبان میں ترجمے ہو رہے ہیں۔ اردو اخبارات و ادبی رسائل کی طرح مختلف موضوعات سے متعلق ادبی کتب ہر سال بڑی تعداد میں شائع ہو رہی ہیں۔ اردو اخبارات و رسائل و کتب کی اشاعت کی رفتار و تعداد اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ہندوستان میں اردو قاری کی تعداد اطمینان بخش ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی رفتارِ ترقی سے متعلق اس مختصر جائزے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بھارت میں اردو کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

○

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو
ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں

پروفیسر شہاب عنایت ملک

شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی

اُردو ایک عالم گیر زبان ہے اور اس زبان کی ترویج وترقی اور بقا کے لیے وہ سبھی ادارے مصروفِ کار ہیں جنھیں اس زبان کی افاقیت اور افادیت کا اعتراف بھی ہے اور انسانی زندگی میں اس کی غیر معمولی اہمیت کا احساس بھی۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کی آئینی حیثیت کیا ہے اس زبان کو کون سے تحفظات حاصل ہیں، کون سے خدشات لاحق ہیں اور اس سلسلے میں میری سوچ کے دھارے کس سمت بہہ رہے ہیں، یہی سب نکات اِس مقالے کی اساس ہیں۔ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تہذیب اور ثقافت سے انحراف نہیں کرسکتا ہے کیونکہ مِل جُل کر رہنا اور مِل جُل کر رہنے کے لیے خوب سے خوب تر وسائل واسباب فراہم کرنا اس کی سماجی نسبت اور وابستگی کی اولین اور بنیادی ضرورت ہے۔ انسانیت کی مکمل تکمیل ومعراج حاصل

کرنے کے لیے جہاں اسے دیگر اخلاقی عوامل سے بہرہ مند ہونا پڑتا ہے وہیں عالمِ انسانیت کی ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی مکمل فطری و ذہنی مشاطگی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تبادلہ خیال اور مکالمہ کی صلاحیت ہو کیونکہ اس کے بغیر اُس کی ذہنی نشوونما رُک جاتی ہے۔ جن ماہرین نفسیات نے گونگے اور اندھے بچوں کی نشوونما کا مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اُن کی ذہانت اور سمجھداری کے راستے میں گونگا ہونا اندھا ہونے سے کہیں بڑی رکاوٹ ہے۔ انسان کا ذہن اپنے تخیل کی دُنیا کو بعض دفعہ معمولی اور ناکافی مواد کے ذریعے بھی تعمیر کر سکتا ہے۔ فرانس کے مشہور مفکر قیصر نے اپنے فکر انگیز مقالے ''انسان'' میں لکھا ہے کہ زبان کی اقلیم میں الفاظ کی حیثیت علامات کی ہے اور اِن کا کام یہ ہے کہ وہ بے جان نشانوں میں جان ڈالیں تاکہ وہ بول اُٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کو ''جذبات کی سانس'' کہا گیا ہے۔

انسان نے اپنی ترقی کی راہوں میں رکاوٹوں کو رفع کرنے کے لیے ابتدا سے ہی ان گنت بیڑے اُٹھا رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی تعریف مختلف مفکروں اور فلسفیوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ کسی نے اِسے صاحب فکر، کسی نے صاحب تخلیق اور کسی نے حیوانِ ناطق کہا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے اور اپنی ذات کے خول میں ڈوب کر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان سب صفات کے علاوہ حضرتِ انسان میں ایک اور بڑی صلاحیت موجود ہے جس کی طرف مشہور فلسفی برگساں نے اشارہ کیا ہے یعنی خود کو بنانے کی صلاحیت (Creation of the self by the self) اُس کے نزدیک یہ آرٹ اُن تمام فنون سے افضل ہے جن کے ذریعے اس نے اپنی زندگی کو مالا مال کیا ہے۔ وہ اپنی حیوانی میراث یا اُس انسانی میراث پر بھی قانع نہیں جو اس کو ملا ہے کیونکہ تلاش و تجسس انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ لہٰذا مسلسل جہد و عمل میں لگا رہتا ہے کہ اس میں اور اضافہ کرے۔ گو مختلف لوگ مختلف قسم کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کوشش میں زبان ہی سب سے زیادہ موثر آلہ ثابت ہوئی ہے۔ زبان کی وساطت سے اُس نے نہ صرف اپنے ہم جنسوں کے دِل و دماغ بلکہ خود اپنے دِل و دِماغ کی گہرائیوں میں نظر ڈالی اور صرف اُس کی اپنی ہی زبان نے انسانی ذات کے بھید نہیں

کھولے بلکہ دُنیا میں جو بڑے صاحبانِ تحریر وتقریر، شاعر اور ادیب، ماہرین نفسیات اور فلسفی گذرے ہیں، اُن کی فکر اور کارناموں نے اپنے زاویہ نظر سے اُس کی ذات پر روشنی ڈالی ہے۔

زبان کی اِس ہمہ جہت خصوصیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر ریاست جموں وکشمیر کے تاریخی پس منظر پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہاں پر کوئی بھی زبان فارسی، کشمیری، ڈوگری، سنسکرت یا پھر ہندی وہ کارنامہ انجام نہیں دے پائی ہے جو اس کی سرشت میں شامل ہے۔ اگر ہم صرف آپسی بھائی چارے، میل ملاپ، اخوت ومحبت اور ایثار وہمدردی جیسے دِلی جذبات کی بات کریں تو یہ جذبات حسنیٰ جو بنیادی طور سے تخلیقِ ارض وسما کے باعث ہیں، ریاست جموں وکشمیر میں وہ کارنامہ انجام نہیں دے پائے ہیں جن سے ایکتا اور یگانگت کی فصلِ بہار آنکھوں میں ایک اہمیت کو کسی نے خاطر میں نہیں لایا ہے اور اگر لایا بھی ہے تو اس کا اظہار کرنے میں آپسی بغض وعناد کی بنا پر قاصر رہے ہیں۔ اگر ہم آج کے یا گذشتہ دس بیس برسوں سے ریاست جموں وکشمیر میں رونما ہونے والے حالات وواقعات پر نگاہ ڈالیں تو یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ وہی دور ہے جس دور میں زبان ایک مجتہدانہ رول ادا کرتی ہے جس کا اعتراف ایک انگریزی مُفکر نے ایک مدت پہلے اپنی کتاب Faith for living میں کچھ اِس طرح سے کیا ہے:

> ''بدنظمی کے اندر نظم کی شان پیدا کرنے میں انسان کو سب سے زیادہ کامیابی سائنس یا قانون کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ زبان کے ذریعے ہوئی ہے۔ انسان کے تبادلہ خیال کے ذرائع کو پاک اور صاف رکھنا ایک ایسا ہی مقدس فریضہ ہے جیسا ابتدائی عہد کے انسانوں کے لیے مقدس آگ کی حفاظت۔''

انگریزی مفکر کے اِس فکر انگیز خیال کے پیش نظر اگر ہم اپنی زبان اور ذرائع ابلاغ پر نظر دوڑائیں تو ہر شخص، چاہے وہ کسی بھی ازم کے نشے میں مستغرق ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اُردو زبان ریاست کی واحد ایک ایسی زبان ہے جس میں نہ صرف زبان کی وہ جملہ اوصافِ حُسنیٰ موجود ہیں جو ایک زبان کے لیے لازمی جُز مانے جاتے ہیں بلکہ یہ زبان اپنی تمام تر رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ اس خطۂ جنت بے نظیر کے تینوں خطوں جن

میں جموں، کشمیر اور لداخ کے نام لیے جاسکتے ہیں کی روح رواں بنی ہوئی ہے۔ جیسے کہ گزشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے کہ زبان کی آفاقی، اقتصادی اور سماجی اہمیت پر کسی نے اُس طرح سے غور نہیں کیا جیسا کہ غور کرنے کا حق تھا۔ جہاں تک اُردو سے پہلے راج شُدہ زبانوں کا تعلق ہے تو اس حوالے سے میں عرض کرتا چلوں کہ ان زبانوں یا بولیوں کی ناگفتہ بہ حالت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس زمانے میں ثقافتی ترا سیل کے وسائل اس قدر موجود نہ تھے جیسے کہ دورِ حاضر میں دُنیا ایک Global village کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

جہاں تک ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان کا تعلق ہے تو اسے بجا طور پر ریاست کی دورِ ترسیلیت کی موثر اور دیرپا ایجاد شدہ زبان ہونے کا شرف اسی طرح حاصل ہے جس طرح مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کو اُردو زبان کے فروغ کا شرف حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان ریاست جموں وکشمیر میں مواصلاتی نظام کے استحکام کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھی اور اتنی سرعت روی سے وہ مقام ومرتبہ حاصل کیا کہ ہم اس زبان کو فخر سے ہندوستان کی واحد ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے اعزاز سے یاد کرتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اس زبان کے آغاز وارتقا کی داستان نہایت دلچسپ اور پُرلطف ہے جس کے ذریعے نہ صرف ریاست کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے بلکہ ذہنی، شعوری اور فکری وحدت کے موثر ذریعے کے خدوخال بھی اپنے مربوط جامے میں اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست میں اُردو زبان وادب کے آغاز وارتقا کے حوالے سے بہت سارے قلم کاروں نے اپنے اپنے طریقہ فکر ونظر سے اظہار خیال کیا ہے لیکن یہ مختلف اہلِ قلم کے خیالات ایک ہی نکتے کی طرف رواں دواں ہیں جس سے ''شُد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا'' کا فقرہ کہے بنا، اُردو زبان کا قاری درج ذیل نتائج پر پہنچ جاتا ہے اور نہایت ہی روانی سے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ ریاست میں اُردو زبان وادب کے ارتقا کے سلسلے میں جو روایتیں ملتی ہیں اُن کا تعلق وادی کشمیر کے ساتھ ساتھ صوبہ جموں سے بھی رہا ہے۔ ہندوستان کا یہ خطہ جنت نشاں ایک عرصے تک بدھ مت کی سرگرمیوں کا مرکز رہا تو کبھی گپتوں کے فنونِ لطیفہ کا گہوارہ بنا۔ ہندو راجاؤں کے بعد مسلمانوں

کادور آتا ہے۔اُس دور میں بھی عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کا اثر جاری رہا۔اسی دوران یہاں عظیم صوفیوں، ریشیوں اور عالموں کی آمد ہوتی ہے جن میں بلبل شاہؒ، شاہ ہمدانؒ، شیخ نورالدینؒ، شیخ حمزہ مخدومؒ اور شیخ یعقوب صرفی کے نام قابل ذکر ہیں۔تاریخ کی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انہی کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنا کر سلطان زین العابدین 'بڈشاہ' نام پاکر کشمیری حکمران کہلائے۔بڈشاہ کی حکومت میں کشمیر کی تعمیرنو اور شعروادب کے لیے شاندار کام کیے گئے۔

چودھویں پندرھویں صدی عیسوی تک ریاست میں سیاست اور یہاں بولی جانے والی زبانوں کے شعروادب میں کیا کیا کام ہوا، اس کی تفصیل کلہن کی 'راج ترنگنی' میں دیکھی جاسکتی ہے جو اس عہد کی ایک عظیم تاریخی کتاب ہے۔اس کے بعد یہاں افغانوں اور سکھوں کی حکومت بنی۔اُن کا زمانہ لوٹ مار اور ظلم وستم کا زمانہ مانا گیا ہے لیکن جب ہندوستان میں مغل بادشاہوں کا دوردورہ ہوا تو اُن کا اثر اِس علاقے پر بھی پڑا اور مغلِ اعظم شہنشاہ اکبر کو جب 1589 میں فتح کشمیر حاصل ہوئی تو اُس نے اِس خطہ بہشت مثال کو مغلوں کی آنے والی نسلوں کے لیے عشرت کدہ وسیرگاہ بنانا چاہا۔جب جہانگیر اور شاہجہاں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور آئی تو اِن بادشاہوں نے بھی اس خطہ کو سنوارا، یہاں اورنگ زیب بھی آیا۔اُس عہد میں شعروادب کے ساتھ فنونِ لطیفہ کا بول بالا ہوا۔یہی نہیں بلکہ قلم کاروں کی دِل کھول کر حوصلہ افزائی بھی کی۔فیضی، عرفی، غنی کاشمیری، للہ عارفہ، شیخ العالمؒ، حبیب اللہ جی اور محسن فانی اس عہد کے قابل ذکر شاعر اور ادیب ہیں۔اُردو کے نشاۃ الثانیہ کے دوران جب ہندوستان انگریزوں کے اقتدار میں آیا تو انہوں نے 16 مارچ 1846 میں مہاراجہ گلاب سنگھ کو عہد نامہ امرتسر کی رُو سے نانک شاہی 75 لاکھ مالیت کے نکے کے عوض کشمیر کو اُن کے حوالے کردیا۔اسی سودابازی پر شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

دہقان وکشت وجوئے وخیاباں فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

چنانچہ ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر کی حسین ودلفریب وادی کو خرید لیا

اور ریاست میں ڈوگرہ حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ ریاست میں ڈوگرہ حکومت سے پہلے اور ڈوگرہ حکومت کے بہت بعد تک دفتری زبان فارسی رہی۔ جموں میں عام بول چال کی زبان ڈوگری تھی جب کہ کشمیر میں کشمیری۔ ڈوگرہ حکمرانوں گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ نے ڈوگری کو دفتری زبان کا درجہ دینے کی بڑی کوششیں کی لیکن 'کوہ کنید وکاخ آوردن' کے مصداق ثابت ہوئیں۔ کیونکہ ڈوگری میں وہ اہلیت ہی نہ تھی جو دفتری زبان کے لیے ضروری ہے، گو کہ موجودہ دور میں ڈوگری میں اچھا خاصا ادب جمع ہو گیا ہے۔ 1930 سے 1940 کے دورانیے تک بھی ڈوگری کے نوجوان شاعر دینو بھائی پنت نے اُردو کے مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر داد پائی لیکن عام بول چال میں ڈوگری زبان کا چلن عام تھا۔ چونکہ ڈوگری لسانی اعتبار سے پنجابی اور اُردو سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے اس زبان نے جلد ہی اُردو کے اثرات قبول کرنے شروع کر دیے اور کچھ ایسے حالات بھی پیدا ہوئے جن میں اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ کوئی ایسی زبان ہو جو دونوں صوبوں میں رابطے کا ذریعہ بنے۔ چونکہ جموں کے باشندے کشمیری سے نا آشنا تھے اور اہل وادی ڈوگری زبان سے۔ مواصلات کا انتظام بھی کچھ ایسا نہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں کی آمدورفت عام ہوتی۔ کچھ عرصہ بعد مواصلاتی نظام بہتر ہونے لگا اور ریاست کو پڑھے لکھے اور ہنرمند لوگوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہندوستان اور پنجاب سے لوگ کشمیر میں آنے لگے۔ یہ لوگ اپنی زبان اُردو بھی ساتھ لائے اور مقامی لوگوں کے میل ملاپ سے کشمیر میں اُردو کی ترویج کی داغ بیل پڑ گئی۔ 1857 کی جنگ آزادی بھی ریاست میں اُردو کی ترویج کا ایک موثر سبب بنی۔ ہوا یوں کہ تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے انگریزوں نے مہاراجہ سے مدد طلب کی اور انھوں نے انگریزوں کا حق نمک ادا کرنے کے لیے ڈوگرہ فوجوں کو انگریزوں کی امداد کے لیے دہلی بھیجا۔ جنگ آزادی ختم ہونے کے باوجود ڈوگرہ فوجیں کچھ عرصہ دہلی میں مقیم رہیں اور جب ریاست میں واپس آئیں تو اپنے ساتھ اُردو کے بے شمار الفاظ بھی ساتھ لائیں جس سے جموں میں جہاں ڈوگری، گوجری اور پنجابی کا راج تھا۔ معمولی محنت سے اُردو کو اپنا لیا گیا۔ اہلِ کشمیر بھی آہستہ آہستہ اُردو سے مانوس ہونے لگے جن کی مانوسیت کی وجہ محققین نے ہندوستانی سیاحوں کی آمدورفت بتائی ہے۔ اس طرح گلگت، بلتستان اور لداخ میں

اردو را بطے کی زبان بن گئی، جہاں کی زبانیں شینا، بلتی اور لداخی تھی۔ ان علاقوں میں ڈوگرہ راج کے تسلط کے بعد انتظامی امور کے لیے جو ملازمین گئے اُن کا تعلق جموں وکشمیر سے تھا۔ چونکہ مقامی لوگ تعلیمی اعتبار سے صفر کے برابر تھے۔ ان حضرات کی فروغ تعلیم کی جدوجہد اور ادبی مجلسوں سے بلند پہاڑوں میں گھرے ہوئے علاقوں میں اُردو کی ہر دلعزیزی روز بروز بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ان علاقوں میں اُردو کے ادیب اور شاعر بھی پیدا ہو گئے۔ اس دوران کچھ لوگ ریاست سے باہر جانے لگے اور کچھ باہر سے تجارت اور شعروادب کی غرض سے یہاں آنے لگے۔ اس طرح ریاست کی حکومت نے دہلی اور لاہور کے علاوہ یوپی، سمرقند، بخارا اور چین سے بھی تعلقات مستحکم کیے، جہاں اُس وقت اُردو کا بول بالا تھا۔ اس بات کی تصدیق 'سفرنامۂ بخارا، مصنف شیر سنگھ سے ہوتی ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے 65۔1964 رام پور راجوری کے ایک شخص چودھری شیر سنگھ کو تجارتی وسیاسی تعلقات کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے بخارا بھیجا تو اُس نے واپس آ کر اُردو میں 50 صفحات پر مشتمل اپنے سفر کے کوائف اور جائزے کے نتائج مرتب کر کے پیش کیے۔ یہ رپورٹ ریاست کے سرکاری ریکارڈ میں اُردو کی پہلی تحریر ہے۔

اس کے علاوہ غلام محی الدین میر پوری نے 1131 میں ''گلزارِ فقیر'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ یہ مثنوی چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے پر 113 راشعار درج ہیں۔

گلاب سنگھ کے دور میں ہندوستان کے بعض حصوں سے نہ صرف اُردو کے شاعر ادیب یہاں آئے بلکہ سیاح، تجارت گر اور ملازم بھی آئے جو اپنے ساتھ اپنے خاندانوں کو بھی لائے جن کی عام بول چال کی زبان اُردو تھی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد 1857 میں رنبیر سنگھ کا دور آتا ہے جن کی علم وادب پروری کی دین چھاپہ خانہ ''بدیابلاس'' اور ''بدیابلاس سبھا''۔ 1858 ہے۔ جس کے جلسوں میں دیگر زبانوں اور بولیوں کے علاوہ اُردو کے دانشور، ادیب اور شاعر شرکت کرتے تھے۔ اس طرح اُن کی کمی کے پیش نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ 1889 میں جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اُردو کی اہمیت ومقبولیت کو سمجھا تو اُنہوں نے اِسے سرکاری زبان کا درجہ دے دیا اور اسے دفتری اور تعلیمی اداروں میں بھی رائج کر دیا۔ اس طرح اُردو کی شہرت ومقبولیت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

اُردو کی آئینی حیثیت متعین کرنے سے پہلے اختصار سے ہی سہی اُن بنیادی محرکات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جن کے سبب سے اُردو نہ صرف ریاست کی واحد ہندوستانی زبان، سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل کر گئی بلکہ آج بھی تمام تر پیچیدگیوں کے باوجود اپنے پورے وقار کے ساتھ ہندوستان کی کم وبیش تین کروڑ آبادی کی زبان وقلم کی دِلوں کی دھڑکنوں کی روحِ رواں بنی ہوئی ہے۔ ان میں جہاں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی علم پروری کے پیش نظر اُٹھائے گئے بنیادی اقدامات خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں، وہیں دوسری طرف کشمیر میں عیسائیوں کی آمد اور عیسائیت کی اشاعت، تعلیم وتربیت کے خصوصی انتظامات، جموں وکشمیر میں مجالس محرم کا انعقاد، ناٹک کمپنیوں کا قیام، فوجی اہلکاران ودیگر اعلیٰ آفیسران کی اُردو میں تقاریر و اظہارِ خیال ریاست کی ملازمت میں ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا عمل دخل، ابتدائی ادبی وشعری نشستیں، مولانا محمد حسین آزاد سے ڈوگرہ راج کی تاریخ لکھوانے کی آرزو، ریاست میں اُردو کا پہلا مطبع، آل انڈیا ایجوکیشن کانفرنس، آل انڈیا کشمیری کانفرنس، انجمن اسلامیہ جموں، انجمن نصرت اسلام سرینگر، مسلم ایسوسی ایشن جموں بزم سخن جموں، سالانہ مشاعرے، بزم مشاعرہ، فیروزالدین طغرائی کی جموں میں آمد اور قیام خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔

مذکورہ بالا حالات وواقعات کے پیش نظر اُٹھائے گئے اقدامات بدرجہ غائب ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کی ترقی وترویج کا باعث بنے۔ چونکہ یہ اقدامات اُردو کی ہمہ گیر شخصیت سے کسی نہ کسی طرح متاثر تھے اور اُردو نے ہندوستانی آئین میں اپنا اہم مقام ومعیار حاصل کیا تھا جس کے پیش نظر کوئی جواز نہیں بنتا تھا کہ اس زبان کو سرکاری اور ذریعہ تعلیم کا درجہ نہ دیا جائے۔

اردو ہماری ریاستی زبان ہونے کی وجہ سے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اس زبان میں بڑی وُسعت ہے اور اِس کا ذخیرہ الفاظ کافی ہے۔ نئے نئے الفاظ وضع کرنے کی اِس میں کافی صلاحیت موجود ہے۔ اِس زبان کے ذریعے اعلیٰ تحقیق وتوسیع موجود ہے۔ یہ زبان عام فہم اور آسان ہونے کے علاوہ گنجلک قواعد کی تمام تر پیچیدگیوں سے آزاد ہے۔ علوم اور فنون کی کتابوں کی اکثریت میں یہ زبان اپنی مثال آپ ہے، کیونکہ اس زبان میں دوسری زبانوں کی

کتابوں کا ترجمہ کرنے کی تمام تر آسانیاں موجود ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ زبان اپنے روزِ ازل سے ہی چاہے ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے دیکھا جائے یا سرکاری دفاتر میں برت کر دیکھا جائے، کامیاب وکامران نظر آتی ہے اور ہر فکر وعمل کو بحسن وخوبی اپنے قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت سے برسرِ پیکار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد دکن کی جامعہ عثمانیہ میں اس زبان کو ذریعہ تعلیم کا درجہ حاصل تھا۔فورٹ ولیم کالج میں اُردو ہی ذریعہ تعلیم تھی اور یہ بات خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ سنسکرت کالج دہلی میں بھی اُردو ہی ذریعہ تعلیم تھی اور وہاں نہایت کامیابی سے اس زبان کے ذریعے سائنس اور دیگر فنون کی تدریس موثر انداز میں ہوتی رہی۔پنجاب اور یوپی کے ہائی اسکولوں میں بھی یہی زبان ذریعہ تعلیم تھی۔اُردو کالج کراچی نے بھی ایک کامیاب تجربہ کیا ہے جو عرصہ سترہ اٹھارہ سال سے عثمانیہ یونیورسٹی کی طرز پر کام کر رہا ہے۔ اس میں قانون، سائنس، تجارت اور آرٹ کے تمام مضامین اُردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔آزادی سے قبل چونکہ اُردو کو نیم سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔اس لیے اُردو ذریعہ تعلیم بنی تھی مگر آزادی کے بعد ہندوستان میں سرکاری زبان ہندی قرار پائی جس کی وجہ سے اُردو ذریعہ تعلیم کے مدارس مقامی زبانوں کے مدارس بن گئے۔حتیٰ کہ کالجوں کے نصاب سے بھی اُردو کو نکال دیا گیا۔ ہندوستان کی واحد یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ میں بھی اُردو ذریعہ تعلیم نہ رہا۔اُس یونیورسٹی نے بھی اس زبان کی بیخ کنی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ اُردو داں طبقے کے بچوں نے اپنی مادری زبان اُردو کو چھوڑ کر دوسری مقامی زبانوں یا انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی اور اپنے آپ کو بیک وقت دو مصیبتوں میں گرفتار کر لیا۔اپنی تمام تر توجہ غیر ملکی زبان کے حصول پر دی مگر اس کے باوجود نتیجہ حوصلہ شکن رہا۔سولہ سال پڑھنے کے باوجود بھی اس درجہ استبداد نہیں ہو پائی ہے کہ وہ اس زبان میں پوری روانی کے ساتھ اظہار خیال کر سکیں۔اس مصیبت کو آج بھی اکثر وبیشتر اہلِ حس لوگوں نے بھانپ لیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہندوستان کے کم وبیش پانچ ساڑھے پانچ کروڑ لوگ اُردو کی آبرو بچانے میں برسرِ پیکار ہیں اور حکومتِ وقت سے قانونی تحفظات کے پیشِ نظر اپنے مطالبات میں لگے ہوئے ہیں جو اُردو کی

بقا کے واحد امین وضامن ہیں۔

ہندوستان کے آئین کے مطابق اُردو آئین کے آٹھویں شیڈول میں ایک قومی زبان کی حیثیت سے موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آئین کی دفعہ 344(الف) کی رُو سے صدر جمہوریہ ہند جو کمیشن مقرر کریں گے اُس میں مذکورہ شیڈول میں درج سبھی زبانوں کے نمائندے ہوں گے اور آئین کی دفعہ 51 کی رُو سے حکومتِ ہند پر ہندی کو فروغ دینے کی ذمہ داری ہے۔ اگر ہم اُردو کے نقطۂ نظر سے دیکھیں اور یہ جاننا چاہیں کہ آئین میں کیا کچھ ہے جس سے اُردو فیض یاب ہوسکتی ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ ایک تو وہ عام دفعات ہیں جو سبھی زبانوں اور اُن کے بولنے والوں کے کام آتے ہیں۔ چاہے وہ زبانیں آٹھویں شیڈول میں درج ہوں کہ نہیں۔ اُن میں دفعہ :29 ضمن۔1 دفعہ :350 ضمن۔2۔ خاص طور سے اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ آئین میں بنیادی حقوق کی دفعات ہیں جن کا اطلاق لسانی گروہ پر بھی ہوتا ہے، جیسے دفعہ :14 دفعہ :16 خاص طور سے اہمیت کی حامل ہیں۔

جہاں تک اُردو کو سرکاری طور پر نظم ونسق کی ایک زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں دفعات :345 اور 357 توجہ طلب ہیں۔ دفعہ 345 کے مطابق دفعہ : 346 اور 347 کے تابع کوئی ریاستی قانون ساز اسمبلی (Legislative) اُس ریاست میں استعمال ہونے والی ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں بشمول ہندی کو ریاست میں سرکاری اغراض کے لیے قانون بنا سکتی ہے۔ یہاں یہ بات صاف ہونی چاہیے کہ دفعہ :346 کا تعلق یونین کی مرکزی زبان یا بین ریاست اور ریاست اور مرکز کے درمیان مراسلت کی زبان سے ہے۔ چونکہ سوال دفعہ :347 اور اس کی تاویل کا ہے۔ اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ صدر جمہوریہ سے اگر مطالبہ کیا جائے تو کسی ریاست میں یا اس کے کسی حصے میں یا سبھی یا چند سرکاری اغراض کے لیے جن کی وہ صراحت کریں گے، اس زبان کے بولنے والوں کی خاطر حکم نامہ جاری کریں گے کہ اُن کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کر کے استعمال کیا جائے۔ یہاں بعض قانون دان اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ اس دفعہ کے نفاذ وعمل کے لیے صدرِ جمہوریہ کا حکم نامہ ہونا ضروری ہے۔ چونکہ دفعہ 345 کی رُو سے کسی زبان کو سرکاری اغراض کے لیے استعمال کا قانون نہیں

بنایا جاسکتا لیکن اُن حضرات کی تاویلات سے آندھرا پردیش، بہار اور دوسری ریاستوں میں جو بھی قانون ہے اُن کا کالعدم کرنا ناگزیر ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آئین کے دفعات انصاف کے حصول کے لیے راستہ تو بتاتے ہیں لیکن تفصیلات کا تعین حکومت پر منحصر ہے اور یہیں سے ہماری مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ گو کہ یہ پورے وطنِ عزیز کا المیہ ہے۔

جہاں تک اُردو کی ریاستی حیثیت کا تعلق ہے تو ریاست جموں وکشمیر کا اپنا ایک الگ آئین ''نیا کشمیر'' ہونے کی حیثیت سے اُردو کو جموں وکشمیر کی قومی، سرکاری، رابطے اور ذریعہ تعلیم کی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ گو کہ یہ خوش خیالی آئینی اعتبار سے ہی قابل ذکر ہے۔ ورنہ جہاں تک نفوذ وعمل کا تعلق ہے تو بیان حنقا ہو جاتا ہے گو کہ ریاست میں اُردو زبان کے داخل ہونے کے بعد سے ہی زبان کی تاریخ کے اوراق سنبھالتے ہی پنجاب یونیورسٹی کا نصاب یہاں لاگو کیا گیا، جس میں اُردو بحیثیت لازمی مضمون پڑھائی جانے لگی۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ 1872 کی ایڈمنسٹریشن رپورٹ اُردو میں مرتب کروائی اور اُردو کو افہام وتفہیم کی زبان کی حیثیت سے متعارف کروا کر سرکاری زبان قرار دیا اور سرکاری گزٹ اُردو میں شائع ہونے لگا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت کے بعد جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ریاست کی عنانِ حکومت سنبھالی تو انھوں نے نئے کانسٹی ٹیوٹ ایکٹ میں اُردو کو ریاستی اسمبلی کی زبان تسلیم کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔

1915 اور 1937 میں محکمہ تعلیم نے جہاں ساتویں درجہ تک کے لیے ذریعہ تعلیم ورنا کیولر رکھا تو وہیں بعد میں اسے لازمی قرار دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حکومت کا کام کاج اُردو ہی میں ہوتا تھا لیکن جب 1947 میں ملک تقسیم ہوا تو اُس کے دِل دوز تھپیڑوں سے زبان بھی دو چار ہوئے بنا نہ رہ سکی جس کی داستان نہایت تفصیل طلب ہے اور موضوع کو خفا دینے کے مصداق بھی۔ مختصر یہ کہ جب حالات میں تھوڑا سا استحکام پیدا ہو گیا تو ''نیا کشمیر'' آئین کے تحت اُردو کی حیثیت کا تعین از سرِ نو کیا گیا۔ چنانچہ دفعہ :19 میں اس بات کی صراحت کی گئی کہ نیشنل اسمبلی کے پاس کردہ قوانین اُردو زبان اور ریاست کی دیگر قومی زبانوں میں ریاست کے حکمران اور نیشنل اسمبلی کے صدر کے دستخط سے شائع کیے جائیں گے۔

دفعہ 37 کی رو سے عدالت عالیہ کی کاروائی ریاست کی بین الاقوامی زبان اُردو میں ہوگی اوراُس کے لیے ریاست کی دیگرقومی زبانیں بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ساتھ ہی ساتھ دفعہ 48 میں اس بات کوبھی باورکروایا گیا کہ اُردوزبان کوریاست میں بین الاقوامی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔وغیرہ۔ قانون کے اِن ناقدشُدہ خصوصی دفعات کااثر یہ ہوا کہ 1950 سے 1960 کی دہائی میں اُردوکی حیثیت کافی متوازن اورمضبوط رہی۔ حدتو یہ ہے کہ صدرِ ریاست کوانگریزی زبان میں خطبہ دینے سے یہ کہہ کر باز رکھا جاتا تھا کہ ریاست کی سرکاری زبان اُردو ہے۔گوکہ آج بھی ہم وہی اُردوبولتے ہیں اور بول کرمستفیدبھی ہورہے ہیں۔آج بھی اس اُردوکوہی سرکاری زبان ہونے کاشرف حاصل ہے۔ اگرحاصل نہیں ہے تووہ پاسداری نہیں، جواپنی ثقافت،تہذیب اورزبان کا آئین ہونے کاشرف بخشتی ہے۔اگرہم 1970 کے دِہے کے بعد کے منظرنامے پرنگاہ ڈالیں تویہ بات کُھل کرسامنے آتی ہے کہ ہماری زبان وثقافت اورتہذیب وتمدن کے آئین وحکمران کس قدرکم نظراور بےفکر ہیں۔بات صرف اُن لوگوں تک محدودنہیں رہتی بلکہ منتظمین بھی چاہے وہ سرکاری ہوں یا کہ غیرسرکاری،کوتاہ بین وناعاقبت اندیش عوامی ضروریات واحساسات سے بےخبرنظرآتے ہیں۔اس کے اثرات یہ مرتب ہوئے کہ انگلش میڈیم اسکولوں نے اُردونصاب کواپنے ہی گھرمیں بے گھرکردیا۔گوکہ جموں وکشمیرآئین ہند کے تحت ایک غیرہندی ریاست ہے لیکن اِس کے باوجوداُردوکوآئینی تحفظ اوّلیت کاتحفظ حاصل نہ ہونے کی وجہ سے انگریزی،ہندی اوراُردوتینوں ذریعہ تعلیم ہوگئیں۔ اُردو کے عدم تحفظ اورآئینی مقام اورمرتبہ میسرنہ آنے سے انگریزی کچھ اولیت کے مقام پرآگئی ہےاور بچوں کو جماعتی تعلیم کے آغاز سے پہلے ہی انگریزی کی تعلیم کابیڑا اُٹھایا جاتا ہےجس سے صاف ظاہر ہے کہ بنیادی جماعتوں میں بھی وہ اپنی زبان وثقافت سے بےبہرہ رہ جائیں گے اورہمیں اِس بات کاذرہ بھرخوف نہیں کہ اپنی قریبی زبان سے کٹ کر بچے کی شناخت قوتِ تمیزاورعلم نامکمل رہ جاتے ہیں۔انگریزی ایک اہم زبان سہی لیکن اچھے اُستاداورمناسب ماحول نہ ہونے کے پیش نظراس میں قدرت ودسترس حاصل نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ اپنے مافی الضمیرکاعمومی اظہاراُس میں ناممکن ہوجاتا ہے۔

جہاں تک ہمارے سرکاری دفاتر میں اُردو کو برتنے کا تعلق ہے تو یہ بات دوٹوک الفاظ میں کہی جاسکتی ہے کہ تحریری سطح پر اُردو ہمارے دفاتر سے عنقا ہو چکی ہے اور اکثر و بیشتر کام انگریزی میں ہوتا ہے۔ بازاروں، دُکانوں، اسٹالوں، چوراہوں، سڑکوں اور کاروباری مراکز سے اُردو رخصت ہو چکی ہے۔ گو کہ اُردو ایک لاوارث زبان کی حیثیت سے سخت جان ہونے کے ناطے زندہ ہے۔ ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے باوجود جموں وکشمیر تعلیمی بورڈ میں اس کی تحفظاتی ضمانت نہیں۔ اول زبان کے درجے پر یہ فائز نہیں۔ اُس پر طرہ یہ کہ اُردو سرکاری زبان ہے، ہماری زندگی ہے، ہماری ضرورت ہے، ہماری فکری اور نظری تسلسل کی داستان ہے۔ اُردو کے بغیر کسی منزل وسمت کا ادراک کرنا پانا مشکل راہِ سفر طے کر پانا محال لیکن اس کے باوجود وہی بے حسی ہے کہ جو تھی۔ گو کہ مادری زبان کی تحصیل بچوں کا آئینی حق ہے اور تکمیل شخصیت کی شرط۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک جٹ ہو کر بغض وعناد کی گتھیوں کو بالائے طاق رکھ کر، اس بات پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیئے کہ اُردو ہماری ریاستی زبان ہونے کی وجہ سے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا ایک منطقی تقاضا یہ ہے کہ اسے نہ صرف سیاسی، انتظامی اور تعلیمی اداروں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہ مقام دیا جائے جس کی یہ بجا طور پر مستحق ہے۔ خاص طور پر اسے تعلیم کی ہر سطح پر ذریعہ درس وتدریس بنانے کی ضرورت ہے تا کہ مختلف طلباء مضامین ومطالب کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور اُن کے ذہنوں پر ایک غیر ملکی زبان سیکھنے کا اضافی بوجھ نہ پڑے۔

اس کے علاوہ جن امور کو زبان کی بقا وارتقا کے لیئے رُو بہ عمل لانا ضروری ہے، اُن میں بعض حسب ذیل سطور میں مذکور ہیں۔

1۔ ریاستی حکومت کی ساری کاروائی براہِ راست اُردو میں منتقل کی جائے۔

2۔ ریاستی طلبا کو مناسب سطح تک اُردو پاس کرنے کی شرط ہو۔

3۔ ریاست کے ہر محکمہ میں درخواست اور اُس کا جواب اُردو میں دینے کی لازمی شرط ہو۔

4۔ ریاست میں اُردو اکیڈمی قائم کی جائے جو کہ ایک دیرینہ مانگ ہے جس سے اُردو پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ جوانوں کو روزگار مل سکے اور اُس کی شاخیں ہر ضلع ہیڈ کوارٹر پر کھولی جائیں۔

5۔ اُردو اساتذہ کے لیے مستقل ورکشاپ لگائے جائیں تاکہ وہ بھی اُردو کے مسائل سے آگاہی حاصل کرلیں۔

6۔ اُردو میں کتابیں شائع کرنے کے لیے ادیبوں کو مالی امداد فراہم کی جائے۔

7۔ ریاست میں ایک دارالترجمہ کی بنیاد رکھی جائے جس سے ادب میں یقیناً اضافہ ہوسکتا ہے۔

8۔ ریاست کے سبھی دفاتر، اسکول اور کالج وغیرہ کے سائن بورڈ، نوٹس بورڈ اور ربڑ کی مہریں وغیرہ انگریزی کے علاوہ اُردو میں بھی ہونی چاہیئے۔

9۔ محکمہ اطلاعات اور محکمہ تعلیم کے لیے اُردو میں کام کرنا اشد ضروری ہے۔ ان محکمہ جات میں انگریزی کے بجائے اُردو میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہونا چاہیئے۔

10۔ ریڈیو کشمیر جموں اور سرینگر میں قابل اُردو جاننے والے آرٹسٹوں کو اپنا جائز مقام دیا جائے تاکہ اُن کو بھی اپنی تخلیقات کا مظاہرہ کرنے کا موقعہ ملے۔

11۔ تحقیق کرنے والے حضرات کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے پوری پوری مالی امداد ملنی چاہیے تاکہ وہ اپنے تحقیقی مقالوں کو منظر عام پر لاسکیں۔

12۔ شعبہ اُردو جموں اور کشمیر یونیورسٹی کو زیادہ سے زیادہ رقومات فراہم کی جائیں تاکہ وہ سائنسی اور ٹیکنیکل نوعیت کی کتابوں کے تراجم کرواسکیں۔

13۔ ضروری قوانین، قواعد اور احکامات اُردو میں شائع کیے جائیں۔

حکومت سے سفارشات تو اور بھی ہیں لیکن اگر متذکرہ بالا سفارشات کو عملایا جائے تو بقول اقبال:

میں کہاں رُکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

ورنہ

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں نہیں نکلنے والی

المختصر یہ کہ حکومت کے ساتھ ساتھ اُردو والوں پر بھی ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل امور کو مدنظر رکھتے ہوئے اُردو کے اس قیمتی سرمایے کو تلف ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

1۔ اُردو والے اپنے بچوں کو اُردو کی تعلیم سے آراستہ کریں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اُردو کے حق میں آواز اُٹھانے والے محبانِ اُردو کے بچے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔

2۔ شادی کا دعوت نامہ انگریزی کے بجائے اُردو میں چھپوانا چاہیئے۔

3۔ اُردو والوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کے نام پپی ''بنٹی'' منو کے بجائے احمد، سلیم، عارف وغیرہ رکھیں۔

4۔ اپنے خطوط پر اُردو میں پتہ تحریر کریں۔

5۔ بینک سے پیسہ نکالتے وقت چیک یا ڈرافٹ اُردو میں کاٹیں۔

6۔ گھروں کے باہر انگریزی کے بجائے اُردو میں نام کی تختی آویزاں کریں۔

7۔ اُردو اخبارات خرید کر پڑھیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

8۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اُردو والوں کو اُردو سافٹ ویر سے واقف ہونا اشد ضروری ہے تاکہ وہ انٹرنیٹ سے اُردو کے بارے میں آگاہ ہو سکیں۔

آخر میں اُردو والوں کو خلوصِ دِل سے کام لینا چاہیئے تاکہ ادب کو دولت سے اونچا مقام حاصل ہو سکے۔ اُردو کی خدمت کرنا، ترقی دینا، چاہنا اور رہبری کرنا ہم سب کا اولین فریضہ ہے۔

○

اردو زبان: حال اور مستقبل

ڈاکٹر مشتاق احمد

ایڈیٹر ''جہانِ اردو'' رحم گنج، دربھنگہ

اکیسویں صدی سائنس اور ٹکنالوجی کی صدی ہے۔ جدید ایجادات اور جدید دریافتوں کے سبب روز نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سائنسی انکشافات، دریافتیں اور نئی نئی تحقیقات ابھی اپنی آخری منزل کو نہیں پہنچی ہیں بلکہ جب تک دنیا ہے اس وقت تک ایسے انقلابات ہوتے رہیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر وہ شئے جو آج انسان کی ضروریات میں شامل ہیں کل وہ بے کار ثابت ہو جائے اور اس کی جگہ کوئی اور دوسری ایجاد قابض ہو جائے۔ آج جدید سائنسی ٹکنالوجی نے دنیا کو جامِ جم میں تبدیل کر دیا ہے اور انسان کی زندگی کے تصور کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی جینے کی روش تبدیل ہوگی تو اس انقلاب سے اس کی تہذیب اور زبان بھی لازمی طور پر متاثر ہوگی۔ اس لیے اکیسویں صدی میں اردو زبان وادب کے سامنے بھی یہ ایک بڑا چیلنج ہے کہ آخر اردو زبان کس طرح بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرے۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبے میں

انقلاب برپا ہوگیا ہے اور جس کی شدت دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی ہے۔اب چوں کہ دنیا ایک بازار بن گئی ہے اس لیے ہر ایک میدان میں مقابلہ بڑھ گیا ہے اور جس کی وجہ سے روایتی زندگی کا توازن بھی یکسر بدل گیا ہے۔زبان وادب میں بھی کچھ اس طرح کی تبدیلی رونما ہورہی ہے۔ظاہر ہے جب زندگی جینے کے طریقے بدل رہے ہیں تو ہمارے وسیلۂ اظہارِ خیال یعنی زبان اور زندگی کا آئینہ ادب میں بھی ہماری تصویر بدلے گی اور ضرور بدلے گی کہ یہ ایک فطری عمل ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عالمی گاؤں کے پھیلتے ہوئے بازار میں چند زبانوں کی اجارہ داری قائم ہورہی ہے اور علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ کئی بڑی زبانوں کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ایک اندازے کے مطابق اکیسویں صدی میں دنیا کی نوے فی صد زبانیں اور بولیاں معدوم ہوسکتی ہیں۔حال ہی میں اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ 2500 سے زیادہ زبانیں اور بولیاں اپنا وجود کھونے والی ہیں جب کہ 234 زبانیں ختم ہوچکی ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ ماہرِ لسانیات ڈیوڈ کرسٹل نے اپنی کتاب Language Death میں یہ انکشاف کیا ہے کہ تقریباً 3340 زبانیں ایسی ہیں جنھیں بولنے والوں کی تعداد اب دس ہزار سے بھی کم ہے۔اور 1500 زبانیں ایسی ہیں جنھیں بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار تک محدود ہوگئی ہے اور 500 زبانیں ایسی ہیں جنھیں بولنے والوں کی تعداد سو سے بھی کم ہے۔اسی طرح کا خیال ایک ماہرِ لسانیات گنیش دیوی نے بھی ظاہر کیا ہے کہ گذشتہ پانچ دہائی میں 261 زبانیں اپنا وجود کھوچکی ہیں۔کچھ اسی طرح کا خدشہ معروف ادیب نارائنی گنیش نے اپنے ایک مضمون بہ عنوان Speech is part of our cultural identity مطبوعہ Times of India مورخہ 3 جنوری 2007 میں ظاہر کیا تھا کہ گلوبلائزیشن کی وجہ سے 3450 زبانیں اپنا وجود کھونے والی ہیں اور ڈاکٹر اروند کالا نے تو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دنیا میں ہر ہفتے ایک زبان مر رہی ہے۔

اتنا ہی نہیں کچھ ماہرِ لسانیات اس حقیقت کو تسلیم کرچکے ہیں کہ اکیسویں صدی کے آخر تک پوری دنیا میں صرف ایک درجن زبان زندہ رہ پائے گی۔جاپان میں بین الاقوامی لسانی کانفرنس

(1995) میں ماہرین نے اپنے ٹھوس دلائل سے یہ ثابت کیا تھا کہ دنیا کی 6760 معروف زبانوں میں 234 زبانیں دم توڑ چکی ہیں اور اگر ہم زبان کے تحفظ کے تئیں سنجیدہ نہیں ہوئے تو آنے والی صدی میں بڑا نقصان اٹھانا پڑسکتا ہے۔معروف ماہرِ لسانیات اینڈریو ڈیلی نے اپنی کتاب "Language in danger" میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا میں الگ الگ اسباب سے کچھ زبانوں کی بالادستی قائم ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے کچھ زبانیں سمٹ کر تاریکی میں جارہی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اکیسویں صدی ختم ہوتے ہی تقریباً 2500 زبانیں دم توڑ دیں گی اور یہ سب گلوبلائزیشن کی وجہ سے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ عالمیت کا مطلب ہی پوری دنیا کا ایک گاؤں میں تبدیل ہونا اور یہ تبدیلی صرف ساز وسامان کی تجارت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس عالمیت کے نام پر دنیا کی دوسری زبانوں کی پہچان کو گم بلکہ ختم کرنا بھی ہے۔ عالمیت کے پردہ میں ایک بار پھر ساری دنیا میں ذہنی طور پر غلام بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جیسا کہ انگریزی حکومت میں لارڈ میکالے نے کیا تھا۔ انگریزی کو گلوبلائزیشن کی زبان قرار دینے کے پسِ پردہ پوری دنیا پر انگریزی کو تھوپنے کی ایک سازش ہی تو ہے۔

غرض کہ بیشتر ماہرِ لسانیات کا خیال ہے کہ اکیسویں صدی میں دنیا کی ہر ایک بڑی زبان کے سامنے اپنے وجود کو بچائے رکھنے کا مسئلہ درپیش ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے تو یونیسکو کے ذریعہ جاری لسانی نقشے میں 1996ء میں ملک کی 1600 سے زائد زبانوں اور بولیوں کو خطرے کے دائرے میں رکھا گیا تھا۔ زبانوں کی بقا اور ترقی کے حوالے سے مذکورہ خدشات کی روشنی میں جب ہم اردو زبان کا جائزہ لیتے ہیں تو اس حقیقت کو تو قبول کرنا ہی ہوگا کہ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو کے سامنے بھی چیلنج ہے اور گلوبلائزیشن کے اس مقابلہ جاتی دور میں اردو کو بھی اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے ان تمام تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا جو اس عہدِ انقلاب کا تقاضہ ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زبان صرف ذریعہ اظہار ہی نہیں ہے بلکہ زندگی جینے کا پیمانہ بھی ہے۔ کسی زبان کو قبول کرنے کا مطلب ہے اس کی تہذیب وثقافت کو قبول کرنا۔ جیسا کہ

فش مین نے کہا تھا کہ ''زبان محض تبادلہ خیال کا ذریعہ نہیں، نہ ہی مختلف خیالات، نظریات کی، خواہ پوشیدہ ہوں یا واضح تر جمانی کا وسیلہ بلکہ زبان خود ایک مکمل مواد کی حیثیت رکھتی ہے، باقاعدہ طور پر سماج کی عکاس ہوتی ہے اور عوام کی معاشرتی حیثیت اور تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ زبان کے ذریعہ مختلف حالات اور سماجی اقدار ظاہر ہوتی ہیں''۔

بلاشبہ عالمیت کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبے میں انقلاب برپا ہوگیا ہے اور انسان کے زندگی جینے کے طریقے بدل گئے ہیں اور اس مقابلہ جاتی دور میں خوفناک قسم کی رقابت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ لسانی شعبے میں بھی کچھ اسی طرح کی رقابت پیدا ہو رہی ہے۔ ماہر سماجیات پروفیسر یوگیندر سنگھ نے گلوبلائزیشن کی وجہ سے زبانوں کے درمیان بڑھتی رقابت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''سماجی اور تہذیبی سطح پر ان کا فرق نمایاں ہو رہا ہے اور یہ عوامل اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے کو مربوط کرنے کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ زبانیں سماجی حرکت پذیری اور اندرونِ سماج نئے ڈھانچے تعمیر کرنے کا ذریعہ بنتی جا رہی ہیں۔ کشاکش اور چیلنج کا یہ عمل کسی بھی سماج میں اس رجحان کو پروان چڑھاتا ہے کہ وہ سماجی، لسانی سطح پر اتنی توانائی حاصل کرلے کہ نہ صرف شناخت بلکہ قانونی جواز کے اعتبار سے بھی اسے فوری اہمیت کا مسئلہ تصور کر لیا جائے''۔

اب سوال اٹھتا ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو کا حال اور مستقبل کیا ہے؟ ظاہر ہے مستقبل کے خاکوں میں رنگ حال کے تغیرِ فکر سے ہی بھرا جاتا ہے اور حال میں عالمی سطح پر جو روز نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان تبدیلیوں کے درمیان اردو اپنی جگہ بنانے کے قابل ہے یا نہیں، اس پر غور وفکر ضروری ہے۔ اس حقیقت کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا لازمی ہے کہ آج جو زبان بازار کی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کی قوت رکھتی ہے اور جس کا تعلق پیداوار اور مواصلات کے عمل سے ہے، جو معقولیت پسندی پر مبنی مہارت رکھتی ہے اور جسے صرف اس زبان کے بولنے والے کا ہی نہیں بلکہ مارکیٹ کا بھی سہارا ہے، اسی زبان کا مستقبل روشن ہوسکتا ہے کہ سائنس کا ایک اصول بقائے اصلح (Survival of the Fittest) ہے۔ یعنی باقی صرف وہی چیز رہتی ہے جو زمانے سے مطابقت پیدا کرلے ورنہ وہ اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ غرض کہ جو چیز عصرِ حاضر

کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی تو وہ اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ اس سلسلے میں چند ماہرِ لسانیات کا خیال ہے کہ وہ زبان جو زمانے کی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو اس کا فنا ہونا فطری عمل ہے لیکن بقائے اصلح نظریے کے حامی اس بنیادی نکتے کو فراموش کر دیتے ہیں کہ زبان نہ صرف سماجی یا تہذیبی حقیقت کو منعکس کرتی ہے بلکہ اسے جنم بھی دیتی ہے لہذا ایک زبان مرتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اس سے تعلق رکھنے والے تمام انسانی رسم ورواج اور عادات وخصائل بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت کی طرف اردو کے ایک ماہر زبان معین الدین نے بھی اشارہ کیا ہے۔

''زبان ترسیل وخیال کا ایک اہم وسیلہ ہے اور زبان اور فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے ذریعہ انسان کے شعور کی تربیت ہوتی ہے اور تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ زبان کے وسیلے سے ہی انسان گردوپیش کے ٹھوس حقائق کو تصورات کے پیکر میں ڈھالتا ہے اور تخیلات کی دنیا آباد کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ تجزیاتی فکر کی داغ بیل پڑتی ہے اور کبھی تخلیقی فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ فکر کی نشو ونما سے ذہنی نشو ونما کا گہرا تعلق ہے۔ زبان فرد اور سماج کے درمیان فعال رشتہ پیدا کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہے اور بہ حیثیت مجموعی شخصیت سازی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

کچھ اسی طرح کا خیال ہندوستانی زبان کے ایک ماہر ڈاکٹر سنتوش کمار کا کہنا ہے کہ زبان وسیلۂ اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ تقسیمِ معاش اور قوت پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ اور سماجی اتحاد وتہذیبی احساس کو بھی جگاتی ہے۔ ڈاکٹر کمار نے اپنے ایک مضمون ''Mind your language'' میں لکھا ہے:

> "Besides being a channel of communication, language influences distribution of power and wealth particularly in an under literate society. It also acts as an emotional and cultural cement for the social compact.

چوں کہ اردو اب صرف برِصغیر تک محدود نہیں بلکہ عالمی سطح پر اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے اور اب عالمی سطح پر اردو زبان دنیا میں بولی جانے والی چوتھی سب سے بڑی زبان بن گئی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے اندر ایسی قوت پیدا کی جائے جس کی بدولت عالمی بازار میں اس کی پکڑ مستحکم ہو سکے اور ایسا اسی وقت ممکن ہے جب اردو بدلتے

ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر سکے گی۔لہذا اکیسویں صدی میں اردو زبان کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو کی تعلیم کو ایک تحریک کی صورت دیں ساتھ ہی ساتھ اس کا رشتہ سائنسی ایجادات اور ٹکنالوجی کے انقلابات سے بھی جوڑا جائے تا کہ اردو آبادی اس احساسِ کمتری کے خول سے باہر نکل سکے کہ بغیر انگریزی کے ہماری دنیا سنور نہیں سکتی۔آج چین، جاپان، فرانس اور جرمنی کے ساتھ ساتھ یوروپ کے دیگر ممالک نے اس حقیقت کو سمجھا ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے سہارے بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتے اس لیے گلوبلائزیشن کے دور میں لسانی غلبے کے ردِعمل میں فرانس نے اپنی فرنچ زبان سے ان الفاظ کو نکال دیا ہے جو انگریزی سے لیے گئے تھے۔ ہمارے اردو معاشرے میں جن لوگوں کی ایسی سوچ ہے کہ انگریزی کے بغیر ترقی ناممکن ہے ان کو چین، جاپان اور جرمنی سے سبق سیکھنا چاہیے کہ ان ممالک نے اپنی اپنی زبان کی بدولت ہی تمام تر ترقیاتی منازل طے کیے ہیں۔

کچھ دنوں قبل برسلیز میں منعقد دو روزہ یورپی یونین کانفرنس میں یورپین امپلائرس ایسوسی ایشن (UNICE) کے صدر E.A. SEILLERE نے انگریزی میں تقریر شروع کی تو فرانس کے صدر مسٹر جے شراک نے انھیں مادری زبان میں ٹوکا کہ وہ انگریزی کیوں بول رہے ہیں اور جب مسٹر سلیر ے نے کہا کہ وہ انگریزی میں اس لیے تقریر کر رہے ہیں کہ تجارت کی زبان انگریزی ہے تو مسٹر شراک اپنے وزیروں کے ساتھ کانفرنس سے باہر چلے گئے اور اپنے واک آؤٹ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''فرانس اپنی زبان کی بڑی عزت کرتا ہے ہم آئندہ کسی ایسی دنیا کا تصور نہیں کر سکتے جس کی صرف ایک زبان اور تہذیب ہو''۔

غرض کہ شراک نے واک آؤٹ کر کے صرف اپنے لسانی تشخص پر اصرار ہی نہیں کیا بلکہ انگریزی کے تسلط کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے۔ کاش! مسٹر شراک کی طرح ہم برصغیر کے باشندے بالخصوص اردو والے بھی اپنی زبان کے تحفظ کے لیے اس طرح کا احتجاجی حوصلہ پیدا کر سکتے؟ لوگوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ اس عالم کاری کے دور میں انگریزی پڑھنے سے ہی اعلیٰ عہدوں کی ملازمت مل سکتی ہے۔ اگر انگریزی پڑھنے لکھنے اور سمجھنے سے ہی اچھی ملازمت ملتی تو برطانیہ اور امریکہ جیسے ممالک میں کوئی بھی شخص بے روزگار نہیں ہوتا۔ سچائی تو یہ ہے کہ انگریزی

کو فوقیت دینے والے ویسے ممالک ہیں جو ملک برطانیہ کے غلام رہے ہیں اور اب تک احساس کمتری کے شکار ہیں۔ ورنہ دنیا کے ایسے درجنوں ملک ہیں جو بغیر انگریزی کے سہارے ترقی کے بامِ عروج تک جا پہنچے ہیں۔

مختصر یہ کہ اکیسویں صدی میں اردو کے حوالے سے جب کبھی گفتگو کی جائے تو اس حقیقت کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ اس عالمیت سے مقابلہ کرنے کی ہمت اس زبان میں ہے کہ نہیں، کیوں کہ آج تعلیم برائے تعلیم ایک اذکارِ رفتہ تخیل بن کر رہ گیا ہے اور تعلیم برائے تہذیبی تشخص اور تعلیم برائے معاش کا تصور عام ہو گیا ہے۔ اس عالمیت میں ہر پانچ دس سال کے بعد حاصل شدہ علم کو بے معنی بنا رہا ہے۔ ایسے حالات میں اردو زبان کا حشر کیا ہوگا۔ کیا اردو صرف اپنے علاقے تک محدود ہو کر رہ جائے گی یا اس کے دائرے اور وسیع ہوں گے؟۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کا دائرہ بھی وسیع تر ہو رہا ہے کیوں کہ اردو بھی کمپیوٹر کی زبان بن چکی ہے اور گوگل کا سہارا بن چکی ہے۔ لیکن یہ اندیشہ تو بہر حال برقرار ہے کہ اس صارفیت کے دور میں جب ہر چیز کو نفع اور نقصان کے میزان پر پرکھا جا رہا ہے ایسے دور میں اردو کہاں ہے۔ کسی بھی زبان کی زندگی، ترقی اور بقا کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ تعلیم کا ذریعہ ہو، روزگار سے اس کا رشتہ ہو اور روز مرہ کے کاروبار اور دفتروں میں اس کا چلن عام ہو۔ جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے تو تقسیمِ ملک نے جس نفسیات کو جنم دیا اس سے اردو کو بھی بڑا نقصان پہنچا ہے۔ آزادی کے بعد اردو زبان کے ساتھ جو عصبیت اور تعصب و تحفظ کا رویہ شروع ہوا وہ ہنوز جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی یا ریاستی سطح پر لسانی پالیسی ترتیب دیتے وقت اردو کے تئیں تنگ نظر سیاسی رہنماؤں اور فرقہ وارانہ نظریہ رکھنے والے سرکاری حکام کا رویہ غیر منصفانہ ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے اردو کے فروغ کو خاصا نقصان ہوا ہے۔

اردو زبان کے متعلق ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ اردو صرف شاعری کی زبان ہے، ادب کی زبان ہے لیکن حقیقتاً اردو میں ہر قسم کے علوم و فنون سے متعلق مواد و معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ جدید تر اصطلاحات کی بھی کمی نہیں اور اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے روزگار کے مواقع بھی کم نہیں ہیں۔ غرض کہ اردو زبان میں وہ علمی اور فکری سرمایہ موجود ہے جس

کی بدولت ہم اس عالمی گاؤں میں جی سکتے ہیں اور ان طاقتوں کو اپنی گرفت میں لا سکتے ہیں جن کے ذریعہ ہم اپنی لسانی پسماندگی کا ازالہ کر سکیں۔ وہ دن گئے جب اردو میں صرف گل و بلبل کے قصے ہوا کرتے تھے، غمِ عشق اور غمِ روزگار کا تذکرہ لکھا جاتا تھا۔ آج اردو کمپیوٹر کی زبان بن چکی ہے اس میں سائنس، تاریخ، فلسفہ، نفسیات، سیاسیات، معاشیات غرض کہ تمام علمی خزینہ موجود ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل جو اردو سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے اس کو اردو کی تعلیم سے وابستہ کرنے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے اور اگر ہماری یہ کوششیں کامیاب ہوتی ہیں تو پھر اردو کا حال تابناک رہے گا اور مستقبل بھی قابلِ فخر ثابت ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ اردو کی تعلیم پر اتنی توجہ نہیں دی جا رہی ہے جتنی کہ اس عالمیت کا تقاضا ہے۔ آج سے دو تین دہائی پہلے تک اردو آبادی کے 90 فی صد طلبا اردو نہ صرف مادری زبان کے طور پر پڑھتے تھے بلکہ دیگر مضامین بھی اردو زبان میں پڑھتے اور لکھتے تھے لیکن آج حالات اس کے برعکس ہیں۔ دیگر سرکاری اسکولوں کی تو بات دور رہی اردو میڈیم اسکولوں میں بھی مشکل سے پانچ فی صد طالب علم ایسے ملیں گے جو غیر لسانی مضامین اردو میں پڑھتے اور لکھتے ہوں۔ ایسے نازک حالات میں اردو آبادی کے بچوں کو اردو ذریعہ تعلیم سے جوڑنے کی اشد ضرورت ہے۔ ورنہ غالب کے اشعار کتھک رقاصہ محترمہ اوما شرما کے رقص میں تو دکھائی دیں گے مگر ہمارے بچے کہیں گے کہ ''کوئی بتلاؤ کہ غالب کون ہے''۔

O

عالمی تغیرات اور تحفظ اُردو

شاہد لطیف

مدیر، روزنامہ انقلاب، پینسولا سینٹر، ڈاکٹر ایس ایس راؤ روڈ، مقابل مہاتما گاندھی ہاسپٹل، ممبئی

آج کی دُنیا اور بیس پچیس برس پہلے کی دُنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ فرق، اُس فرق سے کئی گنا زیادہ ہے جو بیس پچیس سال پہلے کی دُنیا اور اُس سے سو پچاس سال پہلے کی دُنیا میں تھا۔ گزشتہ رُبع صدی میں حالات اتنی تیزی سے بدلے ہیں کہ انسانی زندگی بھی حیرت انگیز تغیرات سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکی ہے۔ ہمارے اُٹھنے بیٹھنے، سوچنے سمجھنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، وقت گزارنے اور خرید وفروخت کرنے سے لے کر زندگی کے دیگر معمولات وترجیحات تک میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ آج کا انسان اتنا سماجی نہیں رہ گیا ہے جتنا کل تھا۔ آج کے انسان کے نزدیک تہذیب وثقافت کی اتنی اہمیت نہیں رہ گئی ہے جتنی کل تھی۔ آج کا انسان، انسانی قدروں کے تئیں اتنا حساس نہیں رہ گیا ہے جتنا کل تھا۔ آج کا انسان اتنا جذباتی بھی نہیں ہے جتنا کل تک تھا۔ بلاشبہ، گزرتے وقت کے ساتھ بہت کچھ بدلتا ہے اور ہر دور میں بدلا ہے لیکن جو تبدیلیاں اس دوران رونما ہوئی ہیں، گزشتہ صدیوں میں اُن کی دھمک بھی شاید محسوس نہیں کی گئی تھی۔

دُنیا کی نصف زبانیں خاتمے کے قریب

ان تغیرات بالخصوص تکنالوجی کی ترقی اور عالم کاری (گلوبلائزیشن) سے دور حاضر کا انسان چاہے جتنا مستفید ہو رہا ہو، تبدیلیوں کے اس چراغ تلے بھی کچھ کم اندھیرا نہیں ہے۔ یہ تبدیلیاں معاشرتی، ثقافتی اور لسانی خواص پر بڑے ناخوشگوار اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ دیگر کئی نقصانات کے ساتھ ساتھ ایک نقصان بلکہ نقصان عظیم یہ ہو رہا ہے کہ دُنیا بھر میں بولی جانے والی ۷ ہزار زبانوں میں سے تقریباً نصف قصۂ پارینہ ہو جانے کو ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق شمالی آسٹریلیا، وسطی جنوبی امریکہ، شمالی امریکہ، مشرقی سائبیریا اور جنوب مغربی امریکہ وہ علاقے ہیں جہاں زبانیں تیزی سے فوت ہو رہی ہیں۔ شکر ہے کہ اس فہرست میں وطن عزیز ہندوستان شامل نہیں ہے لیکن یہ کہنا کہ ہماری تمام زبانیں آج بھی اُتنی ہی قوت سے رائج ہیں جتنی کہ ماضی میں تھیں، درست نہیں ہوگا۔ جو شکوہ اہل اُردو کو اُردو کے تعلق سے ہے کہ اُردو معاشرہ اور زبان کا معیار رو بہ زوال ہے، وہی شکایت دیگر زبانوں کے لوگوں کو اپنی زبانوں کے تعلق سے ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہماری ترجیحات بدلیں اور ترمیم شدہ ترجیحات میں، بدقسمتی سے، زبانوں کی ترویج و تحفظ کی کوئی شق شامل نہیں ہے۔ جس طرح زبانیں آناً فاناً وجود میں نہیں آجاتیں اسی طرح وہ دیکھتے دیکھتے فوت بھی نہیں ہوتیں۔ جو زبانیں ہمارے درمیان ہیں وہ بولی اور سمجھی جا رہی ہیں، لکھی اور پڑھی جا رہی ہیں چنانچہ زندہ ہیں لیکن اُن کا معیار؟ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معیار متاثر ہوا ہے۔ زبانوں کی صحت دن بہ دن خراب ہوتی چلی گئی ہے۔ جن خاندانوں کو اپنی زبان پر ناز تھا، اُن میں وہ نسل آچکی ہے جو زبان کے تعلق سے زیادہ حساس نہیں ہے۔ کئی گھرانے ایسے ہیں جہاں والدین اُردو، ہندی، مراٹھی، گجراتی، تامل، کنڑ وغیرہ میں سے کم از کم ایک زبان بولتے ہیں لیکن اُس زبان کے بارے میں بچوں سے دریافت کیجئے تو کوئی خوش کن جواب نہیں ملے گا کیونکہ وہ کسی اور زبان عموماً انگریزی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اہل اُردو محسوس کرتے ہیں کہ مسئلہ صرف اُردو کا ہے۔ جی نہیں، مسئلہ دیگر ہندوستانی زبانوں کا بھی ہے اور دیگر ملکوں کی اُن زبانوں کا بھی جو

عالمی سطح پر بولی اور سمجھی جانے والی انگریزی سے نبرد آزما ہیں۔ کم یا زیادہ ساری زبانوں کی مقبولیت اور معیار متاثر ہوا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کل ان زبانوں کا کیا ہوگا۔ بے شک، یہ ''کل'' اتنی جلدی نہیں آئے گا لیکن یہ سمجھنا کہ ''کبھی نہیں آئے گا'' شاید خود کو بہلانے کی کوشش کے مترادف ہے۔

زبانوں کو زندہ درگور کرنے والے تغیرات ومحرکات

عالم کاری (گلوبلائزیشن)، شہریانے کا عمل (اربنائزیشن)، صارفیت، پوری دُنیا میں رابطے کی زبان کے نام پر ایک مخصوص زبان (انگریزی) کے تسلط کی کوشش، زبانوں کے تعلق سے یہ پروپیگنڈا کہ وہ محض اظہار کا وسیلہ اور ترسیل کا ذریعہ ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں، جیسے عوامل زبانوں کے لیے سم قاتل ثابت ہو رہے ہیں۔ مختلف ملکوں میں بولی اور سمجھی جانے والی اُن زبانوں کو بھی، جو کل تک بڑی زبانوں میں شمار کی جاتی تھیں، انگریزی سے خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ انگریزی کو عالمی رابطے اور ترقی کی زبان بنا کر پیش کیے جانے کی جدوجہد سے کئی ملکوں کے اُن خاندانوں کی نئی نسل انگریزی میں کشش محسوس کرنے لگی ہے جو اپنی زبان سے اس حد تک محبت کرتے تھے کہ دیگر زبانوں کے الفاظ استعمال کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی حیران کن ترقی بلاشبہ اس دور کا کارنامۂ عظیم ہے لیکن ہر نئی ایجاد کا جس نام سے تعارف کرایا جاتا ہے وہ عموماً انگریزی ہی کا کوئی لفظ ہوتا ہے۔ ریفریجریٹر سے لے کر موبائل تک اور ٹیلی ویژن سے لے کر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تک یا ان کے گاڑھے تکنیکی ناموں تک بہت کچھ انگریزی سے مستعار ہے۔ جتنی بھی جدید اشیا ہمارے روزمرہ کا حصہ بنی ہیں سب نے ہماری بول چال کی زبان میں انگریزی کے الفاظ داخل کر دیئے ہیں۔ یہ الفاظ اتنی سرعت کے ساتھ مقبول اور رائج ہوئے ہیں کہ ان کے نعم البدل کی تلاش بھی بے معنی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ مثال کے طور پر لفظ 'موبائل' جتنی تیزی سے عام ہوا اُتنی ہی تیزی سے یہ لفظ عوام قبول کر لیا گیا۔ اب آپ چاہیں کہ اس کا اُردو نعم البدل وضع کریں تو یہ حماقت قرار پائے گی اور لوگ باگ مضحکہ اُڑائیں گے کہ جب ایک لفظ (موبائل) اس حد تک رائج ہو گیا کہ

پوری دُنیا میں بولا جارہا ہے تو اسے ''اُردُ وانا'' چہ معنی دارد؟ ویسے بھی اہل اُردو ہر غیر اُردو لفظ کو یہ کہتے ہوئے جوں کا توں قبول کر لینے کے عادی ہیں کہ ہماری زبان کے مزاج میں اتنی لچک ہے کہ کسی بھی زبان کا لفظ اِس زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں ایسے ضم ہوجاتا ہے جیسے اسی زبان کا زائیدہ اور پروردہ ہو۔ اُردو میں جو لچک اور لوچ ہے اُس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن متبادلات کے نہ ہونے سے اُردو کا دائرہ بہرحال محدود ہورہا ہے کیونکہ معاملہ صرف ایجادات و انکشافات تک محدود نہیں۔ عالمی سطح پر کئی نظریات کی تفہیم بھی انگریزی زبان ہی سے مشروط ہوکر رہ گئی ہے۔ وہ چاہے کوئی سائنسی نظریہ ہو یا معاشی، اطلاعاتی تکنالوجی سے متعلق ہو یا کسی اور علم جدید سے۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ آپ سائنس یا تکنالوجی یا معاشیات کے کسی مضمون کا اُردو ترجمہ کرنا چاہیں تو معیاری ترجمہ مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہوگا۔ مثال کے طور پر بیلنس شیٹ کو آپ کیا کہیں گے اور کیسے سمجھائیں گے کہ یہ کیا بلا ہے؟ اور اگر آپ سمجھانے کی زحمت اُٹھانے لگے تو جس مضمون کا ترجمہ کرنا ہو وہ تو دھرا کا دھرا ہی رہ جائیگا! یہ ایک بہت چھوٹی سی مثال ہے۔ ہمیں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنا ہوگا کہ ہم نے اپنی زبان کو نئے دور کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کتنی کوشش کی۔ جب کوشش ہی نہیں ہوگی تو اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ ہم کمپیوٹر کو کمپیوٹر ہی کہیں اور بیلنس شیٹ کو بیلنس شیٹ ہی لکھیں ورنہ کوئی سمجھ ہی نہ پائے گا کہ کیا کہہ دیا اور کیا لکھ دیا۔ یہی ہورہا ہے۔ ہماری بول چال میں جو نئے الفاظ درآرہے ہیں وہ دیگر زبانوں بالخصوص انگریزی کے ہیں اور جو ہمارے اپنے الفاظ تھے اور اب بھی لغات میں موجود ہیں، ترک استعمال کا شکار ہیں، کوئی ان سے واقف ہو بھی تو استعمال نہیں کرسکتا کہ سمجھے گا کون؟

1990 کی دہائی میں ایک گھپلہ کئی ماہ خبروں میں رہا۔ وہ ہرشد مہتا کا ''سیکورٹیز اسکیم'' تھا۔ اس زمانے میں اسکیم (Scam) سے لوگوں کی اتنی واقفیت نہیں تھی اس لیے گھپلہ کہنے یا لکھنے میں کوئی تردد نہیں تھا لیکن ''سیکورٹیز''؟ جوں کا توں لکھ دیا جاتا تو اس کے جاننے والے محدود اور اگر اسے سمجھایا جاتا تو ایسا کرنا کارے دارد تھا۔ ہم نے اس کا اُردو متبادل تلاش کیا، تمسکات۔ یہ لفظ اچھا بھی تھا اور اپنا بھی لیکن سمجھتا کون؟ یہی وجہ تھی کہ اخبار میں چند دنوں تک

تمسکات کے استعمال کی سزا بھی بھگتنی پڑی، وہ یہ کہ اسے سمجھانا پڑا۔ مختصر یہ کہ ہمارے پاس الفاظ نہ ہوں ایسا بھی نہیں ہے لیکن اُن سے ہمارا رابطہ ہی نہیں رہ گیا ہے۔ دن بہ دن یہ خلیج بڑھتی جارہی ہے۔ اسی لیے، میری طرح یقیناً آپ بھی سوچتے ہوں کہ اب سے چند برس بعد ''یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز'' جیسے غالب کے مصرعوں کو کون سمجھ پائے گا؟ ویسے بھی ''نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا'' پڑھتے وقت لوگ باگ ''نقش'' کو اضافت کے ساتھ پڑھنے جیسے ادبی وشعری گناہ کا ارتکاب تو کرنے ہی لگے ہیں!!

دروغ برگردن راوی، آگے بڑھنے سے قبل یہ بھی بتاتا چلوں کہ ایک اسکول میں جب طالب علم نے اپنے اُستاذ سے پوچھا کہ ''جناب، راستی کسے کہتے ہیں؟'' تو اُستاذ محترم نے چند ثانیوں تک کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا: ''راستی؟ راستی نہیں جانتے؟؟ چھوٹا راستہ!!''

ٹی وی، ویڈیو، موبائل، انٹرنیٹ اور ایسے ہی دیگر آلات کے فوائد سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن یہ اور ایسی جادو اثر دلچسپیوں نے انسان کو اتنا مصروف کردیا ہے کہ اب اُن کے پاس لکھنے، پڑھنے، سیکھنے اور زبان کو بہتر بنانے کا وقت ہی نہیں رہ گیا ہے۔ نوجوانوں میں نئے آلات کے ذریعہ باہمی رابطہ کیلیے جو زبان استعمال ہورہی ہے وہ بھی چوں چوں کا مربہ ہے۔ اس میں اتنی بے دردی سے زبان کی کھال کھینچی جاتی ہے کہ نہ تو انگریزی سلامت رہ پاتی ہے نہ ہی اُردو یا ہندی محفوظ۔ اکثر اوقات ''ہرچہ آید درگھسیٹ'' کے مصداق جو لفظ جہاں سے مل جائے، استعمال کرلیا جاتا ہے۔ ایسے نوجوان کسی بھی زبان کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتے۔

صارفیت، عالم کاری اور شہریانے کا تیز تر عمل جہاں وقت کا دشمن ہے وہیں زبان وادب کو بھی نقصان پہنچا رہا ہے۔ نت نئی مصنوعات میں کشش محسوس کرنے والے ہزار ملیں گے تب کہیں جاکر کوئی ایک آدھ شخص کتاب سے دلچسپی رکھنے والا سامنے آسکتا ہے۔ ماضی میں، چھوٹے چھوٹے قصبات میں وقت کی فراوانی ہوا کرتی تھی۔ اب وہاں بھی شہروں جیسی صورت حال ہے۔ چائے خانوں، نکڑوں اور دُکانوں کی وہ محفلیں دم توڑ چکی ہیں جہاں چند لوگ مل بیٹھتے اور دُنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ انہی میں اخبار کی خبروں اور مضامین پر گفتگو یا کسی کتاب کے چند ایک مشمولات پر تبادلۂ خیال کا جو معمول تھا اب وہ بھی داغ مفارقت دے چکا

ہے۔ یہ محفلیں یا تو خالص کاروباری ہوچکی ہیں یا یہاں بھی سیریلوں، فلموں، برقی پیغامات اور نت نئے آلات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ گھروں کے بڑے، چھوٹوں کے ساتھ بیٹھتے بھی ہیں تو یا تو ٹی وی دیکھتے ہوئے، نئی مصنوعات پر گفتگو کرتے ہوئے، سیر سپاٹے کے پروگرام بناتے ہوئے یا وہاٹس ایپ یا فیس بک وغیرہ کے مشمولات پر خوش گپیاں کرتے ہوئے۔ زبان و ادب کی یہاں بھی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔

اُردو کی صورت حال

اُردو اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ اس کی دلآویزی، شگفتگی اور شیرینی بہت سوں کو دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ وہ لوگ بھی جو اُردو نہیں جانتے، اُردو کے شائقین میں شامل ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اُردو کی حالت دیگر متعدد زبانوں سے بہتر ہے لیکن اس حالت کو بہت اچھا بھی نہیں کہا جاسکتا۔ حقائق یہ سمجھانے کے لیے کافی ہیں کہ اگر اُردو کے تحفظ، اس کی ترویج، اسے نئی تکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے اور اسے روزگار سے جوڑنے کی کوشش ہر ممکن سطح پر نہیں کی گئی تو اس کا دائرہ جو محدود ہوتا چلا گیا ہے، محدود تر ہوجائیگا۔ اُردو کی تدریس اپنی آب و تاب کھوچکی ہے، اُردو کی محفلیں اُجڑتی جارہی ہیں، اُردو کے رسائل و کتب کی جو حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، اُردو اور روزگار میں بعدالمشرقین سا ہوگیا ہے، اُردو کو حاصل سرکاری مراعات کی زیادہ سے زیادہ اثر پزیری بنوز ایک معمہ ہے (سوائے چند ایک اداروں کے جن کے ارباب اقتدار نئے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے منصوبے بناتے اور انہیں روبہ عمل لاتے ہیں)، اُردو کا صحیح املا، اُردو کے صحیح تلفظات، اُردو اشعار کی صحیح قرأت، اُردو کے کلاسیکی شاعروں اور ادیبوں سے خود اُردو عوام کی وسیع تر واقفیت وغیرہ کی صورت حال بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ نئے علوم کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے کی رفتار بھی انتہائی سست ہے۔ اُردو تہذیب کتابوں تک محدود ہوگئی ہے۔ اُردو کو ہر خاص و عام تک پہنچانے کا سب سے مؤثر ذریعہ (مشاعرے) اپنی ادبی خصوصیات سے عاری ہوتے جارہے ہیں اور سو باتوں کی ایک بات یہ کہ نئی نسل اُردو سے دور ہو رہی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کو چھوڑ کر جن دیگر ملکوں میں اُردو بولی، لکھی اور پڑھی

جاتی ہے وہ اُن تارکین وطن کی مرہون منت ہے جو اُن ملکوں میں آباد ہیں۔ وہ نشستیں برپا کرتے ہیں، مشاعرے منعقد کرتے ہیں، اُردو رسائل و جرائد جاری کرتے اور جاری رکھتے ہیں لیکن یہ ساری رونقیں اُن ہی کے دم خم سے ہے۔ اہل اقتدار سے اہل اُردو کا تعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ یا تو خوش ہوتے ہیں یا ناراض ہوجاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اُردو کی صورت حال کا بڑا تعلق اُس طرز عمل سے ہے جو اہل اردو نے اپنا رکھا ہے۔ راقم محسوس کرتا ہے کہ اہل اُردو نے اُردو سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ لینے کی کوشش کی ہے، وہ چاہے تنخواہ کی شکل میں ہو یا شہرت ومقبولیت کی شکل میں۔ جہاں تک کچھ دینے کا سوال ہے، بہت کم لوگ ہیں جو زبان کو اپنی جانب سے کچھ دیتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ جو لوگ بڑی کتابیں لکھتے ہیں وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو کو فیض پہنچا رہے ہیں جبکہ وہ اس کے برعکس کر رہے ہوتے ہیں۔

کرنے کے کام

الغرض، اُردو کی حالت فی الوقت اُس مریض کی سی ہے جسے شافی غذا اور دوا میسر آجائے تو وہ جی اُٹھے گا لیکن اگر اس کی جانب سے غفلت برتی گئی تو اُس کا بقید حیات رہنا مشکل ہے۔ اس لئے پوری اُردو دُنیا کو فوراً سے پیشتر اُن کاموں کیلئے کمربستہ ہونا ہوگا جن سے اُردو کو جلا مل سکتی ہے۔ اکابرین اُردو کو ایک لائحہ عمل مرتب کرنا اور یہ سمجھانا ہوگا کہ کون سے کام کس سطح پر ہونے چاہئیں، مثال کے طور پر تدریسی سطح پر کیا ہو، لسانی سطح پر کیا ہو، صحافتی سطح پر کیا ہو، کون سے کام اہل اُردو کو خود انجام دینے ہوں گے، کون سے حکومتوں اور سرکاری اداروں سے کروانے ہوں گے وغیرہ۔

یہاں چند کاموں کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) اُردو کی تدریس کو بہتر بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ کلاس رومس میں بہتر انداز میں اُردو پڑھائی جائے، صحیح اُردو پر اصرار ہو، طلبہ میں اُردو کا شوق اور ذوق پیدا کیا جائے، اُنہیں کلاسیکی شعرا و ادبا سے روشناس کرایا جائے خواہ اُن کا نصاب میں تذکرہ ہو یا نہ ہو، اُردو کی اچھی کتابوں کی معلومات اُن تک پہنچائی جائے، اُنہیں الفاظ اور اشعار یاد

کرنے کی ترغیب دی جائے، اُن میں لغت دیکھنے کا شعور پیدا کیا جائے اور اس کی عادت ڈلوائی جائے اور ایسی ہر سرگرمی کا اُن میں جذبہ پیدا کیا جائے جو اُنہیں اُردو کا سپاہی بنا سکے۔

(2) اُردو زبان کی تدریس کا فریضہ انجام دینے والے اساتذہ کو اپنی ذمہ داریوں کے تئیں حساس بنانے کیلئے اُردو کے سرکردہ ادارے کوئی ایسا پروگرام مرتب کریں جس سے تدریسی عمل زیادہ مؤثر ہو سکے۔

(3) اُردو کی تدریس ہی کے سلسلے میں یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اہل اُردو علاقائی یا ریاستی سطح پر ایسی کمیٹیاں تشکیل دیں جن کی ذمہ داری یہ معلوم کرنا ہو کہ کن اداروں میں اُردو کی تعلیم و تدریس کا کیا حال ہے۔ جن اداروں میں اُمید افزا صورت حال ہو، کمیٹی اُن کی خدمات کی ایماندارانہ تائید کرے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرے۔

(4) اگر یہ طے ہے کہ غیر ادبی مشاعروں کو روکا نہ جا سکتا تو ادبی محفلوں کو فروغ دیا جائے اور اخبار میں اعلان شائع کروانے کے علاوہ یہ زحمت بھی اُٹھائی جائے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت کو یقینی بنانے کیلئے جدید ذرائع ابلاغ خاص طور پر سوشل میڈیا کا استعمال کیا جائے۔

(5) اُن لوگوں کو اُردو کا اثاثہ سمجھا جائے جو اُردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن اُردو اُنہیں بھی معلوم ہوتی ہے اس لئے وہ اس زبان سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے ذریعہ بھی اردو کو دیگر زبانوں کے لوگوں میں عام کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے جس کیلئے یہ بہی خواہان اُردو، اپنی خدمات ضرور پیش کریں گے۔

(6) اُردو ویب سائٹس، اُردو ای میل، اُردو بلاگ، اُردو ای بک، اُردو ای میگزین اور ایسی ہی جدید سہولتوں سے اُردو کیلئے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں لیکن اب تک اُردو کو دیگر زبانوں جیسی تکنیکی تقویت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ تکنیکی ماہرین کی ایک ''اسپانسرڈ ٹیم'' کو یہ کمی دور کرنے پر مامور کیا جا سکتا ہے۔

(7) اُردو اصطلاحات و متبادلات پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم

دیگر زبانوں بالخصوص انگریزی کے الفاظ دھڑلے سے قبول کرتے چلے جائیں اور اپنی عدم توجہی یا تن آسانی کو اُردو کی فراخدلی کا نام دیں۔

(8) اُردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو نئی تکنالوجی کے ذریعہ عام کرنے پر توجہ دی جائے تاکہ دیگر زبانوں کے لوگ سن کر یا دیکھ کر اُردو کی طرف راغب ہوں اور اس زبان سے محبت کرنے والے بن جائیں۔

(9) برقی ذرائع ابلاغ بالخصوص الیکٹرانک میڈیا پر اُردو کے غلط استعمال کی جانب سے خاموشی ٹھیک نہیں۔ اس کیلئے متعلقہ اداروں کو متوجہ کرنا اور اُنہیں حساس بنانا بھی اہل اُردو کی ذمہ داری ہے۔ کاش، اُردو والے ''جذبات کو جذباتوں''.....''مخالفت کو خلافت'' اور ''علماء کو علماؤں'' کہنے والوں کو دل سے بُرا کہنے کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت عملی کوشش بھی کرتے! برقی ذرائع ابلاغ سے پہلے اس جانب خود اہل اُردو کی توجہ مبذول کرانا بھی ایک کام ہے تاکہ اُن میں مثبت ردعمل کی ضرورت کا احساس پیدا ہو۔

(10) اُردو کے اُن غیر ملکی اداروں کی پزیرائی ضروری ہے جو اُردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کررہے ہیں مثلاً بی بی سی اُردو، وائس آف امریکہ، وائس آف جرمنی (ڈچیز ویل/ڈی ڈبلیو)، وائس آف جاپان (این ایچ کے ورلڈ)، وائس آف رشیا (صدائے روس) وغیرہ۔

مجھے اُمید ہے کہ اُردو کی قدآور شخصیات کی موجودگی میں یہ سہ روزہ کانفرنس اُردو کی عالمی ترویج وترقی اور اکیسویں صدی میں اُردو کے سماجی وثقافتی فروغ کا وہ لائحہ عمل مرتب کرنے میں کلیدی کردار ادا کرے گا نیز اہل اُردو کو یہ پیغام دے گا کہ رونا رونے کے بجائے ٹھوس عملی اقدام ہر اُس شخص کی ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے جو اس زبان سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔

○

اکیسویں صدی میں اردو طنز و مزاح

نصرت ظہیر، دہلی

گزری ہوئی بیسویں صدی کے مجھ جیسے گزرے ہوئے شخص سے — بلکہ گئے گزرے شخص سے یہ کہنا، کہ اکیسویں صدی میں اردو طنز و مزاح کی صورت حال کیا ہے اور کیسی ہے یہ بات کم و بیش ایک ہزار لفظوں میں پھیلا کر بتاؤ، بالکل ایسا ہے جیسے کسی سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنی کمر کچھ دیر تک آپ ہی کھجائے، اور کسی زخم کے بھرنے سے پہلے ناخن بڑھ آئے ہوں تو خود ہی لہولہان بھی ہوتا رہے۔ میرا شمار چونکہ اسی برادری میں ہونے لگا ہے جس پر طنز و مزاح نگاری کا الزام عائد ہوتا ہے اس لیے اس سوال کا صحیح جواب دینا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ہاں غلط جواب دینے میں کچھ مشکل نہیں۔ مثلاً اگر میں کہوں کہ اردو میں طنز و مزاح کا حال اور مستقبل بے حد تاب ناک اور بہت ہی روشن ہے تو یہ جملہ اتنا آسان، سادہ اور بالکل سہل ممتنع قسم کا ہے کہ اسے لکھنے میں بمشکل پندرہ سیکنڈ لگیں گے۔ بلکہ اگر میں اس جملے سے پہلے دلیل کے طور پر اپنے پسندیدہ لوگوں کے نام بہترین طنز و مزاح نگاروں میں شامل کرلوں اور ذاتی طور پر ناپسندیدہ طنز و مزاح نگاروں کے نام ارادتاً بھول جاؤں تو اس سے نہ صرف میری پی آر شپ

بہتر ہو جائے گی بلکہ کئی طرح کے فائدوں کا امکان بھی کھل جائے گا۔

اس پر بھی آپ بضد ہوں کہ میں صحیح جواب دے کر اپنی عاقبت کو خطرے میں ڈال ہی لوں تو صرف اتنا کہوں گا کہ اکیسویں صدی میں اردو طنز و مزاح کی صورت حال تقریباً ویسی ہی سمجھئے جیسی خود آج کل مجھے اپنی نظر آنے لگی ہے۔ دم جھڑ گئی پر اڑ گئے پھرتے ہیں لنڈورے۔ باقی چیزوں کو چھوڑ کر صرف سر پر ہی غور فرمالیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ اس سر اور اردو طنز و مزاح کے موجودہ حالات لگ بھگ ایک جیسے ہو گئے ہیں۔ سیاہی معدوم ہو چلی ہے اور سفیدی مسلسل پھیلتی جا رہی ہے۔ یہی حال اردو طنز و مزاح کا ہے جس میں قلم کی روشنائی کم ہو گئی ہے اور کاغذ کی سفیدی میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ جو تحریریں اس کاغذ پر نظر آتی بھی ہیں تو انھیں پڑھ کر تبسم زیر لب بھی طلوع نہیں ہوتا۔ میکلینس کی مسکان اور کولگیٹ کی ہنسی تو بہت دور کی بات ہے!

ہمارے کچھ طنز و مزاح نگار ایسے ہیں جو لکھ لکھ کر صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتے ہیں پھر بھی ان صفحوں میں کچھ نہیں کہتے۔ چنانچہ میں بھی انھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ ایک اور چھوٹا سا قبیلہ اُن ریٹائرڈ گان کا ہے جو اپنے گملوں اور کیاریوں کو پانی دینے اور خالص مسوڑھوں کی مالش جیسے اعمال بزرگانہ سے فارغ ہونے کے بعد سوچتے ہیں کہ چلو بچے ہوئے وقت میں طنز و مزاح نگار ی کر لی جائے تاکہ کچھ تو اردو کی خدمت ہو سکے۔ کاش کوئی ان بزرگوں کو سمجھا سکتا یا سمجھا سکتی کہ محترمی اگر آپ اپنے طنز و مزاح بالجبر کی تخلیق میں ضبطِ تولید کے جذبے سے کام لیں یا اس کام سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو کر اپنی تخلیقی توانائیوں کو گملوں کی آبیاری اور مسوڑھوں کی مالش تک محدود فرمالیں تو یہ واقعی اردو کی خدمت ہو گی جس کے لیے یہ مظلوم زبان ہمیشہ آپ کی احسان مند رہے گی۔

تقریباً اسی طرح کا حال ان حضرات کا ہے جو پارٹ ٹائم طنز و مزاح نگار بن کر گیسوئے اردو ادب کو الجھا رہے ہیں۔ شاید ان ہی حضرات کو دیکھ کر کہا گیا ہوگا کہ گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے۔ بدقسمتی سے میرے ایک ایسے دوست بھی ان میں شامل ہیں جن کا سرِ اقدس پوری طرح بے نیازِ شانہ ہو چلا ہے۔ وہاں نہ قلم کی روشنائی ہے نہ کاغذ کی سفیدی۔ بس ایک لق

ودق چٹیل میدان ہے۔ اس کے باوجود اُن کا شمار طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ اگر چہ شروع میں ایسا نہیں تھا۔ بالائی منزل پر اتنی زرخیزی ضرور تھی کہ خضاب کی شیشی پورے مہینے چل جائے۔ لیکن جیسے جیسے ان کے گنج گراں مایہ کا رقبہ بڑھا شیشی کا وقفہ ودورانیہ طویل تر ہوتا گیا۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ انھوں نے سر پر تو اس شیشی کا استعمال کم کر دیا ہے البتہ اُس قلم میں خوب کرنے لگے ہیں جس سے وہ طنز و مزاح تخلیق فرماتے ہیں۔ چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ ان کی خضاب آلود تحریریں پڑھتے ہیں اور کھلکھلا کر رو دیتے ہیں۔ خود مجھے بھی جب ان کے قلم کا خیال آتا ہے تو اُس کی شان میں مرحوم نازش پرتاپ گڑھی کی شہرہ آفاق نظم کے مصرعے یاد آجاتے ہیں کہ:

مرے قلم کو مرے ساتھ دفن کر دینا
کہ یہ عذاب نئی نسل تک نہ جا پہنچے

ایک اور صاحب ہیں جنھیں میں اردو طنز و مزاح کا حرفِ آخر مانتا ہوں۔ ان کے چہرے پر کچھ ایسی ہولناک اداسی اور خوف ناک سنجیدگی چھائی رہتی ہے کہ اچھا خاصا آدمی پہلی ہی ملاقات میں بھوں بھوں کر کے رو اٹھے۔ یعنی روئے اور اٹھ جائے۔ طنز و مزاح لکھتے وقت موصوف اس قدر محتاط رہتے ہیں کہ مجال ہے جو کسی جملے سے ذرا سی بھی مسکراہٹ خارج ہو جائے۔ قاری جب ان کا مضمون پڑھتا ہے اور مسکرانے کے بہانے ڈھونڈتے ہوئے کہیں پر ایسی سچویشن آتی ہے جہاں اسے یہ لگے کہ بس اب یقیناً کسی جملے سے ہنسی پھوٹ بہے گی وہیں پر مصنف جملے کو ادھورا چھوڑ دیتا ہے اور قاری ان کی کتاب کو۔ اچھی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی کتاب چھاپنے کے بعد کوئی اور کتاب نہیں چھاپی۔ میں سمجھتا ہوں اردو زبان اس احسان کو بھی ہمیشہ یاد رکھے گی۔ مجھ سے کوئی پوچھے تو پوری ذمہ داری سے عرض کروں گا کہ اکیسویں صدی میں اردو طنز و مزاح کو فروغ دینے کے ایوارڈ کا کوئی سچا حق دار ہے تو وہ یہی حضرت ہیں۔ اگر ایوارڈ نہیں تو کم از کم ایک سپاس نامہ انھیں ضرور پیش کر دینا چاہیے کہ آنجناب نے اپنے مضامین کا نیا مجموعہ نہ چھاپ کر اردو زبان و ادب کے فروغ کی راہ میں جو قربانی دی ہے اس سے اردو کی آئندہ نسلیں تا قیامت مستفید ہوتی رہیں گی۔

خیر، دل لگی کی باتیں تو ہو چلیں اب ذرا دل کی لگی کا ذکر ہو جائے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اور سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ جس زبان میں طنز و مزاح کی روایت سیدھے خسروِ شیریں سخن سے شروع ہوتی ہو اور ان کے پاؤں دھو کر پینے والے غالب کو جس زبان میں نثری طنز و مزاح نگاری کا باوا آدم مانا گیا ہو اس پر یہ کیسی افتاد آ پڑی ہے کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے کاروانِ طنز و مزاح مختصر سے مختصر ہوتا جا رہا ہے۔ رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، پطرس بخاری، حاجی لق لق، شوکت تھانوی، شفیق الرحمن، ابن انشا، فکر تونسوی، کنھیا لال کپور، راجہ مہدی علی خاں اور مشفق خواجہ جیسے طنز و مزاح کے چاند ستاروں کو بیسویں صدی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس کے بعد جب اکیسویں صدی آئی اور بشارت دی گئی کہ یہ انٹرٹینمنٹ کی صدی ہو گی تو امید بندھی کہ شاید اردو طنز و مزاح کو بھی اس سے فروغ حاصل ہو جائے۔ لیکن افسوس۔ اس صدی کا پہلا عشرہ ختم ہوئے بھی چار سال گزر گئے ہیں اس کے باوجود اردو کا کوئی نیا طنز و مزاح نگار پیدا ہونے کی اطلاع کم از کم مجھ، اوسط درجہ قاری کو اب تک نہیں ملی ہے۔ میں نہیں جانتا اردو میں طنز و مزاح نگاری کے معیار و مقدار میں مسلسل گراوٹ کے اسباب کیا ہیں۔ تحقیق و تنقید کے لوگ اس پر زیادہ روشنی ڈال سکیں گے اور امید ہے کہ اس سیمینار میں تنقید و تجزیے کے جو اجلاس ہونے والے ہیں ان میں کچھ مقالے ضرور اس موضوع سے بھی انصاف کریں گے۔ مجھے تو صرف یہ دکھائی دے رہا ہے کہ کم از کم ہندوستان کی حد تک اردو میں طنز و مزاح کا مستقبل قطعی روشن نہیں ہے۔ ہاں پاکستان میں حالات نہ صرف مختلف بلکہ حوصلہ افزا بھی ہیں۔ وہاں قصہ مشتاق یوسفی پر ختم نہیں ہوا ہے۔ ان کے بعد لکھنے والوں میں نہ صرف یونس بٹ، عطاالحق قاسمی اور خالد اختر مورچہ سنبھالے ہوئے ہیں بلکہ ان کے بعد کی بھی ایک نسل مزاح نگاروں کی تیار ہو رہی ہے جس میں گل نوخیز اختر نے اپنا الگ مقام بنا لیا ہے۔ اس نوعمر مزاح نگار نے ایک طنزیہ مزاحیہ ناول لکھ کر اردو مزاح میں اپنی خاص جگہ محفوظ کرا لی ہے۔ اگرچہ اس ناول کا نام بڑا بچکانہ سا ہے، 'ٹائیں ٹائیں فش!' لیکن اس کے نثری اسلوب، ہیئت اور ٹریٹمنٹ میں اس قدر تازگی اور انفرادیت ہے کہ انٹرنیٹ پر اس ناول نے خود کو مجھ سے صرف ایک نشست میں پورا پڑھوا لیا۔ اس میں، خالص مزاح بھی ہے، پولیٹکل سیٹائر بھی ہے، طبقاتی مزاج و نفسیات

سے ابھرنے والے قہقہے بھی ہیں، جذبات و احساسات کی لطیف بیانی سے مرتعش ہونے والی مسکراہٹیں بھی ہیں اور خوشی و غم کے تصادم و ادغام سے پیدا ہونے والی وہ شبنمی اداسی بھی ہے جو زندگی کے حوصلوں کو مضمحل یا شل نہیں کرتی بلکہ توانائی بخشتی ہے اور زندگی کا عرفان کراتی ہے۔ان سے عمر میں کچھ بڑے یونس بٹ نے پہلے سے ہی پاکستان میں دھوم مچا رکھی ہے اور وہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں میں اپنی دھاک جمائے ہوئے ہیں۔ انور مسعود ان سب سے سینئر ہیں اور شعری طنز و مزاح میں ان سے بڑھ کر فی الحال پاکستان میں کوئی نہیں۔ان کے ہم قافیہ اور ہم عصر انور مقصود مزاح نگاری میں کمال پیدا کیا ہے لیکن وہ اسکرپٹ اور ٹی وی شوز کی دنیا میں زیادہ سرگرم ہیں۔ یہی حال گل نوخیز اختر کا ہے جن کا قلم کاغذ پر کم اور ٹی وی اسکرین پر زیادہ چل رہا ہے۔ان جیسے بالکل نئی اور نوعمر نسل کے اور بھی کئی مزاح نگار پڑوسی ملک میں موجود ہوں گے جن کے نام ادب پاروں کی ترسیل میں حائل رکاوٹوں کے سبب ہم تک نہیں پہنچے ہیں۔

لیکن اپنے وطن میں تو ترسیل کی ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں کہ طنز و مزاح لکھنے والی مخلوق کو ڈھونڈنے میں مشکل پیش آئے۔ یہاں کرناٹک کے کسی شہر میں، مہاراشٹر کی کسی اردو بستی میں، بہار کے کسی غیر معروف علاقے میں دور بین سے ڈھونڈیں تو شاید پانچ سات لوگ ہاتھ آجائیں۔لیکن ان میں سے بیشتر کی تحریروں میں آپ کو خورد بین سے ڈھونڈنے پر بھی طنز و مزاح نہیں ملے گا۔حیدرآباد میں بھی جسے طنز و مزاح نگاروں کا مکہ سمجھا جاتا رہا ہے، حالات خراب ہیں۔مجتبیٰ حسین عمر کی ان منزلوں میں ہیں جہاں تخلیق کار صرف صدارت اور سرپرستی کے لائق رہ جاتا ہے۔ پوری دنیا میں اردو طنز و مزاح کا سب سے طویل العمر ماہنامہ 'شگوفہ' ثابت قدمی سے ضرور چل رہا ہے اور گزشتہ چھیالیس برسوں سے مسلسل، کسی ناغہ کے بغیر اب تک پابندی سے شائع ہوتا ہے، لیکن تا بہ کے؟ سارے کا سارا دن مین شو ہے۔ جناب مصطفیٰ کمال کے ہاتھ پاؤں میں جب تک دم ہے، تب تک شگوفہ بھی کھلتا اور مہکتا رہے گا۔ مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر اور سلیمان خطیب جیسے بزرگوں نے طنز و مزاح کا جو کارواں حیدرآباد میں کھڑا کیا تھا وہ کبھی کا منتشر ہو چکا۔ نئے لکھنے والے حیدرآبادیوں میں بس ان

کے نام آپ ضرور لے سکتے ہیں جو شگوفہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

یہ سبھی باتیں میں نے لاشعوری طور پر صرف نثری طنز و مزاح کے بارے میں کہی ہیں۔ لیکن غور کیجیے تو شعری طنز و مزاح کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ اکبر الہ آبادی اور دلاور فگار کے بعد کوئی اور اس پایہ کا تخلیق کار شعری طنز و مزاح کے آسمان پر جلوہ فگن نہیں ہوا ہے جس نے منظر کو بدل کر رکھ دیا ہو۔ البتہ مشاعروں کی اسٹیج پرفارمنس نے مزاحیہ شاعری اور شاعروں کی بڑی حد تک حفاظت کی ہے اور کم از کم اس صنفِ ادب کو ابھی تک ناپید ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مشاعروں میں ان شعرا کی تعداد پہلے بھی آٹے میں نمک کی طرح ہوا کرتی تھی اور آج بھی کم و بیش وہی صورت حال ہے۔ تاہم حیدرآباد اس معاملے میں خاصا آگے ہے۔ وہاں مزاحیہ شاعر آج بھی خاصی تعداد میں ہیں اور زندہ دلان حیدرآباد کی تقریباً نصف صدی پرانی تنظیم صرف مزاحیہ شاعروں کا مشاعرہ بھی بڑے آرام سے کرا لیتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ مشاعرے ٹکٹ لگا کر کیے جاتے ہیں پھر بھی تقریباً آدھا حیدرآباد ان میں شرکت کے لیے امڈ پڑتا ہے۔ حضرت امیر خسرو نے شعری طنز و مزاح کی جو شمع روشن کی تھی اس سے روشنی پانے والے چراغوں کا سلسلہ میر جعفر زٹلی، نظیر اکبرآبادی، اکبر الہ آبادی، دلاور فگار، سید محمد جعفری، رضا نقوی واہی جیسے تخلیق کاروں سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اور اکیسویں صدی میں بھی یہ سیل نور بہتا رہ سکتا ہے بشرطیکہ مشاعروں کا کمرشیلزم اور اسٹیج شو کی ضرورتیں اس کی چمک اور معنویت کو اس طرح نہ کھا جائیں جس طرح ہمارے کئی مزاحیہ ٹی وی شوز میں ایک سردار صاحب جھوٹے قہقہے لگا کر کھا جاتے ہیں۔ ظاہر ہے پرائیویٹ ٹی وی چینل ان صاحب کو لطیفے بازی کے پروگراموں میں اس لیے شریک کرتے ہیں تاکہ انھیں ہنستا دیکھ کر ناظرین کو بھی ہنسی آجائے اور چینل کی ٹی آر پی بڑھتی رہے۔ میرا خیال ہے پروگرام میں چیئرس لیڈر کے طور پر ان کا جو چیک بنتا ہوگا اس کی رقم کا حساب اُن کے قہقہوں کی تعداد دیکھ کر لگایا جاتا ہوگا۔ تبھی تو موصوف ایک ایک لطیفے پر چار چار قہقہے لگا دیتے ہیں۔ بلکہ کئی بار تو یہ دیکھنے میں بھی آیا ہے کہ لطیفہ شروع ہونے سے پہلے ہی حضرت کا قہقہہ شروع ہو جاتا ہے۔

اردو طنز و مزاح نگاری میں مقدار و معیار کی زوال پذیری پر میں جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی اپنے اس خیال پر میرا یقین پختہ ہوتا جاتا ہے کہ دراصل مزاح نگاری کو ہم ایک سنجیدہ کام سمجھتے ہی نہیں۔ عام طور سے مزاح کو غیر سنجیدگی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ برعکس معنی دینے والے لفظوں کا جب استعمال ہوتا ہے تو سیاہ کے ساتھ سفید اور دن کے ساتھ رات کی طرح ہم، مزاح کے ساتھ سنجیدہ کا لفظ جوڑ دیتے ہیں کہ صاحب یہ مزاحیہ کلام تھا اب سنجیدہ کلام کی طرف آتے ہیں۔ یعنی مزاح اور سنجیدگی ایک دوسرے کے اُلٹ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ غیر سنجیدہ کوئی بات نہیں ہوسکتی کیونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ فکشن اور تنقید کے نام پر آپ صفحے کے صفحے کسی خاص محنت کے بغیر سیاہ کر سکتے ہیں۔ لیکن طنز و مزاح کے دو ڈھنگ کے جملے بھی لکھنے بیٹھیے گا تو بقول پروفیسر محمد حسن، آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو کر رہ جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مزاح انتہائی سنجیدہ، اور بے حد تخلیقی عمل ہے جسے آپ زبردستی انجام نہیں دے سکتے۔ نہ اس کی کوئی ردیف اور بحر ہوتی ہے کہ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات کی گردان کرتے ہوئے مصرعے جوڑ لیے جائیں۔ نہ یہ ساختیات اور کنسٹرکشن یا ڈی کنسٹرکشن کی تھیوری سے تخلیق پاتا ہے کہ کافکا، کامو اور دریدا جیسے ناموں والے معروف بزرگوں کے محیر العقول حوالوں کے ساتھ لکھے گئے تنقیدی مقالوں کی طرح پیدا کر لیا جائے۔ یعنی کوئی طے شدہ فارمولہ یا پیمانہ یا معیار یا اوزار ایسا نہیں ہے کہ اُسے تھام کر جب جی چاہا مزاح پیدا کر لیا۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں مزاح دیگر اصناف کے مقابلے میں سب سے کم لکھا جاتا ہے۔ اور اردو اگرچہ دوسری زبانوں کی بہ نسبت مزاح کے معاملے میں انگریزی کی طرح خاصی متموّل زبان ہے لیکن اس میں بھی یہ حال ہے کہ ڈھائی من اردو ادب تولیے، تب کہیں ایک دو چھٹانک مزاحیہ ادب ہاتھ میں آتا ہے۔

ایک خاص پہلو جس کی طرف خاص طور سے اشارہ کرنا مقصود ہے وہ اردو طنز و مزاح کے اسلوب سے تعلق رکھتا ہے۔ طنز و مزاح کے مختلف اسالیب کو ذہن میں رکھا جائے تو میرے حساب سے اردو طنز و مزاح کی کہانی مرزا غالب سے شروع ہوتی ہے اور مشتاق یوسفی پر ختم ہو جاتی ہے۔ یوسفی کے بعد کی نسل کے طنز و مزاح نگار بالعموم پرانے گھسے پٹے انداز میں ایک

طرح کا جبری مزاح یعنی زبردستی کا مزاح لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اردو ادب میں شاعری کا مزاج بدلا۔ افسانے اور فکشن کا لہجہ تبدیل ہوا۔ یہاں تک کہ تنقید میں بھی ظ انصاری سے لے کر گوپی چند نارنگ تک ہمارے کئی ناقدین ادب کی تنقیدی تحریروں تک میں تخلیقی نثر کے کئی روشن اسلوب نظر آتے ہیں۔ لیکن نہیں بدلا تو اردو طنز و مزاح نگاروں کی نثر کا اسلوب نہیں بدلا۔ وہی ہم کے صیغۂ جمع متکلم میں گفتگو۔ وہی بیگم کو سہارا بنا کر بیان کو دل چسپ بنانے کی غیر شریفانہ کوشش۔ وہی لفظوں کی ساخت سے چھیڑ چھاڑ کر کے یہ امید رکھنا کہ اس سطحی مزاح کو پڑھ کر قاری قہقہہ زار ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ موضوع بھی ہمارے تقریباً ان ہی جیسے ہیں جن پر پطرس بخاری، شوکت تھانوی، ابنِ انشا اور مشتاق یوسفی بار بار قلم اٹھا چکے ہیں۔ اردو فکشن اور شاعری میں جس طرح اسلوب اور ہیئت کے تعلق سے طرح طرح کے تجربے کئے گئے ہیں وہاں طنز و مزاح کا میدان اس معاملے میں دور دور تک چٹیل پڑا ہوا ہے۔ انشائیہ اور خاکہ بس یہی دو اصناف مزاحیہ نثر میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مزاحیہ ناول، مزاحیہ ڈرامہ، مزاحیہ افسانے، عہدِ رفتہ کا قصہ ہو گئے ہیں۔ مزاح کے پیرائے میں ادبی تنقید لکھنے کا جو ڈھب مشفق خواجہ نے نکالا تھا وہ بھی ان ہی کے ساتھ ختم ہوا۔ خالص مزاح کی تحریریں پطرس بخاری اور شفیق الرحمن کے علاوہ کسی کی تحریر میں ڈھونڈے نہیں ملتیں۔ پولیٹکل سیٹائر یا سیاسی طنزیوں کا معاملہ فکر تونسوی اور کنھیا لال کپور کے ساتھ پہلے ہی مرحوم ہو چکا ہے۔

یہاں ایک دو باتیں پولیٹیکل سیٹائر پر کہنا چاہوں گا۔ انگریزی میں پولیٹیکل سیٹائر اس شکل میں بھی ملتا ہے جس میں لکھنے والا اصل سیاسی اور سماجی شخصیتوں کے طرز بیان، نظریاتی تضاد اور اندازِ فکر کو نشانہ بنا کر اور باقاعدہ ان کے نام لے کر اسی طرح پُرمزاح کیری کیچر تخلیق کر لیتا ہے جس طرح کوئی کارٹونسٹ کسی اصل شخصیت کی ناک، کان، منہ، ٹھوڑی وغیرہ کی ساخت میں مبالغہ اور دروغ کو ڈال کر پوری شخصیت کا کارٹون بنایا کرتا ہے۔ اس طرح کی پولیٹکل کامیڈی یا تحریری کارٹون نگاری اردو میں کبھی سوچی ہی نہیں گئی ہے لکھنا تو بعد کی بات ہے۔

آخر میں ایک بات میں ناقدینِ ادب کے تعلق سے وہی بات دوہرانا چاہوں گا جو ایک مرتبہ ساہتیہ اکادمی کے طنز و مزاح سیمینار کے کلیدی خطبے میں عرض کی تھی۔ اردو کے طنز و مزاح نگار

تنقید نگاروں کو اپنی تحریروں میں خواہ کتنا بھی مزاح کا نشانہ بنائیں لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ دنیا کا کوئی بھی تخلیقی ادب صحیح اور ایماندارانہ تنقید کو ہم رکاب کیے بغیر زیادہ دور تک آگے نہیں جا سکتا۔ صرف تخلیق ہی تخلیق ہوتی رہے اور اس کے متن کو پڑھ کر کوئی evaluate نہ کرے تو جو کچھ لکھا جارہا ہے نہ اس کی قدرو قیمت کا اندازہ ہوگا نہ تخلیق کار اپنے وفورِ شوق میں یہ سمجھ پائے گا کہ کہاں اس نے راہ میں چراغ جلادیا ہے اور کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ صورتِ حال تخلیقی ادب میں stagnation تو پیدا کرسکتی ہے dynamism نہیں۔ یہ تنقید ہے جو تخلیق کو تحرک بخشتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں اور میری سمجھ غلط بھی ہوسکتی ہے کہ اردو میں طنز و مزاح نگاری کو، خاص طور سے عصری طنز و مزاح نگاری کو صحیح معنوں میں ابھی تک تنقید میسر نہیں آئی ہے اور اس معاملے میں اردو کے تنقیدی ادب کا آئکن Icon مانے گئے تنقید نگاروں کا زیادہ قصور اس لیے ہے کہ زیادہ ذمے داری بھی ان ہی پر ہے۔ یہاں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام لینے کی کوئی ضرورت نہیں لہٰذا میں ان کا نام نہیں لے رہا ہوں۔ تاہم یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اُن جیسے نظریہ ساز اور رجحان ساز نقادوں نے اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب کی اپنی تنقیدوں سے رہنمائی کی ہوتی تو اس کی حالت شاید اتنی بری نہ ہوتی جتنی مجھے لگتا ہے کہ ہندوستان میں ہوگئی ہے۔

اور اب میرا خیال ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو طنز و مزاح کے موضوع پر اتنا مقالہ کافی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ زیادہ لکھے کو تھوڑا سمجھیں اور خط کو تار! میری باتوں سے آپ اتفاق کریں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ نہیں کریں گے تو اور زیادہ خوشی ہوگی کہ اس طرح میرے اندیشوں کے غلط ثابت ہونے کی راہ بھی نکل سکتی ہے۔ شکریہ، خدا حافظ!

○

اردو زبان و ادب کا قومی و بین الاقوامی منظر نامہ

اردو میں لسانی تحقیق: ایک جائزہ

پروفیسر نصیر احمد خان

نئی دہلی

اردو لسانیات سے میری مراد اردو زبان کے سائنٹیفک مطالعے کے وہ معروضی پہلو ہیں جو تاریخی، تقابلی، توضیحی، تجزیاتی اور اطلاقی تریق کاروں کی مدد سے اخذ کیے ہیں۔ یہاں زبان و بیان کی تعلیم و تدریس اور لغت نویسی کے مباحث بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔

بیسویں صدی میں اردو کے لسانی اور لسانیاتی مطالعے کے اس مختصر جائزے میں زیادہ کہنے کی گنجائش اس لیے بھی نہیں ہے کہ ہم نے زبان کے مطالعے میں لسانیات کے معروضی طریق کاروں سے بہت کم استفادہ کیا ہے۔ ہمارے پیش روؤں میں خان آرزو، انشاالله خان انشا اور محمد حسین آزاد اتنے بڑے نام ہیں کہ ایک آدھ کو چھوڑ کر بیسویں صدی کا کوئی بھی ماہر لسانیات ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ خان آرزو نے فارسی اور سنسکرت میں مماثلت دیکھ کر زبان کے درمیان لسانی رشتوں کا نظریہ پیش کیا جس کو لے کر بعد میں سر ولیم جونس نے دنیا کے سامنے ہند یوروپی خاندان السنہ کا تصور پیش کیا۔ انشا الله خان کی معرکتہ الآرا تصنیف دریائے لطافت

ہے جو ہند یورپی لسانیات میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں اردو زبان، اس کے معیار، اس کی بولیاں اور اس کی قواعد سے متعلق بے حد بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ اس طرح محمد حسین آزاد کی 'سخند انِ فارس' کا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ یہاں ماہرین قواعد بالخصوص مغربی قواعد دانوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے 17ویں صدی تا 19ویں صدی میں اردو کی سیکڑوں قواعدیں لکھی ہیں۔ یہاں چند منظوم قواعدیں بھی شامل ہیں۔ اس دوران لغت نویسی سے متعلق بھی کئی اہم کام منظر تمام پر آئے ہیں۔

زبان وقواعد کے مطالعے کی اس روایت کے ساتھ بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کی لسانی اور لسانیاتی تحقیق کو مندرجہ ذیل عنوان دیے جا سکتے ہیں:

1۔ اردو زبان کی تاریخ یعنی اردو کے ماخذ، تشکیل اور ارتقا سے متعلق
2۔ روایتی انداز فکر کے تحت لکھی گئی اردو قواعدیں۔
3۔ وضع اصطلاحات کے اصول اور مختلف علوم کی فرہنگیں۔
4۔ اردو کی لسانی ساخت کا مطالعہ۔
5۔ اردو لغات اور لغت نویسی
6۔ اردو رسم خط اور اس کی املا کا مسئلہ
7۔ اردو اسلوبیات
8۔ اردو زبان کی معیار بندی
9۔ اردو زبان کی تعلیم وتدریس اور نصاب کے مسائل
10۔ اردو کی بولیاں

اردو کے ماخذ:

اردو کی ابتدا اور ماخذ سے متعلق مباحث کا سلسلہ بہت لمبا ہے، زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے عالموں نے اکثر کسی نہ کسی شکل میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں جو نظریات سامنے آئے ہیں ان میں تاریخی ولسانی شواہد کی بنیادوں

پر صحیح نتائج تک پہنچنے کی سعی ملتی ہے۔ گریرسن، شیر علی خان، عبدالحق، سید سلیمان ندوی، نصیرالدین ہاشمی، محی الدین قادری زور، دتا تریہ کیفی اور عبدالقادر سرور کے ایسے نام ہیں جنھوں نے ضمنی طور پر اپنی اپنی کتابوں میں اس موضوع سے بحث کی ہے۔ تیسری اور چھٹی دہائیوں کے درمیان پانچ ایسے معتبر نام لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے اردو کے ماخذ اور تشکیل و ارتقا پر باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں۔ پہلا نام شمس اللہ قادری کا ہے، جنھوں نے 1925 میں اردو زبان کی تاریخ یعنی اردوئے قدیم لکھی۔ ان کے مطابق سبکتگین کے عہد میں پنجاب کے مقامی غیر مسلم اور نو مسلم باشندوں کے ساتھ غیر ملکی فارسی، عربی، اور ترکی بولنے والے مسلمان فاتحین کے لسانی و معاشرتی اور سیاسی اختلاط کے نتیجے میں اردو زبان کا جنم ہوا۔ محمود شیرانی اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں اردو کے آغاز سے متعلق اپنے نظریے کی بنیاد تاریخی و لسانی استدلال پر رکھتے ہیں۔ ان کے خیالات پنجابی اور اردو کے درمیان زبردست مماثلت کی وجہ یہ ہے دونوں کا ماخذ ایک ہے یعنی وہ مخلوط زبان جو غزنوی کے عہد میں عربی، فاسی اور ترکی زبانوں کے ساتھ پنجابی کے اختلاط سے پیدا ہوئی۔ پنجاب ہی سے یہ زبان دہلی اور وہاں سے دکن پہنچی اور دکن سے واپسی پر شمالی ہند میں اس کا رواج عام ہو گیا۔

سنیتی کمار چٹرجی ''ہند آریائی اور ہندی'' میں اردو زبان سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ 17 ویں یا 18 ویں صدی عیسوی میں ''ہندوستانی'' زبان کی مسلم شکل میں اردو وجود میں آئی۔ مشرقی پنجاب اور گنگا جمنا کے دوآبے پر واقع مدھیہ پردیش کا علاقہ اردو کے اہل زبان کا علاقہ ہے۔ چٹرجی ہندوستانی یا کھڑی بولی کی نشونما کو اردو سے الگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ جس کا ان کے پاس کوئی منطقی جواز نہیں ہے۔ بعد میں ہندوستانی پرچار سبھا، ممبئی کے مہاتما گاندھی میموریل خطبات میں وہ اپنی اس غلطی کا ایک مضمون کی شکل میں اعتراف بھی کرتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خان اپنی مشہور تصنیف ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' 1948 میں اردو کی ابتدا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اردو شورسینی اپ بھرنش کی ترقی یافتہ شکل ہے جو نواحِ دہلی میں بولی جاتی تھی۔

شوکت سبزواری اپنے تحقیقی مقالے ''اردو زبان کا ارتقا'' 1956 میں اردو کے ماخذ سے

بحث کرتے ہوئے اُسے پالی پراکرتسے متعلق بتاتے ہیں۔ انھوں نے اردو کے ارتقا کو چار ادوار میں بانٹا ہے۔اردو کے ماخذ سے متعلق ان نظریوں میں کافی دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔اکثر ماہرین کی یہی رائے ہے کہ اردو پنجاب، دہلی اور اس کے گرد ونواح کی بولیوں سے ماخوذ ہے ان تحریروں میں تاریخی استدلال ملتا ہے لسانی مماثلوں کا بھی ذکر ہے لیکن زبان کی ابتدا و ارتقا کے اس مطالعے میں سائنٹی فک طریق کار کی کمی کا احساس رہتا ہے۔ زبانوں کے درمیان پائی جانے والی مماثلیں ان کے لسانی رشتوں پر روشنی تو ڈال سکتی ہیں لیکن ماخذ اور تشکیل و ارتقا کی بحث کو مکمل نہیں کرتیں۔ اگر گیارھویں صدی سے تا حال کی علاقائی اور لسانی اعتبار سے اردو کے قریب کی زبانوں اور بولیوں کے تحریری مواد کو تاریخی تسلسل کے ساتھ ترتیب دے کر اردو اور پنجابی، سندھی دہلی ونواح دہلی کی زبانوں و بولیوں کے اسماء ضمائر، صفات، افعال نحوی ساخت اور لغات کی صوتی اشکال کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا تو شاید ہم زیادہ معروضی ہوکر نتائج اخذ کر سکتے تھے۔اس طرح کے مطالعے میں اردو اور زیر غور تمام زبانوں اور بولیوں کی ادوار میں تقسیم بے حد ضروری ہے تاریخی لسانیات کی بیساکھیاں یعنی تقابلی طریق کار اور مابعد تشکیل کے اصول بھی یہاں بے حد موثر ثابت ہو سکتے تھے۔ تاہم موجودہ تحریروں کی شکل میں اردو کے ماخذ، ابتدا، ارتقا اور تشکیل پر جو کچھ ملتا ہے اس کی تاریخی اہمیت اور علمی جامعیت سے انکار ممکن نہیں۔

اردو کی قواعد:

اردو زبان کی قواعد لکھنے کا آغاز اٹھارویں صدی کی ابتدائی دہائیوں سے ہو گیا تھا۔ یہ کام عیسائی مذہب کے مبلغوں نے شروع کیا تھا جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ بعد میں تجارتی، سیاسی اور علمی مقاصد کے تحت قواعد لکھی گئیں۔

پہلی اردو قواعد 1715 میں شاکیستر نے لکھی جو ڈچ تھا۔ بنجمن شلگر نے لاطینی میں ہندستانی قواعد کے نام سے اردو کی قواعد لکھی جو 1745 میں چھپی، پھر یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ اردو قواعدنویسی میں یورپی مفکرین کا بڑا ہاتھ ہے۔اردو قواعد پر کسی ہندستانی کی پہلی کتاب انشااللہ خاں انشا

کی ''دریائے لطافت'' ہے جو فارسی میں 1802 میں لکھی گئی اور جس کا دتاتریہ کیفی نے اردو میں ترجمہ کیا۔ دوسرا نام سرسید احمد خاں کا ہے، جنھوں نے 1840 میں اردو کی قواعد ''قواعد صرف ونحو زبان اردو'' کے نام سے تالیف کی۔ بیسویں صدی میں نسبتاً جدید طرز پر مولوی عبدالحق کی اردو قواعد ملتی ہے۔ پنڈت دتاتریہ کیفی کی تالیف ''کیفیۃ'' 1942 میں ایک بڑا حصہ اردو قواعد سے متعلق ہے جس میں اردو کے الفاظ، مرکبات، اسما، صفات، ضمائر، حروف، تذکیر وتانیث، مصادر اور اردو افعال وغیرہ کی بحث ملتی ہے۔ Comperative Urdu Grammer کے نام سے ابواللیث صدیقی کے زیر نگرانی ایک اردو قواعد پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔ چار جلدوں میں ایک اور اردو قواعد لکھی ہوئی ملتی ہے، جسے 1905 میں نثار علی بیگ نے تالیف کیا تھا۔ بیسویں صدی کی آخر دہائی تک اردو کی جو قواعد ملتی ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخی حیثیت ہے۔

ان قواعد میں سوائے چند کے تقریباً سبھی قواعد زبان کی تعلیم وتدریس کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ ایسی کوئی قواعد نہیں ملتی جو اردو زبان کی لسانی ساخت کی جامع تصویر پیش کر سکے۔ اس کمی کا احساس شدید ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کروڑوں انسانوں کی مادری زبان کا دعویٰ کرنے والوں کے پاس اپنی زبان کی ایک بھی Reference Grammer نہیں ہے۔

اردو قواعد نویسی کی روایت میں چار اندازِ فکر دیکھنے کو ملتے ہیں:

1۔ فارسی قواعد نویسی کی طرز پر لکھی گئی اردو قواعد۔
2۔ سنسکرت قواعد نویسی کے اصولوں کے تحت لکھی گئی اردو قواعد
3۔ لاطینی قواعد نویسی کے طریق کار کو اپنا کر لکھی گئی اردو قواعد۔
4۔ لسانیاتی جدید اندازِ فکر کے زیرِ اثر لکھی گئی اردو قواعد۔

اردو میں لغت نویسی:

اردو میں لسانی تحقیق کا آغاز لغت نویسی سے ہوتا ہے منظوم، لغت، ''خالق باری'' ہماری لسانی تحقیق کا ایک طرح سے نقطۂ آغاز ہے اس سلسلے کی دوسری کڑی فخرالدین قوا اس کی ''فرہنگ نامہ'' ہے جس میں اردو الفاظ معنی کی وضاحت کے لیے استعمال کیے گئے ہیں لیکن

جس لغت کو اردو کی پہلی لغت کا درجہ حاصل ہے وہ عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' ہے اس لغت کو بنیاد بنا کر خان آرزو نے تقریباً نصف صدی بعد ''نوادرالالفاظ'' ترتیب دی۔ یہ دراصل غرائب اللغات کی تصحیح و ترمیم ہے۔ یہاں مغربی ماہرین زبان جان گل کرسٹ پلیڈس، فورگسن وغیرہ نے نسبتاً جدید تیکنیک کو برتتے ہوئے انگریزی اور اردو کی ذولسانی لغات مرتب کیں۔ یہ سلسلہ 19ویں صدی کے آخر تک چلتا ہے۔ اردو سے اردو یک زبانی لغات میں خصوصاً قاموس الالفاظ،فرہنگ آصفیہ، امیر اللغات، مہذب اللغات، فرہنگ عامرہ، نوراللغات، کریم اللغات، سرمایہ زبانِ اردو، مباث اللغات،فرہنگ اثر اور باتصویر لغت، رئیس اللغات شامل ہیں۔جن کی قدر و قیمت مسلم ہے۔لغات کے اندراجات میں عام طور پر تلفظ، مآخذ،نحوی حیثیت اور معنی شامل ہیں اردو کی کسی لغت میں سیاق و سباق سے معنی کا تلفظ کے ساتھ تعین نہیں ملتا بلکہ اکثر و بیشتر قدیم اساتذہ کے کلام سے سند لی گئی ہیں۔عہد جدید میں مختلف اداروں نے اردو میں لغات مرتب کرائی ہیں جن میں انگریزی،فرانسیسی،ترکی، جاپانی، جرمن،عربی، فارسی اور چینی وغیرہ شامل ہیں۔ ہندو پاک کی مختلف زبانوں مثلاً، ہندی، بنگلہ، پنجابی، مراٹھی، کنڑ، تیلگو، سندھی، پشتو وغیرہ کو لے کر بھی اردو کی ذولسانی لغات مرتب ہوئی ہیں۔قدیم اردو کی بھی کئی لغات ترتیب دی گئی ہیں۔حال ہی میں ترقی اردو بورڈ جواب NCPUL ہے نے اور پاکستان میں سات زبانوں کی لغت جو ہفت زبانی لغت کے نام سے پکاری جاتی ہے، تیار کرائی ہے۔اردو کی کوئی صوتی لغت نہیں ہے جو زبان کے تلفظ کی معیار بندی کر سکے۔

اردو ساخت کا لسانیاتی مطالعہ:

اردو میں خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے بہت کم کام ہوا ہے اردو لسانی ساخت پر تجزیاتی نوعیت کی جو تحریریں سامنے آئی ہیں ان میں پہلا نام محی الدین قادری زور کا ہے جنھوں نے ہندوستانی لسانیات (انگریزی 1930) میں اردو اور دکنی پر تاریخی و توضیحی نوعیت کے مضامین قلم بند کیے ہیں جن میں صوتی تغیر و تبدل اور زبان کی ہیئت، آغاز اور تشکیل خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ عبدالقادر سروری کی کتاب'' زبان اور علم زبان'' لسانیاتی تجزیے کے طریق کار، زبانوں

کی تقسیم اور زبان، علمِ زبان کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔ دکنی زبان پر ایک مضمون بھی ملتا ہے جس میں دکن کی صوتی، صرفی اور نحوی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تیسرا نام مسعود حسین خاں کا ہے جنھوں نے اردو صوتیات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ انگریزی کے اپنے کتابچہ میں اردو الفاظ میں آوازوں، ان کی بنیادی شکلوں، رکنوں کی ساخت اور ترتیب سے بحث کی ہے۔ گیان چند جین نے اردو کی لسانی ساخت کو اپنا موضوع بنا کر زبان کے مسائل پر بحث کی ہے۔ انھوں نے ایک طویل مضمون اردو اور ہندی کے لسانی رشتے پر بھی لکھا ہے۔ عبدالعظیم نے اردو افعال کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی دلچسپی تاریخی اور توضیحی لسانیات سے ہے، جن کے تحت انھوں نے متعدد مضامین اور کتابیں مرتب کی ہیں۔ روی خاتون سونمتی چٹرجی کو ودا نے اردو افعال پر ایک بصیرت افروز تحقیقی مقالہ پیش کیا ہے۔ عصمت جاوید کی ''نئی اردو قواعد'' چار حصوں پر مشتمل ہے جن میں احدات الفاظ اور جملوں کی ساخت پر خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ اقتدار حسین خاں نے اردو صرف ونحو کا لسانیاتی اصولوں کے تحت جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اردو اور ہندی کے تقابلی مطالعے پر اپنا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی بھی لکھا ہے۔

اردو زبان پر دوسرے تحقیقی مقالے برائے پی ایچ ڈی اس طرح ہیں دکنی اردو کا لسانیاتی مطالعہ (عبدالغفار شکیل) اردو نحو کا تجزیاتی مطالعہ (مشکور اللہ خاں شیروانی) شمالی ہند کی اردو کی تاریخی قواعد (مرزا خلیل بیگ) اور راقم الحروف کا مقالہ کرخنداری اردو کا توضیحی تجزیہ جو ہندو پاک میں اردو زبان پر پہلی لسانیاتی تحقیق ہے جس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب اردو ساخت کے بنیادی عناصر میں آواز سے لے کر حرف تک اردو کے تمام لسانی پہلوؤں کا لسانیاتی تجزیہ بھی کیا ہے۔ ادھر علی گڑھ یونیورسٹی نے شعبۂ لسانیات میں بھی اردو زبان پر لسانیاتی تحقیق کا کام جاری ہے۔ بیسویں صدی میں اردو میں لسانیاتی مطالعے کی سمت و رفتار کا اندازہ ان مضامین سے بھی لگایا جا سکتا ہے ''پرانے لفظوں کی نئی تحقیق'' (سید سلیمان ندوی)، اردو اشتقاقات'' اور ''اردو کے مرکب الفاظ (شوکت سبزواری) لفظ و معنی (دتاتریہ کیفی)، صحت زبان نو کے لسانیاتی پہلو (احتشام حسین) اردو صرف ونحو کا خاکہ

(عبدالرؤف عشرت) اردو میں تلفظ کا مسئلہ اور اردو میں دخیل آوازیں (عبدالستار دلوی) پنجابی اور اردو کی مشترکہ ساخت کے بنیادی عناصر (حامد اے خاں) اردو کی اسمیہ فقروں کی ساخت کا تجزیہ (انور دل) اردو میں انفیت و ہاکاریت (گوپی چند نارنگ) قدیم اردو میں اسم جمع اور میسور کی اردو نے (فہمیدہ بیگم) وغیرہ۔

وضع اصطلاحات کے اصول اور مختلف علوم کی فرہنگ:

اردو میں ترجمے اور اصطلاحات وضع کرنے کی روایت صدیوں پرانی ہے مثلاً مدرسہ غازی الدین 1792، فورٹ ولیم کالج 1800، دہلی کالج 1825، سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ 1867 وغیرہ۔ ان اداروں میں یہ سلسلہ بڑی مستعدی کے ساتھ چلتا رہا۔ بیسویں صدی میں انجمن ترقی اردو، ہند 1903، دارالترجمہ عثمانیہ، حیدرآباد 1917 اور بیورو فار پرموشن آف اردو جو آج NCPUL کہلاتا ہے۔ ایسے تعلیمی اور علمی ادارے ہیں جنھوں نے مختلف علوم کے ترجموں اور اصطلاح سازی کے میدان میں کئی گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ مولوی عبدالحق اور وحید الدین سلیم نے وضع اصطلاحات کے اصولوں پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ دارالترجمہ عثمانیہ نے اپنی سرپرستی میں تمام انسانی علوم کی فرہنگیں تیار کرائی تھیں۔ ترقی اردو بورڈ نے 18 موضوعات پر فرہنگیں ترتیب دی ہیں۔ اردو انسائیکلو پیڈیا پر بھی برابر کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں بارہ جلدوں میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے۔

اردو اسلوبیات:

اردو اسلوبیات کی باقاعدہ شروعات محی الدین قادری زور کی تالیف اردو کے اسالیب بیان 1964 سے ہوتی ہے انھوں نے اردو انشا پردازوں کے نثری اسالیب اور رجحانات پر مدلل بحث کر کے اسلوبیاتی مضامین کی شناخت کر کے انھیں مرصع نگاری، سادہ نگاری، محاورہ بندی، انگریزیت، الہامی اردو، ادب لطیف اور گلابی اردو کے نام دیے ہیں۔ آل احمد سرور (نثر کا اسٹائل) اسلوب احمد انصاری (نثر کا آہنگ)، مسعود حسین خاں نے اسلوبیاتی مطالعات کر

برتتے ہوئے چند اہم مضامین لکھے ہیں مثلاً کلامِ غالب کے قوافی و ردیف کا صوتی آہنگ، غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت اور مطالعہ شعر وغیرہ محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، مغنی تبسم اور مرزا بیگ نے اپنے مضامین میں اسلوبیاتی مطالعے کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔

''ادبی اسلوبیات'' کے عنوان سے راقم الحروف نے بھی ایک کتاب لکھی ہے جس میں ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، پریم چند اور اقبال کے اسالیب پر تفصیل سے بحث ہے۔ اس علم کے تحت جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ادھر چند تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی لکھے گئے ہیں۔

اردو رسمِ خط اور اس کا املا:

اردو رسمِ خط پر جو اظہار خیال کیا ہوا اُسے ہم پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ 1۔ اردو کے صوتی نظام کے حوالے سے حروفِ تہجی کا جائزہ۔ 2۔ رسمِ خط سکھانے کے مختلف طریقِ کار۔ 3۔ رسمِ خط اردو میں اصلاح کی تجاویز۔ 4۔ اردو املا کے مسائل۔ 5۔ اردو رسم خط بدل دینے کا مشورہ اور رسمِ خط سے متعلق مباحث جن حضرات کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں ان کے نام اس طرح ہیں:

مولوی عبدالحق، پنڈت دتاتریہ کیفی، مسعود حسین خاں، حیات اللہ انصاری، رشید حسن خاں، عبدالستار صدیقی، اسلم پرویز اور گوپی چند نارنگ، راقم الحروف نے بھی اردو آوازیں، حروف اور ان کی زیلی شکلیں، مصوتوں کا صوتی نظام اور اردو رسمِ خط عنوانات سے مضامین قلم بند کیے ہیں۔ یہاں رشید حسن خاں کی کتاب ''اردو املا'' کا ذکر ضروری ہے جس میں اردو املا کے بیشتر مسائل پر انتہائی عالمانہ اور ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

اردو بولیاں:

اردو کی سماجی، لسانی اور علاقائی بولیوں کی نشان دہی سب سے پہلے ''دریائے لطافت'' میں کی گئی ہے۔ مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔

عبدالغفار شکیل، فہمیدہ بیگم اور حنیف کیفی نے دکن کے حوالے سے اردو کے مختلف لسانی پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ کرخنداری اردو پر بہادر سنگھ اور گوپی چند نارنگ کے کتابچے اور راقم الحروف کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی بھی اس موضوع پر ہے۔ مزید برآں میری ایک مستقل کتاب اردو کی مختلف لسانی، علاقائی اور سماجی بولیوں پر 1979 میں چھپی ہے جس میں عمرانی لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو کی دکنی، کشمیری، پنجابی، کلکتہ اور کرخنداری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو زبان کی معیار بندی:

خان آرزو، شاہ حاتم، مرزا مظہر جانِ جاناں، انشا اللہ خاں انشا، شیخ امام بخش، جیسے ماہرین زبان وشعر نے اردو کی اصلاح سے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے بیسویں صدی میں وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق، دتا تریہ کیفی اور حسرت موہانی کے نام لیے جاتے ہیں۔ لغات، مکاتیب، مضامین، تذکروں، قواعدوں اور اردو املا ناموں میں اس موضوع پر تبادلۂ خیالات ہوا ہے۔

ان مباحث میں لکھی عوامی لہجے کو اہمیت دیتے ہوئے قریب الفہم اور کثیر الاستعمال الفاظ کے استعمال پر زور دیا گیا ہے تو کبھی اساتذہ کے کلام کو سند مان کر جمالیاتی پیمانوں پر اصلاح زبان کی بات کہی گئی ہے اور کبھی عربی و فارسی لغت کی صوتی وصرفی تشکیل کو معیار تصور کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا موضوعات کے علاوہ اردو میں جو لسانیاتی تحقیق ہوئے ہے ان میں با اعتبار عنوان تدریس زبان و ادب، فنی ترتیب، مخطوطات کے زبان و بیان کا لسانیاتی مطالعہ، زبان اور تہذیب اور عروض و آہنگ وغیرہ اہم ہیں۔ اردو تعلیم تدریس کے لسانیاتی پہلوؤں پر خصوصاً مغربی اور ہندنژاد مغربی ماہرینِ لسانیات نے خصوصی توجہ دی ہے؛ مثلاً عبدالرحمٰن باکر، پیٹر ہک، گمپرز، برمن وان اولفن، سونیا چرنی کوا، تش مرزا، سی ایم نعیم، عبدالعظیم اور انور دل وغیرہ۔

ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں۔ ادھر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومتِ ہند کو کچھ ایسے کام کرنے چاہیے جس کی نہ صرف اردو زبان کے فروغ میں ضرورت ہے بلکہ اردو کی بقا کے لیے ناگزیر بھی ہیں۔ چند باتوں کی طرف ذیل میں اشارے کیے جاتے ہیں۔

1۔ اردو زبان کی ساخت کا لسانیاتی تجزیہ

2۔ اردو زبان کی حوالہ جاتی قواعد

3۔ اردو کی صوتی لغت

4۔ صوتی عمل خانے کے قیام کے لیے مالی تعاون

5۔ پہلی اور دوسری زبان کی حیثیت سے اردو سکھانے کے سائنٹیفک طریقۂ کاروں کی بنیاد پر نصاب کی تیاری

6۔ اردو کے کلاسیکی ادب کا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ اور ان زبانوں کی ادبیات کا اردو میں ترجمہ

7۔ اردو کا کل ہند عمرانی لسانیاتی جائزہ

8۔ سترہویں، اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے اردو ادب کی تدوین و ترتیب

9۔ اردو کے سماجی و تہذیبی اداروں کی ریکارڈنگ جو ان کے مآخذ، تشکیل و ترتیب اور ارتقا کو پیش کرے

10۔ ملک گیر پیمانے پر اردو رسم خط سکھانے کی مہم

11۔ مختلف یونی ورسٹیوں کی تحقیقی سرگرمیوں کے درمیان تال میل

○

عالمی ادب کے رجحانات سے اردو ادب کی اثر پذیری

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

شعبۂ اردو، علی گڑھ

اردو زبان و ادب نے جس طرح اپنے گردوپیش کی زبانوں اور ادبیات کو اپنے مخصوص رویوں اور رجحانات سے متاثر کیا ہے اس سے کہیں زیادہ اردو کے ادب نے عالمی اور مقامی رجحانات سے متوازی اور متوازن انداز میں اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ چوں کہ رد و قبول کا یہ سلسلہ مختلف ادبیات کے درمیان چلتا رہتا ہے اس لیے اردو ادب نے بھی اپنے آپ کو عالمی ادب کے رویوں سے کبھی الگ نہیں رکھا۔ دنیا کی بیش تر بڑی زبانوں کے ادب میں قدرے تقدیم و تاخیر کے ساتھ بعض رجحانات کا یکساں طور پر نفوذ اور وفور نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی زبانوں میں ادبی میلانات کو کسی بڑے فکری رجحان یا فلسفیانہ رویے کے پس منظر میں نمایاں ہونے کا موقع کم ملا ہے، مگر مغربی زبانوں میں جو ادبی رجحانات امتدادِ وقت کے ساتھ کارفرما رہے ہیں ان کے اثرات تاخیر سے ہی سہی مگر مشرقی زبانوں پر بھی ضرور مرتسم

ہوتے رہے۔ مثال کے طور پر ہم مغرب کے تناظر میں کلاسیکی رجحان کا زمانہ عموماً نشاۃ ثانیہ (Renaissance) سے پہلے کے ادوار میں متعین کرتے ہیں، مگر اس اصطلاح سے بلند ہوکر اگر گفتگو کیجیے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ازمنۂ قدیم میں جب سماج اور معاشرت کا شیرازہ بکھرا نہیں تھا اور نمایاں انسانی اور اخلاقی اقدار پر سماجی اداروں کا مکمل اتفاق پایا جاتا تھا، ان زمانوں میں پیش کیے جانے والے ادب کو بلاتفریق زبان و ادب کلاسیکی ادب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ تاہم ایک بات اب بھی وضاحت طلب رہ جاتی ہے کہ موضوع، مواد اور مضمون کے اعتبار سے اس نوع کی یکسانیت اور یک جہتی کو آیا محض فکری رویے کا نام دیا جاسکتا ہے یا پھر اس یکسانیت اور یک جہتی کے مظاہر کو ہم اس زمانے میں تخلیق ہونے والے ادب کی پیش کش، زبان و بیان، سلیقۂ اظہار اور فنی دروبست میں بھی ملاحظہ کرسکتے ہیں؟ اگر اس پہلو پر غور کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ازمنۂ قدیم کی ادبیات میں جس طرح کی اجتماعی اقداریت موضوع اور مضامین میں ملتی ہے اسی نوع کا اجتماعی اتفاق اس بات میں بھی ملتا ہے کہ کلاسیکی عہد کے ادب میں زبان و بیان کو تزک و احتشام کا حامل ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ اندازہ لگانے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ معاملہ خواہ صنائع اور بدائع کا ہو یا فنی تدابیر کو اختیار کرنے کا، یا پھر ہیئت کے معاملے میں روایتی ضوابط اور اصولوں کی پابندی کا، بیش تر کلاسیکی ادبی سرمایے کے پس منظر میں ایک منظم، متحد اور منضبط اندازِ فکر کے حامل سماج کی موجودگی کا ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چوں کہ یہی اجتماعیت قدیم کلاسیکی عہد کی شیرازہ بند اقدار کا طرۂ امتیاز رہا ہے اس لیے رومانیت، انفرادیت یا بعد کے دوسرے ادبی میلانات کے مقابلے میں کلاسیکیت کا طرۂ امتیاز ان ہی عناصر کو تصور کیا جاتا ہے۔

عالمی ادب سے اردو کی اثر پذیری سے متعلق یہ بات محض کلاسیکی ادبی رجحان کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی، بلکہ بعد کے زمانے میں اس اثر پذیری میں اور بھی اضافہ ہوتا رہا۔ تفصیل سے گریز بھی کیا جائے جب بھی بعض نکات توجہ طلب معلوم ہوتے ہیں۔ بات خواہ رومانیت کی ہو، عبوری دور میں تخلیق کردہ ادب کی ہو یا پھر حقیقت پسندی، فطرت پسندی یا تجربیت پسندی کی، جب جب ادب میں اس نوع کے کسی ادبی رجحان کو فروغ ملا ہے تو ایک طرف اس کا رشتہ کسی نہ کسی فکری اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے جاملتا ہے اور دوسری طرف دنیا کے نسبتاً

غیر ترقی یافتہ معاشروں میں تخلیق کردہ ادب بھی ان ادبی میلان سے اپنا رشتہ استوار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اردو ادب، اپنی ہزار سال سے کم عرصے کی تاریخ میں بھی اس نوع کے کسی بھی ادبی رجحان سے لاتعلق نہیں رہا۔ جدید اور جدید تر ادبی رویوں میں وجودیت کا معاملہ ہو، اشتراکیت کا موضوع ہو، تاثیریت کی بات ہو یا اظہاریت کا رجحان ہو، اردو کے گذشتہ نصف صدی کے ادب میں ان تمام رجحانات کی نشان دہی بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ یہ اردو ادب کا وہ امتیاز ہے جس کے باعث ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے مابین اردو نے عالمی اثر پذیری کے سلسلے میں ہمیشہ اپنا امتیاز نمایاں رکھا ہے۔

چنانچہ عالمی ادب میں خواہ Classicism، Romanticism، Realism اور Naturalism کے رجحانات رہے ہوں، یا پھر بعد کے زمانے میں Symbolism، Expressionism اور Impressionism کا معاملہ رہا ہو، اردو ادب کی مختلف اصناف پر ان رجحانات کی کارفرمائی کا ضرور مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ تو رہی عام ادبی رجحانات کی بات، جہاں تک سوال نئی تھیوری کے نام سے ساختیات (Structuralism) مابعد ساختیات (Post-Structuralism) اور ان رجحانات کے زیر اثر بین المتونیت (Intertextuality)، نئی تاریخیت (New Historicism)، علم شرح و تعبیر (Hermeneutics) اور تانیثیت (Feminism) جیسے ان موضوعات کا ہے جو گذشتہ ربع صدی سے اردو میں خاص سرگرمی سے زیر بحث ہیں یا مابعد جدیدیت (Post Modernism) کے مباحث جنھوں نے آج اردو ادب کے بیش تر رویوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، یہ تمام اثرات اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اردو کا ادبی منظرنامہ کبھی بھی منجمد اور فکری طور پر غیر متحرک نہیں رہا۔ اردو نے ہمیشہ ایک حساس اور روشن خیال زبان ہونے کا ثبوت دیا ہے اور عالمی سطح کے ادبی مباحث سے ہمیشہ آنکھیں چار کرنے کی کوشش کی ہے۔

کہنے کو تو یہ مباحث بہت تفصیل طلب ہیں مگر عالمی ادب سے اردو کی اثر پذیری کا سلسلہ ہر دور میں دراز رہا ہے، جس کی ایک جھلک متذکرہ معروضات میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے اور اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کا ادب کن کن سطحوں پر عالمی ادب سے ہم آہنگ رہنے کا ثبوت فراہم کرتا رہا ہے۔

○

اکیسویں صدی میں اردو تنقید

ناصر عباس نیرؔ (پاکستان)

اکیسویں صدی

پہلے اس سوال پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کہ اکیسویں صدی کا ذکر ہم اس شدت سے کیوں کرنے لگے ہیں؟ آج سے ڈیڑھ دہائی پہلے جب بیسویں صدی آخری دموں پر تھی تو ایک عجب ہنگامہ برپا تھا۔ ہر طرف یہ ہاہا کار مچی ہوئی تھی کہ ایک نئی ہزاری کا آغاز ہونے جارہا ہے۔ گزشتہ دو ہزار سالوں میں عموماً اور گزشتہ ایک صدی میں خصوصاً کیا کچھ ہوا، اور اگلی ہزاری اور اکیسویں صدی میں کیا ہوگا؟ مستقبلیات کے ماہرین سے لے کر ادب، تاریخ، صحافت، سائنس، فلسفے سے وابستہ لوگ گزشتہ کا محاسبہ اور آئندہ کے ممکنات کا اندازہ لگانے میں بے دم ہوئے جارہے تھے۔ اس طرح اکیسویں صدی کا ڈسکورس، اس کی باقاعدہ آمد سے پہلے تشکیل پا گیا تھا۔ اس ڈسکورس نے اب نئی جہت اختیار کی ہے۔ اب ہم ہر علم، ادب کے ہر رجحان، ہر سیاسی، معاشی تبدیلی، یہاں تک کہ معاصر عہد کی سب سے بھیانک حقیقت دہشت گردی کو بھی اکیسویں صدی کے تناظر میں سمجھنے لگے ہیں۔ زندگی کے تمام سماجی اور ذہنی منطقوں میں ہونے

والی تبدیلیوں کو اس صدی کی روشنی میں ہم کیوں سمجھنے پر اصرار کرنے لگے ہیں جو اپنی اصل میں ایک کیلنڈری حقیقت ہے؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ مسائل و رجحانات کو صدی کے سیاق میں سمجھنے کا رویہ ہمیشہ سے نہیں تھا۔

صنمیات، اساطیر، مذاہب اور فنون میں وقت کی تبدیلی کا احساس دو طرح سے تھا۔ بڑے قدرتی واقعات اور بڑے لوگوں کی پیدائش، موت یا ان کی زندگی سے وابستہ کسی بڑے واقعے سے، اور دن رات، صبح شام، پہر دوپہر، یا موسموں کے تغیر و تبدل سے۔ یہ وقت کا غیر حسابی تصور تھا۔ اردو کی کلاسیکی شاعری میں عموماً وقت کا یہی تصور ظاہر ہوا ہے۔ جیسے: رات دن گردش میں ہیں سات آسماں رہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا (غالب)؛ یا: جوشش اشک سے ہوں آٹھ پہر پانی میں رگرچہ ہوتے ہیں بہت خوف و خطر پانی میں (میر)؛ اور داستانوں میں قرن کا ذکر ہوتا تھا، یا پھر خزاں، بہار، سردی گرمی کے ذکر سے وقت کی تبدیلی کو سمجھا جاتا تھا۔ وقت کا یہ تصور دائرے کا تھا؛ چوں کہ دائرے کا تصور تھا، اس لیے کچھ زیادہ پریشانی نہیں تھی؛ ایک پہر گزر گیا تو دوسرا آجائے گا؛ ایک موسم میں کچھ نہیں کیا تو اگلے موسم میں کچھ کر لیں گے؛ دوسرے لفظوں میں وقت کے ہاتھ سے پھسل جانے اور پھر کبھی واپس نہ آسکنے کا خیال نہیں تھا۔ لیکن اٹھارویں صدی کے وسط میں صنعتی عہد شروع ہوا، اور ایک نئی آفت آن پڑی۔ گھروں، کارخانوں میں میکانکی کلاک نصب ہونے لگے اور چوکوں بازاروں میں گھنٹہ گھر نمودار ہوئے۔ پھر کیا تھا، لمحہ لمحہ شمار کیا جانے لگا۔ انسانی شعور میں پہلی مرتبہ حسابی وقت نے پنجے گاڑے۔ تبدیلی کا ادراک تیزی سے گزرتے ثانیوں، منٹوں، گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور صدی کے تناظر میں کیا جانے لگا۔ وقت پیسہ ہے؛ وقت کا ضیاع دولت کا ضیاع ہے۔ یہ مفروضے جدید صنعتی عہد کے ساتھ ہی، پہلے یورپ اور بعد ازاں دوسرے ملکوں کے لوگوں کی زندگی میں اس طرح شامل ہو گئے جیسے یہ عقیدہ ہوں؛ عقیدے کے آگے سر تسلیم خم کیا جاتا ہے، اس پر سوال نہیں اٹھایا جاتا۔ حسابی وقت سیدھی لکیر کا ہے۔ جس طرح آپ ایک دریا میں دو مرتبہ نہیں اتر سکتے، اسی طرح گزرا ہوا لمحہ لوٹ کر نہیں آسکتا؛ چوں کہ وقت کی لکیر پر ایک نکتہ دوبارہ نمودار نہیں ہوتا، اس لیے ضروری ہے کہ ہر لمحے کو ایک منفرد واقعہ سمجھا جائے، اور اس کے

گزرنے سے پہلے اس سے، جتنا ممکن ہو رس نچوڑ لیا جائے؛ اور زیادہ رس نچوڑنے کے لیے ہر لمحے میں زیادہ سے زیادہ جسمانی و ذہنی حرکت کو ممکن بنایا جائے، یعنی عمل اور علم کا پہیا تیزی سے گھمایا جائے۔ اس کے نتیجے میں علم اور ٹیکنالوجی غیر معمولی تیز رفتاری سے تخلیق ہونے لگیں۔ زیادہ اشیا پیدا ہوئیں تو ان کے صَرف کی پریشانی ہوئی، جس کے لیے ایک بار پھر حسابی وقت سے مدد لی گئی۔ فلاں چیز پرانی ہوگئی، اب اِس شے کا فیشن ہے۔ صارفی ذہنیت کا عکس ادب میں بھی ظاہر ہونے لگا: اردو افسانے کا علامتی رجحان ساٹھ کی دہائی کا ہے۔ ستر کی دہائی کے شعرا نے غزل میں نئے دستخط ثبت کیے۔ اکیسویں صدی کی شاعری، ستر، اسی، نوے کی دہائی کی شاعری کی مانند کیوں کر ہوسکتی ہے۔ یوں حسابی وقت نے دن رات، ہفتے، صدی کو ان کی پیداواری قدر کی نسبت سے پہچاننے کا رویہ پیدا کیا۔

اکیسویں صدی کے ڈسکورس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس بات کو بھی پیش نظر رکھیں کہ اکیسویں صدی 'عیسوی کیلنڈری حقیقت' ہے۔ دنیا میں سیکڑوں کیلنڈر تھے، (اور اب بھی ہیں) جنھیں 1852 میں رائج ہونے والے، پوپ گریگورین سیزدھم کے نام سے منسوب عیسوی کیلنڈر نے بے دخل کر دیا، یا غیر مؤثر کر دیا ہے۔ برصغیر کے تناظر میں دیکھیں تو ہم مسائل و رجحانات کو ہجری اور بکرمی کیلنڈر کی نسبت سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، حالاں کہ یہ کیلنڈر بھی رائج ہیں۔ ہجری کیلنڈر کا استعمال محرم، رمضان اور عیدین کے سلسلے تک محدود ہے، اور زندگی کے کسی بھی شعبے میں ہونے والی تبدیلی کو اس کی روشنی میں ہم نہیں سمجھتے۔ بکرمی کیلنڈر سے ہمارے کسان مدد لیتے ہیں۔ تیز رفتاری، وقت کا ساتھ دینے، وقت کے قیمتی ہونے، جدیدیت، نئی فکر، نئی دنیا جیسے تصورات و تلازمات صرف عیسوی کیلنڈر ہی سے وابستہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عیسوی کیلنڈر وقت کی پیمائش سے بڑھ کر ایک ثقافتی حقیقت ہے۔ لہٰذا اکیسویں صدی کا تصور یورپی علم، ٹیکنالوجی سے لے کر یورپی علمیات کے غلبے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا؛ یہ غلبہ ان سب ملکوں پر ہے جنھیں ایک نفرت انگیز اصطلاح میں تیسری دنیا کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب ہم اپنے ادب و سماج کو اکیسویں صدی کے سیاق میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم دانستہ یا نا دانستہ، وقت کے اس حسابی، پیداواری تصور کی زد میں

آجاتے ہیں جسے صنعتی سرمایہ دارانہ جدیدیت نے وضع کیا تھا، اور جس سے ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں واقف ہوئے تھے۔ (برطانیہ میں گریگورین عیسوی کیلنڈر کا استعمال 1571 میں شروع ہوا تھا)۔ اکیسویں صدی کے ڈسکورس نے ہم سے صرف وقت کا متبادل تصور ہی نہیں چھینا، بلکہ کسی دوسرے ڈھنگ سے چیزوں کو سمجھنے، کسی اور، زیادہ سہل انداز میں زندگی جینے کا خیال بھی ہتھیا لیا ہے۔ علم، ادب، انسانی رشتوں، مصروفیتوں کو وقت کے حسابی، پیداواری تصور نے ایک عفریت کی طرح اپنے پنجے میں لے لیا ہے۔ (اس کا ایک فوری ثبوت تو یہ ہے کہ مجھے یہ گفتگو چند منٹوں میں ختم کرنی ہے؛ مجھے کیا کہنا ہے، اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کتنے منٹوں میں کہنا ہے)۔

تنقید

ان گزارشات کی روشنی میں پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا اکیسویں صدی میں تنقید بھی 'وقت کے حسابی، پیداواری تصور' کی اسیر ہے، یا اس سے آزاد ہے؟ اس سوال کے جواب کا ایک حصہ تو ہمیں ان تنقیدی سرگرمیوں میں ملتا ہے جو 1990 کی دہائی کے ختم ہونے کے ساتھ شروع ہوئیں اور اکیسویں صدی کے اوائلی سالوں تک جاری رہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ عالمی تنقید 1960 کی دہائی میں ایک نئے عہد میں داخل ہوئی، جسے تھیوری کا عہد کہا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ تھیوری کی مخالفت میں آوازیں یورپ، امریکا اور ہمارے یہاں اٹھتی رہیں۔ لیکن بیسویں صدی کے خاتمہ جوں جوں قریب آرہا تھا، مغرب میں یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ تھیوری کے بعد کیا؟ 1996 میں ٹامس ڈوشرٹی کی After Theory شایع ہوئی؛ اسی برس وینڈل ہیرس نے Beyond Postsrtucturalism شایع کی؛ 1999 میں مارٹن میکوئیلین کی Post-Theory منظر عام پر آئی۔ ٹیری ایگلٹن نے 2003 میں After Theory شایع کی، جس کا چرچا ہمارے یہاں زیادہ ہوا۔ ٹھیک اسی برس مائیکل پائن اور جون شیڈ نے life.after.theory کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی، جس میں ژاک دریدا، فرینک کرموڈ، ٹورل موئی اور کرسٹوفر نورس کے انٹرویو، تھیوری کی نئی صورتِ حال کے حوالے سے شامل ہیں۔ ان کتابوں کا

بنیادی سوال یہ ہے کہ تھیوری کے بعد کیا؟ غور کیجیے: یہ سوال ان مباحثوں، کلامیوں کی گونج لیے ہوئے ہے جو بیسویں صدی کے خاتمے کے قریب آتے ہی شروع ہوئے تھے۔ وقت کے مستقیمی، حسابی اور پیداواری نظریے نے لوگوں کو 'فطری' طور پر سوچنے کی تحریک دی تھی کہ صرف بیسویں صدی کا خاتمہ نہیں ہو رہا، اس صدی کے سمندر میں رواں سارے جہاز بھی غرق ہونے کو ہیں۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ تاریخ، نظریات، بیانیوں کے عظیم جہازوں کے ڈوبنے کا خیال ایک ہزاری اور صدی کے خاتمے کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ان جہازوں میں تیکنیکی خرابیاں بھی تلاش کی جانے لگیں۔ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل کی تنقید میں بنیادی سوال 'بعد' یعنی after تھا۔ یہی سوال ژاک دریدا کے سامنے 10 نومبر 2001 میں لفبرو یونیورسٹی (برطانیہ) کے شعبہ انگریزی و ڈراما کی طرف سے، رکھا گیا۔ دریدا کا جواب ہمیں، اکیسویں صدی کی تنقید کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے:

> لفظ 'بعد' دوہرے معنی کی گردش کا حامل ہے: 'بعد' یعنی پیچھے آنے کے معنی میں، اور مابعد (post) اور دیگر کے معنی میں۔ (life.after.theory، ص9)

گویا دریدا کا موقف تھا کہ جب ہم تھیوری کے بعد کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں تھیوری کے پیچھے چلنے، اس کی پیروی کرنے، اس کے سوالات کو قبول کرنے کے مطالب بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہاں دریدا کے مخاطب وہ سب لوگ ہیں، جو صدی کے خاتمے کے ساتھ ایک اہم تنقیدی رجحان کے خاتمے کی خواہش کرنے لگے تھے۔ ان کا مجموعی موقف یہ لگتا ہے کہ کوئی نظریہ، وقت کی گردش سے ختم نہیں ہوتا، وہ اپنی داخلی توانائی (جسے آپ علمیات کہہ لیں یا اہلِ علم کی دل چسپی کو قائم رکھنے کی اہلیت کہہ لیں) کے صَرف ہو جانے سے اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

مائیکل پائن نے فریڈرک جیمسن سے پوچھا کہ تھیوری کے بعد جمالیاتی قدر کا کیا بنا؟ غور کیجیے: یہ سوال قائم کرتے ہوئے ایک مفروضہ پہلے ہی سے قائم کر لیا گیا کہ تھیوری ختم ہو گئی، اب ادب پارے کی جمالیاتی قدر کو کیوں کر سمجھا جائے گا۔ جیمسن سے یہ سوال دریافت کرنے کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ جیمسن رد تشکیلی تنقید کے موئید ہونے کے باوجود جمالیاتی اقدار کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ اس کے جواب میں جیمسن نے کہا کہ 'ہم سیلبریٹی کلچر میں جی رہے ہیں'۔

دریدا جیسے نقاد بھی سیلبریٹی تھے۔ ہر سیلبریٹی کا ایک دورانیہ ہوتا ہے۔ جب ہم ادب، آرٹ کے رجحانات کو بھی سیلبریٹی کی حیثیت میں شناخت کرنے لگتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی یہ توقع بھی باندھ لیتے ہیں کہ ایک سیلبریٹی کی جگہ دوسرا کب جگہ لیتا ہے۔ سیلبریٹی کلچر جلنے بجھنے، زندگی و موت کے متضاد رویوں کا جشن ہے۔ یہ ٹھیک وہی طرزِ فکر ہے جو ہمیں وقت کے پیداواری، سرمایہ دارانہ تصور نے سجھایا ہے؛ یعنی ہر شے پرانی ہوجاتی ہے، ہر شخصیت کا سحر دم توڑ دیتا ہے، ہر نظریہ صرف ہوجاتا ہے، ہر ادب پارہ مخصوص وقت کے بعد فنا ہوجاتا ہے اور ہر تنقیدی نظریہ اپنے پیداواری مقصد کو پورا کرنے کے بعد تاریخ کے کوڑے دان میں چلا جاتا ہے۔

اس طرزِ فکر کی معنویت کو ہم ذرا پیچھے جاکر، ماضی کے زمانے کے کچھ واقعات کو یاد کرکے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ آج جسے ہم تھیوری کہتے ہیں وہ اپنی نہاد و اصل میں تنقید ہی ہے، جس کا یورپ میں آغاز ارسطو کی بوطیقا سے ہوا اور یہاں بھرت کی ناٹیہ شاستر سے ہوا۔ قدیم، کلاسیکی، رومانوی، جدید، مابعد جدید تنقید کے تمام نظریات ایک داخلی سطح کی ہم آہنگی رکھتے ہیں: ادب کی روح، جمالیات، ان کے سرچشموں اور انسان و سماج پر ان کے اثرات کا مطالعہ۔ جمالیات، جمالیات کے منبع اور اثرات کے سلسلے میں جو نئے نئے نظریات سامنے آئے، انھی کے نتیجے میں تنقید کبھی کلاسیکی کہلائی، کبھی رومانوی، کبھی جدید، پھر مابعد جدید یا تھیوری کے نام سے پہچانی جانے لگی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ پہلے زمانوں میں یہ سوال نہیں اٹھایا گیا کہ کلاسیکیت کے بعد کیا؟ اسی طرح عالمی تنقید اور اردو تنقید میں کچھ نقاد یا تنقیدی نظریات اس طرح زیرِ بحث آتے ہیں، جیسے وہ ہمارے معاصر ہوں۔ مثلاً ارسطو، لانجائنس، کالرج، میتھیو آرنلڈ، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، یا آنند وردھن، عبدالقاہر جرجانی، ابن خلدون۔ ان کے بہت سے خیالات سے اختلاف کیا جاتا ہے، مگر ان کے خاتمے کا تصور شاید ہی کیا جاتا ہو۔ کہنے کا مقصود یہ نہیں کہ تھیوری میں جو کچھ ہے وہ ابدی اہمیت کا حامل ہے، بلکہ یہ واضح کرنا مطلوب ہے کہ 'خاتمے' اور 'بعد' کے تصورات اپنی اصل میں 'نئے' ہیں، اور ان کا گہرا رشتہ وقت کے حسابی، پیداواری، صارفی تصور سے ہے۔ نیز اکیسویں صدی کے آغاز سے ذرا پہلے اور کچھ بعد تنقید پر شروع ہونے والا مباحثہ/کلامیہ وقت کے اس تصور ہی سے پھوٹا۔

اس ساری تفصیل کا مقصود معاصر تنقید کو سمجھنے کی راہ میں حائل ایک بڑی رکاوٹ کی نشان دہی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں تھیوری پر قائم ہونے والا مباحثہ رکلامیہ ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاصر تنقید یعنی تھیوری اپنے اندر ایک زبردست مزاحمت رکھتی ہے، اپنے صارفی، پیداواری شے میں بدلنے کے خلاف۔ اس ضمن میں ہم یہاں ٹیری ایگلٹن کی رائے پیش کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے 1983 میں تھیوری کے تعارف پر کتاب (Literary An Introduction:Theory) لکھی، مگر اکیسویں صدی کے تیسرے برس تھیوری کے بعد کے عنوان سے کتاب شایع کی۔ 'تھیوری کے بعد' میں لکھتے ہیں:

> تھیوری ایک طرح کے فوق سوالات (meta-questions) قائم کرنے کا میلان رکھتی ہے۔ یہ پوچھنے کے بجائے کہ 'کیا یہ نظم قابلِ قدر ہے؟' تھیوری استفسار کرتی ہے کہ 'ایک نظم کو اچھا یا برا کہنے سے آپ کی مراد کیا ہے؟'... [روایتی] نقاد علامتوں کو زیرِ بحث لاتا ہے، جب کہ تھیورسٹ سوال کرتا ہے کہ کس پراسرار عمل سے ایک چیز دوسرے کی قائم مقام بنتی ہے؟ [روایتی] نقاد [شیکسپیئر کے ایلیے] کوریولینس کے کرداروں سے متعلق گفتگو کرتا ہے، جب کہ تھیورسٹ پوچھتا ہے کہ کس طور لفظوں کے پیٹرن سے ایک صفحے پر ایک شخص نمودار ہوتا ہے۔ (After Theory، ص 88-87)

اگر کسی چیز کو تھیوری کی روح قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ ہے مسلسل اور بنیادی سوالات اٹھانا۔ اسی بنا پر تھیوری کا مزاج بہ قول ٹیری ایگلٹن، جمہوری ہے؛ یہ نظریات مسلط نہیں کرتی، سوال قائم کرنے کی تحریک دیتی ہے۔ تنقید میں سوالات قائم کرنے کی روایت، خود تنقید جتنی پرانی ہے۔ مثلاً ڈرامے میں وحدت سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال ارسطو نے قائم کیا۔ نظم میں وحدت سے کیا مراد ہے؟ اسے جرمن رومانوی نقادوں اور کالرج نے اٹھایا۔ ادب میں ذات کا اظہار کیسے ہوتا ہے؟ یہ سوال نفسیاتی تنقید اور جدیدیت نے اٹھایا۔ ادب پارہ کن لسانی و شعری وسائل سے بہ طور ادب قائم ہوتا ہے؟ اسے ہیئتی تنقید نے قائم کیا۔ ادب کس طور معاشی پیداواری نظام کا حلیف یا حریف بنتا ہے؟ یہ سوال مارکسی تنقید نے قائم کیا۔ لفظ کے مجازی و استعاراتی

تفاعل سے معنی خیزی کیوں کر ممکن ہوتی ہے؟ یہ سوال آنند وردھن کے یہاں ملتا ہے۔علم البلاغ اور علم البیان میں کیا فرق ہے؟ اس سوال پر بحث عبد القاہر جرجانی نے کی۔ بعد میں تھیوڈ رو اڈورنو نے ابلاغ کی زبان اور آرٹ کی زبان کا بیانیہ وضع کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تنقید کی تاریخ میں سوالات قائم کرنے کی روش قدیمی ہے۔لیکن ان تمام سوالات اور تھیوری کے سوالات میں ایک فرق ہے۔تھیوری،سوالات و مفروضات کے تشکیل پانے کے عمل پر سوال قائم کرتی ہے۔صرف ایک مثال کافی ہے۔جدیدیت کا مؤقف تھا کہ ادب،ذات کا اظہار ہے۔مابعد جدید تنقید/تھیوری سوال اٹھاتی ہے کہ ذات ہے کیا؟ کیا یہ ادب کی روایت اور زبان سے باہر وجود میں آتی ہے، یا ان کے تحت اور اندر؟ کیا ہم کسی انسانی ذات کے اس تصور کو سمجھ سکتے ہیں جسے انسانی زبان سے باہر تشکیل دیا گیا،اور ظاہر کیا گیا ہو؟ نیز اگر ہم یہ بات مانتے ہیں کہ زبان ایک اجتماعی چیز ہے؛اسے نہ تو انفرادی طور پر بنایا جاسکتا ہے،نہ مکمل علیحدگی کی حالت میں،ایک ماورائی نوعیت کی تنہائی میں،اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔لہٰذا ہر اظہار حقیقتاً سماجی اور اجتماعی ہوتا ہے؛ ثقافت کے جال کا ایک حصہ ہوتا ہے،اور اس بنا پر ثقافت و سماج کے جال کے ایک حصے میں رونما ہونے والا واقعہ پورے جال کے دھاگوں،ریشوں میں تناؤ پیدا کرتا ہے۔اس لیے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ آدمی جس ذات کا حامل ہوتا ہے،وہ علیحدگی،ماورائی تنہائی میں تشکیل پا گئی ہو،اور وہ اپنے عصر کے واقعات، بیانیوں،سانحوں سے اثر پذیر نہ ہوئی ہو؛اس کے خلاف ردِعمل ظاہر نہ کیا ہو،گریز اختیار نہ کیا ہو، یا اس سے مطابقت پیدا نہ کی ہو، یا سرے سے اپنا رخ کسی اور جانب نہ موڑ لیا ہو؟ یہ سوالات جدیدیت کے بنیادی مؤقف ہی کو مسترد کرتے ہیں،جو ادب کو ذات کا انتہائی منفرد، مستند اظہار سمجھے جانے سے عبارت ہے۔

تھیوری کے یہ سوالات بنیادی ہیں۔ان میں سے بعض کو ساختیات نے، کچھ کو ردِتشکیل نے، کچھ کو فوکو کے نظریہء ڈسکورس نے تشکیل دیا۔ یہ سوالات چوں کہ خاص نظریات اور خاص علمیات کے تحت وضع کیے گئے تھے،لہٰذا یہ خاص حد تک ہی بروے کار آسکتے تھے۔اکیسویں صدی کے آغاز میں جب یہ کہا جانے لگا کہ تھیوری کا دور گزر گیا تو من جملہ دیگر اسباب

کے،ایک سبب یہ بھی تھا کہ ساختیات، پس ساختیات، مابعد جدیدیت پر کافی ہنگامہ ہو چکا، ہر پہلو واضح ہو چکا؛اب نیا کیا؟ دوسرے لفظوں میں اعتراض مخصوص نوعیت کے سوالات پر تھا۔اس بات کو تھیوری کے کٹر ناقدین (جن میں ٹیری ایگلٹن بھی شامل ہیں) نے بھی قبول کیا کہ تھیوری کی ،فوق سوالات اٹھانے کی روح اب بھی باقی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ تنقید کی روایت میں تھیوری کا حقیقی اور بے بدل اضافہ یہی ہے کہ اس نے ادب کی ہر ہر جہت سے متعلق بنیادی نوعیت کے سوالات قائم کرنے کا ایک طریق کار متعارف کروایا ہے؛ کسی خیال، نظریے، ہیئت ،صنف، رجحان وغیرہ کو تاریخی یا ثقافتی تشکیل سمجھا ہے۔چوں کہ یہ ثقافت و تاریخ کے محور پر تشکیل پاتے ہیں،اس لیے ان کے معانی کا سرچشمہ بھی یہی ہیں۔تھیوری کے سوال اٹھانے کی یہی روح اب کچھ نئے زاویے سے اپنا اظہار کرنے لگی ہے۔

کوئی ڈیڑھ برس پہلے تھیوری کی ایک نئی جہت سامنے آئی ہے۔ یہ جہت تازہ ہے،مگر پوری طرح تھیوری سے جڑی ہے۔2012 میں نینسی ایسٹرلن کی کتاب A Biocultural Approach to Literary Theory and Interpretation چھپی ہے۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب ادبی تھیوری میں حیاتی ثقافتی طریق کار سے کام لیتی ہے۔تھیوری کے ساتھ نقاد ادبی، ثقافتی ،تنقیدی جیسے سابقے عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔نینسی نے اب ایک نئے سابقے کا اضافہ کیا ہے: حیاتیاتی۔تھیوری نے اپنے فوق سوالات کی مدد سے جو بین العلومی روش اختیار کی تھی، یہی روش اس کتاب میں بھی ظاہر ہوئی ہے۔تھیوری کے تحت ہونے والے مابعد نو آبادیاتی اور تانیثی مطالعات بھی بین العلومی ہیں کہ ان میں تاریخ ثقافت، زبان، فلسفہ،نفسیات جیسے علوم کی بصیرتوں سے کام لیا جاتا ہے۔نینسی ایسٹرلن نے ڈارون کے حیاتیاتی ارتقائی (اور نفسیاتی ارتقائی) نظریے کے اطلاق سے ادبی مطالعات کیے ہیں۔نینسی نے آرٹ کی تخلیق کو ایک ثقافتی سرگرمی کے ساتھ ساتھ فطری سرگرمی سمجھا ہے۔غالباً یہ ہر شے کو محض ثقافتی سمجھے جانے کا ردِعمل ہے۔نینسی کا مؤقف یہ نظر آتا ہے کہ انسان نے اپنے ارتقائی عمل میں فطرت سے مطابقت اختیار کی اور فطرت پر غلبہ حاصل کیا (اور ثقافت پیدا ہوئی)،اور اس کے نتیجے میں اپنے شعور کی نشوونما کی،اسی تسلسل میں آرٹ بھی تخلیق کیا۔ وہ محض یہ نہیں

کہتیں کہ آرٹ کی تخلیق انسان کی فطرت، جبلت میں شامل ہے۔ یہ تو ایک اہم نظریے کی بہت سادہ تخفیف ہوگی۔ وہ یہ رائے ظاہر کرتی ہیں کہ آرٹ کی تخلیق ایک عام شے کو خاص بنانے کا نام ہے، یعنی اس شے کو ایک دوسری، مختلف، جادوئی دنیا میں لے جانے کا نام ہے؛ شے کو اس کی فوری افادی حیثیت سے آزاد کرانے کا نام ہے، اور یہ سب انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ گویا انسان کی فطرت سے تعلق کی اہم جہت تخلیقی ہے، جو فطرت پر محض غلبے سے مختلف ہے۔ اسی رو میں وہ ادب میں ظاہر ہونے والی اکثر تشکیلات، جیسے جگہ، ماحول، فطرت، عورت، جسم، احساس، جنس وغیرہ کی تعبیرات کرتی ہیں اور ہر جگہ ارتقائی حیاتیات اور ارتقائی نفسیات اور تھیوری کے تناظر کو سامنے رکھتی ہیں۔

اردو تنقید:

اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی صورتِ حال پر خود اکیسویں صدی کے ڈسکورس اور مغربی تنقید کا عکس ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاصر اردو تنقید مغربی تنقید کی ہو بہو، یا خاصی بری نقل ہے۔ یہ تو درست ہے کہ زندگی کے دیگر شعبوں کی مانند اردو ادب میں بھی وقت کا حسابی، پیداواری، صارفی تصور راہ پا گیا ہے؛ اب ہم پرانے صنمیاتی، اساطیری، کلاسیکی وقت کی یاد میں جتنا مرضی ہلکان ہولیں، وہ واپس آنے سے تو رہا۔ اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک زبان کے علم یا ادب کے رجحانات، جب دوسری زبان میں آتے ہیں تو ان کی نوعیت عکس کی ہوتی ہے، نقل کی نہیں؛ عکس عارضی ہوتا ہے، نقل دیرپا ہوتی ہے۔ نظری طور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ کوئی دوسری زبان لاکھ ہم پر، اپنے نظریات، رجحانات سے دھاوا بولے، وہ ہم سے ہماری زبان کی ملکیت (ownership) نہیں چھین سکتی؛ کوئی آدمی چاہے بھی تو اپنی زبان کے تصورِ کائنات سے باہر جا کر نہیں سوچ سکتا۔ لہٰذا اصولاً یہ ممکن ہی نہیں کہ اردو تنقید مغربی اثرات کے نتیجے میں، مغرب کی ہو بہو نقل بن جائے۔ اردو ادب پر فارسی کے اثرات کے ضمن میں بھی، اردو نے اپنی مقامیت کو قائم رکھا اور یہی صورت مغربی اثرات کے ضمن میں بھی ہے۔ یہاں ہمارے پیشِ نظر اردو کے بہترین لکھنے والے ہیں، جو دو ثقافتوں کے

باہمی فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں؛ ثقافتی اجارہ داری کے تصور سے آشنا ہوتے ہیں، اور مقامی ثقافتی و جمالیاتی روح کے نشو ونما کے اصولوں کو جذب کیے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اپنی زبان کی ملکیت کا شعور رکھتے اور اسے برقرار رکھنے کی ذہنی وتخلیقی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔

عاصر اردو تنقید کی صورتِ حال پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک سے زیادہ رجحانات موجود ہیں۔ واضح رہے کہ یہ رجحانات نئے نہیں ہیں، یعنی ان کے بارے میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اکیسویں صدی ہی کی پیداوار ہیں۔ یہ بات بھی سامنے رہنی چاہیے کہ فقط ڈیڑھ دہائی میں ادبی رجحانات کے بارے میں ہم کوئی بات قطعیت سے نہیں کہہ سکتے؛ یہ رجحانات تشکیل کے مراحل میں ہوتے ہیں۔ اکیسویں صدی کی اردو تنقید کے بیشتر رجحانات وہی ہیں جو یا تو بیسویں صدی سے چلے آرہے ہیں، یا پھر ان کی جڑیں بیسویں صدی میں ہیں۔

اس وقت اردو تنقید میں ایک رجحان تھیوری کا ہے، جو بیسویں صدی کے اواخر سے چلا آتا ہے۔ اس رجحان کے علم برداروں میں ہندوستان سے گوپی چند نارنگ، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال حسین، شافع قدوائی، عتیق اللہ اور مولا بخش ہیں، جب کہ پاکستان سے وزیر آغا، ضمیر علی بدایونی، قمر جمیل اور فہیم اعظمی کے نام اہم ہیں۔ ہر چند یہ چاروں مرحوم ہو چکے ہیں، مگر ان کی کتابیں اکیسویں صدی کی اردو تنقید کا اہم حصہ ہیں۔ تھیوری کے دیگر پاکستانی نقادوں میں اقبال آفاقی، قاسم یعقوب اور دانیال طریر کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان تینوں نقادوں کی کتابیں گزشتہ دو تین سالوں میں شایع ہوئی ہیں۔ اردو میں تھیوری کے مباحث کی خاص بات یہ ہے کہ اسے وسیع ثقافتی و علمی تناظر میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ مثلاً وزیر آغا نے تھیوری کو معاصر سائنسی نظریات کی روشنی میں سمجھا ہے۔ انھوں نے اپنی آخری کتاب (جو ان کی وفات کے دو برس بعد 2012 میں شایع ہوئی) تنقیدی تھیوری کے سو سال میں روسی فارمل ازم، نئی تنقید، ساختیات اور ساخت شکنی کو کائنات کی چار بنیادی (یعنی طاقت ور، برقی مقناطیسی، کم زور اور کشش ثقل) قوتوں کی مانند سمجھا ہے، اور ان کی وحدت کا خیال پیش کیا ہے۔ وزیر آغا اردو کے واحد نقاد ہیں جنھوں نے معاصر سائنسی علوم کی روشنی میں تنقیدی مباحث کو سمجھا، اور اس ضمن

میں یہ خیال پیش کیا کہ سماجی و تنقیدی نظریات میں بنیادی تبدیلیاں طبیعیات کے نظریات کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً مذکورہ کتاب میں لکھتے ہیں کہ دریدا کی ساخت شکنی کی نوعیت، کشش ثقل کی مانند ہے۔ جس طرح ساخت شکنی یا ردِ تشکیل کے ساتھ یہ مسئلہ درپیش ہے کہ وہ کس طرح اپنے گنجلک پن کے ساتھ روسی فارملزم، نئی تنقید اور ساختیات کے نظام کا حصہ بنے، یہی مسئلہ کشش ثقل کے ساتھ رہا ہے کہ وہ دیگر قوتوں میں ضم نہیں ہو سکتی، مگر طبیعیات میں بہ قول وزیر آغا ''ایم سٹرانگ تھیوری نے جس Ultra-Microscopic Level کو نشان زد کیا ہے، وہاں چاروں قوتیں باہم آمیز ہوتے دکھائی دے رہی ہے... چونکہ Ultra-Microscopic Level پر محض غدر کا عالم اور گنجلک کا منظر نامہ ہی نہیں ابھرتا، اس کے اندر تخلیق کاری کی جہت بھی نمودار ہوتی ہے... یہ ایک اہم بات ہے جس کے پیش نظر یہ کہنا ممکن ہو گیا ہے کہ ساخت شکنی کا پیش کردہ گورکھ دھندے کا تصور محض تلازمہ خیال نہیں، یہ تخلیقی عمل مرابطے یعنی Creative Bi-Sociation کا حامل بھی ہے''۔ (ص 173) سادہ لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اب کائنات کی چاروں قوتیں متحد خیال کی جانے لگی ہیں، اس طرح بیسویں صدی کے چاروں اہم تنقیدی نظریات بھی متحد سمجھے جا سکتے ہیں۔ ہم شاید وزیر آغا کی اس منطق کو پوری طرح قبول نہ کریں، کیوں کہ روسی ہیئت پسندی، نئی امریکی تنقید، ساختیات اور ردِ تشکیل بیسویں صدی کے تنقیدی نظریات ہیں، اور ان میں پہلے کے اور بعد کے نظریات کو شامل نہیں کیا گیا، لہٰذا انھیں تنقید کے چار بنیادی نظریات سمجھنا مشکل ہی سے قابلِ قبول سمجھا جائے گا، نیز سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہم تنقیدی نظریات کو سائنس کے حتمی نظریات کی مانند مستقل، غیر مبدل سمجھ سکتے ہیں؟ بایں ہمہ ہم وزیر آغا کے اس دانش ورانہ اجتہاد کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے، جس کی مدد سے انھوں نے ادب کے فہم کے اصولوں کو خالص سائنسی بنیاد مہیا کرنے کی کوشش کی، اور اس طور اردو تنقید کو سنجیدہ عالمانہ وقار عطا کیا۔

اردو میں تھیوری کے مباحث کو برصغیری ثقافتی تناظر مہیا کرنے میں اہم کردار گوپی چند نارنگ کا ہے۔ اگرچہ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں انھوں نے اپنی کتاب ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات میں تھیوری کے فکری رشتے ہندوستانی فکر سے جوڑے تھے، تاہم گزشتہ

برس یعنی 2013 میں انھوں نے اپنی کتاب غالب،معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات میں غالب کا مطالعہ بودھی نظریے شونیتا کی روشنی میں کیا ہے،اور دریدا کی ردتشکیلی فکر کا رشتہ ناگارجن کے شونیتا کے نظریے سے قائم کیا ہے۔گوپی چند نارنگ نے پروفیسر فرتھ، کنجی راجا، رابرٹ میگلیو لا اور ہیرولڈ کوڈور کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''زبان کی افتراقیت کا نکتہ سوسئیر نے بودھوں ہی سے اخذ کیا تھا'' (ص ۱۰۴)۔شونیتا بہ قول گوپی چند نارنگ''،ایک آگہی ہے اس احساس کی کہ کائنات میں کچھ بھی،یعنی کوئی شے،کوئی بھی خیال،کوئی بھی نظریہ،کوئی بھی تصور،کوئی بھی نقطۂ نظر،کوئی بھی اصول قائم بالذات نہیں''؛کسی شے کی کوئی اصل نہیں۔ نارنگ صاحب کو شونیتا کی علمیات،غیر معمولی اہمیت کی حامل محسوس ہوئی ہے۔ یہ جدلیاتی علمیات ہے، جسے انھوں نے مارکسی،ویدانتی جدلیات کے مقابل رکھ کر دیکھا اور کہیں زیادہ بصیرت آگیں پایا ہے۔ باقی سب جدلیاتی طور کسی نہ کسی اثبات پر منتج ہوتے ہیں،مگر بودھی جدلیات نفیِ محض ہے،اور نفیِ محض آگہی و آزادی ہے؛یہ معنی سے زیادہ معنی سازی کے امکانات سے متعلق ہے۔یہ ایسی خاموشی ہے جو تمام صداؤں کا مصدر ہے۔ معاصر عالمی فکر(جس کی بصیرت انھیں حاصل ہے) اس کی توثیق ہی نہیں کرتی،اس کی روشنی میں اپنے خدوخال بھی مزید نمایاں کرتی ہے۔انھیں مابعد جدید ذہن،خصوصاً دریدائی فکر اور شونیتا میں غیر معمولی مماثلت محسوس ہوئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پوری کتاب میں اپنے تھیسس کو ثابت کرنے کے لیے بودھی جدلیاتِ نفی سے بیش از بیش مدد لیتے ہیں،اور دریدا کی ردتشکیل،معنی کے التوا کا صرف ذکر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ ثقافتی عصبیت نہیں، دونوں کی علمیات کا شعور ہے۔ دردیدا معنی کے افتراق و التوا پر زور دیتے ہیں،اور ایک معنی کے اندر دیگر معانی کے نامختتم سلسلے کی نشان دہی کرتے ہیں، جب کہ شونیتا معنی، یا اس کی افتراقیت ہی کو رد کرتی ہے۔اس ضمن میں نارنگ صاحب بیدل اور شیخ ناصر علی کی اس بحث کا حوالہ ایک سے زیادہ مرتبہ لاتے ہیں(جسے مراۃ الخیال سے حمید احمد خاں نے مرقع غالب پیش کیا ہے)،جس میں ناصر علی نے کہا کہ معنی لفظ کے تابع ہے،لفظ جب بھی ظاہر ہوتا ہے معنی خود بہ خود ظاہر ہوجاتا ہے؛اس پر بیدل نے کہا کہ وہ معنی جسے آپ تابعِ لفظ قرار دے رہے ہیں،اس کی اصلیت بھی ایک لفظ سے زیادہ

نہیں۔ جو چیز حقیقت میں معنی کہلاتی ہے، وہ کسی لفظ میں نہیں سما سکتی۔ ناصر علی اور بیدل کی یہ گفتگو تھیوری کے اس بنیادی مفروضے کی روشنی میں کہیں بہتر انداز میں سمجھی جا سکتی ہے، جس کے مطابق 'حقیقت زبان کے اندر تشکیل پاتی ہے'۔ اگرچہ بیدل کے پیش نظر معنی کا مابعد الطبیعیاتی تصور ہے، جو لفظ یعنی انسانی اظہار کی گرفت سے ماورا رہتا ہے، مگر جسے ہم ماورا کہتے ہیں، اس کا تصور یا خیال یا اس کی طرف اشارہ بھی زبان کرتی ہے۔

تانیثی و مابعد نوآبادیاتی تنقید کا رجحان ہمیں شدت سے اکیسویں صدی کی اردو تنقید میں محسوس ہونا شروع ہوا ہے۔ اکیسویں صدی کے شروع کے چند سالوں میں ہمیں اردو میں تانیثی تنقید کا رجحان شدت سے محسوس ہونے لگا تھا، مگر اب اس میں ٹھہراؤ سا آ گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس طرزِ تنقید کے بنیادی تصورات واضح ہو چکے ہیں، یعنی یہ کہ ادب و ثقافت میں عورت کی نمائندگی پدرسری نظام کے تابع رہی ہے؛ عورت کو غلاموں کی مانند حاشیائی مقام ملا ہے؛ خود ادب کی جمالیات کی تشکیل میں 'مرد اشرافیہ' غالب رہی ہے۔ اب یہ تصورات اردو تنقید کے عمومی شعور کا حصہ ہیں۔ تانیثی اور مابعد نوآبادیاتی تنقید میں مشترک نکتہ یہ ہے کہ دونوں مرکز شکن ہیں۔ تانیثی تنقید مرد مرکزیت کی تمام صورتوں کو چیلنج کرتی ہے، اور مابعد نوآبادیاتی تنقید ادب و کلچر میں یورپ مرکزیت کے تصور کو بے دخل کرتی ہے۔

مابعد نوآبادیاتی تنقید کو معاصر اردو تنقید کا اہم ترین رجحان سمجھا جانا چاہیے۔ فرانز فینن، البرٹ میمی، ایڈورڈ سعید، برنارڈ ایس کوہن کی تحریروں سے اس طرز مطالعہ کی بنیاد بیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے میں پڑی، جسے ہومی بھابھا، گائیتری چکرورتی، اعجاز احمد، ضیا الدین سردار، چنوا اچیبے، وؤئیل سونیکا نے آگے بڑھایا۔ اردو میں مابعد نوآبادیاتی تنقید پر مبنی قابل ذکر تحریریں اکیسویں صدی ہی میں سامنے آئیں۔ اس طرزِ تنقید کے نتیجے میں انیسویں اور بیسویں صدی کے اردو ادب کا ایک نیا فہم، ایک نئی تعبیر سامنے آ رہی ہے، جس کے مطابق اس زمانے کا اردو ادب نوآبادیاتی مقتدرہ کی تشکیل دی گئی اساطیر کے تابع بھی ہے، اس سے کش مکش کا رشتہ بھی رکھتا ہے، اور اس سے آزادی و نجات کی سعی بھی کرتا ہے۔ یہ تنقید برصغیر میں مغربی جدیدیت و روشن خیالی کے پراجیکٹ، مغربی تہذیب کی آفاقیت، انگریزی زبان و

ادب کی تہذیب آموزی، لسانی و مذہبی قوم پرستی، ادب کی کینن سازی وغیرہ کے داخلی تضادات کا پردہ چاک کرتی ہے۔ مجموعی طور پر اس کا منشا ردّ نو آبادیات یعنی Decolonisation ہے۔ ابھی اس تنقید کا آغاز ہوا ہے، اور زیادہ تر انیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ، اس کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا نے جس نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا، اور ادب و ثقافت و تعلیم میں جس جدیدکاری کی بنیاد ڈالی، اس پر ایک نئے، جرأت مندانہ زاویے سے نظر ڈالی ہے۔ مثلاً شمیم حنفی نے اپنے ایک تازہ مضمون میں لکھا ہے: ''تاریخ کے فیصلوں نے یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہنے دی کہ آزمائش کے اس لمحے میں نشاۃ ثانیہ کے موئدین [آزاد، سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد] جس نتیجے تک پہنچے، وہ سب کے سب صحیح نہیں تھے، نہ ان کی اساس صرف فکری، معاشرتی اور تہذیبی بنیادوں پر قائم تھی۔ ذہنی تبدیلیوں کے آئندہ مراحل کی طرح نشاۃ ثانیہ کے اس مرحلے میں بھی ایک پس پردہ سیاسی ایجنڈہ، نئی فکر اور نئے علمی و ادبی تصورات اور مقاصد کا حصہ تھا۔'' (دنیا زاد، شمارہ 39، نومبر 2013، ص18)۔ واضح رہے کہ شمیم حنفی نے سرسید و حالی و شبلی کی جدیدکاری کے عمل کی نفی نہیں کی، اس عمل کو ڈی کولونائز کیا ہے۔ اسی طرح ابوالکلام قاسمی نے محمد حسین آزاد کی تنقید کے نو آبادیاتی مضمرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ''اپنی نظری و عملی تنقید کو دولخت بنا لیتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کے نظریہ و عمل کے مابین ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر اس مغربی یا نو استعماری نقطۂ نظر سے پر ہوتا ہے جو نہ ان کا مزاج ہے، نہ ترتیب اور نہ افتادِ طبع''۔ (آزاد صدی مقالات، ص 131)۔ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ ڈیڑھ صدی پہلے کے اردو ادب میں سرایت کر جانے والی نو آبادیاتی اغراض کی نشان دہی سے کیا حاصل، جو اثرات یہ ادب مرتب کر سکتا تھا، وہ تو مرتب ہو چکے؟ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! ماضی کے وہ ادبی متون جو کینن کا درجہ اختیار کر گئے ہوں، چوں کہ وہ ہمارے مطالعے اور شعور کا مستقل حصہ ہوتے ہیں، لہٰذا ان سے متعلق نیا فہم، ان کے اثر کو بھی تبدیل کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ سنتالیس میں آزادی کے بعد جنوبی ایشیا کا خطہ نئی نو آبادیات کے زیر اثر چلا گیا تھا، اور اب تک وہ ادارے، وہ کینن، وہ پیمانے موجود ہیں جنھیں نو آبادکاروں نے اپنے ثقافتی غلبے کے لیے رائج کیا تھا، اس لیے اس طرزِ تنقید کی

معاصر عہد میں غیر معمولی موزونیت ہے۔

اکیسویں صدی کی اردو تنقید میں ایک اور میلان اینٹی تھیوری کا ہے، جس کی نمائندگی آرتھو ڈاکس ترقی پسند، جدیدیت پسند اور مذہب رروایت پسند نقاد کرتے ہیں۔ یہ ایک قابل غور بات ہے کہ آرتھوڈاکس ترقی پسندوں یا مذہب پسند نقادوں کے پاس اگر کوئی نئی بات ہے تو صرف تھیوری کی مخالفت ہے؛ اسے سادہ لوحی کہنا چاہیے کہ مجبوری، یہ لوگ مخالفت کے لیے دلائل بھی کسی مغربی نقاد سے لیتے ہیں؛ باقی وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ سنی دہائیوں پہلے کی باتوں کی تکرار کے سوا کچھ نہیں؛ یعنی یہ کہ یہ مغربی سامراج کی سازش ہے، مغرب کے چبائے ہوئے نوالے ہیں، پروفیسروں کے ڈھکوسلے ہیں؛ مغرب میں تھیوری کا خاتمہ ہو چکا وغیرہ۔ ان کی نظر اس بات پر نہیں جاتی کہ گزشتہ پچیس تیس برسوں میں اردو تنقید کا مزاج تبدیل ہوا ہے، یعنی اس میں ایک بین العلومی جہت نمودار ہوئی ہے؛ ادب کا مطالعہ یہ سب تھیوری کے اثر سے ہے۔

یہاں تھیوری کے ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی کے خیالات کا مختصر ذکر ضروری ہے۔ تھیوری کے ضمن میں ان کا رویہ دو جذبی ہے، یعنی بہ یک وقت محبت اور نفرت کا۔ وہ جگہ جگہ تھیوری، مابعد جدیدیت پر اعتراضات کرتے ہیں، مگر اپنی بعض اہم تحریروں میں مختلف موقف ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے داستان امیر حمزہ کے مطالعے کی پہلی جلد (مطبوعہ 1999) میں زور دے کر لکھا ہے کہ "میرا کہنا یہ ہے کہ روسی ہیئت پسندی (Russian Formalism) اور بیانیہ کی فرانسیسی وضعیاتی تنقید [یعنی ساختیاتی تنقید] سے معاملہ کیے بغیر ہم ناول اور داستان دونوں کی تنقید میں ناکام رہیں گے" (ص 71) اسی طرح 2009 میں شایع ہونے والی اپنی کتاب جدیدیت، کل اور آج میں لکھا ہے کہ "وضعیات (یعنی ساختیات) اور مابعد وضعیات (یعنی پس ساختیات) ادب کے پڑھنے کے طریقے ہیں، ادب بنانے کے نہیں..... وضعیات یا مابعد وضعیات نے بعض بڑی بیش قیمت باتیں ضرور کہی ہیں..... اردو میں ان نئے نظریات قرأت کا ورود نیک فال کا حکم رکھتا ہے، لیکن ان سے تخلیقی ادب میں کوئی تبدیلی شاید نہ ہوگی" (ص 44-45)۔ فاروقی صاحب نے تھیوری کے اصل مزاج کی صحیح نشان دہی کی ہے: یہ کہ تھیوری ادب کی قرأت و تعبیر سے متعلق ہے؛ یہ تخلیق کار کو ادب کی تخلیق سے متعلق کوئی گائیڈ لائن

نہیں دیتی۔دوسرے لفظوں میں یہ تخلیق کار کی آزادی کا احترام کرتی ہے کہ وہ جو چاہے، جس طرح چاہے لکھے۔تھیوری یہ تو نہیں بتاتی کہ ادب کیسے بنانا چاہیے، مگر یہ ضرور بتاتی ہے کہ ادب بنتا کیسے ہے۔تھیوری کا زور 'چاہیے' کے بجائے 'ہے' پر ہے۔'چاہیے' میں خواہش، خواب، حکم، ایجنڈا شامل ہوجاتے ہیں، اور ان کی وجہ سے ادب میں طاقت کا کھیل شروع ہوجاتا ہے؛ یہ طاقت سیاسی بھی ہوسکتی ہے، اور نظریاتی بھی۔دوسری طرف 'ہے' ایک وجودی صورتِ حال ہے، جو آزادی کے ساتھ کسی بھی راستے کے انتخاب کو ممکن بناتی ہے۔تھیوری کے پاس کوئی ایجنڈا نہیں، سوالات ہیں۔

اکیسویں صدی کی اردو تنقید کا یہ مختصر تذکرہ چند ایسے نقادوں کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا، جن کی تنقید پر کوئی خاص لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ان میں سب سے پہلے شمیم حنفی کا ذکر ضروری ہے۔جدیدیت کی روشن خیالی، تہذیب اور تخلیق تجربہ، شمیم حنفی کی تنقید کے عناصر ثلاثہ ہیں۔دوسرا اہم نام آصف فرخی کا ہے۔انھوں نے فکشن کو اپنے خصوصی مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔فکشن ہی کی تنقید میں ایک اہم نام مرزا حامد بیگ کا ہے۔اجمل کمال ایک روشن خیال اور جرأت اظہار سے مالا مال نقاد ہیں۔دیگر پاکستانی نقادوں میں تحسین فراقی، محمد حمید شاہد، ضیاء الحسن، مبین مرزا، امجد طفیل قابل ذکر ہیں۔

آخر میں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی کی اردو تنقید کے رجحانات میں سے کون سا رجحان معاصر عہد کے مطالبات سے ہم آہنگ ہے، اور کون سے رجحانات محض پرانے تصورات، نبٹ چکے نظریات کی تکرار محض ہیں؟اس سوال کا جواب ہم اس تنقید کے بنیادی مزاج کی روشنی میں تلاش کر سکتے ہیں۔تنقید کا بنیادی مزاج، ادب پاروں کا فہم ہے، ان کی روایت، تاریخ، عصر موجود کے تناظر میں، اور یہ اصولی بات ہے کہ فہم کبھی جامد نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ روانی کی حالت میں رہتا ہے۔ادبی متن اپنی جگہ پہ، اپنی خاص حالت میں برقرار رہتا ہے، مگر اس کا فہم کبھی یکساں نہیں ہوسکتا۔چناں چہ معاصر تنقید کا وہی رجحان قابلِ قدر ہوسکتا ہے جو معاصر دنیا میں فہم کی صورتوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہو، یا کم از کم اس محاورے میں اپنا اظہار کرتا ہو جو مذکورہ تبدیلیوں کی زبان کا محاورہ ہے۔

○

اقبال کی اردو شاعری اکیسویں صدی کے تناظر میں

ڈاکٹر جمیل اصغر

فیصل آباد یونیورسٹی، پاکستان

اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جو قسم قسم کی خوشبوؤں سے مشک بار ہے۔اس کی جادو اثری میں شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی اور نطق اعرابی کا ہاتھ ہے۔عصر حاضر کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنے والی یہ زبان بین الاقوامی واسطوں اور ناطوں کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ براعظم سے غلامی کے آثار مٹانے کی جدوجہد و ہند و پاک کے عوام کو قریب تر لانے میں، اس زبان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ یہ زبان صرف زبان ہی نہیں بلکہ مشترکہ تہذیب و ثقافت کا وہ عکس بھی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے تعاون اور اختلاط و ارتباط سے وجود میں آئی۔ درحقیقت یہ زبان بازاروں، گلیوں، کوچوں، میلوں ٹھیلوں، بھگتوں، گروؤں، سنتوں، فقیروں اور صوفیوں کی وہ زبان ہے، جو جہاں جہاں پہنچی آنکھوں میں بستی اور دلوں کو شاداب کرتی گئی۔ اس زبان کے دامن میں انسان دوستی، وسیع النظری، آفاقیت، محبت و یگانگت کا وہ سبق ہے جس سے قومیں عروج پاتی ہیں اور تاریخ میں ان کے کارنامے جگمگاتے ہیں۔خواجہ معین الدین اجمیری،

فرید الدین گنج شکر، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، رامانند، تکارام، بھگت کبیر اور گرونانک جیسے لوگوں نے اردو زبان و ادب کے میخانے کو آباد کیا۔ اردو زبان کا اہم اقبال بھی اسی میخانے سے رجوع کرتا ہے اور اپنی شاعری کے ذریعے ایسے افکار و خیالات پیش کرتا ہے جو زمانی و مکانی حدود کے پابند نہیں۔

اقبال کی تہذیبی شناخت میں اردو، فارسی، پنجابی، عربی، جرمنی اور انگریزی کی ادبی اور فکری روایات شامل تھیں۔ دنیا کے معروف علوم جیسے فلسفہ، الہیات، تصوف، قانون، اقتصادیات، سیاسیات کا انھوں نے عمیق مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے اس فکری توانائی اور ادیبانہ تونگری کو نہایت عرق ریزی اور جگر کاوی سے پیش کیا:

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر (1)

اس طرح وہ شاعری تخلیق ہوئی جو اپنے عہد کے علاوہ مستقبل کی بھی حقیقت بنی۔ عصر حاضر میں جدید عالمی تہذیبوں کا تصادم، تاریخ کا خاتمہ اور نئے عالمی نظام کے تصورات نہ صرف نو آبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کا ذریعہ بنتے جا رہے ہیں جس سے انسانیت اور دنیا کے امن کو خطرات لاحق ہیں۔ اقبال وہ شاعر ہے جس نے مختلف تہذیبوں کے مطالعے اور تجزیے کے حوالے سے غیر معمولی ژرف نگاہی، اعتدال پسندی اور غیر جانبداری سے وہ نتائج اخذ کیے ہیں، جو آج بھی پیچیدہ صورت حال میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اکیسویں صدی کا ایک اہم سوال نئے عالمی نظام اور عالمی تہذیب کا ہے۔ یہ اسی عالمی نظام اور عالمی تہذیب کا تسلسل ہے جس کے لیے انیسویں صدی میں یورپی سامراج نے کاوشیں کیں تھیں۔ اقبال نہ صرف تاریخ کے جدید رجحانات سے آشنا تھے بلکہ افق پر نمودار ہونے والی آہٹوں کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ اقبال نے یکم جنوری 1931 میں اپنی ریڈیائی تقریر میں سال نو کے موقع پر جو پیغام دیا تھا اگر اسے اکیسویں صدی کے حالات و واقعات کے تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال موجودہ دنیا کا نقشہ کھینچ رہے ہیں:

''دور حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر

یقیناً حق بجانب ہے۔لیکن تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے
جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا
نقاب اوڑھ رکھے تھے۔ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں حریت اور شرف
انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک
صفحہ بھی اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔'' (2)

اقبال کی اس بات میں ہمارے عہد کی روح دکھائی دیتی ہے اور آج نام نہاد تہذیب یافتہ اقوام پسماندہ اقوام کے ساتھ جس وحشت اور بربریت کا سلوک کر رہی ہیں یہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اقبال کے خیال میں سامراجی ذہن میں وحدت آدم کے بجائے وحدت اقوام کا تصور کارفرما ہے۔حقیقت یہ ہے کہ انسانیت، جمہوریت اور انصاف کے نام پر استحصال اور مکروفریب ہی ملوکیت کی نفسیات ہے،اقبال کہتے ہیں:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم (3)
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری (4)
نسل، قومیت، کلیسا،سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات (5)

اقبال کے اشعار کے حوالے سے دیکھا جائے تو سامراجی طاقتوں کے یہ دعوے کہ ان کے اقدامات عدل و انصاف، جمہوری اقدار اور تہذیب کے تحفظ کی خاطر ہیں، سراسر فریب محسوس ہوتے ہیں۔دراصل استعماری سیاست، ذاتی اقتصادی مفادات کی غرض سے جدید ترین نوآبادیاتی نظام کے ذریعے دنیا کا ثقافتی اور معاشی استحصال کر رہی ہے جسے تہذیبوں کی ترقی کا وسیلہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اقبال کی اردو شاعری سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ دنیا کو جدیدیت کے نام پر تمدن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش اس لیے نہیں کی جا رہی کہ دنیا کو مہذب اور روشن خیال بنایا

جائے یا اس دنیا کے باسیوں کو اخوت، مساوات اور آزادی کی قدروں سے روشناس کرایا جائے بلکہ پس پردہ صارفیت مقصد ہے۔''خضرراہ'' میں اس امر کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم گر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری (6)
مجلس آئین و اصلاح و رعایت و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری (7)
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات (8)

اس صورت حال میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جدید عالمی نظام یہ لبرل جمہوریت یا نئی تہذیب عصر حاضر کے مسائل کا واحد حل ہے۔لیگ آف نیشنز (League of Nations) کے بارے میں اقبال کے ہاں جو طنز اور مغربی اقوام نیز سرمایہ دارانہ فوجی نظام کے خلاف استحقار ہے وہ آج بھی مغربی سیاست کے ضمن میں بصیرت کا ذریعہ ہے۔اقبال ''جمعیت اقوام'' میں کہتے ہیں:

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرا نظر آتی ہے و لیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتہ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے (9)

ان الفاظ میں آج بھی اتنی ہی سچائی ہے جتنی اس وقت تھی، جب اقبال نے انھیں پیش کیا تھا۔فرق صرف یہ ہے کہ نام تبدیل ہو گیا ہے۔آج اقوام متحدہ کا ادارہ بھی امریکہ کے ہاتھ میں اسی طرح کٹھ پتلی ہے جس طرح کل کی جمعیت اقوام مغربی طاقتوں کے ہاتھ میں موم کی ناک جیسی تھی۔اقبال تمام کرہ ارض کو امن و سلامتی کا گہوارہ دیکھنا چاہتے ہیں خامیاں اور کوتاہیاں

چاہے مغرب میں ہوں یا مشرق وہ اس کے مخالف ہیں۔وہ نہ صرف اہل مغرب کی استعماری اغراض، سائنس اور حکمت کے پنجہ خونیں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ پسماندہ اقوام کی جہالت، کم علمی اور بے عملی کو بھی مناسب خیال نہیں کرتے۔ جہاں انھوں نے اقوام مغرب کو آدم شناسی اور حقوق انسانی کی پاسداری کی جانب متوجہ کیا، وہاں پسماندہ اقوام کو بھی خودداری و بیداری کا درس دیا۔ وہ اہل مشرق اور اہل مغرب کو ایک دوسرے سے استفادے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔درحقیقت آج ایک دوسرے سے استفادے اور افہام وتفہیم کا یہی لچک دار رویہ اتحادِ انسانیت کی فضا پیدا کرسکتا ہے اور ایک ایسے عالمی نظام کی تخلیق کرسکتا ہے جس کی بنیاد اخوت ومساوات، وحدت انسانی پر ہو اور جس میں اقوام ایسے مسائل کو مکالمے کے توسط سے حل کرسکیں، اقبال یہ ہے وہ عالمی نظام جس میں کرہ ارض کے تمام بسنے والے ایک وحدت کا روپ اختیار کر کے امن وآشتی کے لیے سرگرم ہو سکتے ہیں اور جس کے نتیجے میں ایک نئی دنیا وجود میں آسکتی ہے جہاں باہمی تنازعات آپسی صلاح ومشورے سے حل کیے جاسکتے ہیں اور:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر (10)

اقبال کے تصور انقلاب سے ہر عہد کے انسان کو تبدیلی کی تلقین ملتی ہے۔ان کا خیال ہے کہ کوئی چیز ایک حالت پر باقی نہیں رہتی۔وہ تبدیلی اور انقلاب کا استقبال کرتے ہیں اور اسی کو دائم وقائم مانتے ہیں۔وہ تجدید کاری اور جدت افکار کو زندگی میں طاقت وقوت کا سرچشمہ سمجھتے ہوئے پیش افتادہ روایات زندگی کو رد کرتے ہیں:

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں (11)
نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح اور شام بدلتی ہے ان کی تقدیریں (12)

تبدیلی اور انقلاب کے ساتھ زندگی کا ترقی تصور کناں ملتا ہے، جس میں سچائی بھی ہے اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت بھی، یہ تصور ہر وقت کا تقاضا ہے۔اقبال نے حریت و

آزادی کا جو تصور دیا ہے وہ آج بھی علمی، سیاسی، سماجی، ذہنی غرض ہر نوع کی آزادی کے لیے ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر انسان خاطر خواہ ترقی اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ غلامی انسان کی آزادی کو سلب کر دیتی ہے۔ بقول اقبال:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی (13)
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم (14)

انسانی سیرت و شخصیت کی انفرادی اور اجتماعی تعمیر و ارتقا کے لیے حریت، فکر و ضمیر، بنیادی شرط ہے۔ غلامی کی زنجیریں نہ صرف جسم کو بلکہ فکر و ضمیر کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں جس سے انسان بے جان، بے چہرہ اور بے روح ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں غلامی کے انسانیت کش ماحول پر جو ضربیں لگائی ہیں ہر عہد میں آزادیِ وطن کے لیے تڑپ رکھنے کے والوں کے بڑی کارآمد ہیں۔

اقبال نسل نو سے زیادہ مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ نژادِ نو کو اپنی امیدوں کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ ان کی اردو شاعری میں ایسی بے باکی، بے نیازی اور قلندرانہ رنگ موجود ہے، جو ان کے زمانے کی نئی نسل کے لیے بھی با معنی تھا اور آج کی نسل کے لیے بھی حرارت جاں ہے۔ اقبال کا یہ کلام اکیسویں صدی کی نئی نسل سے مکالمہ قائم کرتا ہے اور اس نسل میں ایک تحریک پیدا کرتا ہے:

نگہ بلند سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے (15)
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (16)

اس نوع کے اشعار نہ صرف نئی نسل کے لیے محرک ہیں بلکہ ان کی زندگی کے لیے ایک سطح پر اصول بھی ہیں۔

اقبال نے اپنے زمانے میں وطن سے محبت کے جو نغمے لکھے ہیں، وہ آزاد ہندوستان میں حب الوطنی کی ایک ایسی زندہ علامت بن گئے ہے کہ آج بھی ہندوستان بھر میں گائے جاتے ہیں اور لوگ ان کے توسط سے اپنی حب الوطنی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان نغموں میں اقبال نے جو پیغام دیا ہے وہ آج کے ہندوستان کی اہم ضرورت ہے۔

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز نہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا (17)
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا (18)
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفیہ کو بیدار قوموں نے (19)
اجاڑا ہے اپنے تمیز وملت و آئین کے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے (20)

اقبال کی وطن سے یہ محبت سطحی نہیں بلکہ اس میں تاریخی، تہذیبی ہے۔ چنانچہ ''ترانہ ہندی'' میں اور فکری معنویت محسوس کرتے ہیں۔ ترانۂ ہندی میں جہاں وہ مذہبی رواداری کا ذکر بڑی وضاحت سے کرتے ہیں کہ:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا (21)

وہ پرانی تہذیبوں کی تباہی کو بیان کرتے ہوئے بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں:

یونان مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشان ہمارا (22)

اس تہذیبی تفاخر کے باوجود اقبال ایک درد نہاں محسوس کرتے ہیں۔ یہ درد ان کی نظم'' صدائے درد'' میں بہت نمایاں ہے۔ نظم کا کچھ حصہ دیکھیے:

سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں
کب زباں کھولی ہماری لذت گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتش پیکار نے(23)

ہندوستانی معاشرہ آج بھی ایک صدی گزر جانے کے بعد اسی قرب وفراق آمیز اور آتشِ پیکار کی آگ میں جھلس رہا ہے۔اقبال نے اس دردنہاں کی تشخیص کے بعد جو نسخہ تجویز کیا ہے وہ آج بھی نیا شوالہ میں موجود ہے۔یہ مشورہ آج بھی نقش دوئی مٹانے کا اہم ذریعہ ہے۔

اقبال پسماندہ طبقوں اور محنت کشوں سے بہت ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔وہ ان کی مشکلات پر سخت رنجیدہ ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی انقلاب ایسا رونما ہو، جو مزدوروں کو سماج میں ان کی حقیقی جگہ دلا سکے۔وہ معاشی بلندیوں اور پستیوں کو ایسا جبر قرار دیتے ہیں،جس کی بنا پر سماجی مراتب دیے جاتے ہیں۔اقبال کا مقصود ہے کہ انسانی معاشرے میں مزدور کو بھی ترقی اور ارتقا کے وہی مواقع میسر آئیں جو سرمایہ دار کو ملتے ہیں۔اس صورت حال کو دیکھ کر وہ احتجاج کرتے ہیں:

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات (24)

اقبال کی اردو شاعری میں غریبوں، بے کسوں، ناداروں،مزدوروں اور کسانوں کی جس طرح منصفانہ حمایت اور ترجمانی کی گئی ہے،وہ آج بھی خفتہ و پسماندہ طبقوں کی جائز زندگی کی تحصیل و تسخیر کے لیے ضروری ہے۔اقبال کی مظلوم انسانوں کی حمایت میں صدائیں اکیسویں صدی کے خفتہ طبقوں کو بدلتے معیارات اور تقاضوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے قابل بناتی ہیں۔

اقبال نے انسانی عظمت کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہر عہد کی آواز ہے۔ وہ انسان کی آزادی خیر و شر کی تمیز مخلوق میں اس کے بلند درجے کی بنا پر احترام انسانیت کے قائل ہیں۔ اقبال کا فلسفہ خودی بھی شعور ذات کے ذریعے عظمت انسان ہی کو بلند کرنے کا نظریہ ہے۔ وہ انسانی عظمت و ارتفاع کے لیے خودی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ خودی کے وسیلے سے انسان کو عرفان انسان ہو۔ اقبال کے نزدیک انسان سے ہمدردی ہی انسان دوستی کی اساس ہے۔ چنانچہ وہ ہر انسان کے دل کو ہمدردیٔ انسان سے معمور دیکھنا چاہتے ہیں۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا (25)

شاہد قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو
سر میں جز ہمدردیٔ انسان کوئی سودا نہ ہو (26)

اقبال کے ہاں انسان دوستی کا یہ تصور صرف ان کے عہد تک محیط نہیں بلکہ ہر عہد کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔ اس ضمن میں مجنوں گورکھپوری ارقام کرتے ہیں:

''ان کی شاعری کا اصل جوہر نہ حجازیت ہے نہ عقابیت بلکہ وہ انسانیت ہے جو ہر زمانے میں قابل تسلیم چیز سمجھی جائے گی۔ آئندہ نسلیں اقبال کی جس چیز کو اپنے لیے باعث خیر و برکت تصور کریں گی۔ وہ ان کا نہ بندی نغمہ ہو گا نہ حجازی لے، بلکہ انسانیت اور آفاقیت کی دھن کے وہ ارتعاشات ہوں گے جن سے ان کی ساری شاعری گونج رہی ہے اور جن کی انسانی تہذیب کو اپنی بقا اور ترقی کے لیے ہمیشہ ضرورت ہو گی۔'' (27)

اقبال بنیادی طور پر ایک رجائی شاعر ہیں۔ انھوں نے مصائب و مشکلات کے شکار انسانوں کو جس طرح ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور پنجہ آزمائی کا درس دیا ہے۔ وہ اکیسویں صدی کیا آنے والی ہر صدی کے انسانوں کے لیے مفید ہے۔ وہ غم کو انسانی ہستی کے لیے تعمیری اور مثبت پہلو سمجھتے ہیں، جو انسان کو کارگاہ حیات کی بھٹی میں کندن کرنے والا ہے۔

گو سراپا کیف عشرت ہے شراب زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحاب زندگی
موج غم پر رقص کرتا ہے حباب زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی (28)

ہر عہد کے لیے ان کے ہاں ایسے مثبت اور پر امید نقشے مرتب کیے گئے ہیں جن سے حزن و ملال، ناکامی و نا امیدی، غمنا کی و افسردگی کی جگہ جوش و ولولے، فکر و عمل اور امید و رجا کے منظر سامنے آتے ہیں۔ اقبال کا رجائیت پسند لہجہ اور روشن مستقبل پر یقین، حوصلہ بھی دیتا ہے اور مقابلہ کرنے کی تعلیم بھی:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی (29)

اقبال کی اردو شاعری کا دور حاضر کے ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ ان کی زبان اپنے دور میں ہی نہیں بلکہ عصر حاضر میں بھی نو آوری کی مثال ہے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کا اردو کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ان کے ہاں ایسے متعدد اشعار ہیں جو اکیسویں صدی کے قاری کے ذہن میں ایک خوشگوار تلاطم اور لذت خیز سنسنی پیدا کر دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے
یقین محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اٹھا نہ شیشہ گراں فرنگ کے احساں سفال
ہند سے مینا و جام پیدا کر

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوئے نہیں جہاں پیدا (30)

طویل مدت گزر جانے کے باوجود اقبال کے کلام کی افادیت، مقبولیت اور تاثیر میں کمی اور مرجھاہٹ دکھائی نہیں دیتی بلکہ اس میں نئے معانی و مفاہیم کی کثرت نظر آتی ہے۔ آج بھی ہندو پاک کے اردو داں گھرانوں میں اقبال کا نام اور کام بیشتر افراد کے سوانح کا حصہ ہے۔ ان میں ایک بڑی تعداد کے شعور کی آنکھیں ''بچے کی دعا'' اور ''ماں کا خواب'' جیسی نظموں کے ساتھ کھلتی ہیں، نیز برعظیم سماجی و ثقافتی تقریبات میں ہر جگہ اقبال کے اردو کلام کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کلام اقبال کی اس قوت کا اعتراف رحمت یوسف زئی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''بڑے شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس کا پیام ہر دور کے لیے ہوتا ہے۔ اقبال کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ اپنے دور میں ایک اہم اور بڑے شاعر کی حیثیت سے تو جانے ہی جاتے تھے لیکن آج بھی اقبال کی فکر اور قوت اظہار ذہنِ انسانی کو اپنی گرفت میں لینے کی بے پناہ صلاحیت کی حامل ہے۔'' (31)

اقبال نے انسانی زندگی اور اس سے وابستہ معنوی معارف کو جس انداز سے دیکھا ہے وہ موجودہ زمانے میں انسانیت اور انسانی مسائل سے جڑے ہوئے سوالوں کا مناسب جواب فراہم کرنے میں بہت مددگار ہیں۔ گویا حق بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو اقبال ایک ایسی آواز کا نام ہے جو جس عہد میں سنائی دے گی اسی عہد کی آواز ہو گی اور جس عہد کا انسان اس آواز کو جتنی غور سے سنے گا اتنا ہی اس آواز سے مستفیض ہو گا۔

اقبال اپنی بصیرت سے آنے والے دور کی جو تصویر دیکھتا ہے اس کی ضرورت اکیسویں صدی میں شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ آج کے متمدن عہد کے لیے اقبال کے تصورات ناگزیر بن گئے ہیں کیونکہ اقبال بنی نوع انسان کے لیے دستور ساز پیغام پیش کرتے ہیں۔ یہ دستور مشرق و مغرب، مسلم و غیر مسلم کے امتیازات سے ماورا سورج کی روشنی کی مانند ہے۔ دور حاضر درحقیقت، فکری بیداری اور اطلاعات و آگہی کا دور ہے۔ آج اطلاعاتی وسائل میں حاصل شدہ غیر معمولی ترقی کی وجہ سے دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اگرچہ دنیا کے

معاصر اور اقبال کے دور کے مابین ایک طویل فاصلہ موجود ہے، تاہم غور سے دیکھا جائے تو اس زمانے میں اقبال کی اردو شاعری کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

○

حوالہ جات

1. اقبال ''کلیاتِ اقبال اردو'' شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز لاہور۔ 1975ء، ص 393
2۔ لطیف احمد شروانی (مرتب) ''اقبال حرف اقبال''، انشا پریس لاہور، 1955ء، ص 23
3۔ا قبال ''کلیاتِ اقبال اردو''، ص 519
4۔ ایضاً، ص 260
5۔ ایضاً، ص 262
6۔ ایضاً، ص 260
7۔ ایضاً، ص 261
8۔ ایضاً، ص 263
9۔ ایضاً، ص 618
10۔ ایضاً، ص 517
11۔ ایضاً، ص 148
12۔ ایضاً، ص 684
13۔ ایضاً، ص 259
14۔ ایضاً، ص 325
15۔ ایضاً، ص 341
16۔ ایضاً، ص 348
17۔ ایضاً، ص 71
18۔ ایضاً، ص 72

19۔ ایضاً،ص75

20۔ ایضاً،ص76

21۔ ایضاً،ص83

22۔ ایضاً،ص83

23۔ ایضاً،ص42

24۔ ایضاً،ص399،400

25۔ ایضاً،ص 141

26۔ ایضاً،ص49

27۔ مجنوں گورکھ پوری،''اقبال کا اجمالی تبصرہ''،اقبال مذاکرے کے چند مقالات، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی،1977ء، ص76

28۔ اقبال''کلیاتِ اقبال اردو''،ص155

29۔ ایضاً،ص303

30۔ ایضاً،ص 562،439،353،272،35

31۔ رحمت یوسف زئی،(مضمون)مشمولہ''ترجمانِ اقبال''،مرتبہ عبدالرحیم خان، انجمن ترقی اردو(ہند)،2006 ص14

ایران میں اُردو کے ثقافتی فروغ کی آخری صورت حال

پروفیسر وفا یزدان منش

یونیورسٹی آف تہران، ایران

جب سے انسان پیدا ہوا ہے اس کی یہ کوشش رہی ہے کہ کسی نہ کسی ذریعے یا ایجاد سے اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کرے۔ انسانوں کی تعداد جتنی بڑھ رہی ہے ایک دوسرے سے تعلقات قائم کرنا زندگی میں اہم ترین حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ آہستہ آہستہ آدمی کو علم ہوا کہ اس کے پاس تخلیق کاری کی ایک ایسی نعمت ہے جس کو کام میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس نعمت کا اظہار زبان و بیان ہے مختلف قوموں کی مختلف ہیں۔ اب زبان صرف بات کرنے اور رابطہ قائم کرنے والی چیز نہیں رہی۔ وہ دوسروں سے نفرت کے اظہار، ایک دوسرے کے خلاف سازش کرنے نیز اپنی تہذیب سے دوسروں کو متعارف کرانے کا ذریعہ بن چکی ہے، زبان ایک دوسرے سے سیکھنے اور دوسرے کو سیکھانے کے قابل بن چکی ہے۔ ہر قسم کی تبدیلی، چاہے وہ سیاسی، سماجی اجتماعی، معاشی، تہذیبی یا علمی ہو، زبان پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ اس کی اتنی اہمیت بڑھ چکی ہے کہ اس کی صحیح پہچان کے لیے ایک علم وجود میں آیا ہے یعنی لسانیات۔ اس علم کے ذریعے زبان کو شروع سے لے کر موجودہ حالت تک کو پرکھا جا سکتا ہے اور اس سے قوم کے

بدلے ہوئے رجحانات تک رسائی بھی ممکن ہے۔

جب کوئی زبان اس قابل ہوجاتی ہے کہ جذبات اور خیالات کا اظہار کر سکے تو اس کے بطن سے ادب پھوٹتا ہے۔ادب ہر زبان کا اعلیٰ فن اور موثر ترین روپ ہوتا ہے۔ادب، زبان سے بڑھ کر ہر ملک کے میلانات اور اقدار کو سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔زبان اور ادب ایک دوسرے کے جزو لاینفک ہیں۔عام طور پر جب کوئی سامراجی ملک کسی دوسرے ملک کو اپنے قابو میں لانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اس ملک کی تہذیب کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔جس طرح زبان و ادب ہر قوم کی تہذیب کی ایک اہم شاخ ہے۔ اسی طرح سامراجی ملک کے لیے زبان و ادب بھی مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ جب کوئی کسی دوسرے ملک سے باہمی تعلقات کی تلاش میں ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس ملک یا قوم کی تہذیب سے دوطرفہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں بھی سب سے پہلی توجہ زبان و ادب پر ہوتی ہے۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف رخ کرتے ہیں: ایران اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کی تاریخ کافی پرانی ہے۔اس کے جو تاریخی منظر کی یہاں وضاحت کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا مقصد ایران میں اُردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینا ہے تو مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ ان دونوں سرزمین کے دوستانہ تعلقات صدیوں سے چلے آرہے ہیں لیکن زبان کے حوالے سے یک طرفہ ربط قائم ہوا تھا۔برصغیر میں فارسی کی ترویج شروع ہی سے نظر آتی رہی ہے۔اس کی جو وجہ تاریخ میں محفوظ ہے سب پر واضح ہے۔ بلکہ ایران کی تہذیب کا برصغیر میں سلسلہ رہا ہے۔صدیوں تک ہندوستان کے باشندوں نے ایرانی تہذیب کا استقبال کیا، فارسی سیکھی، فارسی ادب کو اپنے ادب میں سمویا (یہ بات اُردو کے حوالے سے زیادہ دکھائی دیتی ہے)،ایرانی اور ہندوستانی لوگوں کے درمیان تعلقات بن گئے۔یہ سب خود بخود انجام نہیں پایا۔ یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ایران پر ہندوستانی حاکم نے نہ حکومت کی ہے اور نہ ان لوگوں پر اپنے خطے کی تہذیب کو نافذ کرنے کی کوشش ہوئی ہے۔پھر بھی ایران میں اُردو کی طرف رجحان کیسے پیدا ہوا؟ کیوں اس خطے کی تہذیب اور زبان کی طرف توجہ بڑھتی رہی ہے۔اس کی وجوہات دو بنیادی باتوں میں پائی جاتی ہیں:

1: حکومتی رجحان

ایران کی اسلامی انقلاب سے پہلے اُردو کی طرف توجہ بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ اسلامی انقلاب کے بعد حکومت کو یہ محسوس ہوا کہ اُردو زبان کو جاننا، اس پر تحقیق کرنا اور لوگوں سے اس کا تعارف کرانا ضروری ہے۔ ایران ایک امن پسند ملک ہے اور سیاسی لحاظ سے اس نے ہمیشہ ہندوستان کے لیے اچھے جذبات رکھے ہیں اور اپنے جذبات کو بروئے کار لانے میں کوششیں بھی کی ہیں جن میں سے ایک اُردو کو مختلف پہلوؤں میں فروغ دینا نمایاں ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں اتحاد ضروری امر ہے، اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اسی رو سے برصغیر میں جتنی زبانیں موجود ہیں ایران کے ہاں اُردو ترجیح پر رہی ہے۔ مزید وجہ: اُردو زبان میں فارسی بلکہ ایران کی پرانی تہذیب کو ابھارا جاسکتا ہے، اُردو کا مطالعہ کرنے سے ان دونوں زبانوں اور ممالک کے تعلقات سامنے آئیں گے۔ اسی بنیاد پر ایران نے اُردو پر کاوش کرنے کے کئی نئے راستے نکالے ہیں یا جو اس زبان کا پہلا پس منظر تھا اس میں وسعت لانے میں نئی تدبیریں کیں۔ اس کام کے لیے ایران نے اُردو زبان سے دو انداز میں استفادہ کیا ہے: اُردو زبان اور ادب کی ترویج، نیز برصغیر میں اُردو زبان کے ذریعے اپنی زبان اور تہذیب کا تعارف۔

2: عوامی رجحان

ایرانی لوگ اپنے سچے جذبات کے ساتھ اور ہر قسم کی سیاست سے دور، ہندوستان سے لگاو رکھتے ہیں۔ ان کا ہندوستان کی سیر و سیاحت نیز ہندوستانی فلمیں شوق سے دیکھنا اور ہندی زبان سیکھنے کی خواہش کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایرانی ہندوستان کو پسند کرتے ہیں۔ ایران میں اعلیٰ سطح تک تعلیم حاصل کرنے کے لیے اُردو مضمون کے امیدواروں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا جارہا ہے اس کی ایک وجہ مسلمانوں کی زبان سیکھنے کا رجحان ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندی اور اُردو بہت ملتی جلتی ہیں۔ نہ صرف زبان کی سطح تک بلکہ اُردو تہذیب و ادب کی معلومات حاصل کرنے کی خواہش ہی اس جذبے کو مستحکم کرنے میں مدد و معاون ہے۔

اب یہاں اُردو کی اہمیت وترویج جومختلف انداز سے آج کل ایران میں جاری وساری ہے اس کو اجاگر کرنے کے لیے نیز اس راستے میں جو کمیاں اور خامیاں سامنے ہیں ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بحث

مدتوں بعد اُردو آج ایران میں عروج پر ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک مستقل اور تہذیب سے بھرپور زبان کی حیثیت سے ثابت کرتی جارہی ہے۔ایران میں اُردو پہلے خال خال دکھائی دیتی تھی اب بہت سے مراکز میں اس کا باقاعدہ وجود ہے۔

اعلیٰ وزارت تعلیم میں اُردو

یونیورسٹی میں اُردو ایک اہم مضمون کے طور پر پڑھائی جارہی ہے۔ پہلے صرف 'اصفہان یونیورسٹی' میں اُردو کے مضمون میں بی اے کی سطح پر طالب علموں کا داخلہ ہوتا تھا۔ چند سال سے وہ بند ہے۔لیکن 'تہران یونیورسٹی' میں 1370ہ۔ش/1991 سے باقاعدہ طور پر 'شعبہ اُردو' قائم ہے جہاں پہلے بی اے کی سطح تک اُردو پڑھائی جاتی تھی۔ ایران میں بی اے آٹھ سمسٹر پر مشتمل ہے۔ چار سمسٹر زبان سیکھنے میں لگ جاتے ہیں اور چار سمسٹر میں ادب پڑھایا جاتا ہے۔تقریباً ہر سال 20 طالب علموں کا داخلہ ہورہا ہے۔اسی یونیورسٹی میں 1388 / 2009 سے ایم اے کی سطح کے داخلے بھی ہورہے ہیں۔ایم اے میں وہ تین سمسٹر میں اُردو ادب پڑھتے ہیں اور اس کے بعد علمی مقالہ لکھنا ہوتا ہے۔اس سطح میں تقریباً ہر سال 5-8 طالب علموں کا داخلہ ہوتا ہے۔چند سال پہلے تک عام لوگ اُردو زبان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے بلکہ وہ یہ نام سن کر سوال کرتے تھے کہ اُردو ہے کیا؟ آہستہ آہستہ یہ زبان انھیں طالب علموں کے ذریعے عام لوگوں سے بھی متعارف ہوئی اور اب ہر سال شوق رکھنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔اسی وجہ سے دوسری یونیورسٹیاں 'اصفہان' اور 'فردوسی' اور 'دانشگاہ آزاد اسلامی' (پرائیوٹ یونیورسٹی) بھی چند سال سے اُردو مضمون رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔لیکن فی الحال

'تہران یونیورسٹی' میں با قاعدہ ہر سال داخلہ ہو رہا ہے اور اساتذہ جو اینڈیا یا پاکستان سے پی ایچ ڈی کر کے واپس آئے ہیں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ کوشش یہ ہے کہ ہر سمسٹر میں طالب علم کسی تعلیم یافتہ اہل زبان سے بھی مستفیض ہوں۔ یہ تقاضے دو صورتوں میں انجام پاتے ہیں: شعبہ اُردو میں اہل زبان (ہندی یا پاکستانی) کے اُردو استاد کی کرسی موجود ہے۔ افسوس ہے کہ چند سال سے یہ کرسی خالی ہے اور ہمارا انتظار جاری ہے اور دوسری صورت ایران میں جو تعلیم یافتہ اہل زبان ہیں وہ شعبۂ اُردو کی کلاس میں پڑھانے میں تعاون کرتے ہیں۔ اساتذہ کلاس میں اُردو زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور طالب علموں کو بھی اُردو میں گفتگو کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ طالب علم اُردو زبان و ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں لہذا ان کے دل میں ہمیشہ ایک حسرت رہتی ہے کہ وہ چاہے تھوڑے ہی عرصے کے لیے کیوں نہ ہو اُردو کے ماحول میں رہ کر زبان کی تہذیب سے انسیت حاصل کریں۔

بعض یونیورسٹی میں ایسے شعبے قائم ہیں یا ایسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں جن کے لیے اُردو کی کلاس بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر 'دانشگاہ علامہ طبا طبائی' میں 'اقبالیات' کا ایک مضمون موجود ہے جس کے لیے طالب علموں کو چند یونٹ اُردو پڑھنی چاہیے۔ اس طرح اُردو ایک ضمنی مضمون کے طور پر بھی پڑھنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ترقی کے امکانات روشن ہیں۔ ایک اور اہم نمونہ تہران یونیورسٹی میں شعبہ 'طب سنتی' ہے۔ اس طب کی جڑ برصغیر میں پائی جاتی ہے اور تالیفات اُردو زبان میں ہیں۔ اس رو سے اس شعبے میں اُردو میں تالیفات کی تدریس ہوتی ہے، ان کا ترجمہ ہوتا ہے اور وہاں طالب علموں کے لیے اُردو سیکھنا ضروری ہے۔

عام طور پر ایک ملک دوسرے ممالک میں اپنی زبان کی ترویج کے لیے مختلف راستے نکالتا ہے۔ اس حوالے سے ایک ایسا مرکز قائم کرتا ہے کہ اس کے ذریعے اپنی زبان و ثقافت کا تعارف کر سکیں نیز اس زبان کو سکھا سکیں لیکن ایران میں اس طرح کے مرکز کی (اعلیٰ وزارت تعلیم کے سوا) کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

اُردو زبان کی تعلیم کے لیے معیاری کتب کی بھی کمی ہے اور اس حوالے سے طالب علموں کو ہمیشہ شکایت رہتی ہے۔ اس سلسلے میں دو طرح کے مآخذ کی کمی ہوتی ہے۔ ادب و زبان سے

متعلق لکھی ہوئی کتابیں بے شک ملتی تو ہیں لیکن ایران میں ان پر رسائی مشکل ہے۔دوسری مآخذ وہ ہیں جو زبان کی تعلیم سے متعلق ہیں۔اس حوالے سے ایران میں ایک ہی کتاب فارسی زبان میں چھپی ہے اس کے ساتھ دوسری ایسی کتابیں جو انگریزی میں تیار ہوئی ہیں اور بہت عمدہ ہیں، قابل استفادہ ہیں۔خوش قسمتی سے طالب علم اس قدر اُردو کا استقبال کرتے ہیں اب ان کا اپنے اساتذہ سے یہ تقاضا ہے کہ فارسی زبان میں مزید مکمل اُردو کے قواعد پر بہتر کتابیں لکھی جائیں تا کہ ان کی ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

یہ بات ضمنی طور پر پیش کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ شعبہ اُردو کے طالب علم یہ سوال اٹھایا کرتے ہیں کہ: اب اُردو زبان میں بے تحاشا انگریزی الفاظ داخل ہوئے ہیں پھر جب یہ لوگ اپنی زبان کی تہذیب کا خیال نہیں رکھتے ہم کیوں ان کی تہذیب و تمدن کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور زبان سیکھنے کی کوشش کریں؟ اگرچہ اساتذہ بات کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اُردو زبان سیکھنے کے فائدے بتاتے ہیں پھر بھی ہماری اہل زبان سے یہ خواہش ہے کہ اس الجھن کو دور کرنے کی کوشش بھی کریں۔

اُردو زبان و ادب پر مقالات لکھنے کی طرف رجحان:

جب سے یونیورسٹی میں اُردو پڑھائی جا رہی ہے اساتذہ کے ذریعے اُردو ادب کا تعارف بھی ہوتا جا رہا ہے۔حالانکہ اس سے پہلے اُردو ادب کے بارے میں فارسی اہل ادب کے ہاں معلومات نہ ہونے کے برابر تھی۔اُردو میں زبان و ادب کا بہت بڑا ذخیرہ ہے خاص طور پر معاصر ادب میں جو انقلاب برپا ہوا اور مختلف نثری اور شعری ہیئتوں اور موضوعات کا جو انکشاف ہوا وہ مختلف پہلوؤں سے قابل تحقیق و مطالعہ ہیں۔ایران کے اہل ادب یہ سمجھتے تھے کہ اُردو ادب میں سوائے فارسی تہذیب و ادب کے کوئی قابل ذکر آثار موجود نہیں ہیں!! یہ افسوس کی بات ہے کہ ایران جیسے مسلمان ملک میں ایرانی ادیب اپنے ہم خیال ملک کی زبان و ادب کے بارے میں کچھ واقفیت نہ رکھتے ہوں۔ان کو صرف برصغیر کے فارسی گویوں کے متعلق علم تھا لیکن اب صورت حال میں بہت بہتری آئی ہے ان چند برسوں میں ہم چند لوگ ہیں جو

مسلسل سلسلے میں مقالات لکھتے ہیں، علمی تقاریب میں تقریر کرتے ہیں اور اس کا یقیناً استقبال بھی کیا جاتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اُردو کتابوں پر تنقیدی مقالات کا سلسلہ بھی شروع ہوا ہے۔ امید ہے اُردو میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کا بہت جلد نمایاں اضافہ ہوگا۔

مقالات کی ایک اور نوعیت، تھیسس کی شکل میں ہے۔ ایران میں ایم اے میں طالب علموں کے لیے تھیسس لکھنا لازمی ہے اور یہ ایک بہت اچھا موقع ہے کہ اُردو زبان و ادب پر محنت کی جائے۔ قابل ذکر ہے کہ اُردو طالب علموں کے لیے اُردو زبان میں ہی رسالہ لکھنا چاہیے۔ مقصد یہ ہے کہ بعد میں ہر ایک رسالہ سے کم سے کم دو مقالات فارسی علمی رسالوں میں چھپوائے جائیں تا کہ اس طرح لوگ بھی اُردو ادب سے متعارف ہوسکیں۔

ایک اور نکتہ جو ایران میں اُردو کے حوالے سے نیا اور قابل توجہ ہے: اُردو اور فارسی ادب کا تقابلی جائزہ ہے جو کلاسیک اور معاصر کی سطح پر ہوسکتا ہے۔ یہ موازنہ فی الحال رسالوں میں چل رہا ہے۔ اس طرح کے مطالعے سے ہم نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ برصغیر اور ایران کے لوگوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اُردو اور فارسی معاصر ادب میں بھی یکساں خیالات اور جذبات ملتے ہیں۔ ایران کے جنوبی علاقوں میں ایسی زبانیں ملتی ہیں جن پر تحقیق کی تشنگی ابھی باقی ہے اور ایسے لوگ ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں جن کو اُردو اور مقامی زبان پر عبور ہو۔ اس طرح تحقیق کرنے سے اہم نتائج اخذ ہوسکتے ہیں۔ ایران میں بولی جانے والی زبان پرکھنا، ایک ایرانی بولی اور اُردو زبان کے درمیان اشتراک پانا، دو قوموں کی تہذیب پر رسائی کا امکان اور مختلف تاریخی، سیاسی پہلوؤں سے معلومات حاصل کرنا ہے۔

علمی اور تحقیقی مراکز پر اُردو (زبان اور تہذیب) کی طرف بڑی توجہ

بہت سے انسائیکلو پیڈیا اور معلوماتی مآخذ ایران میں چھپتے ہیں جن کے موضوع کے مطابق برصغیر کے کالم وہاں ملتے ہیں۔ جہاں اسلامی تہذیب کی بات چلتی ہے تو برصغیر کا نام لینا ضروری ہے؛ جہاں ایشیا سے متعلق معلومات بہم پہنچانا ہو برصغیر کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ جہاں فارسی کی ترویج پر مطالعہ کرنا ہو اُردو کا ذکر ضروری ہے۔ ایران میں جتنے ادبی، تاریخی،

مذہبی وغیرہ موضوعات پر تحقیقی کام ہو رہا ہے ان میں برصغیر کی کرنیں نظر آتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کی اہمیت کی بنا پر زبان اور ادب میں اُردو کی تالیفات پر توجہ زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر 'دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی' نے جو جہان اسلام پر 1362 / 1993 انسائیکلو پیڈیا نکال رہا ہے، اس کی بنیاد اسلامی اور ایرانی تہذیب وتمدن پر رکھی ہے۔ اس نے اُردو زبان و ادب کے عنوانات کو بھی اپنے اندر سمولیا ہے اور معیاری نتیجہ نکالنے کے لیے اہم اُردو منابع کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اب تک تقریباً اس کی سات جلدوں کا عربی زبان میں 'دائرۃ المعارف الاسلامیہ اکبری' کے عنوان سے اور پہلی اور دوسری جلدوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہوکر چھپ گیا ہے۔ اس طرح اس میں شامل معلومات منجملہ اُردو دوسری زبان کے قارئین کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں۔

'برصغیر ہندو پاک' پر تحقیقی سرگرمیوں کے لیے مستقل شعبے کا قیام اور اس شعبے میں اُردو زبان وادب کو خصوصی اہمیت دینا:

ایران میں جہاں شبہ قارہ ہند کی بات ہوتی ہے اس سے ہندوستان، پاکستان اور بنگلادیش مراد لیے جاتے ہیں۔ اسی عنوان کے تحت علمی مراکز او ریونیورسٹیوں میں شعبے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر 'دانشگاہ تہران' میں 'دانشکدہ مطالعات جہان' جس میں ایک شعبہ ہندوستان سے متعلق ہے؛ 'دانشگاہ سیستان و بلوچستان' میں شعبہ 'مطالعات شبہ قارہ ہند'۔ موخر الذکر شعبے سے ایک علمی تحقیقی رسالہ یعنی 'فصلنامہ مطالعات شبہ قارہ ہند' تین مہینے پر نکلتا ہے جس میں اُردو زبان وادب پر بھی مقالات لکھے جاتے ہیں۔ علمی مراکز میں، فرہنگستان زبان و ادب فارسی میں 'گروہ شبہ قارہ ہند'؛ دائرۃ المعارف اسلامی میں 'گروہ شبہ قارہ ہند و جنوب شرقی آسیا' (برصغیر اور ایشیا کا مشرقی جنوب)۔ آخری جو دو شعبے ہیں دو مختلف نوعیت کے ہیں۔ فرہنگستان میں جو گروہ شبہ قارہ ہند ہے بیشتر فارسی سے متعلق موضوعات پر توجہ دیتے ہیں اور ان پر تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اب ان کو یہ احساس ہوا ہے کہ اس طرح کی سعی کے لیے اُردو جاننا ضروری ہے اور وہ ایسا موقع ڈھونڈ رہے ہیں تا کہ اُردو سیکھنے سے اُردو میں تحریر شدہ مآخذ سے استفادہ کرسکیں۔

دائرۃ المعارف اسلامی سے تین دہائی سے ایک معیاری انسائیکلو پیڈیا نکل رہا ہے جس کا نام 'دانشنامہ جہان اسلام' ہے۔ اس میں دنیائے اسلام سے متعلق عنوانات پر کام ہوتا ہے۔ تاریخ، عرفان، جغرافیا، سیاست اور اُردو زبان و ادب۔ جب یہ دانشنامہ نکلنا شروع ہوا چند سال تک اُردو زبان و ادب سے متعلق تقریباً چالیس عنوانات موجود تھے۔ آہستہ آہستہ راقم الحروف کی کوششوں سے یہ عنوانات ایک سو سے اوپر تک بڑھ گئے ہیں۔ پہلے ان کے انتخاب کی بنیاد اکثر وہ شعرا اور مصنفین تھے جن کا فارسی کی طرف رجحان تھا۔ اس وقت افسوس کہ اتنا بھی علم نہیں تھا کہ غالب اُردو کے بڑے شاعر اور مصنف ہیں۔ صرف غالب کو ایک فارسی گو کی حیثیت سے جانتے تھے اور ان پر مطالعہ، فارسی ادب کے شعبے کے ذمے تھا جبکہ ان کو اُردو ادب میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ جب یہ مشورہ دیا گیا تو جواب یہ ملا کہ کیا غالب کا اُردو میں کوئی کارنامہ ہے؟ کیونکہ ان کی شہرت فارسی شاعری سے ہے نہ کہ اُردو سے۔ ایسی غلط فہمیوں کو دور کرنا مشکل کام ہے اور صرف بات سمجھانے سے کام نہیں چلتا اس کو ثبوت اور شواہد کے ساتھ لکھنا چاہیے تا کہ لوگ حقیقت کو تسلیم کر لیں۔

بہر حال اُردو زبان و ادب پر کام سنجیدگی سے ہو رہا ہے اور عربی، ترکی کے ساتھ ساتھ اُردو پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ اُردو حروف الفابٹ پر جو مطالعہ ہو رہا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ ایک اور نمونہ یہ ہے کہ ذیل 'دستور نویسی' میں مختلف اسلامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو پر تاریخی تناظر سے ایک تخلیقی کام ہوا ہے۔

اُردو سے متعلق جو عنوانات جاری ہیں، دائرۃ المعارف میں شعبہ شبہ قارہ ہند کے علاوہ دوسرے شعبوں کے ممبروں کو بھی اُردو زبان سیکھنے کی ضرورت ہے اس لیے طویل عرصے سے سالوں سے مختلف ادوار میں اُردو کلاسیں رکھی جاتی ہیں اور لوگ شوق سے یہ زبان سیکھتے ہیں۔ ایران میں اُردو زبان و ادب اور اُردو میں دیگر کتابوں کا تعارف کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ ایک اور اہتمام اس شعبے میں ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے دانشوروں سے مقالے لکھواتے ہیں۔ اس طرح ایک دانشنامہ معزز ادبا کے اسم گرامی سے مزین ہوتا ہے اور دوسرے یہ ہے کہ علمی و ادبی سطح پر تعلقات بڑھ جاتے ہیں۔

ایران اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کے موضوع پر سیمینار منعقد کیا جانا:

ایران میں زبان و ادب کے حوالے سے جو سمینار منعقد کیے جاتے ہیں ان میں اُردو زبان و ادب کے تین مقام ہیں: وہ سمینار جو فارسی زبان و ادب پر ہوتے ہیں اور ذیلی عنوانات میں اس کا موازنہ دوسری زبان و ادب سے کیا جاتا ہے۔ فارسی و اُردو میں کلاسیکی اور معاصر دونوں کے حوالے سے اشتراکات بڑے پیمانے پر ملتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کلاسیک پر کافی کام ہوگیا ہے لیکن معاصر پر ہم ابھی ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ چند سال پہلے تک اکثر مطالعہ یک طرفہ تھا یعنی اکثر محققین فارسی کے اثرات اُردو میں ڈھونڈ تے تھے لیکن چند سال سے اس میدان میں وسعت آ گئی ہے۔ دو دہائیوں سے اُردو کا رخ فارسی کی جگہ مغربی ادب کی طرف ہوا ہے ابھی دونوں کے خیالات اور جذبات میں ہم آہنگی کے لیے راستہ ہموار ہو رہا ہے۔

دوسری قسم وہ سیمینار ہیں جس کا عنوان خاص 'شبہ قارہ ہند' سے متعلق ہے جس میں ایک بڑا حصہ اُردو زبان وادب کا ہے۔ یہاں بھی عام طور پر ایران و برصغیر کی مشترکہ میراث پر گفتگو ہوتی ہے۔

تیسری نوعیت وہ ہے جو اُردو پر ایک ہی عنوان گرفت میں لا کر اُردو زبان یا ادب پر مقالات پڑھے جاتے ہیں اور بحث و گفتگو چلتی ہے۔ اس نوعیت کا ایک ہی سیمینار مندرج ہے جو اقبال پر تہران یونیورسٹی، شعبہ اُردو میں ہوا۔ امید ہے آئندہ اس سے متعلق کانفرنس منعقد کی جائیں گی۔

اُردو سے متعلق مآخذ بہم پہنچانے کی کوشش:

اوپر جو رپورٹ پیش کی گئی ہے اس کی بنیاد مضبوط ہو سکتی ہے اور وہ ہے 'مآخذ تک رسائی'۔ جب ایران میں اُردو زبان وادب کی اہمیت ابھر آئی، اس سے متعلق مآخذ کا اہتمام کیا جانے لگا۔ جبکہ شروع میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ رفتہ رفتہ بڑی مقدار میں بجٹ اس پر لگایا گیا اور مختلف طریقوں سے ان کو انڈیا، پاکستان حتیٰ کناڈا اور امریکا سے تالیفات

خرید نے کی کوشش ہوئی۔ ابھی یہ ذخیرہ ادھورا ہے جس کی وجہ سے ہمارا علمی کام پیچھے رہ جاتا ہے یا ہم اس سے مطمئن نہیں ہوتے۔ تہران یونیورسٹی کا شعبہ اُردو، پی ایچ ڈی کی سطح پر کلاسز شروع کرنے کی کوشش میں ہے لیکن مآخذ کی کمی اس راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ایم اے کے دور میں بھی ہم طالب علموں کے تقاضے پورے نہیں کر پاتے پی ایچ ڈی تو دور کی بات ہے۔ کبھی کبھی کام چلانے کے لیے ہندو پاکستان کے عزیز اساتذہ یا دوستوں سے مدد لی جاتی ہے کہ کسی ماخذ کے کچھ صفحات کا عکس ہمیں بھیجیں۔ اُردو مآخذ کی قلت کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اُردو میں لکھی ہوئی کتابیں قابل اعتنا نہیں تھیں یا ان کا کسی کو علم نہیں تھا اب نہ صرف وہ بنیادی مآخذ میں شامل ہیں بلکہ ان کی فراہمی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں معیاری رسالے مدتوں سے چھپ رہے ہیں۔ ایران میں ہم نام سنتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں کہ کاش ہم صرف ان کی جلد پر ہاتھ لگا سکیں! ایران میں بعض علمی مراکز ان کی فراہمی کے لیے پیسہ لگانے کو تیار ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ کیسے مل پائیں۔ سفیروں سے بات ہوتی ہے، ہندوستان اور پاکستان کے کلچر ہاوس کے ڈائرکٹروں سے گفتگو چلتی رہتی ہے لیکن ہمارا انتظار ختم نہیں ہو پاتا۔

اُردو کا رناموں کے ترجمہ اور لغت پر ایک نگاہ:

اُردو کی ترویج دو طریقوں سے ہوسکتی ہے : تعارف، ترجمہ۔ اب تک ہماری بات تعارف پر چل رہی تھی۔ ترجمہ بھی بجائے خود بہت اہم ہے۔ یعنی براہ راست کسی زبان کی تہذیب کو اپنی زبان سے بیان کرنا۔ چند اُردو تاریخی کتابوں، اُردو شعرا کے منتخب کلام اور بچوں کی کہانیوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس حوالے سے ابھی بہت کام کرنے ہیں۔ اُردو زبان میں وقیع سفرنامے، ناول اور افسانے لکھے گئے ہیں جن کو پڑھنے سے لطف آتا ہے۔ خاص طور پر مشرقی ہونے کی وجہ سے ان تالیفات کی فضا، تہذیب اور جذبات کو پورے وجود سے محسوس کر کے لطف اٹھاتے ہیں۔ ایسے متاثر کن داستانی ادب پر ظلم ہوا ہے کیونکہ جن کو اُردو آتی ہے صرف وہ پڑھ سکتے ہیں، ہماری یہ ذمے داری ہے کہ ان کا ترجمہ کر کے یا کرا کے اُردو زبان و تہذیب

کی خدمت کریں اور دوسری یہ کہ ادب کے میدان میں وسعت پیدا کریں۔ ہم ایرانی لوگوں کے لیے افسوس کی بات ہے کہ اُردو کے نثری اور شعری متون کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مثلاً امراؤ جان ادا کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بلکہ انگریزی زبان میں کئی دفعہ ہوا ہے۔لیکن فارسی میں اس کا کوئی نام نہیں ہے۔

جب کسی زبان کی ترویج دوسرے ملک میں ہونے لگتی ہے تب اس زبان کی لغت کی ضرورت پڑتی ہے۔ بہت پہلے فارسی سے اُردو اور اُردو سے فارسی میں دو لغتیں چھپی ہوئی تھیں۔ اگرچہ وہ کافی حد تک مددگار ثابت ہوئی ہیں لیکن ابھی مزید کام کرنے کی گنجائش باقی ہے۔ اسی کمی کو پورے کرنے کے لیے اساتذہ سمیت طالب علم کوشاں ہیں۔ چند سال پہلے محاورات کی لغت اُردو سے فارسی میں چھپ چکی ہے اب اس کا تکملہ جاری ہے۔ جب یہ تقاضے پورے ہوں گے تو اہل قلم کی اُردو متن کے استعمال میں اور ترجمہ میں حوصلہ افزائی ہوگی۔

ریڈیو، ٹی وی:

تہران کی اُردو ریڈیو اور ٹی وی سروسز سے مختلف سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور مذہبی موضوعات پر صبح اور دو پہر کل آٹھ گھنٹے کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ سحر یونیورسل نیٹ ورک اسلامی جمہوریہ ایران کا ایک بین الاقوامی چینل ہے جو اُردو سمیت دنیا کی مختلف زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے۔ سحر اُردو ٹی وی مختلف پہلوؤں پر مذہبی، ثقافتی، تاریخی وغیرہ جیسے موضوعات پر فلمیں، ڈرامے، فیچر اور دستاویزی پروگرام نشر کرتا ہے۔ خبروں اور حالات حاضرہ کے پروگراموں میں عالم اسلام، ایران اور جنوبی ایشیا کے مسائل کو فوقیت دی جاتی ہے۔ کبھی مہمانوں کو بلا کر اُردو فارسی زبان و ادب پر بحثیں ہوتی ہیں۔ شروع میں نشریات کا دورانیہ تیس منٹ تھا پھر اس کو بڑھا کر نوے منٹ کیا گیا اور 2010 میں اس کا ٹائم بڑھا کر اب آٹھ گھنٹے کر دیا گیا۔

اگرچہ ہر ملک ایسے ذرائع ابلاغ پر اپنی تہذیب وتمدن کو ترجیح دیتا ہے لیکن مذکورہ بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایران میں اُردو زبان کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور اُردو مختلف

قوموں کے باہمی تعلقات بڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

اُردو کا کردار میڈیا میں:

ایران میں ملٹی میڈیا اور ویب سائٹ پر کام ہو رہا ہے جو مختلف زبانوں میں قارئین کے لیے قابل قدر ہے۔مختلف میدانوں میں اس کی اہمیت اور ضروت کے پیش نظر علمی، اخلاقی، تاریخی، سیاسی، ادبی، تہذیبی بالخصوص اسلامی تہذیب کے موجودہ مسائل کے بارے میں باخبر تعلیم یافتہ اور ماہر افراد نے مختلف عنوانات پر ایک فکری اور تجزیاتی ویب سائٹ کا آغاز کر کے اس سمت میں قدم اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ان کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور ایران کے عہدہ داروں کی ویب سائٹ جن میں رہبر انقلاب، صدر کی اُردو میں سائٹ ہے۔اس کا یہ مطلب ہے کہ اُردو کی ترویج میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور اُردو زبان دوسری بڑی زبانوں کے مقابل ہے۔مزید علمی و تحقیقی مراکز میں اُردو زبان پر عبور حاصل کرنا ترجیحی عمل ہے۔

یہ مقالہ اختتام پر پہنچ گیا لیکن باتیں ختم نہیں ہو پائیں۔بے شک ایران میں اُردو کا اہم رول ہے۔ بہت سے مراکز ہیں جن میں اُردو زبان وتہذیب کی اہمیت کا بڑھی ہے۔ان کا ذکر نہ کرنے سے میں معافی چاہتی ہوں۔ان سب کی طرف سے میری عہدہ داروں سے ایک درخواست ہے کہ اُردو کی ترویج میں ہمارا ساتھ دیں اور ایسی نشستیں رکھنے کا اہتمام کریں جن میں رپورٹیں پیش کی جائیں اور مختلف پہلوؤں سے اس کا جائزہ لیں تاکہ آئندہ علمی اور تحقیقی کاوشوں میں باہمی گفتگو کے نئے راستہ ہموار ہو اور اُردو کا مستقبل تابناک ہو اور ہمارے اچھے تعلقات سے علم وادب کو بیرونی سیاست سے متاثر نہ ہونے دیا جائے۔

نتیجہ اردو کا باقاعدہ جنم پانچ صدیوں میں ہوا ہے اُردو شعرا اور مصنفین کے ہاتھوں سے پروان چڑھی اور آہستہ آہستہ اجنبیوں کی توجہ کا مرکز رہی۔ایران میں وہ ایک طرف ایک زندہ اور بڑی تعداد میں بولی جانے والی زبان کی حیثیت سے قابل توجہ ہے جو دوسری زبانوں کی طرح باہمی تعلقات کے فروغ کا اہم ذریعہ سمجھی جاتی ہے، اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ایران میں اس زبان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بہت کم ہے انھوں نے اس میدان میں کوشش

شروع کی ہے جس سے اُردو کی بڑے پیمانے پر تحقیق اور مطالعے کی اہمیت بڑھی ہے۔ اور اس کی ترقی کی رفتار تیز ہوئی ہے۔ اُردو زبان سیکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اُردو زبان کی ترویج میں اضافہ ہوگا اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی ہے کہ روزی کا ایک ذریعہ بنے۔ اُردو کے مختلف موضوعات یعنی لسانیات، تہذیب، ادب، مذہب، سیاست، تاریخ وغیرہ پر قلم اٹھایا گیا ہے، مقالات لکھے جاتے ہیں، تھیسز تحریر ہوتے ہیں سمینار ہوتے ہیں، بحثیں چلتی ہیں۔

فارسی اور اُردو زبان و ادب کے اشتراکات پر کوشش سے بہت سے اقدار اور بنیادی رجحانات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ایران کے مختلف شعبوں میں اُردو زبان کے مآخذ اور اُردو زبان و ادب سے متعلق کتابوں کی فراہمی کی کوشش سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ اُردو اس ملک میں اپنا ایک مقام بنا چکی ہے۔ اب ایک ہی تقاضا رہ گیا ہے کہ جن کے پاس اُردو کا گنجینہ موجود ہے اور وہ اس کے اصل مالک ہیں اُردو کی دوسری ممالک میں صورت حال کا جائزہ لیں، ان میں موجودہ کمیاں دیکھیں، دوسرے ملکوں میں اُردو کی ترقی کے حوالے سے منصوبہ بندی کریں۔ حکومتی سطح پر ایسا اہتمام کریں تا کہ ایرانی طالب علم مزید اُردو میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کے ماحول میں رہ سکیں۔

○

اُردو اور جاب مارکیٹ (بازار اور روزگار)

ناظم الدین مقبول

مسی ساگا۔ کناڈا

21 ویں صدی میں اُردو کا سماجی و ثقافتی فروغ، سہ روزہ اردو کانفرنس کا مجوزہ موضوع ہے اور میں اس کانفرنس کے ایک ذیلی عنوان' اُردو اور جاب مارکیٹ' کے عنوان پر یہ چند گزارشات رقم کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔

اُردو کسی خاص علاقے کی زبان نہیں یہ ہر اعتبار سے بین الاقوامی زبان بن چکی ہے اور چہار دانگ عالم میں اس کی شہرت کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ امریکہ' کناڈا' برطانیہ' فرانس اور دیگر ملکوں سمیت متعدد ممالک میں اُردو کی شمع پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتی نظر آتی ہے۔ یونیورسٹیوں اور اکادمیوں میں اُردو کی تعلیم کا باقاعدہ بندوبست ہے اُردو کی ہر دل عزیزی اور بڑھتی ہوئی مقبولیت اور دنیا بھر میں آئے دن اُردو کی نئی بستیوں کے پیش نظر ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں ؎ 'سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

گو کہ موجودہ تناظر میں ملازمتوں میں اُردو زبان سے واقفیت کو بظاہر ملازمتوں کے

حصول میں اہم عنصر نہیں گردانا جاتا ہے اور ہم چند مفروضوں کی بنیاد پر کسی حد تک مایوسی کا شکار بھی ہیں۔ درحقیقت اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق اُردو کا شمار ان پانچ بڑی زبانوں میں ہوتا ہے جو دنیا کے بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔شمالی امریکہ ہو یا یورپ ہم سب جانتے ہیں کہ ہر مقام اور ہر شہر میں اُردو زبان اپنی موجودگی کا بانگ دہل اعلان کرتی نظر آتی ہے۔ جہاں منعقد ہونے والے مشاعرے اور ادبی تقاریب ہندوستان اور پاکستان میں منعقد ہونے والی ادبی تقریبات سے کسی طور کم نہیں۔ مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک میں تو گویا عربی کے بعد اُردو ہی کا نمبر آتا ہے۔ جدہ، دبئی، بحرین اور قطر اس کی واضح مثالیں ہیں جہاں سے اُردو روزنامے اور ماہانہ رسائل بڑے اہتمام سے شائع ہوتے ہیں۔

اُردو بولنے والوں کے لیے اُردو میں ملازمتوں کے امکانات (جاب مارکیٹ) پر غور کیجیے تو اتنے دل شکن نہیں جتنے آئے دن مختلف گوشوں سے جتلائے جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو زبان کی معراج صرف اس کی شاعری ہی نہیں بلکہ اس کا نثری سرمایہ بھی ہے۔ اس زبان نے اسلام اور دیگر مذاہب کی تمام تہذیب اور تاریخ کو بھی اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں، بلکہ اس زبان نے وراثت میں ملے ہوئے اس سرمائے کو مذہبی، فکری، علمی، تحقیقی، تمدنی اور تہذیبی طور پر جس طرح پھیلایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عربی، فارسی اور ترکی جیسی زبانوں کی امانت اور قدامت کے باوجود تہذیب اور تمدن کے حوالے سے امیر ترین زبان اگر کوئی ہے تو اس زبان کا نام اُردو ہی ہے۔

انگریزی اور چینی زبانوں کے بعد اُردو دنیا کے تمام ممالک میں کسی نہ کسی حد تک سمجھی، بولی پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ بالی ووڈ کی فلمیں بظاہر ہندی زبان میں ہوتی ہیں لیکن دراصل نوے سے پچانوے فی صد الفاظ خوبصورت اُردو زبان کے ہوتے ہیں اور اب یہی چلن ٹی وی پر پیش کیے جانے والے ڈراموں کی زبان سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، اخبارات ہوں یا فلم اور ٹی وی کے شعبے میں اردو دانوں کے لیے روزگار کے مواقع ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر میں جب کہ دنیا ایک بتدریج آفاقی محلہ (Global village) بنتی

جارہی ہے ویسے ہی اُردو زبان بولنے والوں اور اس زبان کو سمجھنے والوں کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

معاشی تجزیوں سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ حصول علم میں سرگرداں نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ بورژوائی طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور یہ شہری متوسط طبقہ اپنی تعلیم اور صلاحیتوں کی بنیاد پر حصول روزگار کے لیے خود کو جاب مارکیٹ میں پیش کرتا ہے۔ اعلیٰ طبقے کے افراد کے شانہ بشانہ حصول روزگار کے لیے سماجی، معاشی، تعلیمی اور روزگار سے وابستہ علم اور تجربہ ایک متوسط شہری نوجوان کے ہاں بھی مناسب طور پر پایا جاتا ہے۔ ثانوی تعلیم کے بعد دیگر حقائق کو بروے کار لاکر ہی مستقبل کے پیشے اپنانے کے بارے میں منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔

دراصل تعلیم ایک ایسی جگہ ہے جہاں سماجی فرق اور ناانصافی اور معاشی وسائل تک رسائی ان عوامل کو ایک نظریاتی نظام کے مطابق قانون کا درجہ دے کر جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کی واضح تعلیم اُردو زبان میں قائم شدہ وہ دینی مدارس ہیں جہاں ابھی تک روایتی نصاب پڑھایا جاتا ہے جہاں شرعی طور پر قدیم تعلیم کا چلن ہے۔ دراصل اُردو زبان میں بہتر روزگار کے لیے مدارس میں نصاب کو جدید تعلیم اور رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

ہندوستان میں (Urdu Research and Development Foundation) یا URDUATION میں اُردو زبان کے ترجموں کا کام بڑی کامیابی سے جاری ہے اس ادارے کا مقصد امتیازی حقوق سے محروم اُردو داں طبقے کو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر کمپیوٹر میں جدید تحقیق اور معلومات فراہم کرنا ہے۔ ایسی کوششوں سے اُردو داں نوجوانوں کو بہتر روزگار کے لیے معلومات، تحقیقی اظہار اور نئے رجحانات سے روشناس کروانا ہے۔ تعلیم، تجارت، فن اور ثقافت اور کاروباری شعبوں میں نت نئی معلومات کے باعث کما حقہ، فائدہ حاصل ہوگا اور روزگار کے لیے وہ اُردو زبان کو ایک اہم اور ضروری وسیلہ بھی سمجھنے لگیں گے۔

بین الاقوامی طلبا و طالبات کی ایک بڑی تعداد جو اُردو زبان سیکھنے کی خاطر ہندوستان اور پاکستان کا رُخ کررہی ہے ان کے لیے تدریسی اساتذہ کی ضرورت آئے دن بڑھتی ہی جارہی ہے یہ مفروضہ بھی خام خیالی پر منطبق ہے کہ صرف اُردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے ہی

اُردو زبان کے استاد بن سکتے ہیں ایسے نوجوان جنھوں نے انگریزی ذریعہ تعلیم کو اپنایا ہے وہ بھی اُردو کے لیے تدریسی فرائض کو انجام دے رہے ہیں انھوں نے اُردو اخبارات' کتابیں اور مجلّات کے مطالعے کو سنجیدگی سے جاری رکھا اور زبان پر عبور حاصل کیا۔

اُردو اور ہندی زبانوں میں مماثلت کے باعث کسی بھی ہندی بولنے والے کے لیے بھی اُردو زبان میں دسترس حاصل کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے فرق صرف رسم الخط اور چند الفاظ کا ہے۔

St.Stephen's College دہلی میں اس خصوص میں بین الاقوامی طلبا و طالبات کی مثال دی جاسکتی ہے جو کسی بھی ہندوستانی زبان سے واقف نہیں ہیں صرف اُردو کی محبت ان کو یہاں کھینچ لائی ہے۔ حکومت کے زیر انتظام ہو یا خانگی مدارس اُردو اساتذہ کی تنخواہیں 24000 سے 25000 ہزار روپے تک دیگر زبانوں کے اساتذہ کے برابر اور کالجز میں 35000 ہزار ماہانہ دی جاتی ہیں اور ان میں اضافہ معیاد اور تجربہ کی بنیاد پر تدریجی طور پر ہوتا رہتا ہے۔

ابھی حال میں Urdu Economic Affair اور Urdu Global Resources کی جانب سے انٹرنیٹ پر پوسٹ کردہ اعلان کے مطابق دس لاکھ کے قریب اُردو زبان بولنے والوں کے لیے ملازمتوں کا اعلان کیا گیا ہے۔ اُردو جاب مارکیٹ کا تجزیہ کرنے پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ بیرونی ممالک میں بھی اب نقل مکانی کے باعث برصغیر سے تعلق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان ممالک میں آباد ہوگئی ہے جو دفاتر' بازاروں' مجالس اور گھروں میں اُردو زبان کے ذریعے ایک دوسرے سے آسانی کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتے ہیں ان ممالک میں پچھلے چند سالوں میں جو ملازمتوں کے اشتہارات شائع ہوئے ہیں ان میں یہ چند ملازمتیں شامل تھیں۔

Client Care Co ordinator, Lead generator, Cultural interpreter, In School Settlement worker, Market Research Interviewer کے علاوہ Work from Homes جیسی ملازمتیں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ مقامی اور بین الاقوامی طور پر انگریزی کے ساتھ اگر آپ اُردو زبان سے

واقف ہیں تو تجارتی بینکوں میں بھی آسانی کے ساتھ ملازمت کا حصول ممکن ہے جہاں Mortgage specialist اور Customer Service کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔

21 ویں صدی میں اُردو زبان کا مستقبل کسی حد تک روشن اور امید افزا نظر آتا ہے ماہرین کا خیال ہے کہ جدید ٹکنالوجی میں انگریزی زبان کا اثر ورسوخ بتدریج کم ہوتا چلا جائے گا۔ ویب پر علاقائی زبانوں کا اثر ورسوخ بڑھتا جارہا ہے۔

Natioanl University of Computer and Emerging Sciences (NUCES) ادارے میں بیک وقت کئی منصوبوں پر عمل ہورہا ہے جس کا مقصد دیہی علاقوں تک جدید تعلیم اور ٹکنالوجی اُردو زبان کے ذریعے عوام تک پہنچانا ہے اس ادارے کا مقصد تعلیمی ناخواندگی اور انگریزی زبان سے ناواقفیت کی شرح میں خاطرخواہ اضافے کے باعث Speech System (نظام قوت گویائی) کے ذریعے نطقی یا صوتی اظہار کے ذریعے عوام کی ایک بڑی تعداد کو جدید تعلیم سے بہرہ مند کرنا مقصود ہے۔

اُردو نستعلیق اب اوپن سورس میں مہیا ہے نفیس نستعلیق کے نام سے کرلپ (CRULP) (کی ویب سائٹ پر) مگر اُردو انٹرنیٹ پر تب تک مقبول نہیں ہوگی جب تک انٹرنیٹ پر سارے اُردو کے مقالے اور بلوگز وغیرہ نستعلیق میں نہ ہوں۔ اُردو اخبارات کے انٹرنیٹ ایڈیشن اسی لیے مقبول ہیں کہ یہ اخبار نستعلیق اُردو میں ہیں۔ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں اُردو جاب مارکیٹ کے لیے Urdu Language processing Workshop ایک گراں قدر خدمات انجام دے گی اور یوں مقابلتی جاب مارکیٹ (بازار روزگار) میں اُردو داں حضرات کے لیے سہولتوں کی راہیں استوار ہوجائیں گی۔

دہلی میں ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ NEILIT ٹیلی کام اور آئی ٹی وزارت کے تحت قائم کیا گیا جس کا مقصد اُردو زبان سے متعلق ملازمتوں کو مہیا کرنا ہے۔ توقع ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی پچاس سے زائد انسٹی ٹیوٹ قائم کیے جارہے ہیں جہاں اُردو بولنے والے بچوں کو Electronics Hardware کی تعلیم وتربیت دی جائے گی تاکہ ملازمتوں کا حصول ان کے لیے آسان ہوجائے۔ ابھی حال میں Wikipedia کی طرز پر Urdu Pedia اور Urdu

Language Soft ware Tools کا اجرا بھی اس ضمن میں ایک خوش آئند بات ہے۔

مستقبل قریب میں ہم اُردو میں Tweet کر سکیں گے اور Face Book پر بھی اُردو کا چلن رائج ہوگا کوئی بھی زبان حکومت کی نگرانی میں ترقی نہیں کرتی بلکہ اس کے بولنے والے منصف حضرات اس کی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ اُردو زبان کے سماجی اور ثقافتی فروغ کا عمل جاری ہے اور اُردو داں طبقے کی توجہ اور دلچسپی کے باعث اُردو زبان کی تعلیم اور ترویج کی سنجیدہ کوششیں اور خود اس زبان کی مٹھاس اور دل نشینی کے باعث یہ زبان سلامت رہے گی اور زبان بولنے والوں کے لیے جاب مارکیٹ (بازار روزگار) میں مواقع انشااللہ موجود رہیں گے' شرط یہ ہے کہ جدید ٹکنالوجی اور تعلیم سے اس زبان کو ہم آہنگ کر دیا جائے جس کی قابل قدر کوششیں شروع ہو چکی ہیں:

'پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'

○

اردو زبان اور اردو شاعری کا فروغ
ماضی اور حال: ایرانی ذہن و تہذیب
(تلخیص)

ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی

اسسٹنٹ پروفیسر، تہران یونیورسٹی

برصغیر میں اردو زبان ہند ایران مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہے۔ لہذا دونوں تہذیبوں اور زبانوں سے تشکیل شدہ اصطلاحات، تلمیحات، محاورات و تشبیہات اردو زبان و ادب میں بکھری پڑی ہیں۔ اس زبان کے فروغ ماضی میں ایک طرف وہ ذخیرہ ہے جو ایرانی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے دوسری جانب مقامی روایات و اثرات ہیں۔ اردو زبان ماضی سے حال تک فارسی اور ایرانی تہذیب کی چھاؤں میں سفر کرتی ہے جب انسانی ذہن کسی تہذیبی نظام سے متاثر ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ اس علاقے کے ادب، تاریخ اور فکر و فن سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی ہم آہنگی اخذ و قبول کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ خارجی روایات و اثرات کا تجزیہ کرتے وقت اردو زبان و ادب فارسی کی مرہون منت معلوم ہوتی ہے جس نے ماضی میں اردو

زبان و ادب کو اس وقت کی اہم ترین زبان فارسی سے جوڑ دیا ہے۔ کیونکہ عجمی تہذیب کے مظاہر ہندی تہذیب کے آس پاس موجود تھے جس کے اظہار کے لیے فارسی کی ادبی روایت ہی اس کا وسیلہ بن سکتی تھی۔ آج بھی اردو زبان اپنے فروغ اور ترقی میں فارسی زبان اور ایرانی ذہن وتہذیب سے وابستہ ہے۔

اس تحقیقی مضمون میں اس بات کے لیے ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو زبان کی آن بان شان اور ہندوستان میں امن اور صلح، فتح، فنونِ لطیفہ، شعروشاعری، عاشقانہ روایات، صوفیانہ مضامین، داستانی قصے نیز اظہارِ درد وطن، قید فرنگ، مجاہد کے دل کی تڑپ، امنگ وآرزو، شوق وحوصلۂ شہادت، آزادی کا جنون، خدمتِ خلق وملت کے لیے آج بھی فارسی الفاظ اظہار کا ذریعہ ہیں اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ اردو زبان کا فروغ ماضی سے حال تک فارسی روایت اور ایرانی ذہن وتہذیب سے وابستہ رہے۔

موضوع: اردو زبان کا فروغ؛ ایرانی ذہن وتہذیب؛ فارسی روایت؛ تاریخی اور ادبی ثبوت

Dr:Farzanch Azam Lotfi Assistant Professor of Urdu Department

Tehran University Faculty of Foreign Languages and Literaures

B.A ULL.TU IRAN TEHRAN

M.A.M.phil and ph.D.ULL.C.JNU INDIA NEW DELHI

F. azamlotfi @ut.ac.ir

Farzanch_azamlotfi @yahoo.com

Fax:0098-21-88634500

تمہید:

1707 سے 1857 تک کا عہد سیاسی اعتبار سے زوال آمادہ تھا لیکن اردو شاعری اور اردو زبان کے لیے سنہرا عہد ثابت ہوا ہے۔ تہذیبی اعتبار سے یہ پورا دور ایرانی اور فارسی اثرات کا غماز ہے فارسی کا غلبہ اس دور کی خصوصیت ہے غزل ہو یا قصیدہ، اسلوب بیان ہو یا بیان ہر چیز

پر فارسی زبان کی چھاپ موجود ہے شمالی ہند کا مزاج فارسی زدہ اور تہذیب ایرانی تھی لہذا ابتدا ہی سے اردو میں فارسی اسالیب و تراکیب کا رنگ جھلکنے لگا تھا، دراصل اردو زبان کے ابتدائی سخن سنج فارسی میں دادِ سخن دے چکے تھے اس لیے ان پر فارسی کا اثر تھا کبھی استاد خان آرزو نے سودا کو کہا: ''مرزا فارسی ادب تمھاری زبان مادری نہیں اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمھارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابل تعریف ہو طبع موزوں ہے شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے تم اردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہو گے تمہید: مرزا فارسی ادب تمھاری زبان مادری نہیں''

''(عبدالحق قدیم اردو ص 177) مرزا بھی سمجھ گئے زبان بدل گئی مگر فارسی کے اسالیب اور موضوعات از بر تھے یہی ان کے عہد کا تقاضا بھی تھا جہاں جہاں تنگی جائے اردو کا گلہ ہوا تو ؟ آسمان وسعت فارسی سے تلاش کر لیے مگر فارسی کو بھولا نہیں۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کے فورا بعد ہی اردو زبان کی وسعت کے پیش نظر فارسی الفاظ و تراکیب استعمال میں لائے جانے لگے تھے فارسی محاوروں اور فقروں کے ترجمے بھی فارسی گو شاعروں کے کلام میں آنے لگے مثلاً: شیوہ لینا: شیوہ گرفتن، پیمانہ بھرنا: پیمانہ گرفتن، مگر یہ سب خصوصیات لسانیات کے ذیل میں آتی ہیں لیکن فارسی کے اثر اور واقفیت کے بغیر ناممکن تھیں اس معیار پر ان کے شاعرانہ اسالیب و دیگر خصوصیات بھی پوری اترتی ہیں۔ اکثر ہندوستان کے فارسی گو شاعروں نے تمام شعرائے فارس کا اتباع کیا ہے خاص طور پر سودا نے:

پوچھا اشعار کا سودا کے کیا ہے شاعرو
گفتگو میں اس کی پاتا ہوں نظیر کا دماغ

سودا نے اپنے شعروں میں علی رقم خان آرزو کے پند، نظیری، انوری، خاقانی، سلیم، کلیم، صائب بیدل کے شعری رویوں سے متاثر نظر آتے ہیں مثالیت پسندی، خیال بندی، معاملہ بندی وغیرہ ان شاعروں کی صفات ہیں جن سے ہندوستانی فارسی گو شاعروں نے فیض اٹھایا ہے۔ بھگوان داس ہندی نے کہا ہے: ''اگر مثال بندی اشعار غزل میں سودا کو اپنے وقت کا صائب کہا جائے تو ٹھیک ہے۔ سودا نے اس اسلوب کو بہ خوبی برتا ہے اور تمثیل کے پردے میں مضامین بیان کرنے کی روایت اردو کے سپرد گی کی ہے۔''

فارسی زبان اور ایرانی ذہن و تہذیب اردو شاعری کے قصیدہ، غزل، ریختہ تصوف و عرفان سے لے کر ہندوستان کے دور سیاسی اور انتظامی بد حالی کو بیان کرنے میں بھی بہ خوبی ساتھ دیا ہے چنانچہ جعفر زٹلی نے (1713-1125) فارسی زبان کو سیاست کے اوزار سمجھ کر یوں اشارہ کیا ہے:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ دانہ کش فرخ سیر

مرزا محمد جعفر زٹلی کے زمانے میں انسانیت اور محبت و خلوص کے رشتے پامال ہونے لگے لیکن انھوں نے معاشرے سے سمجھوتا نہیں کیا بلکہ فارسی الفاظ کے طنز و ہجو کی تلوار سے اپنے زمانے کے معاشرتی رویوں، مکاروں اور منافقوں پر گہرا وار کیا:

کشتی جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است
ڈبکوں ڈبکوں می کند از یک توجہ پار کن
غریب عاجز مسکین زٹلی ام جعفر
ہزار شکر کہ زور و نہ زہرہ دارم من

(ادبیات بے بہرہ داری)

اور دوسرے ابیات میں فارسی الفاظ سے تبحرانہ انداز میں فیض اٹھایا ہے:

در بیکسی افتادی و بادرد و غم آبادی
مفلس شدی و در بہ در کہہ جعفر اب کیسی بنی
از ہجو آن سلطان خود کردی پریشان جان خود
واماندہ بے بال و پر کہہ جعفر اب کیسی بنی
آن دیدن شہزادہ کوں آں ساقی ساقی و آں بادہ کوں
کردی خطا خود سر بہ سر کہہ جعفر اب کیسی بنی
مرہوں خار و خس شدی ممنوں ہر ناکس شدی
گشتی چو سنگ رہ گزر کہہ جعفر اب کیسی بنی

دل کوں ٹھکانے لا و اب کر صبرمت پچھتاو اب
ہرگز ملو بار دگر کہہ جعفر اب کیسی بنی
از لفظ بے معنی خود از حرف لا یعنی خود
محتاج از ہر خشک وتر کہہ جعفر اب کیسی بنی

جعفر کے کلام میں فارسی الفاظ وتراکیب کے بھروسے سے نہ صرف اس دور کے حالات وعوامل کا پتا چلتا ہے بلکہ معاشرتی وتہذیبی گراوٹ اور سیاسی واخلاقی زوال کے بنیادی اسباب کا بھی پتا چلتا ہے(جمیل جالبی تاریخ ادب اردوص96)

تصوف اور فارسی ذہن وتہذیب :

کہا جاتا ہے تصوف کی شراب کسی خاص پیمانے تک محدود نہیں لیکن ہر قوم اور ہر زبان کی شاعری کا تصوف مخصوص حالات کی دین ہوتا ہے اردو شاعری نے فارسی روایت اور ایرانی ذہن کے اثر سے نشو ونما حاصل کی اس لیے قدرتی طور پر دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ صوفیانہ مسائل و واردات بھی اردو میں منتقل ہوگئیں اس طرح اخلاقی مضامین جو تصوف سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور ایران کے مخصوص سیاسی و معاشرتی حالات ان کی پیدائش کا سبب بنے، اردو شاعروں نے اسے قبول کیا اور برصغیر کے سیاسی انتشار نے حوصلہ افزائی کی۔ تاج وتخت کی بے حرمتی، دولت کے لیے بھائیوں کے درمیاں نزاعی حالات، درباروں کی خوش آمد اور ترک دنیا، لوٹ مار، بے ثباتیِ دنیا، قناعت وتوکل، تسلیم ورضا، عزلت نشینی جیسے خیالات کو فارسی الفاظ سے اخلاقی فلسفے کی شکل دے دی گئی۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرا اور نئی نسل نے سراج الدین خان آرزو کے زیر اثر ایرانی اہل زبان کے خلاف ردعمل کا اظہار کر کے فارسی کے بجائے اردو کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا مگر ایک اساسی سوال اٹھتا ہے کہ اردو ادب اور اردو شاعروں نے کیوں اپنے رابطے کو فارسی زبان وادب سے اب تک ختم نہیں کیا؟ فارسی زبان سلاطین دہلی سے لے کر اٹھارویں صدی تک سرکاری دربار کی زبان تھی۔ اس زبان میں علم و ادب کا بڑا

ذخیرہ موجود تھا اور واحد ادبی و علمی زبان تھی جو تہذیبی سطح پر دوسری زبانوں کے مقابلے میں عوام کے قریب تھی۔ اس زبان کا روایتی ادب اس دور کے تہذیبی مزاج کا حصہ تھا اس لیے جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو اس کی شعری تخلیقات کے لیے شاعروں نے فطری طور پر فارسی زبان و ادب ہی کی طرف رجوع کیا۔ اردو شاعروں کے لیے فارسی شعرا قابل تقلید تھے۔ بارہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں کوئی اردو زبان کا شاعر ایسا نہیں تھا جس نے صائب کا تتبع نہ کیا ہو۔ شمالی ہند سے لے کر دکن میں فارسی زبان کا چرچا تھا:

دگر شعر ہندی کے بعضے ہنر
نہ سکتے ہیں لیا فارسی میں سنور
میں اس دو ہنر کے خلاصے کوں پایا
کیا شعر تازہ دونوں فن ملا
(نصرتی)

یہی بات ولی دکنی کے یہاں دوسرے اسلوب میں ملتی ہے:

ترا مکھ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے
نین جامی جبیں فردوسی وابرو ہلالی ہے

یا:

عرفی و انوری وخاقانی
مجھکو دیتے ہیں سب حساب سخن

ماضی میں میر خدائے سخن فارسی بحر کے ایک رکن کو گھٹا کر ہندی جیسی بحر میں غزلیں کہیں لیکن ہندی بحور چونکہ محدود تھیں اس لیے فارسی نظام عروض کو اپنا کر اردو شاعری میں وسعت اور تنوع پیدا ہوگیا۔ فارسی میں اظہار کے سانچے وسیع اور وقت کے تقاضوں کے مطابق تھے اس لیے اردو نے قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ، مسمط اور اس کی آٹھوں قسمیں یعنی مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع مثمن، اور فرد کو بھی قبول کیا اور ساتھ ساتھ حمد، نعت، منقبت، ہجو، واسوخت، مرثیہ، شہر آشوب اور تاریخ گوئی کو پوری روایت کے ساتھ قبول کیا۔ صوفیانہ اردو

شاعری کی بنیادی روایت ماضی اور حال میں بھی فارسی ہی سے اخذ کی گئی ہے۔ صوفیانہ اصطلاحات، اخلاقی تخلیقات میں پند و نصائح، گلستاں و بوستاں سعدی انوار سہیلی منطق الطیر اخلاق جلالی اخلاق ناصری اخلاق محسنی و سیاست نامہ میں نظر آتے ہیں جہاں تک رزمیہ مثنویاں ہیں تو شاہنامہ فردوسی سے نمونہ مل جاتا ہے۔

تحقیقات کے مطابق فارسی زبان و ادب کے اثرات صرف اردو تک محدود نہیں بلکہ براعظم کی مختلف علاقائی زبانوں مثلاً: مرہٹی، تلگو، پشتو، کشمیری، پنجابی، سندھی وغیرہ پر بھی واضح ہیں اور اگر چہ 1844 کے بعد فارسی رو بہ انحطاط ہوگئی لیکن شعروشاعری کا ذوق فارسی ادب اور تاریخ کے ساتھ اکثر کائستھ اور برہمن خاندانوں میں موجود رہا۔ ہندو طلبہ 1900 عیسوی تک اختیاری مضامین میں فارسی کو ترجیح دیتے تھے آرنلڈ صاحب 1857 میں پنجاب کی تعلیمی حالت پر رپورٹ کے دوران رقم طراز ہیں:

> ''کہ فارسی اور قرآن کے مدارس ملک کی حقیقی تعلیمی درسگاہیں ہیں۔ ان درسگاہوں میں مسلمانوں کی نسبت ہندو طالب علم زیادہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہندوؤں میں فارسی کا بیج اکبر اور ٹوڈرمل نے بویا اور یہ درخت مسلسل تین سو سال تک پھولتا پھلتا رہا۔ (عبداللہ سید ص223)

فارسی زبان کی قابل فخر بات فارسی کا پہلا روزنامہ مراۃ الاخبار 1822 راجہ موہن رائے کی روایت بھی غور طلب ہے۔ انھوں نے سیاسی خاموشی اختیار کرنے کے لیے حافظ کے شعر سے فیض اٹھایا ہے:

گدای گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
رموز مملکت خویش خسروان دانند

ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ اردو زبان و ادب کی جڑیں فارسی زبان اور ایرانی تہذیب میں پیوست ہیں اور اس سے الگ اپنی شناخت کو قائم رکھا ہے۔

موجودہ ہندوستان میں ماضی کی طرح کوئی فارسی شاعری کی اصلاح کے لیے کسی ایرانی فارسی داں کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ کسی خاص احساس اور جذبے کو

قاری کے دل و دماغ تک پہنچانا چاہتا ہے تو فارسی الفاظ فرشتہ وحی کی طرح اس کے کام میں آتے ہیں۔ گویا فارسی الفاظ وتراکیب ذہن کا حصہ بن چکے ہیں۔ جنھیں ذہن سے نکالنا کسی طور ممکن نہیں ہے۔ آج کی اردو زبان شعر و شاعری، نثر اور تمام اصناف سخن فارسی الفاظ کے استعمال کے بغیر محال ہے۔

نتیجہ: اردو زبان کا فروغ ماضی میں اور ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حال میں اردو زبان نے اپنے فروغ کے لیے فارسی کا دامن نہیں چھوڑا ہے چنانچہ آج کی جدید شاعری میں جہاں حرکت وعمل اور خدمت، نیز اتحاد وطن کا تصور ہو اس میں فارسی الفاظ بہ خوبی اردو زبان کا ساتھ دیتے ہیں:

مرحبا اے مادر ہندوستاں جنت نشاں
مرحبا اے مادر ہندوستان اے روحانیت کی سرزمین
ہم کہاں جائیں گے مکہ و مدینہ چھوڑ کر
ساری دنیا میں ہے تیری پاک تر بہتر زمین
(مقدس سرزمین نادر کاگوروی)

فارسی الفاظ حب الوطنی کے اظہار کے لیے قابل قدر ہیں۔ یوں تو عجمی اثرات اور فارسی الفاظ ماضی کی اردو شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں مگر آج کی شاعری میں بھی فیض زبان فارسی کو کسی نے نظر انداز نہیں کیا۔

عجمی اثرات کے سبب بسا اوقات اردو شاعری میں مے کشی و بت پرستی پر فخر کیا جاتا اور زاہد و شیخ کو ہدف بنایا جاتا تھا، کوچۂ یار میں رہنے والا کعبہ کو دور سے سلام کرتا، قشقہ کھینچ کر دیر میں بیٹھتا اور ترک اسلام کا فخریہ اعلان کرتا تھا۔ آج کے دور میں اردو کی جدید شاعری اور جدید اردو ادب میں جنگ، مذہبی، بحران، اقتصادی بدحالی، فرقہ وارانہ فسادات اور غلامی کے شدید احساس نے بعض ذہنوں کو مذہب سے برگشتہ کر دیا ہے۔ البتہ وہ مذہب جو ریا و فریب سے آلودہ ہو ایسی صورت حال کے اظہار کے لیے کچھ خاص فارسی الفاظ اردو شاعری کی زینت بنتے ہیں:

اگر کج رو ہیں انجم آسمان تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے لا مکان خالی
خطا کس کی ہے یارب یہ جہاں تیرا ہے یا میرا
(اقبال)

محمد حسین آزاد کا خیال ملاحظہ ہو:

''زبان اردو کے پاس جو کچھ ہے وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے جنھوں نے فارسی کی بدولت اپنی دکان سجائی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عام مطالب کے ادا کرنے میں بھی مفلس ہے اس کی سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی جو کچھ ہے وہ اتنا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اڑی لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی وہاں سے جو گری تو استعاروں کے تہہ میں ڈوب کر غائب ہوئی۔''
(محمد حسین آزاد نیرنگ خیال ص 4)

مگر آج کا اردو ادب اور اردو شاعری فارسی کے پروں سے ہندوستان کے دل و دماغ تک پرواز کر سکتا ہے اور فارسی کے الفاظ کے استعمال کے بغیر گویا آسمان دل تک نہیں چڑھ سکتا:

میں آسماں پہ بہت دیر رہ نہیں سکتا
مگر یہ بات زمیں سے تو کہہ نہیں سکتا
کسی کے چہرے کو کب تک نگاہ میں رکھوں
سفر میں ایک ہی منظر تو رہ نہیں سکتا
جو آزمانے کی فرصت تجھے کبھی مل جائے
میں آنکھوں آنکھوں میں کیا بات کہہ نہیں سکتا
سہارا لینا ہی پڑتا ہے مجھ کو دریا کا
میں ایک قطرہ ہوں تنہا تو بہہ نہیں سکتا

وسیم بریلوی کی شاعری میں بھی فارسی کے بہترین اور عمدہ الفاظ خیال اور بحر و عروض میں

کو جاری رکھتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایرانی اور برصغیر ہندو پاک کے لوگ ایک دوسرے کو سمجھنے اور تعلقات بڑھانے میں ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور اسلامی سلطنتوں کے قیام سے فارسی کو دفتری، سرکاری اور ادبی زبان کی حیثیت سے خاص مقام ملا اور ہندوستانی لوگوں نے فارسی کی تعلیم، فارسی سے علاقائی زبانوں میں ترجمہ کرنے، حتی کہ ہندوستانی زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کرنے کے عمل کو سنجیدہ طور پر ضروری سمجھا۔ لیکن اس کے برعکس صورت، یعنی اردو سے فارسی میں ترجمے کو دونوں خطوں میں، کبھی سنجیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا، حالانکہ دوطرفہ افہام وتفہیم کے لیے، یہ ایک ضروری بات ہے۔ اس بناپر، فارسی سے اردو میں اور اردو سے فارسی میں تراجم کی روایات، ضروریات اور اصولوں کا مطالعہ، اس راستے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

فارسی سے اردو میں تراجم کی روایت پر مختصر تبصرہ

ڈاکٹر سلیم اختر کے خیال میں ''اردو کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہاں بھی تراجم اہم ترین کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ تمام ترقی کے باوجود فارسی زبان و ادب اہل اردو کے لیے مثالی نمونہ تھے۔ اس لیے اہل قلم کسی نہ کسی طور پر تراجم سے اردو کا دامن مالا مال کرنے کی سعی کرتے رہتے۔'' (سلیم اختر، 2003، 339) قلی قطب شاہ سے لے کر، ملا وجہی اور ولی دکنی تک اور میر تقی میر و سودا و عطا خان حسین تحسین و میر امن سے لے کر متاخرین تک، فارسی سے ترجمے کے ذریعے، اپنی شاعری اور تصنیفات کو مستفید کرتے رہے۔ اردو محاورات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ، ان میں اکثر وہ محاورات ہیں، جو فارسی الفاظ سے بنے ہیں یا مشہور فارسی محاورات کا لفظی ترجمہ ہیں۔ اردو شعرا کے دواوین اور مصنفوں کی تصنیفات میں جہاں پوری کی پوری غزلیں، اشعار، مصرعے، عبارات، جملے وغیرہ فارسی سے ترجمہ ہوئے ہیں، وہاں، اردو نثر میں بھی ہمارا سامنا ان، کہانیوں اور کتابوں سے ہوتا ہے، جن کو اگر فارسی کہانیوں اور کتابوں کا من وعن ترجمہ یا چربہ کہا جائے، بے جا نہ ہوگا۔ اختر راہی نے اپنی مشہور کتاب" ترجمہ ہائے متون فارسی بہ زبان ہائے پاکستانی " میں مختلف

موضوعات وعناوین کے تحت ایسی کتابوں کی نشاندہی کی ہے۔ جن میں تفسیر و درباره قرآن، عرفان، جغرافیہ وسفرنامہ، دستور زبان، بلاغت وعروض، متن ہائے ادبی، داستان ومنظومہ ھا (راہی، 1986، 14-13)، جیسے عناوین، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہاں ان کی تفصیلی فہرست دینا یا تفصیلی وضاحت تکرارِ مکررات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ گذشتہ ادوار میں خاص طور پر اور حتی کہ جدید دور میں بھی مختلف وجوہات کی بناپر، فارسی سے اردو میں تراجم ہوئے ہیں اور اردو نے ان تراجم کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا ہے۔

لیکن ایک اہم سوال یہ ہے کہ اس اخذ کے عمل اور اس کی رفتار میں، اکیسویں صدی کے ربع اول میں جہاں ہم آپ کھڑے ہیں، کیا کوئی کمی آئی ہے؟ کیا اب بھی وہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے؟ کیا اس کے باوجود کہ اردو زبان نے، انیسویں صدی سے اپنے استقلال اور وجود کا اعلان کیا ہے اور اس استقلال کے دور میں، جب ایک دوسرے ادب، یعنی انگریزی ادب سے اسے مستفید ہونے کی فرصت ملی ہے اور پچھلی دوصدیوں میں اس نے اس زبان وادب سے اور اس زبان کے ذریعے سے، دنیا کے دیگر ادبیات سے، بھرپور استفادہ کیا ہے، اب ایسا وقت نہیں آیا ہے کہ دوسری زبان بولنے والے لوگ، اور ان میں خاص طور پر فارسی زبان لوگ، اس زبان کے کم از کم اعلی کارناموں سے بذریعہ ترجمہ، آگاہی حاصل کریں؟ یا حتی کہ اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر، تراجم کی مدد سے فیض حاصل کر کے اپنے اپنے ادبی سرمایے میں اضافہ کریں؟ یہ اور اس طرح کے بے شمار سوال اٹھائے جاسکتے ہیں، جن کے جوابات ابھی تک سامنے نہیں آسکے۔

جب سے اردو ادب کی زبان بنی، یقیناً اس کی بنیاد، فارسی کے ادبی سرمایے پر ہوئی۔ محمد بن قاسم سے لے کر محمود غزنوی اور بابر تک، اس کے باوجود کہ ان فاتحوں کی مادری زبان فارسی نہیں تھی، لیکن ان کی درباری زبان، فارسی رہی۔ فارسی ایک طرف سے فاتح قوم کی زبان تھی، تو دوسری طرف سے، ایک مضبوط ادبی روایت کی مالک بھی تھی۔ اس لیے بہت جلد برصغیر میں اس کی بڑے پیمانے پر پذیرائی ہوئی۔ ہندوستان کے بہت سے مقامی لوگ سیاسی تحفظات کی بناپر، فاتح قوم سے قربت حاصل کرنے کے لیے اور ان کے خوان گستردہ سے فیض یابی کی

غرض سے فارسی کی تعلیم حاصل کر کے اس میں ماہر ہو گئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ اردو تراجم کے پہلے دور یعنی انگریزوں کے تسلط سے پہلے دور میں تراجم میں سیاسی پہلو، نظر نہیں آتا ہے۔ (سلیم اختر، 2003، 342) حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں بھی، ذاتی سیاسی مفادات زیادہ نظر آتے ہیں۔ چونکہ مسلمان فاتحوں کے عزائم اور سیاسی حکمت عملی اور انگریزوں کے عزائم اور حکمت عملیوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ مسلمان فاتحین نے اس خطے کی فتح کے بعد، ہندوستان کو اپنا وطن بنایا جبکہ انگریزوں نے صرف اور صرف اپنے سیاسی و معاشی مفادات کو پیش نظر رکھا۔ اس لیے اسلامی دور میں لوگ ذاتی طور پر ترقی کے لیے ارباب اقتدار سے قربت حاصل کرنے کے لیے اس کام کو ضروری سمجھے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں نے فارسی ادب کے ثقافتی پہلو سے لطف اندوزی کے لیے، فارسی سیکھی اور عرصہ دراز تک فارسی ادب کے میدان میں ایسی ہنرنمائی کرتے رہے کہ ان کے ادبی کارناموں کو خود ایرانیوں کے مقابل میں رکھا جاسکتا ہے۔ امیر خسرو دہلوی، بیدل اور غالب کلاسیکی دور میں اس بات کی روشن مثالیں ہیں۔

اردو سے فارسی تراجم کی روایت

قابل غور بات یہ ہے کہ فطرت کے اثرات سے کوئی مفر نہیں، بالآخر ایسا دور بھی آیا کہ یہاں کے لوگ اپنی مادری زبان میں تخلیقی عمل اور اس عمل کی اہمیت سے واقف ہو گئے۔ تاریخ میں اس بات کی طرف دھیان اور میلان پر سیر حاصل بحثیں اور حوالے ملتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات میں یہ بات واضح طور پر لکھی گئی ہے کہ فارسی اور اس کے ذریعے سے عربی زبان وادب نے ہندوستان کی مقامی زبانوں اور ان کی سرفہرست اردو زبان پر، الفاظ و تراکیب اور تمام ادبی اصناف وصنائع پر بہت گہرے اثرات چھوڑے اور اس زبان نے انھیں اثرات سے اپنی بنیادیں، مضبوط کی ہیں۔ شاید یہ کہنا مناسب ہو کہ "فارسی اثرات فطری طور پر اردو زبان میں در آئے۔ یہ اس دور میں ایک فطری عمل تھا اور تہذیب کے اس موڑ پر اس کے علاوہ دوسرا راستہ، دوسرا عمل ممکن نہیں تھا۔" (جالبی، 2008، ج 1، 193) اردو ہر دور میں ترقی کرتی رہی

اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ بول چال کی ہردلعزیز زبان بنی اور پھر ادبیات کی ضروریات پوری کرنے لگی۔ اگر اردو زبان نے فارسی وعربی سے الفاظ، تراکیب، مضامین اور موضوعات کو اخذ و اقتباس کیا، لیکن یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ ''اردو کی جڑیں برصغیر کے تمام تہذیبی مراکز میں پیوست ہیں۔ پراکرت، برج بھاشا، کھڑی بولی، بھوجپوری، اودھی، پنجابی اور سندھی لہجوں، بولیوں اور زبانوں سے اس کا خمیر اس طرح اٹھا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے پورے برصغیر کی زبان بن گئی۔'' (اخبار اردو، دسمبر 2008، 19) اور یہ اس سکے کا دوسرا رخ ہے جس کو کسی طرح سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کے جواب میں، جن کے نزدیک اردو نے تمام چیزیں فارسی وعربی سے اخذ کرلی ہیں اور اس زبان سے ترجمے کو اہم نہیں جانتے ہیں، یہ کہنا ضروری ہے کہ اردو نے اپنا دامن ہند۔ اسلامی تہذیب وتمدن سے بہرہ یاب ہوکر ایسے فن پاروں کی تخلیق کی ہے، جن کو سربلندی کیساتھ، دیگر تمام طاقتور زبانوں کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان سب سے آگاہی کا واحد طریقہ ترجمہ ہے جو یقیناً عالمی برادری کی ترقی اور اس خطے کی ثقافت اور تمدن سے بہرہ یابی کے لیے بہت مفید رہے گا۔ اس تمہید کے پیش نظر، اس مضمون میں اردو سے فارسی میں تراجم کی ضرورت اور اس کے اُن فن پاروں اور کارناموں کی بطور نمونہ نشاندہی کی جائے گی جو اردو دنیا کی صحیح شناخت کرانے اور اس سے متعلق ممالک کے ساتھ تعلقات کو مزید خوشگوار بنانے میں ضروری ہیں۔

اس عنوان میں 'روایت' کے لفظ کا ذکر، بہت غور طلب ہے۔ روایت کی صحیح تعریف اور اس کے معیار کو اگر دیکھیں، یقیناً اس عنوان میں 'روایت' کے لفظ کا استعمال صحیح نہیں۔ "انسانی زندگی میں کچھ ایسے طور طریقے، کچھ ایسی قدریں، کچھ ایسے تصورات جن پر سب لوگ بنیادی طور پر متفق ہوں اور افراد جن کو لوگ اپنا آدرش یا آئیڈیل مان لیں وہ روایات کہلاتی ہیں۔ تہذیب اور کلچر انہی مجموعوں کا نام ہے۔ (ابولاعجاز، 1985، 89) اس تعریف کی رو سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اردو سے فارسی میں ترجمے کا عمل، کسی روایت کی پیروی نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے لیے روایت کا استعمال مناسب ہے۔ یہاں صرف بحث کو آگے بڑھانے کے لیے یہ لفظ اس عنوان میں مذکور ہوا ہے۔ چونکہ اس کے بارے میں، نہ فارسی بولنے والے لوگوں کے

پاس، کوئی مضبوط لائحہ عمل ملتا ہے اور نہ ہی کسی فارسی علمی و ادبی ادارے نے اس بارے میں کسی خاص موضوع پر لگے بندھے ضوابط کے تحت، ترجمے کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ رسالہ 'دریافت' کے گیارھویں نمبر میں ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے اس عنوان کے تحت ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اس کی نشاندہی کی ہے کہ وقتاً فوقتاً، مذہبی اور ادبی ضروریات کے تحت، انفرادی سطح پر کچھ ایرانی، افغانی اور خاصی تعداد میں خود ہندوستانی فارسی دان دانشوروں کے ذریعے بعض اردو کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس مضمون کی مدد سے ذیل میں بعض اہم کتابوں کے فارسی تراجم کی فہرست پیش خدمت ہے:

1- مذہبی کتابوں میں، قادیانی مسلک کی تبلیغ اور تبیین میں بشیر الدین محمود احمد نے 'دعوت الامیر' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس کا فارسی ترجمہ افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان کو ارسال ہوا۔

2- الطاف حسین حالی کی 'حیات سعدی' کا فارسی ترجمہ نصر اللہ سروش نے 1937 میں تہران سے شائع کیا۔

3- 'شعر العجم' کے دو ترجمے ایران اور افغانستان سے شائع ہوئے۔ ایران سے فخر داعی گیلانی نے اور افغانستان سے منصور انصاری اور گویا اعتمادی نے اس کا فارسی ترجمہ کیا ہے۔

4- فخر داعی گیلانی نے شبلی کی 'سوانح مولانا روم'، 'علم الکلام'، الکلام'، 'مقالات شبلی' اور 'کتابخانہ اسکندریہ' کو بھی فارسی کا جامہ پہنایا۔

5- محمد حسین آزاد کی 'سخندان فارس' کا افغانستان کے ملک الشعرا 'عبداللہ خان' نے فارسی میں ترجمہ کیا۔

6- علامہ اقبال کی اردو شاعری اور بعض مضامین کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔ ان پر لکھی گئی کتب اور مضامین کا بھی بڑی مقدار میں فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔ شاید یہ وہ واحد موضوع ہے کہ سرکاری اور وسیع ادبی سطح پر بعض ایرانی ادارے، اس سے متعلق کتابوں اور مضامین کو اردو سے فارسی میں ترجمے کرنے کو اب تک اہم قرار دیتے ہیں۔ 'ضرب کلیم' اور 'ارمغان حجاز' کا فارسی ترجمہ دستیاب ہے۔ اس سلسلے میں بہت اہم مترجم،

شہبیند خت مقدم صفیاری ہیں، جنھوں نے 'میزان اقبال'، 'ایقان اقبال' اور 'اقبال کی فارسی غزل' از پروفیسر محمد منور اور 'زندہ رود' از جاوید اقبال کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ راقم نے 'مطالعہ بیدل فکر برگسون کی روشنی میں' کا 'مطالعہ بیدل در پرتو افکار برگساں' کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

7۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب 'ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ' کا محمد اسلم خان نے فارسی میں ترجمہ کیا۔

8۔ ڈاکٹر شاہد چوہدری نے چھ جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر ظہورالدین احمد کی 'پاکستان میں فارسی ادب' کا ترجمہ کیا ہے۔ (دریافت، ش 11، صص 18۔9)

اس فہرست میں شاید چند اور کتابوں اور مترجمین کے نام مزید اضافہ کیے جا سکیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر شریف حسین قاسمی کا ترجمہ یادگار غالب وغیرہ۔ لیکن حق یہ ہے کہ اردو زبان میں سیکڑوں ایسی کتابوں اور مضامین کے نام لیے جا سکتے ہیں کہ جن کے تراجم کی فارسی زبان میں اشد ضرورت ہے۔

اردو سے فارسی میں تراجم کی ضرورت

یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ ہر زبان کے ادیب و دانشور، اخذ و اقتباس کے ساتھ ساتھ اپنے علمی و ادبی ماحول کے مواد کی مدد سے، نئے نئے فن پاروں کی تخلیق کرتے ہیں۔ اگر یہ مانا جائے کہ کلاسیکی دور میں اردو زبان و ادب نے فارسی و عربی سے وسیع پیمانے میں استفادہ کیا اور اسی طرح انگریزوں کی آمد کے بعد، اسے انگریزی زبان و ادب سے مستفید ہونے کا موقع ملا تو یقیناً قدیم و جدید کی آمیزش سے ایسے ادبی کارنامے سامنے آئے کہ کسی صورت میں فارسی، عربی یا انگریزی نہیں تھے۔ قدیم اصناف شعر مثلاً غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مرثیہ وغیرہ کو اردو نے فارسی و عربی شعرا سے تو حاصل کیا لیکن ایسا دور بھی آیا کہ ان ہی اصناف ادب میں میر تقی میر، سودا، مومن، میر انیس، غالب اور اقبال جیسے شعرا نے نئے نئے مضامین شامل کر کے ان کو خالصتاً ہندوستانی ثقافت اور افکار سے متصف کر کے پیش کیا۔ اگر انگریزی ادب سے اثر پذیری

کی وجہ سے، افسانہ، ناول اور ڈرامہ جیسی اصناف نثر نے اردو میں راہ پائی تو پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور امتیاز علی تاج کے افسانے، ناول اور ڈرامے خالص ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کے لیے کافی ہیں۔ یہی نہیں، اب جاپانی ہائیکو، انگریزی سانیٹ اور مغربی ادب کے زیر اثر جدید نظم کے ساتھ ساتھ، کالم نگاری، صحافت، رپورتاژ وغیرہ کے میدان میں اردو میں ایسے فنکارانہ کارنامے منصۂ شہود پر آئے ہیں، کہ جن کی نظیر دنیا کے ادب میں شاذ و نادر ملتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: ''فارسی کا یہ اثر اس دور میں ایسا ہی فطری تہذیبی عمل ہے جیسے انیسویں صدی کے آخر سے آج تک انگریزی ادب، اردو کو متاثر کر رہا ہے اور نئی اصناف ادب مثلاً سانیٹ، آزاد نظم، نظم معرّا، مختصر کہانی، رپورتاژ، ڈرامہ، تنقید، پروز پوئم وغیرہ اردو میں عام و مروّج ہو گئے ہیں۔'' (جالبی، 2009، ج2، 32)

اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ایران میں برصغیر ہند و پاک کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی و تہذیبی امور سے مربوط بہت سی کتب، مضامین اور خبریں ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیران کن ترقی کی بدولت یہ ایک ناگزیر عمل ہے۔ لمحے لمحے کی خبریں، دنیا کے کونے کونے میں سنائی دیتی ہیں۔ برصغیر تو ایران کا ہمسایہ ہے، یقیناً دونوں خطوں میں عام خبروں کی ترسیل ہوتی ہے۔ لیکن اس بارے میں چند ایسے امور کی نشاندہی ضروری لگتی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان ممالک کے بارے میں، زیادہ تر اطلاعات انگریزی زبان سے فارسی میں ترجمہ ہوتی ہیں۔ مثال کے لیے ہندوستانی فلموں کو لیجیے۔ ایران کے اندر ان فلموں کے ڈبینگ کے کام کی تعداد اب گننے سے باہر ہے۔ لیکن شاید ایسی فلم مل جائے جس کا براہ راست اردو یا ہندی سے فارسی میں ترجمہ ہوا ہو۔ شاید یہ کہا جا سکے کہ اُن فلموں کو ڈبینگ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے جن کی انگریزی ڈبینگ موجود ہوں اور اس طرح انگریزی سے فارسی میں وہ ترجمہ کی جاتی ہیں۔ اس لیے، فلموں کے مفہوم اور مضمون اکثر اوقات ترجمہ در ترجمہ کی وجہ سے بدل جاتے ہیں۔ اس ضمن میں دوسری مثال خود ہندوستان کی قدیم و جدید تاریخ پر ایران میں ڈھونڈنے سے بہت سی کتب اور مضامین ملتے ہیں، لیکن ان میں شاید ایک دو کتابیں یا مضمون ایسے ملیں گے جو براہ راست اردو سے ترجمہ کیے گئے ہوں۔

وہ بھی فلموں کی طرح اکثر انگریزی سے فارسی میں ترجمہ ہوکر لوگوں کی دسترس میں آتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت پر اگر کسی سفرنامہ نویس نے، اپنے مشاہدات سفر کو قلمبند کیا تو کسی حد تک موثق ٹھہرائے جاسکتے ہیں، ورنہ اس بارے میں بھی اکثر کتب جو فارسی میں ملتی ہیں، وہ انگریزی سے فارسی میں ترجمے کی صورت میں ملتی ہیں۔ اس صورت میں اکثر مقامات و اشخاص کے نام کی صحیح صورت سامنے نہیں آتی۔ نصرت فتح علی خان مرحوم ایک زمانے میں، ایران آئے تھے۔ خبروں میں ان کا نام نصرت 'فاتح' علی خان لکھا گیا تھا۔ چونکہ انگریزی میں 'فتح' اور 'فاتح' کا املا ایک جیسا لکھا جاتا ہے۔ خود ہندوستان کے وزیر اعظم منموہن سنگھ کی ایران میں تشریف آوری کی خبر میں منموہن کو" مانموہن" لکھا اور پڑھا جاتا تھا۔ جو یقیناً انگریزی املا کو فارسی میں تبدیل کرتے وقت، اس غلطی کا ارتکاب کیا گیا تھا۔ یہ مثالیں صرف اور صرف مشتے نمونہ خروار ہیں اور اگر مثالیں دینا شروع ہوجائیں تو کئی دفتر درکار ہوں گے۔ ان باتوں کے باوجود، ایسی غلطیوں سے بچنے اور برصغیر کے بارے میں ہر طرح کی اطلاعات کی صحیح عکاسی کے لیے، یقیناً ایرانی اردو ماہروں کی ضرورت ہے جو اپنی کارکردگی سے اس خطے کے بارے میں ان کتابوں اور مضامین کو فارسی کا جامہ پہنائیں جن سے برصغیر کے تمام امور سے مربوط کتب اور مضامین کے بارے میں ایک صحیح شناخت قائم ہوجائے۔

اس تمہید کے ساتھ موضوع وار، چند ایسی اردو تخلیقات کی محض نمونے کے طور پر نشاندہی کی جائے گی، جن کے تراجم سے فارسی زبان عوام، خواص اور دانشور اپنے اپنے طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں:

1۔ اردو زبان کی ساخت و شناخت پر لکھی گئی کتابیں اور مضامین:

اردو زبان کا ارتقا	شوکت سبزواری
داستان زبان اردو	شوکت سبزواری
اردو لسانیات	شوکت سبزواری
اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ	محمد حسن
تاریخ ادب اردو	گیان چند جین، سیدہ جعفر

اردو کی کہانی	سید احتشام حسین
تاریخ ادب اردو	جمیل جالبی

2۔ فارسی شعرا ادیبوں اور دانشوروں پر لکھے گئے مضامین اور کتابیں:

ادیب ایبٹ آبادی، خواجہ عباداللہ اختر،

3۔ برصغیر کی تاریخ اور جغرافیے سے مربوط اہم کتابیں اور مضامین:

جنوبی ہند کی تاریخ (زمانہ ماقبل سے وجیہ نگر کے زوال تک) آئی، سی، آر/آر، کے بھٹناگر

خلجی خاندان	کے، ایس، لال/محمد یسین مظہر صدیقی
قدیم ہندوستان کی تاریخ	راما شنکر ترپاٹھی

قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب، تاریخی پس منظر میں

ڈی۔ڈی۔کوسمبی/ بال مکند عرش ملیسانی

مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال	ایس۔این۔ترپاٹھی
جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	محمد ہاشم قدوائی
ہمارا قدیم سماج	سید سخی حسن نقوی
ہندوستان میں عورت کی حیثیت	آئی۔سی۔آر/صغری مہدی
ہندو فلسفہ، مذہب اور نظام معاشرت	سید حامد حسین
ہندوستانی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	بسمل پرساد/محمد محمود فیض
قدیم ہندی فلسفہ	رائے شیوموہن لال ماتھر
پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں	حافظ تقی الدین
تاریخ تمدن ہند	محمد مجیب
انقلاب 1857	پی، سی، جوشی

4۔ برصغیر کے عظیم فارسی شعرا کے کلام پر تنقیدی وتحقیقی مضامین وکتب:

بیدل	خواجہ عباداللہ اختر
دیوان حافظ مترجم	ادیب ایبٹ آبادی

اقبال اور حافظ	یوسف حسین خان
اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ	عبدالشکور احسن
اقبال سب کے لیے	فرمان فتحپوری

5۔ اردو اصناف نظم ونثر کا تعارف اوران کے تنقیدی مطالعے پر کتب اور مضامین:

ہند۔ایرانی ادبیات، چند مطالعے	کبیر احمد جائسی
اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب	گوپی چند نارنگ
اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات	شمشاد حیدر زیدی
دکن میں مرثیہ اور عزاداری	رشید موسوی
اردو فکشن (بنیادی وتشکیلی عناصر)	اختر انصاری
اردو افسانے میں علامت نگاری	اعجاز راہی
پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال	شہزاد منظر
اردو افسانہ نگاری کے رجحانات	فردوس انور قاضی
بیسویں صدی میں اردو ادب	گوپی چند نارنگ
اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ	مہناز انور
اردو کا جدید نثری ادب	ہارون الرشید
اردو نثر میں مزاح نگاری	رؤوف پاریکھ
اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید
معاصر اردو ادب	تحسین فراقی
غالب، فکر وفرہنگ	تحسین فراقی
نئی صدی اور ادب	دیوندر اسر
شعور اور لاشعور کا شاعر، غالب	سلیم اختر
اردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر	غلام حسین ذوالفقار
غالب شاعر امروز وفردا	فرمان فتحپوری

مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی
اردوادب میں طنز ومزاح	وزیرآغا
جدید نظم کی کروٹیں	وزیرآغا

6- جدید دور میں ہندو پاک کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی وتہذیبی حالات پر لکھی گئی کتب:

تاریخ تحریک آزادی ہند	تاراچند
جدید ہندوستان 1985-1947	سمت سرکار
پاکستان: تاریخی وسیاسی جائزہ	تجمل حسین
پاکستانی سیاست اورآئین	خورشیداحمد
پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں	آزادکوثری

7- اردو کے مشہور افسانے، ناول اور ڈرامے اوران کی تنقید: مذکورہ ذیل ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے ناولوں اور افسانوں کا انتخاب:

پریم چند، مرزاہادی رسوا، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندرناتھ اشک، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، عزیز احمد، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، میرزا ادیب، ہاجرہ مسرور، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، انتظار حسین، خالدہ حسین، رشید امجد، اعجاز راہی، بانو قدسیہ، مظہرالاسلام، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، عبداللہ حسین

8- اردو طنز ومزاح:

مشتاق احمد یوسفی، پطرس بخاری، ابن انشا، صدیق سالک وغیرہ کے مضامین کا انتخاب

9- برصغیر کی لوک داستانیں:

ہیررانجھا، سسی پنوں، سوہنی ماہی وال وغیرہ

10- اردو کے مشہور شعرا کے منتخب کلام:

میر وسودا، مومن، غالب، فیض، راشد، مجید امجد، علامہ اقبال، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، ناصر کاظمی، پروین شاکر، مرزا سلامت علی دبیر، میر ببر علی انیس، امیر مینائی، داغ دہلوی،

الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، قتیل شفائی، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، ناصر کاظمی، افتخار عارف، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، جون ایلیا، سلیم کوثر

11- اردو کے غیر افسانوی نثر کے مشہور کتب اور مضامین:

مزاح: پطرس بخاری، شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی،

ڈرامے: امتیاز علی تاج، آغا حشر کاشمیری،

یقیناً اس فہرست میں، عناوین اور فن پاروں کا کئی گنا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف اس بات کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ ان مضامین و کتب کے تراجم کے لیے جہاں ایرانیوں کی رغبت اور اشتیاق کی ضرورت ہے، خود ہند و پاک کے دانشوروں اور ادیبوں اور ارباب اقتدار کی طرف سے سیاسی اور ثقافتی ملاقاتوں میں بھی اس پر اصرار اور اس کی اہمیت کی نشاندہی بھی بڑی ضروری ہے۔ مجھے امید ہے ایک ایسی انجمن یا فضا قائم ہونی چاہیے جس کو یہ کام سونپا جائے اور انفرادی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تا کہ ہمارے شعبے سے فارغ التحصیل طلباپوری تندہی سے اس کام میں لگ جائیں۔ اس بارے میں مالی اور معنوی حمایتوں کی بڑی ضرورت ہے، جس کا بندوبست یقیناً دونوں خطوں کے ثقافتی اور تہذیبی ادارے کر سکتے ہیں۔

○

کتابیات

1- ابولاعجاز حفیظ ''صدیقی (مرتبہ)، 1985، کشاف تنقیدی اصطلاحات، نظر ثانی: آفتاب احمد خان، طبع دوم، اسلام آباد، پاکستان، مقتدرہ قومی زبان

2- جالبی، جمیل، 2008، تاریخ ادب اردو، جلد اول، طباعت ہفتم، لاہور، پاکستان، مجلس ترقی ادب

3- جالبی، جمیل، 2009، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، طباعت ششم، لاہور، پاکستان، مجلس ترقی ادب

4- راہی، اختر، 1986، ترجمہ ھای متون فارسی بہ زبانہای پاکستانی، اسلام آباد، پاکستان،

5۔ سلیم اختر، 2003، اردو زبان کیا ہے؟، لاہور، پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز

6۔ سفیر اختر، 2012، "اردو کتابوں کے فارسی تراجم"، مجلہ: دریافت، شمارہ 11، جنوری 2012، اسلام آباد، پاکستان، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز

7۔ ہاشمی، شفق، 2008، "اردو ہے جس کا نام"، ماہنامہ: اخبار اردو، دسمبر 2008، اسلام آباد، پاکستان، مقتدرہ قومی زبان

اردو کی عالمی مقبولیت وسعت اور دقّت

پروفیسر علی احمد فاطمی

شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

ایک وقت ایسا تھا جب اردو محض ہندوستان کی زبان تھی۔ لاہور سے حیدرآباد اور کلکتہ سے بمبئی تک اردو کا دامن پھیلا ہوا تھا۔ اردو پڑھنا اور اردو بولنا اعلیٰ تہذیبی معیار و مذاق سمجھا جاتا تھا۔ اسی نے اردو سماج اور اردو تہذیب کو جنم دیا۔ جو دیکھتے دیکھتے اپنے اوصاف و امتیازات کی وجہ سے پورے ملک میں چھا گئی۔ اپنی ایک مخصوص لسانی تہذیبی پہچان بنا گئی۔ 1857 کی بربادی سے لے کر 1947 کی آزادی تک۔ امیر شخص سے لے کر فریادی تک سب اردو بولتے تھے۔ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیاں، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، حیدرآباد کے یکے تانگے والے یا الہ آباد کے صوفی سنت سب اردو کی زلف میں گرفتار تھے۔ اردو کے ترانے تھے، اردو کے گھرانے تھے۔ علم و ادب اور فکر و نظر کے حوالے سے اردو کے دبستان بھی بنے۔ دہلی اور لکھنؤ بطور خاص لیکن حیدرآباد، عظیم آباد، اکبر آباد وغیرہ بھی مراکز تھے۔ علم و ادب تہذیب و ثقافت کے گہوارے۔ وقت بدلا زمانے کی رفتار بدلی۔ پاکستان وجود میں آیا۔ وہاں کی مقامی بولیوں کے

تبھی تو شاعر نے کہا ہے:

راستو کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہئے

اب موبائیل وغیرہ پر خیریت و اخلاق کی تفصیل میں جایا جائے تو اس کا بل بڑھتا ہے جو متوسط درجہ کے لیے کبھی کبھی نا قابلِ برداشت حد تک چلا جاتا ہے چنانچہ لازمی طور پر اخلاق کا تعلق معاشیات سے ہو گیا۔ محبت متاثر ہوئی اسی طرح مہمان نوازی جو کبھی گراں بہا عطیہ تھی اب گراں گزرنے لگی ہے کہ اس نو آبادیاتی نظام میں نہ صرف گھر اور کمرے تنگ ہو گئے ہیں بلکہ دل و دماغ بھی سکڑ گئے ہیں۔ کسی مہمان کے آجانے سے نہ صرف پورے مہینے کی معیشت بگڑ جاتی ہے بلکہ گھر کے معمولات اور نظام بھی متاثر ہوتے ہیں اور مہمان برکت کے بجائے زحمت بلکہ اذیت بن جاتا ہے۔

بچپن میں مذہبی تعلیم یا اردو کی تعلیم کا بھی اپنا ایک معیار و انداز ہوا کرتا تھا۔ گھر میں دادی۔ نانی۔ والدین۔ بڑے بزرگ تعلیم و تربیت کرتے تھے۔ سلام و آداب کے ساتھ ساتھ زبان، املا تلفظ وغیرہ بھی سکھاتے تھے جس سے بچپن سے ہی شین قاف درست ہو جاتے تھے۔ آج کے والدین بیحد مصروف ہو گئے ہیں۔ اس لیے مولوی صاحب بلائے جاتے ہیں۔ معمولی سے مولوی صاحب جن کا اپنا املا اور تلفظ درست نہیں ہوتا وہ قرآن اور اردو کی تعلیم دیتے ہیں۔ بعد میں بچے انگلش کو چنگ میں بھیجے جاتے ہیں جہاں زبان کے معیار کا کوئی معاملہ یا مسئلہ ہی نہیں ہوتا اس طرح آج کا نوجوان ادھ کچری زبان اور ادھ کچری تہذیب یا ایسی بازاری تہذیب سے واقف ہوتا ہے۔ جہاں زبان تلفظ وغیرہ کا کوئی مقدمہ ہی نہیں ہوتا۔ بس کام چلنا چاہیے یہ صورت صرف اردو کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ہندی اور دوسری زبانوں اور اب تو انگریزی کے ساتھ بھی یہی ہے۔ انگلینڈ کی انگریزی اور امریکہ کی انگریزی میں زمین آسمان کا فرق آچکا ہے اس فرق نے لسانی تہذیب کو بری طرح متاثر کیا ہے۔

یہ معاملہ یا جسے جملہ بھی کہا جا سکتا ہے جارحانہ صنعت گری کا پیدا کردہ ہے جسے آج کی زبان میں بازارواد یا صارفانہ کلچر بھی کہتے ہیں، جہاں کے افکار و اقدار صرف نفع اور نقصان

سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں رشتے، تہذیب، کلچر انسانیت، وغیرہ کا کوئی مول نہیں ہوتا تبھی تو ہمارے آج کے مشاعرے نے دکھ بھرے انداز میں کہا:

دنیا اسیر حرص و ہوس اور ہمیں یہ فکر
انساں کے بیچ رشتہ جاں کس طرح رہے

یہ فکر صرف شاعر کر سکتا ہے، ایک حساس وسنجیدہ انسان کر سکتا ہے لیکن تاجر نہیں، تاجر کو صرف فائدہ چاہیے۔ فراق گورکھپوری ایک لطیفہ سناتے تھے کہ ایک بنئے سے پوچھا گیا کہ تم جنت جانا پسند کرو گے یا جہنم، بنیے نے فوراً جواب دیا کہ بھیا جہاں دو پیسے کا فائدہ ہو بنیا جسے آج تاجر یا بزنس مین یا کارپوریٹ گھرانے اپنے فائدے کے لیے دنیا کو جہنم بنانے کو تیار بیٹھے ہیں کم از کم زبان، تہذیب، کلچر، فنون لطیفہ کے لیے یہ صورتحال انتہائی مضر اور ہلاکت آمیز ہے۔

یہ صارفی اور مشینی زندگی مغرب میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ اسی لیے مغرب میں پرورش پانے والی نئی نسل، خاص طور پر اردو والوں کے بچے اردو سے نابلد ہیں اور یہ نابلدی، ناواقفیت اسی صارفیت کا حصہ ہے۔ ان کا سوال ہے کہ ہم اردو کیوں پڑھیں۔ اس سے کیا فائدہ، مغرب میں اس کی ضرورت اور افادیت کیا ہے۔ ان کا یہ سوال اتنا غیر اہم بھی نہیں کہ اس پر غور نہیں کرنا چاہیے۔ اور کچھ لوگوں نے تو یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اول اردو کو رومن رسم خط میں پڑھا اور پڑھایا جائے۔ دوم اس کو روزگار سے جوڑا جائے۔ لندن کے شاعر اور رسالہ 'صدا' کے مدیر اقبال مرزا نے اپنے بعض رفقاء کے ساتھ مل کر رومن کی حمایت میں آواز بلند کی۔ خوب خوب مخالفت ہوئی اور آواز دب گئی۔ اسی طرح کی چند اور کوششیں ہوئیں لیکن کامیابی نہیں ملی۔ مسئلہ کم وبیش آج بھی اسی انداز سے برقرار ہے اور سنجیدہ والدین بزرگ بیقرار ہیں۔

ابتدا میں مغرب کے اردو شعرا کا محبوب ترین موضوع ہجرت تھا۔ دربدری یا انتقالِ مکانی۔ جسے دیکھو مادی آسائشوں کا لطف اٹھا رہا ہے اور مہجری شاعری میں اپنا درد و کرب بھی پیش کر رہا ہے۔ اردو کی روایتی سیاست بھی کر رہا ہے اور در بدری کا رونا بھی رو رہا ہے۔ افتخار عارف۔ اشفاق حسین۔ وغیرہ اسی ہجرت اور مہجری شاعری کے حوالے سے پہچانے گئے لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب بقول شاعر:

ہم نے جب وادئ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

لیکن ڈالراور پاؤنڈ کی چمک نے یادِ وطن کو دھندلا کردیا۔کچھ دنوں کے بعد ہی دیارِغربت کے سماجی اورتہذیبی مسائل سامنے آئے خصوصاً اس وقت جب مہاجرین کی اولادیں بڑی ہوئیں ان کی تعلیم وتدریس اورتہذیب کے مسائل سامنے آئے۔مشرق اورمغرب کی تفریق سامنے آئی جو ایک خاموش اذیت ناک وتشویش ناک تبدیلی بھی اپنے ساتھ لائی۔اوروہ تھی اپنی مذہبی اورتہذیبی شناخت۔مشرق سے جڑیں کٹ چکی تھیں اورمغرب نے تہذیبی حوالوں سے مکمل طور پر قبول نہیں کیا تو نئی نسل خلا میں معلق ہوگئی۔ یہ درد بزرگوں کو سنجیدہ۔والدین کوشدت سے محسوس ہونے لگا کہ ہماری زندگی تو جیسے تیسے کٹ گئی لیکن ہماری اولادوں کی زندگی کا کیا ہوگا اس کی اصل شناخت کیا ہوگی ان کے اپنے سنسکار۔اقدار کیا ہوں گے۔مشرقی یا مغربی یا ان کا آمیزہ اور ملغوبہ۔ممتاز مفکر وشاعر بیدار بخت نے ایک نظم کہی کہ ہماری نئی نسل منی پلانٹ کی طرح ہے جو اوپر سے تو ہرا بھرا ہوتا ہے لیکن اندر سے کوئی جڑ نہیں ہوتی۔بہر حال ایک بڑا مسئلہ سامنے آیا توشعروادب کے دھارے بدلے۔افکاراقدار بدلے۔تہذیبی وتخلیقی سطح پر شاعروں و ادیبوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔کنیڈا کے شاعر اقبال حیدرتو اس حد تک سنجیدہ ہو گئے:

اب کوئی بھی مجھے نہیں درکار
اب کسی کی مجھے تلاش نہیں
درد جو تھا دوا ہے اب مجھ کو
دل ہی میرا خدا ہے اب مجھ کو
اب تو جوکچھ ہے میری ذات میں ہے

اقبال مرزا یہ کہتے ہیں:

کل نظر آئیں گے کس شکل میں معلوم نہیں
آج جو دوست ہیں

کل دوست رہیں گے کہ نہیں
یہ بھی ممکن ہے یہاں
آج جو دشمن ہیں مرے
کل وہی دوست کی صورت نظر آئیں

یہ شعر دیکھیے:

مشرق کی پرورش ہے تو مغرب میں ہے قیام
میں کشمکش میں ہوں مری مٹی کہاں کی ہے

چند اشعار اور ملاحظہ کیجیے:

ہماری نسل کو وہ کرب آگہی کے ملے
بہت سے بچوں کو دیکھا ہے خودکشی کرتے
خالد سہیل

آندھی وہ تھی زمین کے رشتے بھی کٹ گئے
اکھڑی ہوئی جڑوں سے لپٹ آئے اجنبی
ولی عالم شاہین

آج اپنے گھر میں قید ہیں ان سے حجاب ہے
جو گھر سے بے نیاز ہوئے گھر نہیں گئے
ساقی فاروقی

مثالیں اور بھی ہیں جن کی تفصیل میں کیا جاؤں۔ادھر میں نے مغرب کے اردو رسالوں میں کئی کہانیاں بھی ایسی پڑھی ہیں جن میں اصل مسئلہ شناخت اور پہچان کا ہی ہے۔یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے اپنی تہذیب اپنی معاشرت اور اپنے سماج میں سانس لینے کا۔زندگی کا جو حقیقی لطف ہے وہ اپنوں کے بیچ کا ہی ہے اپنے رسم رواج۔تیج تہوار۔اپنے موسم اور سب سے بڑھ کر اپنی مادری زبان۔لیکن اس بات کو وہی سمجھ سکتا ہے جو ان عناصر کی نزاکت اور قدر و قیمت کو سمجھتا ہو، جو کاروباری ہو اور جس کی سوچ بنئے کی طرح ہو وہ ان چیزوں کو بھی

صرف نفع ونقصان کے بارے میں ہی سوچتا ہے۔اس کے لیے پوری دنیا ایک بازار ہے اور اس دنیا کے لوگ اس کے گراہک۔لیکن یہ دنیا سنجیدہ،حساس اور سنسکاروالوں سے چل رہی ہے۔ایسے لوگوں کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''وہ لوگ جو زندگی میں تخلیقی کام کرتے ہیں وہ کام اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک معاشرہ سے ان کا گہرا تعلق نہ ہو۔جب تک اپنی سرزمین اور اپنے لوگوں سے ان کی محبت جنون تک نہ ہو۔''

لیکن آج کے بڑھتے ہوئے بازارواد۔مارکٹ کلچر۔ضرورت سے زیادہ حاوی ہوتے ہوئے نفع ونقصان نے انسانی جذبات واحساسات کے سامنے خطرے پیدا کر دیے ہیں۔اس کی آدمیت اور اشرفیت کو خطرہ ہے۔اس کے فکر وفن کو خطرہ ہے رنگ و چنگ کو خطرہ ہے۔حرف و صورت کو خطرہ ہے اور امکانات ہیں کہ اگلی صدی تک یہ خطرات اور بھی سنگین ہو جائیں گے اس لیے کہ اس پورے نظام پر جس نوع کے سرمایہ دارانہ نظام کا قبضہ ہے جو اس کو تجارت پسند کی طرح استعمال کر رہے ہیں اور کائنات کی ایک شے کو صارفیت کے حوالے سے انتہائی غیر جذباتی غیر انسانی انداز میں انجام دے کر حیات کو اس کے اقدار کو سود وزیاں کو تول کر ایک منڈی میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔انسان جو اشرف المخلوقات ہے۔مفکر ہے۔دانشور ہے۔دیدہ ور ہے۔ادیب ہے۔شاعر ہے وہ سب کہ سب اس تجارتی بہاؤ میں بہہ جائیں اور اس تیز رفتار زندگی کا حصہ بن کر گھاس کوڑے کی طرح ہو جائیں تاکہ ان کی فکر کی گرمی۔خون کا ابال۔جذبہ کا اچھال۔مزاحمت۔احتجاج اور انقلاب میں نہ بدل جائے۔یہ ایک منصوبہ بند خفیہ جنگ ہے۔اثبات ونفی کے درمیان۔آگہی اور گمراہی کے درمیان۔اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان اور یہ جنگ نئی نہیں ہے بس ذرا شکل بدلی ہوئی ہے۔فیض نے کہا تھا:

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

مسائل اور بھی ہیں انسانی رشتوں کے مسائل۔دلتوں کے مسائل۔عورتوں کے مسائل۔ بچوں اور موسموں کے مسائل غرضیکہ مسائل ہی مسائل اور ان سب پر حاوی تشدد کے مسائل ان پر بھی باتیں کی جانی چاہیے اور ضرور کی جائیں گی۔ یہ تو صرف اشارے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ جیسا انسانی معاشرہ ہوتا ہے ویسا ہی اس کا کلچر۔زبان وادب، کلچرلٹریچر آسمانی چیزیں نہیں ہیں یہ سب کے سب زمینی ہیں اور انسان کے حرکت وعمل، تحریک وتنظیم اور تضاد وتصادم سے ہی اپنی تشکیلِ نو اور تخریبِ نو کی صورتیں اختیار کرتی ہیں۔شاعر و دانشوران امور پر سوچ رہا ہے اور مزید سوچے گا۔ یہ کانفرنس بھی اسی سوچ اور غور فکر کا نتیجہ ہے۔ژاں پال سارتر نے کہا ہے''اگر ہم نے لکھنے کا پیشہ اختیار کیا ہے تو ہم میں ہر شخص ادب کے سامنے جواب دہ ہے'' یہاں ادب سے مراد صرف ادب نہیں، صرف زبان بھی نہیں بلکہ تاریخ ہے اور تاریخِ انسانیت بھی۔جس پر ہم سب کو سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔

○

ازبکستان میں اردو تدریسی اور تحقیقی سرگرمیاں

ڈاکٹر سراج الدین نورمتوف

چیئرمین، ساؤتھ ایشین لینگویجز ڈپارٹمنٹ، تاشقند

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ازبکستان کی آزادی سے قبل اردو شناسی کا جو دور تھا اسے دراصل سنہرا دور کہا جا سکتا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے شعبے میں رحمان بیردی محمد جانوف اور نبی محمدوف جیسے بڑے استاد بڑی ذمے داری کے ساتھ شاگردوں کی تیاری کا کام انجام دینے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے تھے۔ ان کی انتھک کوششوں سے اس میدان میں ڈاکٹر فاتح تیشہ بایف جو بعد میں ازبکستان کے United Kingdom اور USA میں سفیر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور صورت میر قاسموف، جو ہمارے ملک کا ہندوستان میں پہلے سفیر ہوکر ہمارے دونوں ممالک کے درمیان روایتی دوستی کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس کام میں محترم پروفیسر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی صاحب کافی تعاون تھا، انھوں نے ہمارے شعبۂ اردو اور ہندی میں پڑھانے کے مقصد سے Visiting Professor کی حیثیت سے تاشقند تشریف لائے تھے۔

حالانکہ اردو زبان و ادب پر مذکورہ بالا امور بیسویں صدی کے درمیان سے لے کر ہمارے یہاں مروج ہوتے ہوئے بے انتہائی کامیابیاں حاصل کر چکی تھے، تاہم ان کا اصلی ارتقا ملک کو آزادی ملنے کے بعد ہی ہوا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس کی بے لوث خدمات اور مقامی روایتی سلسلوں کا سہارا لے کر آج کل اردو زبان و ادب کی طرف پرخلوص توجہ بڑے پیمانے پر بڑھ گئی ہے۔

اس کی جیتی جاگتی مثال ڈاکٹر تاش مرزا حال مرزا یف کی اردو ازبیک لغت اور اردو روسی لغت ہے۔ اس لغت کی تیاری کا کام بہت تاخیر سے ہوا تھا، ڈاکٹر تاش مرزا نے پاکستان میں زیر اشاعت 22 جلدوں پر مشتمل لغت سے استفادہ کیا تھا، اس کے علاوہ انھوں نے وافر مواد کام میں لانے کی کوشش کی تھی۔ خاص طور پر انھوں نے ضروری توجہ ان الفاظ کی طرف دلائی، جو 'کاری' لاحقہ سے بنائے جاتے ہیں مثلاً بیمہ کاری، ٹائپ کاری، سفارت کاری وغیرہ۔ مذکورہ الفاظ اردو زبان کے ذخیرے میں بالکل نئے شمار کیے جاتے ہیں جن کی علمی کتابوں میں Neologizm کے نام سے تعریف کی جاتی ہے۔ اس لیے یہ لغت دوسرے لغات کے مقابلے میں تدریسی کام کے لیے نہایت مفید ہے۔ انصارالدین ابراہیموف کی اردو ازبیک لغت جو پاکستان سے چھپی ہے اور طلبا و اساتذہ کے لیے نہایت مفید ہے۔ افسوس کہ ڈاکٹر انصارالدین 8 سال کی مختصر مدت میں دو ڈگریاں حاصل کیں۔ دونوں ڈگریاں بابرنامہ اور توزک بابری کی متنی تحقیق و تنقید سی متعلق تھیں۔ Ph.D کی ڈگری بابرنامہ میں ہندوستانی ماخذ کے الفاظ اور D.Lit کی ڈگری بابر کی تصانیف کے متن میں خارجی زبانوں سے مستعار الفاظ کا تنقیدی مطالعہ کرنے پر دی گئی تھی۔

جہاں تک تحقیقاتی کام کا تعلق ہے، تو پروفیسر آزاد شماتوف کی دکنی اردو کی تاریخی لغت ان کا خاص کارنامہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ دراصل اردو کتابیں اردو زبان و ادب کے تاریخی ادوار پر روشنی ڈالنے والی علمی اور نظریاتی کڑی مانی جاسکتی ہیں۔

لہٰذا جملہ امور کے مدنظر C.I.S کے ممالک میں ازبکستان کو باقاعدہ اردو کا ایک اہم مرکز تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر آزاد شماتوف کے بارے میں خاص طور پر بات کرتے ہوئے

یہ کہنا ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے درمیان ان کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر مسعود حسین خاں کی نگرانی میں ملا وجہی کی سبرس پر تحقیقی کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس وقت سے اب تک پروفیسر آزاد شماتوف بلاتوقف 35 سال تک شعبے کے صدر رہے۔ دریں اثنا انھوں نے چند Monograph بھی تالیف کیے، جو ماسکو اور تاشقند سے چھپ چکے ہیں۔ فی الحال اسی سال گرمیوں میں اپنے شاگرد کمولہ ایرگاشیوا کی تکنیکی مدد سے دکنی اردو کی تاریخی لغت کو اشاعت کے مرحلے تک پہنچایا جس کا آغاز 40 سال قبل ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس کی تیاری میں 70 سے زیادہ دکنی میں لکھی قدیم کتابوں اور متعدد مخطوطات میں استعمال عربی، فارسی، ترکی، برج بھاشا، سنسکرت، مراٹھی اور دیگر زبانوں کے الفاظ مع اقتباسات روسی زبان کے ترجمے کے ساتھ نقل کیے ہیں۔ اس سے اہم بات یہ ہے کہ ان الفاظ کی تحقیق کرنے کے دوران مترادف اور ضد الفاظ بھی علیحدہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ایسی لغت ابھی تک ہندوستان اور پاکستان کو چھوڑ کر کسی اور ملک میں تالیف نہیں کی گئی ہے۔

اب رہی بات اردو سے ازبیک زبان میں ممتاز ہندوستانی ادیبوں اور شعرا کی کتابوں اور کہانیوں کے ترجمے کی تو ہماری نظر میں متعدد کاوشیں نمایاں ہیں جن کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کام میں بھی پروفیسر قمر رئیس اور مشہور ادیب منظر سلیم جیسے ہمارے ہندوستانی استادوں کا نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ قمر رئیس نے اگر ازبیک کلاسکی شاعری کے نمونوں کے لیے بے نظیر ترجمان کا کردار ادا کیا تو منظر سلیم نے C.I.S. میں بلاشبہ معروف کتاب بابر کا اردو میں نہایت عمدہ ترجمہ کیا اور ازبیک سرکار نے ان کو علی شیر نوائی کے اعزاز سے سرفراز کیا تھا۔ ان دونوں استادوں کے سلسلے کو ماہر ترجمان ڈاکٹر انصارالدین ابراہیموف نے جاری رکھا۔ انھوں نے کرشن چندر کے افسانوں کا ایک مجموعہ ازبیک میں ترجمہ کر کے بعنوان 'دادر پل پر کھڑے بال بچے' 1999 میں شائع کیا۔ ساتھ ان کی کاوشوں سے کچھ ہندی ادیبوں کی کہانیوں کا ترجمہ بھی مقبول ہوا ہے۔ دیگر ماہرین ترجمہ میں غفور رحمستلایف اور تاش مرزا حال مرزا ایف کے نام بھی ہیں، جنھوں نے خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی جیسے ممتاز ادیبوں کی تصانیف کا ازبیک ترجمہ کر کے شائع کیا۔

اوپر دی گئی جانکاری میں عموماً سبکدوش اساتذہ کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں بعض کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان اساتذہ کے جوان شاگردوں میں ڈاکٹر مہیا عبدالرحمانووا کا نام قابل ذکر ہے، جو آخری دہائیوں میں بہت مفید تدریسی اور تحقیقی سرگرمیوں میں شامل ہیں۔ چنانچہ 2002 میں ان کا ایک دلچسپ علمی مقالہ Compound Sentence Syntax of Urdu and Hindi کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے نہایت سعی و جدوجہد سے مرحوم رحمان بردی محمد جانوف کی اردو کی درسی کتاب کا روسی سے ازبکی ترجمہ کا کام مرحوم انصارالدین ابراہیموف کے تعاون سے مکمل کرنے اور شائع کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ بطور اضافہ ڈاکٹر مہیا عبدالرحمانووا بہت طویل عرصے سے غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی سے وابستہ رہ کر متعدد طویل ومختصر مقالے بھی تالیف کیے۔ جہاں تک ترجمہ کا سوال ہے توانھوں نے بھی مرحوم پروفیسر قمر رئیس کی قیادت میں بابر کی غزلوں اور رباعیوں کا ترجمہ اردو قارئین کے لیے کتابی شکل میں دلی سے 2002 میں شائع کر کے لوگوں کا دل جیت لیا۔

○

اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر سماجی اقدار

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

چودھری چرن سنگھ، یونیورسٹی، میرٹھ

بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ ہر شئے تغیر پذیر ہوتی جاتی ہے۔ ادب سماج کا عکاس ہوتا ہے لہٰذا سماج کی تبدیلی کے اثرات ادبی تخلیقات میں دکھائی دیتے ہیں۔ سماج دراصل انسانی گروہ کے اعمال وافعال کا آئینہ ہوتا ہے۔ سماج کی اپنی راہیں ہوتی ہیں۔ صحیح وغلط کے پیمانے ہوتے ہیں۔ اچھی باتیں اور اچھے کام سماج میں سکون، اطمینان، خوش حالی اور امن وامان کے قیام کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے برعکس غلط باتیں اور غلط کام سماج میں خلفشار، انتشار، بدامنی اور تشدد کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا سماج اپنے رہنے والوں پر بعض شرائط اور پابندیاں عائد کرتا ہے جن کے پورا کرنے کا معاملہ غیر موکدہ نہیں ہے کہ آپ ادا کریں گے تو اچھا نہیں تو کوئی بات نہیں بلکہ بالکل موکدہ کی طرح پورے علاقے، محلے، سماج پر عائد ہوتی ہیں کہ ان کے کرنے سے امن وامان کا قیام، ماحول کو بہتر بناتا ہے جبکہ عائد پابندیوں کی خلاف ورزی، معاشرے میں بے اطمینانی اور اضطراب پیدا کرنے کا عمل ہے۔

جیسے جیسے زمانہ بدلا، صدی تبدیل ہوئی۔ بیسویں صدی قدیم شمار ہونے لگی اور اکیسویں صدی کو نئی صدی کہا جانے لگا۔ صدی کی تبدیلی بہت بڑی تبدیلی ہوتی ہے۔ دونوں صدیوں کے درمیان کا 8-10 سال کا عرصہ یعنی 1995 سے 2005 تک کا زمانہ عجیب زمانہ ہوتا ہے۔ یہ زمانہ تغیر کا راست اثر لیتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جو دونوں صدیوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں تغیر و تبدل سماج کو مقتضے، حلول پذیر ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

صدی کی تبدیلیاں [مثبت و منفی سماج کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہیں۔ سماج کی بعض اقدار تو اس قدر تیزی سے تغیر پذیر ہوتی ہیں کہ یہ علم ہی نہیں ہو پاتا کہ یہ کب جائز نہیں تھی اور کب ان کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دے دیا گیا۔

اکیسویں صدی کی ابتدا سے قبل ماہرین کمپیوٹر کا خیال تھا کہ کمپیوٹر Collaps کر جائے گا، سارے اعداد و شمار زیرو ہو جائیں گے اور کمپیوٹر کے سبب جدید آلات۔ نقل و حمل کے ذرائع خصوصاً ہوائی جہاز وغیرہ، مشینیں، کمپیوٹر کا استعمال کرنے والے سارے شعبے اچانک کام کرنا بند کر دیں گے۔ یہ مانا جا رہا تھا کہ یہ نئی صدی کوئی بڑی آفت لے کر آنے والی ہے۔ یہی نہیں بین الاقوامی شہرت یافتہ کئی نجومیوں نے اعلان کر دیا تھا کہ 2012 میں قیامت بھی آنے والی ہے۔ لہٰذا بیسویں صدی کے اواخر میں نئی صدی کے خطرات اور خدشات سے انسانی دل کمزور ہونے لگے تھے۔ انسان نے کلون کی ایجاد سے لے کر کمپیوٹر کی زندگی کے ہر شعبہ پر قبضہ کر لینے تک نئی صدی کو ایک مختلف عہد کے طور پر پیش کیا ہے۔ انسانی سماج میں بے انتہا تغیر آیا۔ انسانی معاشرہ بھی مشینی ہوتا چلا گیا۔ جذبات، رشتے، تعلق، پڑوس، معاشرہ، سماج وغیرہ کا پاس اور احترام ختم ہوتا گیا۔ اپنی بات، اپنا فیصلہ اور اپنا اقدام صحیح اور بہتر، جبکہ دوسرے کی ہر بات غلط۔ یہیں سے خود پرستی کی ابتدا ہوتی ہے۔ خود پرستی سے فرقہ پرستی، علاقہ پرستی اور مذہب پرستی سماج میں برق رفتاری سے پھیلنے لگتی ہے۔ اکیسویں صدی کی ابتدا کو ابھی محض 13 رسال کا قلیل عرصہ گزرا ہے۔ لیکن تبدیلی اور تغیر نے اکیسویں صدی کی جو شبیہ پیش کی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اکیسویں صدی کے اسی عرصے میں سماج میں ایسی ایسی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جنھیں کم کر کے دیکھنا غیر دانش مندی ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بعض تبدیلیاں تو بیسویں

صدی سے ہی وقوع پذیر تھیں۔ یہ سچ ہے لیکن بیسویں صدی کا اواخر ہو یا اکیسویں صدی کا اوائل، سماج تغیر و تبدل کے غیر معمولی دور سے گزر رہا ہے۔ سماج میں در آنے والی ان تبدیلیوں کو ذیل میں بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر جہاں تک سماج کی عکاسی کا ادب سے تعلق ہے تو یہ بات سب جانتے ہیں کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور جہاں تک اکیسویں صدی میں افسانے کا معاملہ ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی کی بمشکل تمام ساڑھے تیرہ سال کی مدت میں سماج میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔

2000 سے 2014 کے وسط تک اردو میں جو افسانہ لکھا جا تا رہا ہے اسے ہم دو واضح زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

I۔ اکیسویں صدی میں اپنا افسانوی سفر شروع کرنے والے افسانہ نگار جن میں اس مدت میں شائع ہونے والے افسانہ نگار اور اس مدت میں پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہونے والے افسانہ نگار شامل ہیں۔

II۔ دوسرا زمرہ ایسے افسانہ نگاروں کا ہے جو 2000 سے قبل افسانوی دنیا میں مقبول ہو چکے تھے اور جو عمر کی آخری منزل پر ہیں۔

لیکن یہاں دوسرے زمرے کے افسانہ نگاروں کے بجائے صرف زمرہ اول کے افسانہ نگاروں کے افسانوں پر گفتگو ہوگی۔ دراصل اکیسویں صدی نے انسانی سماج پر جو اثرات مرتسم کیے وہ خاصے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس عہد میں پہلے سے رائج کئی طرح کی سماجی کیفیت و حالت اور تغیر کو شدت بخشنے کا کام کیا ہے اور بعض نئی چیزیں سامنے آئی ہیں۔ مثلاً عالمی تشدد، فرقہ پرستی، علاقائیت، ذات، برادری واد، مذہبی حب الوطنی، دہشت گردی، مذہبی دہشت گردی، جنسی تفریق، فسادات، فطرت کا تحفظ، سماجی اقدار کی شکست و ریخت، اخلاق کا انحطاط۔ یہ اور اس جیسی متعدد لفظیات اور اصطلاحیں ہیں جو آج نہ صرف رائج ہیں بلکہ انھوں نے سماج کے تہذیبی جسم اور ثقافتی اقدار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اکیسویں صدی کے اردو افسانے نے سماج میں رونما ہونے والے ان تغیرات کو بخوبی پیش کرنے کا کام کیا ہے۔

اکیسویں صدی کے سماج کو ہمارے افسانہ نگاروں نے بحسن و خوبی پیش کیا ہے۔ شوکت

حیات، بشیر مالیر کوٹلوی مشرف عالم ذوقی، ترنم ریاض، نگار عظیم،، ایم مبین، اشتیاق سعید، فراق مرزا، شائستہ فاخری، ذکیہ مشہدی، اختر آزاد، ابرار مجیب، افشاں ملک، رینو بہل، مسرور تمنا، سلمیٰ صنم، نور الحسنین، خورشید حیات، مظہر سلیم، پرویز شہر یار، مہتاب عالم پرویز، مہ جبیں نجم، کہکشاں پروین، غزالہ قمر، رخشندہ مہدی، شاہد اختر، مجیر احمد آزاد، احمد صغیر، اقبال مہدی، سیدہ نفیس بانو شمع، شکیل جاوید۔ قمر قدیر ارم۔ نصرت شمسی، عذرا نقوی، قاسم خورشید، اشفاق برادر، معین الدین عثمانی، فرقان سنبھلی، وسیم حیدر ہاشمی، تسنیم فاطمہ۔ تبسم فاطمہ اور دیگر کے یہاں اکیسویں صدی کے سماج کا تغیر اور تبدل عمدگی سے موضوع کے سانچے میں ڈھل کر فن کی آنچ سے پگھل کر افسانے کی شکل میں سامنے آ گیا ہے۔

درج بالا موضوعات ہی نہیں اکیسویں صدی میں انسانی کلون، سائنسی ترقیات اور الیکٹرونکس کا ہر دم وسیع ہوتا جہاں۔ اور ان سب کے نتائج کے طور پر رشتے ناطوں، آپسی میل جول، پڑوس، معاشرہ، سماج، ملک۔ یہ سب کس طرح سے زندگی میں نہ صرف معنی بدل رہے ہیں بلکہ ان کی ساخت تبدیل ہو رہی ہے۔ منفی اقدار کس طرح اب مثبت اقدار میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کا اردو افسانہ ان سب کو فن کاری کے ساتھ اس طور پیش کرتا ہے کہ سماج کو آئینہ بھی دکھاتا ہے اور فن افسانہ کے تقاضوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔

سماجی اقدار کا زوال:

ہر سماج اپنے رہنے والوں پر کچھ پابندیاں اور کچھ بندشیں لگاتا ہے۔ حق، ناحق، جائز، ناجائز، غلط۔ صحیح، کے پیمانے ہوتے ہیں سماج میں رہنے والے ہر فرد کو ان اصولوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ جو سماجی اقدار اور اصولوں کے مطابق زندگی گزارتا ہے اسے اچھا آدمی اور شریف کہا جاتا ہے اور جو ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر من موجی زندگی گزارتا ہے اسے سماج میں برا سمجھا جاتا ہے۔ ہر سماج کے اصول وضوابط اور صحیح وغلط کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔ ایک بات ایک سماج میں پسندیدہ تصور کی جاتی ہے جبکہ وہی بات دوسرے سماج کے لیے معیوب ہوتی ہے۔ سماج کی اس تفریق کے مختلف اور متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ فیشن، ترقی وتنزلی، مذہب

بے زاری اور مذہب پسندی، روایت کا احترام اور روایت سے انحراف، احساسِ برتری اور احساسِ کمتری وغیرہ ایسے اسباب ہیں جن کے باعث مختلف سماجوں میں مختلف باتوں کے الگ الگ معیار ہوتے ہیں۔ شوکت حیات کا افسانہ'' میت'' سماجی اقدار کے زوال کا عکاس، خوبصورت افسانہ ہے۔ افسانہ میں آمر درّانی، شہر کی مشہور و معروف سیاسی اور سماجی شخصیت ہے۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ رشتہ دار، تعلق دار، دوست، احباب، آس پڑوس والے آ رہے ہیں۔ جنازہ گھر میں رکھا ہے۔ امام صاحب بھی آ چکے ہیں۔ گھر کے باہر گاڑیوں کی قطار لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن آمر درّانی تدفین کے لیے ابھی کچھ اور خاص لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ بار بار شہر کے تمام معززین کا شمار کیا جاتا ہے کہ کون کون آیا، اور کون ابھی تک نہیں آیا ہے۔ صبح سے شام ہونے کو آئی لیکن جنازہ اٹھایا نہیں گیا ہے۔ امام صاحب پہلو بدل بدل کر تھک چکے ہیں لیکن آمر درّانی چاہتے ہیں شہر کے سبھی لوگ آ جائیں، کاروں کا طویل قافلہ ہو۔ وہ اپنی بیوی کی موت اور جنازے کو بھی سیاسی قوت کی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے عہد نے ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں ہم کسی بھی بات کا سودا کر سکتے ہیں، جہاں ہم اپنی زندگی کے کسی بھی لمحے کو کیش کر سکتے ہیں، جہاں ہم فلمی دنیا کی طرح، ہر کام کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ کچھ بھی حقیقی نہیں۔ کوئی رشتہ سچا نہیں۔ کوئی جذبہ صحیح نہیں۔ بات صرف ایک فرد کی ہو تو وہ خراب ترین ہونے کے باوجود کنارہ کش کرنے لائق تو ہوتی ہے لیکن جب کسی بات کا تعلق ایک فرد نہیں، افراد، بلکہ پورے سماج سے اور عالم انسانیت سے ہو تو پھر کیا ہو..... کہانی ایک گھر کی ہی نہیں ہے، کہانی میاں، بیوی اور اس کے دوست کی بھی نہیں ہے۔ کہانی وقت کی بھی ہے جو کبھی نہیں رُکتا..... کہانی پورے سماج کی ہے جو کبھی جمود پذیر نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کا خاصی مدت تک انتظار نہیں کرتا، لیکن وقت اور سماج دونوں رکے ہوئے ہیں۔ انتظار ہو رہا ہے:

''مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔

آخر کیا سوچ رہے ہیں آمر درانی صاحب..... کن لوگوں کا انتظار ہے اب ان کو..... شرعاً تو صرف سگے رشتہ داروں کا انتظار کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کی

بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مناسب وقت پر تدفین مستحسن ٹھہرتی ہے۔ اب مزید
تاخیر مناسب نہیں۔ سوچوں میں مستغرق مولانا ظہر کے بعد سے لگاتار انتظار
کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ نقاہت چہرے سے جھلک رہی تھی۔ بدن سیدھا
کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کمر اور کولہے کے درد سے بے چینی میں چھوٹی کرسی پر
بار بار کروٹیں بدل رہے تھے۔ گھٹنے بیٹھے بیٹھے جام ہو گئے تھے۔ بوجھل قدموں
سے مولانا دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آمر درانی کے پاس آئے "جنازے کو
رخصت کی اجازت دیجئے حضور ... ابھی کئی مراحل طے کرنے ہیں۔ تاخیر ہوتی
چلی جارہی ہے ...!" [میت، شوکت حیات، مجموعہ گنبد کے کبوتر، ص 70]

سماجی اقدار کی شکست و ریخت کا نوحہ، محمد بشیر مالیر کوٹلوی کی کہانی 'اہل کتاب' بھی ہے۔ یہ ایک مسجد کے امام افضال ملک اور ان کے بیٹے مظہر کی کہانی ہے۔ افضال ملک کی دو کنواری بیٹیاں اور بیمار بیوی ہے۔ مظہر بے روزگاری سے پریشان غیر ممالک جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ ہالینڈ سے اس کے ایک دوست نے کام کا آفر دیا۔ ایجنٹ سے چار لاکھ میں سودا طے ہوا۔ دو لاکھ ابھی اور دو لاکھ تنخواہ سے دینا ہے۔ افضال ملک کے لیے دو لاکھ بھی ناممکن ہے۔ ناچاہتے ہوئے بھی جس مکان میں وہ رہ رہے ہیں اسے گروی رکھ کر دو لاکھ روپے ایجنٹ کو دے کر مظہر ہالینڈ چلا جاتا ہے۔ مظہر کی ماں بیمار پڑتی ہے۔ مظہر پیسے بھیجتا ہے۔ بڑے اور اچھے اسپتال میں علاج ہوتا ہے۔ اسی دوران مظہر کے خطوط کا آنا رک جاتا ہے۔ دو ماہ تک کوئی خیر خبر نہیں۔ یہاں سب پریشان ہیں۔ پھر ایک دن مظہر بتاتا ہے کہ وہ جس بیکری پر کام کرتا تھا، وہاں چھاپہ پڑا، پولس پکڑ کر لے گئی اور وہ دو ماہ جیل میں بند رہا۔ اس کے دوست نے ضمانت لی۔ ہر قدم پر مدد کی۔ اس دوران مظہر، اپنے والد سے اپنی شادی کی بات کہتا ہے۔ والد کہتے ہیں۔ بیٹے لڑکی مسلمان ہو۔ صوم وصلوۃ کی پابند ہو۔ کم از کم اہل کتاب ضرور ہو۔ اہل کتاب سے نکاح جائز ہے۔ مظہر فون پر بتاتا ہے کہ اس نے شادی کر لی اور یہ کہ وہ اہل کتاب ہے لیکن مظہر جب اس کا نام ڈیسوزا بتاتا ہے۔ ڈیسوزا اس کا دوست، جس نے اسے ہر مصیبت سے بچایا۔ وہی ڈیسوزا۔ مولانا افضال ملک کے پیروں تلے کی زمین نکل جاتی ہے۔

محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے عمدگی سے کہانی کے تانے بانے بنے ہیں کہانی کا آخری منظر ملاحظہ کریں:

''بھئی!.....وہ.....!ہماری بہو دیکھنے میں خوبصورت ہے نا.....!؟

مظہر نے جواب دیا''جی!..... ابو.....!''

آنکھیں گھما کر،تھوڑا سہم کر پھر سوال کیا'' وہ اہل کتاب تو ہے نا.....!''

جواب پھر دو لفظوں میں ملا''جی.....ابو.....''

وہ ساری خوشیاں الفاظ میں سمیٹ کر بولے'' ارے خوش کر دیا بیٹے..... اب جلدی سے بہو کا نام بتا.....!!''

مظہر خاموش تھا،وہ دل ہی دل میں دلہن کے مسلمان ہونے کی دعا مانگنے لگے۔

''میاں جلدی بتاؤ!.....یہاں دل اچھل کر حلق میں آنے کو ہے.....!!''

وہ بے صبری سے بولے۔

دوسری جانب مظہر روہانسا ہو کر بولا اس کا.....اس کا.....نام.....مائیکل ڈیسوزا.....!!

[اہل کتاب،مجموعہ چنگاریاں،محمد بشیر مالیر کوٹلوی،ص[21-22

اخلاقی زوال :

موجودہ صدی میں اخلاق و کردار کا کوئی معیار نہیں رہ گیا ہے۔ صاحب اخلاق اور صاحب کردار لوگوں کی کمی میں اضافہ ہو رہا ہے۔غیر اخلاقی باتیں،فیشن کے نام پر جائز قرار دی جارہی ہیں۔اخلاقی زوال کے اسباب وعلل پر غور کریں تو پھوہڑ فلمیں اور ٹی وی کی دنیا،فیشن، دولت کی بہتات، مذہب بے زاری سامنے آتی ہے۔گھر کے سبھی افراد ٹی وی کے شوز دیکھتے ہیں۔ان میں آج کل پھوہڑ اور پھکڑ پن کے علاوہ عریانیت اور جنسیت کی بھرمار ہوتی ہے اور ہر روز نشر ہونے والے ایسے سیریل اور فحاشی پروسنے والے ریئالٹی شوز سے اخلاق و کردار پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔رضیہ فصیح احمد کا افسانہ''ہنسی کی بات'' ایسا ہی ایک افسانہ ہے۔

''ہنسی کی بات'' اخلاقی زوال کو لفظوں کا جامہ پہنانے والا ایک خوبصورت افسانہ ہے۔

یہ افسانہ بھی مغرب کی کھوکھلی قدروں کو بے نقاب کرتا ہے۔ پورا افسانہ بڑے پانی جہاز کا افسانہ ہے۔ یہاں ایک جوڑا مائیکل اور آرلین ہے۔ راوی یعنی افسانہ نگار بھی کہانی میں موجود ہے۔ جہاز میں پچاسوں کمرے ہیں، ریسٹورینٹ ہے۔ لائبریری ہے۔ موج مستی کا سارا سامان ہے۔ مائیکل سیاہ فام ہے اور آرلین سفید۔ دونوں کے جوڑے کو سبھی حیرانی سے دیکھتے ہیں۔ دونوں کی زندگی بہت مختلف ہے۔ آرلین کو ہیرے جواہرات اور بیش قیمت پتھر خریدنے کا شوق ہے۔ نمائش دیکھنے کا جنون ہے جبکہ مائیکل کو مچھلیوں کا بے حد شوق ہے۔ یہ مچھلیاں کم عمر لڑکیاں ہیں۔ آرلین جانتی ہے پھر بھی بے پرواہ سی رہتی ہے اور یہ کہتی ہے اپنے اپنے شوق ہیں۔ راوی ایک بار لائبریری میں مائیکل کو ایک لڑکی کے ساتھ لپٹے ہوئے دیکھ لیتی ہے، آرلین سے بتاتی ہے۔ اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آرلین جب راوی سے زیادہ بے تکلف ہو جاتی ہے تو رازدارانہ طور پر ایک بات یہ کہتے ہوئے بتاتی ہے کہ تم سن کر ہنسو گی:

''یہ جو میرے ساتھ کالیا ہے، یہ میرا شوہر نہیں ہے، بوائے فرینڈ بھی نہیں ہے۔ کرایہ بچانے کے لیے ہم نے ایک کیبن لے لیا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہے سنگل کا کرایہ کتنا زیادہ ہوتا ہے۔ پھر کینیڈا کا ڈالر بھی تمہارے امریکن ڈالر سے ہلکا ہے، اس لیے ہمیں اور بھی مہنگا پڑتا ہے۔''

اور جب راوی آرلین کو اس کے شوہر کے کسی لڑکی سے لپٹے ہونے کے بارے میں بتاتی ہے تو آرلین کا ردعمل کچھ یوں ہوتا ہے:

''بھئی میں نے تمہارے میاں کو دیکھا تھا ذرا۔۔'' میں ہچکچائی۔'' ہاں ہاں کہو نا۔ کسی کے ساتھ بوسہ بازی میں لگا ہوگا۔ تو بھئی مجھے کیا۔ میرا میاں تو ہے نہیں اور دیکھو نا رات کو ایک کیبن میں سوتے ہیں۔ ہم نے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ بینکی چینگی نہیں ہوگی..... اس لیے ڈیڑھ دو بجے آ کر چپ چاپ پڑ کر سو جاتا ہے۔ اب دن میں بے چارہ یہ بھی نہ کرے! وہ پھر ہنسنے لگی۔''

[ورثہ اور دوسری کہانیاں: افسانہ ہنسی کی بات، رضیہ فصیح احمد، ص60]

افسانے میں خاص بات یہ ہے کہ آرلین کے لیے جو بات ہنسی کی ہے وہ راوی کو ہنسا

نہیں پاتی ہے۔ افسانہ نگار نے یہ فطری اظہار کیا ہے کہ اس کا تعلق تو مشرق سے ہے اور مشرقی تہذیب ایسی باتوں پر ہنسنے کی روادار نہیں۔ یہی فرق تو ہے جو مغرب اور مشرق کو الگ کرتا ہے کہ جو وہاں روا ہے، یہاں معیوب ہے، غیر مہذب ہے جس پر وہاں لوگ ہنستے ہیں وہ یہاں عبرت کی بات ہے۔ بہت ہی معنی خیز اور موثر افسانہ ہے۔

طاہر نقوی کی کہانی ''فاریسٹ آفیسر'' بھی اس زمرے کی کہانی ہے۔ کہانی کا راوی یعنی صیغۂ واحد متکلم کہانی کا مرکزی کردار ''فاریسٹ آفیسر'' ہے۔ اس کا تبادلہ ایسی جگہ ہو جاتا ہے جہاں کئی بڑے بڑے، جنگلی برآمدات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت طاقت ور ہیں۔ فاریسٹ آفیسر نے وہاں جا کر اپنی ایمانداری، رعب اور کردار سے سب کو چونکا دیا ہے۔ لوگ اسے دھمکی دیتے ہیں۔ اس سے آفس میں بھی اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ بالآخر فاریسٹ آفیسر کا سارا اخلاق، کچھ اس طرح زوال پذیر ہوتا ہے کہ وہ ڈاک بنگلے کے چوکیدار کی بیوی کے حسن کے جال میں تھوڑی دیر کے لیے پھنستے ہیں اور جنگل کی لکڑیاں کاٹ لی جاتی ہیں۔ کہانی کا آخری حصہ ملاحظہ کریں:

> ''جب میں آفس سے ریسٹ ہاؤس پہنچا تو نوری میرے بیڈ روم کو ٹھیک کر رہی تھی۔ اس نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ میں اس کے بدن کے نشیب و فراز میں کھو گیا۔ وہ میرے کمرے سے جاتے جاتے ٹھہر گئی۔ شاید میری نظروں کا پیغام اس تک پہنچ گیا تھا۔ وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہونے پایا۔ میرے پاس سے وہ گھبرا کر اٹھی اور فوراً غائب ہو گئی۔ نہا دھو کر حسب پروگرام میں سائٹ کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں پریشان ہو گیا۔ بہت سارے درخت کاٹے جا چکے تھے.....!!''

طاہر نقوی نے بڑی فن کاری سے فاریسٹ آفیسر کی ایمانداری، سرکاری رعب اور اصول پسندی کی کایا پلٹ کی ہے۔ یہ اخلاقی زوال ہی کا معاملہ ہے کہ آج ہم کسی نہ کسی معاملے میں خود کے کردار کو داغ دار کر لیتے ہیں۔

[فاریسٹ آفیسر، مجموعہ کوّوں کی بستی میں ایک آدمی، طاہر نقوی، ص 144، 2010ء]

''بیک ڈور'' مہتاب عالم پرویز کی ایک اچھی کہانی ہے جو اخلاقی زوال کی بہتر مثال ہے۔ جس میں ایک پروفیسر کی کہانی ہے جو اپنی ہی ایک طالبہ سے مخرب اخلاق باتیں کرتا ہے۔ بات جان پہچان سے شروع ہوتی ہے اور پھر دوستی تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے آگے کیا ہوتا ہے وہ آپ خود ملاحظہ کرلیں:

''روز ہی تو کسی نہ کسی بہانے آپ سے بات ہوتی ہی رہتی ہے۔ میری سہیلیاں جب بھی مجھے آپ کے سنگ باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھتی ہیں تو آپ کے متعلق ڈھیر ساری باتیں کرتی ہیں اور میرے پاس سوائے خاموشی کے کچھ بھی تو نہیں رہتا۔

مس مونا آپ کی سہیلیوں میں شاید رقابت کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ وہ آپ سے بھی اور مجھ سے بھی جلنے لگی ہیں۔ دیکھئے آپ انکار نہ کریں، اب آجائیں ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے۔

سہیلیاں ہماری کھس پھس پر کان لگائے ہوئی تھیں۔ میں انھیں بائے بائے کہتی ہوئی پروفیسر کے چیمبر میں داخل ہوگئی۔ چیمبر میں داخل ہوتے ہی پروفیسر نے ڈور اندر سے لاک کر دیا تھا۔ کافی پینے کا تو ایک بہانہ تھا۔''

[بیک ڈور، مجموعہ کارواں، مہتاب عالم پرویز، ص48، 2012]

جنسی بے راہ روی:

تغیر پذیر سماجی اقدار کا ایک عنصر جنسی بے راہ روی بھی ہے۔ سماجی قدروں کی شکست وریخت کے سبب اخلاق وکردار میں زوال آتا ہے اور اخلاقی زوال کی ترقی یافتہ شکل جنسی بے راہ روی ہے۔ یہ انسان کو، خاص کر نوجوانوں کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیتی ہے۔ آج کل نئی نسل اس کا تیزی سے شکار ہو رہی ہے۔ اب شراب اور جنسیت عام ہوتی جارہی ہیں۔ یونیورسٹی، کالج اور اسکول کے بڑے طالب علم اس کا شکار ہو کر اپنا کریئر تک خراب کر لیتے ہیں۔ پہلے یہ وبا مغرب میں ہی عام تھی، اب تو یہ مشرق اور ہندوستان میں بھی اپنی جڑیں مضبوط کر رہی ہیں۔

عذرا نقوی نے اپنے افسانے'' الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے'' میں خوبصورتی سے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جنسی بے راہ روی نے آج اپنا جال اس قدر وسیع کرلیا ہے کہ اب تعلیم گاہیں، عبادت گاہیں اور مذہبی جلسے جلوس کی جگہیں..... کوئی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں یہ سب نہیں ہو رہا ہے۔ عذرا نقوی نے محرم کی آٹھویں تاریخ میں امام باڑے میں منعقد ہونے والی مجلس کی عمارت کے آس پاس دنیا و مافیہا سے بے گانے، بوڑھے اور نوجوانوں کی بے راہ روی کو پیش کیا ہے۔ ایک طرف ایک بوڑھا شراب کے نشے میں ہر آنے جانے والی خاتون کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہے تو دوسری طرف ایک لڑکی اور ایک لڑکا بوس کنار میں مصروف ہیں:

''سامنے سے آتا ہوا ایک بوڑھا جو نشے میں دھت لگتا تھا مجھ سے ٹکرا گیا۔ کاغذ میں لپٹی بیئر کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔ بڑے میاں نے سر سے ہیٹ اتار کر مسخرے انداز میں سینے پر رکھا اور جھک کر فرنچ میں بولا

''سوری مادام۔۔۔ایک سپ آپ جیسی خوبصورت خاتون کے لیے''

اور اس نے منہ سے بیئر کی بوتل لگائی۔ باقی ماندہ بیئر اس نے غٹا غٹ گلے میں انڈیل لی۔ گاڑی کے قریب پہنچی تو دیکھا کہ ہماری گاڑی سے ٹیک لگائے ایک نوجوان جوڑا دنیا سے بے خبر، ایک دوسرے میں کھویا ہوا Kiss کر رہا تھا۔ ہماری آہٹ سن کر دونوں نے سر اٹھایا۔ لڑکے نے انگریزی میں کہا:

''کتنی خوبصورت رات ہے۔''

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ہلکا سا اک Kiss کیا اور چل دیے۔''

[''الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے، مجموعہ جب آنگن پردیس ہوا، عذرا نقوی، ص 44، 2013]

جنسی بے راہ روی کا ایک کریہہ چہرہ اشتیاق سعید کے افسانے'' بعید از قیاس'' میں ملتا ہے۔ کہانی میں تسکین صدیقی مرکزی کردار ہے جو قصہ کے راوی الیاس کے پڑوس میں کرایے کے مکان میں رہتی ہے۔ ایک چھوٹی بیٹی اس کے ساتھ، بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ شوہر

سعودی عرب میں ملازمت کرتا ہے۔ ہر دو سال پر چھٹی آتا ہے۔ ایسے میں تسکین کو کبھی بھی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ ادھر ادھر بہکنے لگتی ہے۔ الیاس صاحب پر ہر طرح سے ڈورے ڈالتی ہے۔ ایک منظر ملاحظہ ہو:

''الیاس صاحب دیکھئے، گلاس کو بھرنے کے لیے بوتل کو گلاس پر جھکنا پڑتا ہے.....

یوں سمجھ لیجئے۔ یہاں مرد بوتل ہے اور گلاس عورت!''

''کیا''؟ میں چونک پڑا۔

چونکئے مت۔ مرد اور عورت کے مابین رشتے کی یہی حقیقت ہے...

بوتل لبریز رہے اور گلاس خالی، تو بتایئے گلاس کے وجود کا کیا مطلب؟''

میں یک لخت اس کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور اس کی آنکھوں کے گلشن میں، جہاں شہوت کے، بے شمار بھنورے بھنبھنا رہے تھے۔ اپنی نگاہیں پیوست کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے بوتل لے کے ٹیبل پر ایک طرف کو رکھتے ہوئے کہا۔ دیکھو یہ بوتل اگر گلاس سے بے حسی یا بے توجہی برتتی ہے تو گلاس کو بلا تامل اس بوتل سے استفادہ کرنا چاہیے۔''

[بعید از قیاس، حاضر غائب، اشتیاق سعید، ص52، 2013]

تسکین صدیقی کی بے راہ روی رنگ لائی اور ایک دن وہ ایک ہوٹل میں کسی کے ہمراہ پکڑی گئی۔ پتہ چلا کہ اس نے اپنی بیٹی کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اشتیاق سعید نے عمدگی سے ''بعید از قیاس'' تحریر کی ہے۔

عالمی تشدد :

اکیسویں صدی کی شروعات عالمی سطح پر بھی پر تشدد رہی ہے۔ عراق کی تباہی کا ہولناک منظر نامہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ افغانستان کی خانہ جنگی۔ القاعدہ اور طالبان کا عروج، امریکہ کی فلک بوس عمارتوں کا خاک ہو جانا، چیچنیا، بوسینا کی دل دہلا دینے والی ہلاکتیں، نئے

نئے دہشت گرد گروپوں کا سامنے آنا، انگلینڈ پر دہشت گردانہ حملہ، بن لادن کا خاتمہ۔ ہند۔ پاک اور پھر خلیجی ممالک میں عوامی بیداری کی لہریں جو انھیں تو امن و امان سے تھیں لیکن جن میں تشدد شامل ہوتا چلا گیا۔ فلسطین میں برسوں سے چلا آ رہا تشدد کبھی بھی خطرناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہمارے متعدد افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں عالمی تشدد کو موضوع بنایا ہے۔ دیدہ ور، بوسٹن نے تو نائن الیون پر پورا شمارہ ہی شائع کیا تھا۔ افسانوں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

> 'اعلیٰ کمان خودکش تنظیم کی بنیاد کو اور مضبوط و مستحکم کرنے کی خواہش میں اکثر ان ممالک کی سیر کیا کرتا، جہاں کے لوگ یا تو غریب تھے یا جہاں کے لوگوں کو دوسرے ممالک نے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ یا پھر ویسے مذہبی نوجوان جو کسی بھی قیمت پر اپنے خلاف ایک بھی لفظ سننا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں غریبی سے نکالنے اور آزادانہ زندگی جینے کے خواب دکھا کر اعلیٰ کمان ڈالروں میں تول لیتا اور خودکش کی ٹریننگ دے کر ضرورت مند تنظیموں اور ملکوں کے ساتھ سودے بازی کرتا۔ اور دنیا کے مختلف حصوں میں بھیج کر ایسی تباہی مچاتا کہ دنیا حیرت زدہ رہ جاتی۔''
>
> [ریموٹ کنٹرول، سونامی کو آنے دو، اختر آزاد، ص 138]

علاقائیت :

نئی صدی میں علاقائیت نے بھی خوب اپنا رنگ دکھایا ہے۔ جھارکھنڈ کے نئی ریاست بننے کے بعد وہاں علاقائیت کا طوفان پوری شدومد کے ساتھ اٹھا تھا۔ جھارکھنڈ کے کئی بڑے شہر جمشید پور، رانچی وغیرہ میں زیادہ تر ملک کی دیگر ریاستوں کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں کے اصل اور قدیم باشندے آدی واسی ہیں۔ یہی آدی واسی اب سیاست میں آ گئے ہیں۔ اب ان کے پاس طاقت اور پیسہ بھی آ گیا ہے۔ اقتدار میں آنے کے بعد انھوں نے باہر کے لوگوں کے لیے مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ یہی معاملہ مہاراشٹر میں بھی اکثر زور پکڑتا رہتا ہے۔ کئی بار بڑی

بڑی تحریکیں چلی ہیں۔ ممبئی اور دیگر شہروں میں بھی یو پی، بہار اور بنگال، اڑیسہ وغیرہ کے لاکھوں لوگ آباد ہیں۔ ان کا کاروبار، روزگار ممبئی میں ہے۔ آئے دن علاقائیت کے اٹھتے طوفان نے ممبئی کی زندگی کو متعدد بار مفلوج کر دیا ہے۔ اردو افسانے میں اکیسویں صدی کے ان اہم واقعات کو بھی اپنے اندر سمونے کا کام کیا ہے:

''اب تم ہی بتاؤ کہ عمر کے اس آخری حصے میں جب ہمیں قبر کے لیے تھوڑی سی جگہ چاہیے تو تم کہتے ہو کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ کیا ہم یہاں کے نہیں ہیں۔ کہیں باہر سے آئے ہیں؟'' رام لال کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ان بھیگی آنکھوں میں ملک کے بٹوارے کا وہ بھیانک منظر بھی سمٹ آیا تھا جب سب کچھ گنوا کر وہ اس دھرتی کو اپنا سمجھ بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کی جیب میں نہ پیسے تھے اور نہ ہی جسم پہ صاف کپڑے۔ کئی کئی دن تک اسے فاقے سہنے پڑے تھے۔ اس نے ہوٹلوں میں برتن دھوئے، سیمنٹ کی بوری اٹھائی، قلی کباڑی کا کام کیا، فٹ پاتھ پر نیند کی چادر بچھا کر سویا لیکن اس نے کبھی اندھیرے سے اپنے لہو کا سودا نہیں کیا۔''

[ہم کہاں جائیں بابو لال؟، مجموعہ ایک سپورن انسان کی گاتھا، اختر آزاد، ص22

نئی صدی کے افسانے میں نئی لفظیات بھی فراوانی سے در آئی ہیں۔ مکس زبان کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ یہ جہاں زبان کی صحت کے لیے مضر ہے وہیں اردو میں نئے جھونکے کی مانند ہے۔ بس اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ ان کا استعمال تخلیقیت کے ساتھ ہو:

''وہ کہنا چاہ رہے تھے، شاید ان کے ذہن کے کمپیوٹر سے سارے کے سارے الفاظ ڈی لیٹ ہو چکے تھے۔ انھوں نے یاد داشت کے کرشر Curser کو حواس کے کئی آئی کون سے مس کیا۔ لیکن بے سود۔''

[لالی پاپ، مجموعہ حاضر غائب، اشتیاق سعید، ص63، مطبوعہ 2013ء]

''وہ دیر تک نائٹ اسپاٹ پر تھرکتے رہے۔ لاؤنج میں کچھ دیر ڈام موریس

کی پوئٹری کا لطف لیا۔ پھر کچھ دیر تک نیوٹرس کی آرٹ گیلری میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہے۔''

[بیٹی، مجموعہ لینڈ اسکیپ کے گھوڑے، مشرف عالم ذوقی، ص104، مطبوعہ 2003ء]

''خاص طور پر گزشتہ پندرہ سالوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں جراثیم کش ادویات کی آمیزش، تمباکو نوشی، پولٹری اور ڈیری فارمنگ کے لیے چارے میں ملائے جانے والے estrogens، کیسے ہوئے زیر جامے ۔ کسی ہوئی جینز male infertility کی نئی وجوہات کے طور پر ابھری ہیں ۔ لیکن آپ بے شک ۔ ۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کی Sexual Life بے شک Nrmal ہے۔ لیکن آپ کے Semen میں Sperms نہیں ہیں ۔ ۔ ۔''

[زچ، مجموعہ ایک بوند زندگی، بلراج بخشی، ص48-49، مطبوعہ 2014]

الکٹرانک میڈیا نے انٹرٹینمینٹ کے نام پر معصوم بچوں کے سامنے گیت سنگیت ڈانس اور ہنسی مذاق کی تھالی میں ڈبل میننگ جیسی سیکسی پکوان پروس کر ان کے ذہن کو ایسا اسنیر یونائپ بنا دیا ہے کہ رات دن ان کی زبان پر وہی ذائقہ چڑھا رہتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر سبھی بچے ڈانسر، گیت کار، لافٹر یا پھر جوکر ہو گئے تو پھر ملک کی ترقی کا کیا ہوگا۔؟ کیا یہ لمحۂ فکریہ نہیں ہے۔؟

افسانہ ''ریئلیٹی شو'' اشاعت: 'ایوانِ اردو' مارچ 2014]

اردو افسانے میں نئی صدی کے تغیر پذیر سماج کی عکاسی کا منظر نامہ، خاصہ طویل ہے۔ اس پر ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ میں نے چند اقتباسات پیش کیے ہیں جن سے نئی صدی کا تغیر پذیر سماج ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

○

سعودی عرب میں اردو زبان اور اس کا مستقبل

ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی، مصر

دوسری خلیجی ریاستوں کی طرح سعودی عرب کی سرکاری اور قومی زبان عربی ہے لیکن اس کی آبادی کا بیشتر حصہ اردو بولنے والوں پر مشتمل ہے۔ جس میں زیادہ تر وہ لوگ شامل ہیں. جو پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش سے بسلسلہ ملازمت یہاں مقیم ہیں. سعودی عرب میں ویسے تو بے شمار غیر ملکی قومیں آباد ہیں مثلاً امریکی، انگریز (برطانوی)، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، مصری، سوڈانی، فلسطینی، لبنانی، اردنی، افغانی، صومالی، انڈونیشی، یمنی، فلپینی، تھائی لینڈی، ترکی، کورین وغیرہ لیکن سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پاکستانی باشندے دوسری قوموں کے مقابلے میں دوسرے درجہ پر ہیں جبکہ ہندوستانی پانچویں درجہ پر اور اگر پاکستانی ہندوستانی، افغانی اور بنگلہ دیشی باشندوں کا شمار کیا جائے تو پاکستانیوں کی تعداد ہندوستانیوں اور بنگالیوں سے بہت زیادہ ہے۔

جہاں تک اردو بولنے اور سمجھنے کا تعلق ہے اس میں دیگر اقوام کے لوگ بھی شامل ہیں جو کسی حد تک اردو بول سکتے ہیں اور سمجھ بھی سکتے ہیں ان کے علاوہ خود سعودی جو پاکستان یا

بھارت میں بغرض تعلیم سالہا سال تک مقیم رہے یا اہل پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ معاشرتی میل جول رکھتے ہیں علاوہ ازیں جنھوں نے ہندوستان یا پاکستان کی مسلمان لڑکیوں سے شادیاں کی ہیں اردو جانتے اور بولتے ہیں ان سب باتوں کے باوجود اردو کو سرکاری سطح پر تسلیم تو نہیں کیا گیا البتہ کوشش جاری ہے چنانچہ بالحاظ آبادی کی سطح پر اردو کو سعودی عرب میں مروجہ زبانوں میں دوسرا درجہ حاصل ہے۔ سرکاری سطح پر تو عربی کو اولیت دی جاتی ہے کیونکہ یہ ملک کی قومی زبان ہے۔ بین الاقوامی زبان ہونے کے سبب انگریزی دوسرے درجہ پر آتی ہے۔ تیسری حیثیت اردو کو حاصل ہے کیونکہ اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔

سعودی عرب کے مختلف شہروں میں اردو جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہے دکانوں اور ہوٹلوں پر اردو میں تحریر کردہ سائن بورڈ، تختہ ہائے اعلانات، بازاروں اور گلی کوچوں سے سنائی دینے والی پاکستانی اور اردو گانوں اور موسیقی کی دھنیں اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں خاص طور پر جدہ، مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں تو انسان یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ لاہور میں ہو۔

سعودی عرب کے مختلف شہروں میں پاکستان اور بھارت سے جو رسائل وجرائد اور اخبارات آتے ہیں ان سے اردو کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سعودی عرب میں فروغ اردو کا سہرا بالخصوص ان اداروں کے سر ہے جنھیں سعودی عرب میں مقیم پاکستانی برادری کی سرپرستی حاصل ہے ان میں سرفہرست پاکستانی اسکول اور کالج ہیں جو جدہ، ریاض، طائف اور الخبر میں واقع ہیں ان درسگاہوں میں پاکستانی ایمبیسی اسکول وکالج جدہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یہاں طلبا وطالبات کی مجموعی تعداد ساڑھے چار ہزار سے متجاوز ہے ذریعہ تعلیم اردو اور انگریزی ہے۔ انتظامیہ کی انتہائی کوشش ہے کہ تدریسی شعبے میں قابل ترین اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں چنانچہ پونے دوسو کے لگ بھگ اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ تعلیمی وتدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اسکول وکالج کی نئی عمارت جو بارہ ہزار مربع میٹر پر محیط ہے۔ نئی عمارت میں ایک سو کلاس روم (پچاس طلبا اور پچاس طالبات کے لیے) ہیں ایک عمدہ آڈیٹوریم ہے جس میں آٹھ سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے طلبا اور طالبات

کے مطالعہ کے لیے ایک الگ تھلگ لائبریری اور ریڈنگ روم ہے۔

یہ ادارہ تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ گراں قدر علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی خدمات بھی انجام دے رہا ہے کیونکہ یہاں اجتماعات کی سرکاری طور پر اجازت نہیں اور اس ضمن میں خصوصی اجازت لینا پڑتی ہے، لہذا ایمبیسی سے ملحق ہونے کے باعث یہ سہولت ہے کہ آڈیٹوریم کے دروازے ایسے اجتماعات کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔

پاکستان ایمبیسی اسکول وکالج میں طلبا وطالبات کو علمی، ادبی اور معاون نصابی سرگرمیوں کے وافر مواقع میسّر ہیں۔ دونوں شعبوں میں بزم ادب موجود ہے چناچہ وقتاً فوقتاً تقریری مقابلے، مباحثے، 'ذہنی آزمائش کے مقابلے' تصویروں کی نمائش، کھیلوں کے مقابلے، مقابلہ حسن قرأت وغیرہ کا اہتمام ہوتا رہتا ہے اور ان تمام سرگرمیوں کی روداد ''خبرنامہ'' میں شائع کی جاتی ہے۔ دوسرے نمبر پر پاکستان انٹرنیشنل سکول وکالج (ریاض) ہے اس درس گاہ میں ''بزم ادب'' کے زیر اہتمام وانصرام تقریری مقابلے، مباحثے، ذہنی آزمائش کے مقابلے اور دیگر غیر نصابی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں نیز سرکاری تیوہاروں پر تقاریب اور محافل منعقد کی جاتی ہیں. پاکستانی سفارت خانے کے دارالحکومت (ریاض) میں منتقل ہونے سے اس درس گاہ کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

تیسرے نمبر پر پاکستان کمیونٹی سکول وکالج الخبر ہے یہ عظیم الشان درس گاہ فرد واحد کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے ملک عباس حسین اس کے سربراہ ہیں۔ انھوں نے پاکستانیوں کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر سنہ 1966 میں یہ درس گاہ قائم کی۔ اس وقت گنتی کے طلبا وطالبات تھے لیکن اب طلبا وطالبات کی تعداد تین ہزار سے متجاوز ہے اور اساتذہ اور اردو کے دلدادہ ہیں۔ اور اردو کے فروغ کے لیے دن رات کوشاں ہیں، اس درس گاہ میں انگریزی میڈیم شروع کرنے کے لیے بہت کوشش ہوئی لیکن ملک صاحب نے انگریزی پر اردو کو ترجیح دی اس ادارے سے منسلک ایک عمدہ لائبریری اور تقاریب مقابلوں، مباحثوں اور دوسری معاون نصابی سرگرمیوں کے لیے ایک وسیع وعریض آڈیٹوریم ہے۔

پاکستان اسکول وکالج طائف کا تذکرہ بے جانہ ہوگا اس درس گاہ میں ڈیڑھ ہزار طلبا

وطالبات زیر تعلیم ہیں طلبہ وطالبات کے لیے الگ الگ شعبے ہیں یہاں بھی طلبا وطالبات کو علمی ادبی اور معاون نصابی سرگرمیوں کے مواقع حاصل ہیں اور تمام اہم موقعوں پر تقاریب کا اہتمام ہوتا ہے ان درس گاہوں کے علاوہ اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے جو علمی، ادبی اور ثقافتی ادارے سرگرم عمل ہیں ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

بزم اقبال، ریاض

اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں بزم اقبال ریاض کی پہلی بزم ہے جو چند علم دوست اور پڑھے لکھے پاکستانیوں نے قائم کی اس کا پہلا اجلاس 10 جنوری سنہ 1978 کو چودھری محمد ادریس کے ہاں منعقد ہوا اور صدارت کے فرائض جناب نظام الدین نے انجام دیے اجلاس میں بزم کا تنظیمی ڈھانچہ اور طریق کار وضع کیا گیا اور اتفاق رائے سے جو امور طے پائے ان میں ایک شق یہ بھی تھی کہ مقالات اردو میں پیش کیے جائیں گے تا کہ اردو کو زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل ہو۔

بزم اقبال ریاض کی سب سے پرانی بزم ہے اور اس کے بانی بشیر احمد عابد شروع سے ہی سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ خالد محمود سید ایک عرصہ تک صدر رہے تا آنکہ 13 مارچ سنہ 1986 کو راقم الحروف کو صدر منتخب کیا گیا۔

انجمن ثقافت پاکستان (پاکستان کلچرل گروپ) ریاض

یہ انجمن چند علم دوست پاکستانیوں نے، جن میں بیشتر شاعر اور ادیب ہیں اور اچھے اور معقول عہدوں پر فائز ہیں، سنہ 1982 میں قائم کی۔ انجمن کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے سردار محمد یوسف خان نے بتایا کہ انجمن قائم کرنے کا بنیادی مقصد انفرادی اور اجتماعی طور پر پاکستانیوں اور سعودیوں کے درمیان آشنائی اور مفاہمت پیدا کرنا ہے اور یہ سعودی عرب تشریف لانے والے نامور شعرا اور ادبا کے اعزاز میں محافل ومشاعرے بھی منعقد کی۔

بزم فانوس (ریاض)

انجمن ثقافت پاکستان سے ملتی جلتی بزم فانوس ہے۔ اس بزم کے بانی بھی اسلام الدین

آغا تھے وہ بہت زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت کے حامل تھے۔ بزم کے اغراض ومقاصد یہ ہیں۔ پاکستان کے قومی تہواروں پر اجلاس اور اجتماعات کا اہتمام کرنا۔ وقتاً فوقتاً مشاعرے اور شعری محافل منعقد کرنا۔ پرانے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور اردو زبان وادب کو عام کرنا۔

انجمن خواتین پاکستان (ریاض)

ریاض میں جہاں علمی وادبی سرگرمیوں میں مرد آگے آگے ہیں عورتیں بھی اس میدان میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں چنانچہ انجمن خواتین پاکستان اس ضمن میں قابل ذکر اور قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے انجمن کے اغراض ومقاصد میں بچوں کے فنکشن کرنا، مینا بازار کا اہتمام کرنا، مہمان شعرا اور ادبا کے اعزاز میں محافل منعقد کرنا، اردو زبان کی ترویج واشاعت کرنا اور نجی طور پر ادبی اجلاس منعقد کرنا اور نئے لکھنے والوں کو اپنی نگارشات پیش کرنے کی دعوت دینا شامل ہے۔

سفارت خانہ پاکستان کا خبر نامہ

سفیر پاکستان جناب گلستان جنجوعہ نے سعودی عرب میں سفارت کی ذمے داریاں سنبھالنے کے فوراً بعد متعدد ایسے اقدامات کا حکم دیا جس سے سفارت خانہ اور مملکت میں موجود پاکستانیوں کے درمیان باہمی رابطہ کو فروغ دینا اور افہام وتفہیم پیدا کرنا مقصود ہے ان میں سے ایک نہایت اہم قدم سفارت خانہ پاکستان کے شعبۂ اطلاعات کی جانب سے اپنے زیر نگرانی ایک پندرہ روزہ ''خبر نامہ'' کا اجرا ہے۔

حلقہ ارباب ذوق (جدہ)

اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے اور اس کی ترویج واشاعت کے دلدادگان نے اس ''حلقہ'' کو تشکیل دیا۔ مقصد یہ ہے کہ جملہ اردو بولنے والے حضرات میں اردو کے لیے دلچسپی پیدا کی جائے۔ مختلف علمی اور ادبی نشستوں کا اہتمام کیا جائے۔ پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرایا جائے۔

حلقہ ارباب ذوق خاصا پرانا ادارہ ہے۔جس نے اپنے فعال صدر ہندوستان کے جناب رؤف خلش کی سربراہی میں قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں ۔ اس کے زیر اہتمام مختلف تقاریب اور مشاعرے منعقد ہوئے ان میں نسیم سحر کی تصنیف ''ہر بوند سمندر'' کی افتتاحی تقریب اور مشاعرہ اور ڈاکٹر مغنی تبسم اور سہیل فاروقی کے اعزاز میں منعقدہ تقریب اور مشاعرہ خاص کر قابل ذکر ہیں۔ان تقاریب میں تقریباً تمام مشہور ادبا اور شعرا نے شرکت کی۔

بزم اردو (جدہ)

جدہ کی یہ دوسری ادبی انجمن ہے۔جو اردو کے فروغ کے لیے خاطر خواہ خدمت انجام دے رہی ہے۔ بزم کے صدر حسن چشتی اور سکریٹری جنرل شریف اسلم ہیں۔ بزم اردو کے اغراض ومقاصد حلقہ ارباب ذوق سے ملتے جلتے ہیں۔ دونوں انجمنوں کا بنیادی مقصد اردو کو فروغ دینا،علمی وادبی محافل اور تقاریب کا اہتمام کرنا اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ ہافزائی کرنا ہے۔

انٹرنیشنل اقبال ایوارڈ کمیٹی (جدہ)

مارچ 1986 میں اس کمیٹی کا افتتاح ہوا۔ جو رشید شیخ صدر اور نسیم سحر سکریٹری منتخب ہوئے کمیٹی کی افتتاحی تقریب میں سب سے پہلا اقبال ایوارڈ محمد ابن خلیل عرب شکیب مرحوم کو ان کی علامہ اقبال پر تحقیق کے اعتراف کے طور پر دینے کا اعلان کیا گیا۔ اقبال ایوارڈ ساڑھے گیارہ ہزار روپے پاکستانی اور ایک تعریفی سند پر مشتمل ہے۔

شکیب مرحوم اردو،عربی،فارسی اور انگریزی کے فاضل تھے۔انھوں نے سعودی ادبا کی تخلیقات کا تحقیقی جائزہ لیا اور اسے ایک مضمون کی صورت میں پاکستان قونصل جنرل کے زیر اہتمام منعقدہ یوم اقبال کے موقعہ پر پیش کیا۔

اقبال ایوارڈ کمیٹی کا مقصد علامہ اقبال کے نظریات اور افکار کی ترویج واشاعت اور انھیں نہ صرف اردو داں حضرات تک پہنچانا ہے۔ بلکہ سعودی اہل قلم کو بھی متعارف کرانا ہے۔

سکریٹری اقبال ایوارڈ کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ آئندہ سال کے لیے ایوارڈ کی تیاریاں جاری ہیں اور کمیٹی انعامی رقم بڑھانے پر بھی غور کر رہی ہے۔اس سلسلہ میں ایک ٹرسٹ قائم کیا

جارہا ہے۔ جو باقاعدگی کے ساتھ، اقبال ایوارڈ دیا کرے گا۔

اقبال اسٹڈی سرکل (جدہ)

یہ ایک دوسرا منفرد ادارہ ہے۔ جو بین الاقوامی اقبال ایوارڈ کمیٹی سے مختلف ہے لیکن اس کا مقصد بھی علامہ اقبال کے خیالات، ارشادات، نظریات پیغام اور افکار کو عام کرنا اور ہر پڑھے لکھے انسان تک پہنچانا ہے۔

اقبال اسٹڈی سرکل نے بھی اقبال ایوارڈ کمیٹی کے فیصلے کے پیش نظر محمد بن خلیل عرب شکیب مرحوم کو ان کی خدمات کے صلے میں دس ہزار (روپے) دینے کا اعلان کیا

بزم جگر (جدہ)

یہ بزم حال ہی میں جگر مرادآبادی مرحوم کے نام پر جدہ میں قائم ہوئی۔ اس بزم کا مقصد بھی اردو زبان کو فروغ دینا ہے اور اردو کے ناطے سے جگر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ اس بزم کا قیام اردو سے محبت رکھنے والے چند احباب کا مرہون منت ہے۔ اس میں جگر مرحوم کے نواسے نعیم حامد علی خان کی مساعی بھی شامل ہیں عید الفطر کے مبارک موقع پر بزم جگر کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ انعقاد پذیر ہوا۔ یہ مشاعرہ سابقہ تمام مشاعروں سے مختلف تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا طرحی مشاعرہ تھا۔ جس میں گیارہ شعرا نے شرکت کی۔

سرکاری سرپرستی

اردو کو حکومت سعودی عرب کی سرپرستی اس طور پر حاصل ہے کہ ہر سال فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے لاکھوں مسلمان پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، افغانستان، ایران وغیرہ سے اس مقدس سرزمین میں آتے ہیں اور عمرہ اور حج کے علاوہ روضہ نبوی کی زیارت سے آنکھوں کی روشنی اور دل کا سرور حاصل کرتے ہیں۔ اس موقعہ پر سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے ان تمام ممالک کے اردو دان حضرات کی خاطر نہ صرف ریڈیو اور ٹیلی وژن سے اردو پروگرام نشر کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے بلکہ حجاج کرام کی رہنمائی کے لیے وزارت حج اور

اوقاف اور وزارت اطلاعات کتابچے اور پمفلٹ شائع کر کے مفت تقسیم کرتی ہے۔ یہ سلسلہ پورا ''حج سیزن'' جاری رہتا ہے علاوہ ازیں بعض عربی اخبارات اردو ایڈیشن چھاپتے ہیں۔

المدینہ اردو

المدینہ پریس اسٹیبلشمنٹ کے زیر اہتمام روزنامہ اردو شائع ہوتا ہے۔ اس ادارے کی زیر نگرانی روزنامہ المدینہ عربی میں چھپتا ہے۔ اس اخبار کا اجرا اگست 1983 میں ہوا۔ اس وقت اس کی اشاعت چالیس ہزار ہوگئی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ المدینہ پریس اسٹیبلشمنٹ جس کے زیر اہتمام المدینہ عربی اور اردو شائع ہوتے ہیں۔ 1356ھ میں قائم ہوا تھا۔ چنانچہ اس ادارے کو صحافتی خدمات انجام دیتے ہوئے پچاس برس ہو گئے ہیں۔ اس اخبار کے چیف ایڈیٹر غالب حمزہ ابو الفرج نائب یحیی محمد با جنید اور ایڈیٹوریل اسٹاف میں روزنامہ امروز لاہور کے سابق ایڈیٹر ہارون سعد اور ابراہیم احمد ابراہیم، سلیم حامد علی، عبد الباسط محمد عثمان اور حسین احمد شامل ہیں۔

مساجد میں اردو خطبات

اردو کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اب وزارت حج اور اوقاف نے بڑے بڑے شہروں کی بعض مخصوص مساجد میں جمعہ کے روز نماز عشا کے بعد اردو میں خطبہ/تقریر کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ نماز عشا کے بعد سعودی خطیب عربی میں مختصر سا تعارف کراتے ہیں۔ ان کے بعد عالم دین کسی نہ کسی اسلامی موضوع پر اردو میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ اس موقعہ پر باقاعدہ مائیکروفون استعمال کیا جاتا ہے۔ دار الحکومت ریاض میں حتی الوزارات کی جامع مسجد میں محمد افضل ہر جمعہ کی شام کو یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ موصوف جامعہ امام محمد بن سعود سے منسلک ہیں۔

ٹیلی وژن پروگرام

سعودی ٹیلی وژن سے بعض اوقات خصوصی اردو پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ پچھلے

دنوں جب سید ضمیر جعفری ریاض تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں ترتیب دی گئی محفل مشاعرہ کو ریاض ٹیلی وژن نے کاسٹ کیا۔ جو تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً ریاض ٹیلی وژن سے پاکستانی اور بھارتی اردو فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔

تقاریب اور مشاعرے

جدہ کی آب وہوا علمی وادبی محافل اور تقاریب کے لیے بہت خوشگوار ہے۔ خاص طور پر ''حج سیزن'' اور ''عید الفطر'' کے مبارک موقعہ پر متعدد تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ جب پاکستانی اور بھارتی ادیب اور شاعر عمرہ اور حج کی ادائیگی کے سلسلے میں تشریف لاتے ہیں۔

○

پیمانۂ اُردو..... نصف خالی یا نصف پُر؟

(اکیسویں صدی میں اُردو کے فروغ کے امکانات)

پروین شیر، کناڈا

انسانی زندگی کے لیے انسان کی سب سے اہم ایجاد زبان ہے۔ زبان کے بغیر زندگی کچھ اور ہوتی۔ یقینی طور پر بے معنی، بے جہت، نا زیبا، بے وقعت اور نافہم ہوتی۔ زبان ہی انسانی ارتقائی قدروں، تشخص اور تہذیب کی بنیاد ہے۔ زبان ایک کوچوان ہے جو ہمیں منزل مقصود تک لے جاتی ہے، انسانوں کو انسانوں سے جوڑتی ہے۔ یہ انسانی ثقافت کی علامت ہے۔ اشرف المخلوقات کی توقیر، بلند مرتبہ اور وقار... سب کچھ زبان کا عطا کردہ ہے۔ زبان ہی سوچ اور فکر کی راہ یابی کرتی ہے۔

دنیا میں سیکڑوں زبانیں ہیں۔ ان میں سب سے اہم زبان مادری زبان ہے۔ جس طرح ہر انسان کے لیے اس زمین پر ماں کا وجود اُس کا محافظ ہوتا ہے اسی طرح مختلف تہذیبوں اور مختلف معاشروں کی ماں اُن کی اپنی زبانیں ہیں جو ان کی حفاظت کرتی ہے۔ انہیں پامال ہونے سے بچاتی ہے۔

اُردو ہماری مادری زبان ہے۔ ہماری تہذیب کی محافظ ہے۔ ہماری شناخت، ہماری رسم و روایت کی نگہبان ہے جو ان سے ایک انوٹ بندھن سے بندھی ہوئی ہے اور ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ اُردو کے شانوں پر ہمارے خواب، ہماری ہنسی، ہمارے آنسو سر ٹکائے ہوئے ہیں۔ ہمارے سارے جذبات اور احساسات اُردو کے لبوں سے ادا ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ہمارے خوابوں کی روشنی رہتی ہے۔ ہماری سوچ کا ہاتھ اُردو تھامے ہوئے ہے۔ یہ ہماری تہذیب کی وحدت کا ٹھوس عنصر ہے۔ رسوم و روایات کو منظم کر کے لوگوں میں قربت پیدا کرتی ہے۔ زندگی میں باقاعدگی لاتی ہے۔ تنہائی دور کرتی ہے کہ انسان تنہا نہیں رہ سکتا۔ ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اُسے لمس کا تحفظ چاہیے۔ یہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ مر جاتا ہے۔ زبان اور تہذیب کے ذریعہ تخلیقات، سوچ اور فن پروان چڑھتے ہیں اور اُردو ہماری تہذیب ہے۔ ذہنی تحفظ اور سہارے کی بنیاد ہے۔ ہماری طاقت ہے۔ ہمارے معاشرے کی طاقت ہے۔ اُردو کی زندگی ہماری زندگی ہے۔ ہمارے جذبات کی بھرپور اور صحیح ترجمان ہماری مادری زبان ہی ہوتی ہے۔ نیلسن مینڈیلا (Nelson Mandela) نے بالکل صحیح کہا تھا کہ:

> If you talk to a man or a woman in a language he or she understands. that goes to his or her head. If you talk to them in their own language. that goes to their hearts
>
> (اگر تم کسی سے اُس زبان میں بات کرو جو وہ سمجھ لیتا ہے تو وہ اُس کے ذہن سے تعلق پیدا کر لیتی ہے۔ اگر تم کسی سے اُس کی مادری زبان میں بات کرو تو وہ اُس کے دل میں اُتر جاتی ہے۔)

مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کا علم بھی ضروری ہے۔ خاص کر جب ہم کسی غیر ملک میں جا کر بس جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دوسری تہذیب کو سمجھتے ہیں اور ذہنی اُفق کو وسعت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اپنی مادری زبان سے جس قدر ہم الگ ہوتے جاتے ہیں اُسی قدر ہم خود اپنے آپ سے بھی دور ہوتے جاتے ہیں۔ ادھورے ہو جاتے ہیں۔

میں برس ہا برس سے کنیڈا میں مقیم ہوں اس لیے مستقبل میں اُردو کے فروغ کے امکانات پر میرے یہ تاثرات اُردو کی نئی بستیوں کے متعلق ہیں جو میرے برسوں کے مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ ہیں۔ میں کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتی لیکن یہاں ماضی سے حال تک کا طویل راستہ طے کرتے ہوئے، اُردو کی نئی بستیوں کو بستے ہوئے دیکھتی آئی ہوں۔ وقت کے ساتھ یہاں اُردو کے قدم جمتے ہوئے دیکھتی آئی ہوں۔ میرے یہ الفاظ اُسی بنیاد پر ہیں۔ آگے کیا ہوگا یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ میں نے وہ دور بھی دیکھا ہے جب یہاں اُردو کی بستیاں نہیں بسی تھیں۔

برصغیر سے آئے ہوئے مہجور وطن بہت کم تھے۔ آج جب مُڑ کر دیکھتی ہوں تو اُن دنوں صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ اُس وقت ہندوستان اور پاکستان سے آئے ہوئے لوگ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کو نظر انداز کر کے صرف روزگار اور اپنے قدم جمانے میں مصروف تھے۔ کچھ تو ایسے بھی تھے جن میں انگریزی زبان کے تحت سخت احساس کمتری تھا۔ یہ لوگ تب بہت فخر کے ساتھ کہتے تھے کہ میرے بچے تو اُردو نہیں جانتے اور میرے بچے دیسی کھانا بالکل پسند نہیں کرتے۔ آہستہ آہستہ جب ان کے بچے بڑے ہونے لگے تو وہ اپنی زبان اور تہذیب کھونے لگے۔ اپنے تشخص کو غرقاب ہوتے ہوئے دیکھ کر ان لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس بیدار ہوا۔ یہ تلخ حقیقت کہ ان کی جڑیں اُکھڑ رہی ہیں اور ان کی نسل گُم نامی کے سمندر میں ڈوب رہی ہے نے، انہیں آگہی بخشی۔ پھر یہ لوگ نیند سے جاگ گئے۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

رفتہ رفتہ یہاں اُردو کی بستیاں ہر شہر میں آباد ہوتی گئیں، پھیلتی گئیں۔ نئے آنے والوں نے پرانے لوگوں کی معدوم ہوتی ہوئی تہذیب اور شناخت دیکھی تو خوف زدہ ہوئے۔ وہ اپنی مادری زبان۔۔اُردو کی حفاظت کی طرف رجوع ہوئے تا کہ اُن کی تہذیب برقرار رہے۔ آہستہ آہستہ یہ جذبہ بڑھنے لگا۔ اور آج صورت حال کچھ اور ہے۔ میں نے دونوں ادوار دیکھے ہیں۔ وہی لوگ جو فخر کرتے تھے کہ اُن کے بچے اُردو نہیں جانتے آج تنہائی کا شکار ہیں۔ ان کی پہلی ہی پشت اپنی پہچان گنوا بیٹھی ہے۔ یہ مات کھائے ہوئے لوگ دور سے اپنے بچوں کے

بدلے ہوئے رنگ دیکھ کر سوگوار بیٹھے ہیں۔ اُن کے بچے پوری طرح مغربی تہذیب میں ڈھل چکے ہیں جبکہ والدین مکمل مشرقی ہیں اور اپنے بچوں سے ہر لحاظ سے مختلف۔ وطن بھی چھوٹ گیا اور اولاد بھی۔ چونکہ زبان اور تہذیب کا اٹوٹ بندھن ہے اس لیے ان کے پاس ان کا اپنا کچھ نہیں بچا۔ وہ اُن لوگوں کی طرف حسرت سے دیکھتے ہیں جن کے بچے یہاں پیدا ہوکر بھی اُردو زبان، اپنے ماحول اور اپنی تہذیب سے جڑے ہوئے ہیں۔ جن کے پاس best of both world ہے۔ جن کے والدین مادی اور روحانی طور پر محفوظ ہیں۔ ادھورے لوگوں کا بکھراؤ، اُن کی ہار اور نقصان اُن لوگوں کے لیے ایک تنبیہ، ایک بُری مثال بن گیا جو بعد میں اُردو کی بستیوں میں بسنے کو آئے۔ اسی وجہ سے نئے آنے والوں کے لیے اپنی اُردو زبان کی حفاظت ضروری ہوگئی کہ اس سے اُن کی تہذیب محفوظ رہے جس سے وہ خود بھی محفوظ رہ سکیں۔

ادھورے ہوجانے کے خوف سے اب اُردو زبان کا سرمایہ نئی پیداوار کو سونپ دینے کے لیے لوگ زیادہ سے زیادہ کوشاں ہو گئے ہیں۔ وقت کے جوار بھاٹا کے اُتار چڑھاؤ نے اُردو کی نئی بستیوں میں ایک آگہی پیدا کر دی ہے۔ رویہ بدل گیا ہے اور کافی حد تک احساس کمتری کو دور اندیشی نے مات دے دی ہے۔ جب اپنی روایات، اقدار اور عقاید پر آنچ آنی شروع ہوئی تو اچانک یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ اُردو کی بقا ہی میں اپنی بقا ہے۔ زندگی کے انقلابات اور تبدیلیوں کے باوجود اُردو کی ڈور مضبوطی سے تھام کر رکھنی ہے۔

تو یوں ہے کہ اپنی پہچان کھو جانے کے خوف سے مستقبل میں اُردو کے فروغ کے امکانات اُمید افزا ہو گئے ہیں۔ گرچہ یہاں مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے لوگ ہیں جو ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں۔ کچھ کہتے ہیں اُردو کا پیمانہ آدھا خالی ہے، کچھ کہتے ہیں آدھا بھرا ہوا ہے۔ ایک طرف یہاں اُردو کے ہم نواؤں اور ہم دردوں کا حلقہ ہے تو دوسری طرف کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے لیے اُردو زبان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُن کے خیال سے اُردو صرف ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کی طرح زندہ رہے گی اور یہ زبان اب

ڈھلان پر ہے۔ مر رہی ہے۔ اُن کی یہ دل شکن باتیں سُن کر اُردو مجھ سے ہم کنار ہو کر یوں ہم کلام ہوتی ہے:

مرے گلے میں وہ بانہیں ڈالے
اُداس نظروں سے دیکھتی ہے
یہ کہہ رہی ہے
'' تمہارے دل کی
تمام چھوٹی بڑی رگوں کی
ندی میں بہتی ہوں
ذہن کے ہر گلاب کی پتیوں پہ شبنم
کی روشنی ہوں
میں راستہ ہوں
کہ جس پہ چلتے ہی گُنگ احساس بول اُٹھتے
ہیں سب تمہارے!
کہ مجھ سے تم ہو، تمہیں سے میں ہوں
ہماری چادر کا تُم ہو بانا تو میں ہوں تانا
تمہیں نے میرے
ہر ایک خلیے کی پرورش کی
جہاں میں لائے
مگر۔۔۔۔۔وہ دیکھو
نئی ہواؤں کی تیز قینچی
حسین ریشم کی نرم چادر
سے میرے تانے، تمہارے بانے
کتر کتر کر جُدا نہ کر دے

شرار میرے چہار سو رقص کر رہے ہیں
کہیں مرے پھول سے حسیں لب
یہ نرم و نازک سی جان میری
جھلس نہ دیں یہ
مجھے بچا لو
کہ تم مکمل ہو میرے دم سے''

('فریاد'۔ پروین شیر)

کسی نے مجھ سے پوچھا کہ اُردو زبان کا تعلق آج روزی روٹی سے قایم نہیں رہا تو پھر آج اُردو زبان کا زندہ رہنا کہاں تک درست ہے اور کیوں جبکہ اُردو ضروریات زندگی کے لیے اہم نہیں ہے۔ میرا جواب تھا کہ ضروریات زندگی صرف روزی روٹی تک ہی محدود تو نہیں۔ صرف مادی ضروریات ہی زندگی کی تکمیل تو نہیں۔ روحانی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں۔ جس طرح روزی روٹی حاصل کرنے والی زبان سے جسمانی حفاظت کی اشیاء مہیا ہوتی ہیں اُسی طرح ہمیں اپنی مادری زبان سے روح کی غذا حاصل ہوتی ہے۔ اُردو ہماری پہچان، ہماری عبادت، ہماری سوچ اور ہمارے رشتوں سے جُڑی ہوئی ہے۔ فنون لطیفہ اپنے عروج پر مادری زبان کے سہارے ہی پہنچ سکتے ہیں کیونکہ ان کی بنیاد سوچ ہے اور اپنی سوچ کا اظہار مادری زبان سے بہتر کسی اور زبان میں نہیں ہو سکتا۔ دوسری زبانوں میں ترجمانی تو ہو سکتی ہے ترجمہ نہیں۔ دوسری زبانوں میں شدت جذبات کا اظہار خیالات اور تصورات کو اکثر لنگڑا بھی بنا دیتا ہے۔ روزی روٹی کی زبان کاروباری زبان ہے جو ہمارے جذبات سے عاری ہے۔ اُردو ہمارے روحانی تحفظ کی پاسبان، ذہنی آسودگی اور وجدان کا وسیلہ ہے۔ زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں... مادی اور روحانی۔ کامیاب زندگی کے لیے دونوں کا بھرپور ہونا ضروری ہے۔ پھر جینے کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ورنہ ادھورا پن رہتا ہے۔

چالیس سال پہلے، مجھے یاد ہے، یہاں، مغربی ممالک میں اُردو اخبارات، رسائل اور کتابوں کا وجود ایک تنہائی بھی نہیں تھا۔ آج یہ سارے علاقے ادبی صحافت، اُردو شاعری اور

اُردو فکشن کے نئے میلانات بھرے پُرے ہیں۔ اس منطق سے دیکھا جائے تو اُردو کے تابناک مستقبل کے امکانات یہاں موجود ہیں۔لوگوں میں اپنی تہذیب کو بچانے کا جذبہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہو گیا ہے۔ جدید ترین الیکٹرانک میڈیا کی سہولتیں اور تعاون سے اُردو پوری دنیا میں اپنے قدم جما رہی ہے۔طرح طرح کے سافٹ ویئر نے اُردو لکھنے پڑھنے کو آسان بنا دیا ہے اور اسے ہر گھر میں پہنچا دیا ہے جس سے اُردو زبان پہلے سے زیادہ مستحکم ہو رہی ہے۔ یہاں اُردو کتاب کی اشاعت صرف ایک خواب تھا اور آج یہ ایک عام بات ہے۔

امریکی طرز معاشرت میں رہنے کے باوجود یہاں اُردو کی بستیوں کی نئی پود میں ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعہ اُردو ڈرامے اور فلم دیکھنے کا شوق بڑھ رہا ہے اس طرح وہ اُردو سے بھی قریب آ رہی ہے۔ بالی وُڈ کے نغمے جو اُردو میں ہوتے ہیں یہاں کے دیسی بچے اب بے حد پسند کرتے ہیں۔ موسیقی کی محفلوں میں، مخصوص تقاریب میں یہ بچے اُردو نغمے گاتے ہیں۔ یہ سب جدید الکٹرانکس کا عطا کردہ ہے۔ جو یہاں نئی نسل کو اُردو سے روشناس کر رہا ہے۔ آن لائین اُردو کی تعلیم ان بچوں کے لیے قیمتی تحفہ ہے جس سے اُردو رسم الخط کی بقا کے امکانات اگلی صدی میں تسلی بخش نظر آتے ہیں۔

میرے خیال میں اُردو کے روشن مستقبل کی بنیادی وجوہات یہ ہیں:

(1) جذباتی ترجیحات

(2) ماضی اور حال کو مستقبل تک لے جانے کا مصمم ارادہ اور ضرورت

(3) تشخص، تہذیب اور قدروں کی حفاظت

(4) اُردو کی نئی بستیوں میں بچوں سے جڑے رہنے کی ضرورت

(5) اپنے ماحول کی اجتماعی زندگی کی ضرورت

(6) مادری زبان میں افکار اور احساسات کے بھرپور اظہار کی سہولت

(7) اُردو کی تعلیم کے لیے الیکٹرانک میڈیا کی سہولت

(8) ہندستانی سنیما، ڈراموں اور موسیقی میں اُردو کا وجود

(9) باہمی تعلقات اور آپسی یگانگت کے تحفظ کی ضرورت

(10) گلوبلائی زیشن کے تحت دنیا کا ایک گاؤں کی صورت سمٹ کر اُردو زبان کا دروازہ مختلف ممالک کی طرف کھُل جانا

یہاں اب اُردو کی بستیوں میں تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کا رجحان زیادہ نظر آتا ہے۔ گھروں میں اُردو بولنے کا رواج زیادہ ہو گیا ہے۔ کچھ اُردو گھرانے ایسے ضرور ہیں جہاں اُردو کا کوئی نام ونشان نہیں۔ باوجود اس کے میں مایوس نہیں ہوں، میرا یہی ماننا ہے کہ انسان کا پہلا مکتب اس کا گھر ہوتا ہے۔ مادری زبان کی تعلیم گھر سے شروع ہوتی ہے۔ اب یہاں پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کے گھروں میں اُردو کے سارے شوز دیکھنے کی سہولت ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ بچے اُردو سے قریب تر ہو رہے ہیں۔ یہ صورت حال آج سے بیس سال قبل نہیں تھی۔

روس میں جب میں اُردو زبان کے روسی طلباء سے اُردو میں باتیں کر رہی تھی تو یہ اُمید مزید قوی ہو گئی کہ اُردو کا مستقبل روشن ہے۔ یہی احساس ہوا جب جرمنی، ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اُردو زبان کے جرمن طلباء اور یو ایس اے، پرنسٹن یونیورسٹی میں اُردو کے امریکی طلبا سے اُردو میں گفتگو ہوئی۔ اور پھر یو ایس اے اور انگلینڈ وغیرہ میں، کچھ مشاعروں میں اُردو اور ہندی گھرانے کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو، جو یہیں کی پیداوار ہیں، اُردو میں اپنا کلام پیش کرتے ہوئے دیکھا۔ اُن میں سے چند نے آن لائین اُردو کی تعلیم حاصل کی ہے۔ انٹرنیٹ کا یہ کرشمہ ہے۔ میری ملازمت کنیڈین فلم کلاسی فیکیشن میں ہونے کی وجہ سے یہ علم ہوا کے ہندوستانی فلم کی وجہ سے کچھ مقامی کنیڈین بھی اُردو سے مانوس ہو گئے ہیں۔ بیس سال قبل لفظ 'اُردو' بھی انہوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ تب یہاں ہندوستانی فلمیں کنیڈین تھیٹرز میں کبھی ریلیز نہیں ہوتی تھیں۔ آج کنیڈین فلم کلاسی فیکیشن کے محکمے میں ہم لوگ کم از کم ہفتے میں ایک بار ہندوستانی فلم کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ چند مقامی کنیڈین ادیب اور شعراء جو میرے کلیگس ہیں، اُردو کا سبق لے رہے ہیں۔

آج جب میں اپنے اردگرد اُردو کی بستیوں کا مشاہدہ کرتی ہوں، ماضی اور حال کی طرف دیکھتی ہوں تو نظر آتا ہے کہ پہلے یہاں اُردو کا پیمانہ ایک چوتھائی بھی نہیں بھرا تھا اور آج آدھا بھرا ہوا ہے۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگلی صدی میں یہ پیمانہ شاید تین چوتھائی بھر جائے۔

○

اردو صحافت اور ترجمہ

اردو تراجم: ضرورت و اِمکان

پروفیسر مرزا حامد بیگ

لاہور، پاکستان

یہ طے ہے کہ ہر زبان اپنی معاشرت کی پیداوار اور ثقافتی اقدار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ زبان کا ماضی، اس کے لیے سرمایۂ افتخار ہونے کے ساتھ ساتھ، آنے والے وقتوں میں اس کی بڑھوتری اور نوک پلک سنوارے جانے کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ جبکہ ہر زبان کے لیے لمحہ موجود، اس کے مستقبل کے لیے قطب نما کا کام کرتا ہے۔

کلاسیکی ادب کی Dinchronic زبان کبھی اپنی اہمیت نہیں کھوتی، البتہ محاورہ امروز کے مقابل عمومی سطح پر دب سی جاتی ہے۔ یہ تمام زبانوں کا مقدر ہے۔ شیکسپیئر کے منظوم ڈراموں میں برتی جانے والی زبان، آج اکیسویں صدی میں تو 19 ویں صدی کے اختتام تک اس انجام کو پہنچ گئی تھی اور آج عمومی سطح پر قلی قطب شاہ ہی کیا سراج اور نگ آبادی تک دبیز دھند میں خوابیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ سبب ایک ہی ہے کہ ہر دور میں ادبی، مذہبی، کاروباری، ثقافتی اور کھیل کے میدانوں سے متعلق برتی جانے والی زبان نت نئی اصطلاحات اور تبدیلی محاورہ کے

سبب پینترے بدلتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ترقی یافتہ دنیا میں زبانوں سے متعلق تحقیق و تفتیش کو لینگویج انجینئرنگ کا نام دے دیا گیا ہے۔ بھلے ہم لینگویج انجینئرنگ سے دور ہوں، لیکن ترجمے کا رستہ تو کھلا ہے۔

یہ الگ قصہ ہے کہ ترجمے کو ہمیشہ 'بھنی ہوئی سٹرابیری' شمار کیا گیا۔ مراد یہ کہ ترجمہ ہو کر متن (Text) کا اصل ذائقہ برقرار نہیں رہتا۔ ڈاکٹر سیموئل جانسن شاعری کے ترجمے کو ناممکن قرار دیتے ہیں اور رے۔ ایچ فریئر کو ترجمے کی زبان قابل التفات دکھائی نہیں دیتی۔ حد تو یہ ہے کہ مشہور مترجم ایڈورڈ فٹز جیرالڈ، زندہ کتے کو، مردہ شیر سے بہتر قرار دیتے ہیں۔

ترجمے کے فن سے متعلق یہ آرا تو 19ویں صدی تک کی ہیں، جبکہ 21ویں صدی تک دو مکتبہ ہائے فکر سامنے آئے۔ پہلا گروہ مخالفین کا ہے:

گرانٹ شاور مین کرسپلی کے خیال میں ''ترجمہ کرنا ایک گناہ ہے'' اور پروفیسر ایلبرٹ گیرارڈ کے نزدیک ترجمہ ''نام ہے ایک سعی نامشکور کا، جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے۔''

جبکہ عملی سطح پر دیکھیں تو ارنسٹ فینولوسا، ایزرا پاؤنڈ اور آرتھر ویلی نے ترجمے ہی کے ذریعے قدیم مشرقی شاعری کو مشرق و مغرب کی حال کی شاعری میں بدل دیا اور پاؤنڈ نے جب بھگت کبیر کے چند دوہوں کے ترجمے کے بعد کینٹوز لکھے تو اس کی شاعری میں ''کہت کبیر'' کی گونج نمایاں تھی۔ یوں ترجمہ، گماں کا ممکن ہے۔

مترجمین میں پہلا نام 250 قبل مسیح کے لیویوس اینڈرونیکس (livius Andronicus) کا ہی لیا جائے گا، جس نے اوّل اوّل ہومر کی ''اوڈیسی'' کو لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور تادیر گمنامی سے نباہ کیا۔ انگریزی میں بائبل کے اوّلین مترجم ولیم ٹنڈیل کی ساری عمر جلاوطنی میں گزری۔ وہ 1535 میں گرفتار ہوا 1536 میں پھانسی پائی اور اس کی لاش کو آگ میں جھونک دیا گیا۔ خود ہمارے ہاں ''ترجمۂ قرآن'' کے بعد نذیر احمد دہلوی سے عالمانہ مذہبی تقدس بھی چھن گیا۔

شاید اسی لیے ترجمے کی دیو مالا نے مترجم کی حالتِ زار کو ''سسی فس'' سے تشبیہ دی ہے،

جو انتہائی بااختیار ہونے کے باوجود بے بس اور قابل رحم ہے۔

تقابلی ادبیات کے فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر ایلبرٹ گیرارڈ نے کہا تھا: 'عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔' ('مقدمہ ادبِ عالم' سے اقتباس)

ترجمے کا عمل دو زبانوں کے مابین پُل بنانے کا کام کرتا ہے۔ جبکہ متن کا اس کی تمام اسلوبیاتی، موضوعی اور تکنیکی خصوصیات کے ساتھ کسی دوسری زبان میں منتقل ہوجانا ترجمے کا اصل کٹھن ہے۔

Goeibe کا کہنا ہے کہ: "A good translation takes us a very long way" جبکہ وکٹر ہیوگو نے اسے Absurd اور Impossible کہا۔

یوں گماں کو ممکن بنانے کے لیے مترجم کو بہرصورت بامروت ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مترجم کو اپنی شخصیت و حیثیت کو بھلا کر صاحب متن کی تخلیقی روح میں انتہائی عاجزی کیساتھ گھل مل جانا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی عاشقی کے مماثل ہے۔ خود پسندی و خود بینی کی بجائے اطاعت و وفا شعاری۔

لیکن ترجمے کا عمل سراسر یہی کچھ نہیں۔ یہ عاشقی کا رویہ ہوتے ہوئے ایک داخلی تجزیہ بھی ہے۔ جس طرح ایک تخلیق کار اپنی کسی داخلی انگیخت سے تخلیق فن پر مجبور ہوتا ہے بعینہٖ اسی طرح کوئی سیاسی، سماجی یا تہذیبی صورت حال مترجم سے کسی متن کے ترجمے کا تقاضا کرتی ہے اور مترجم اس راہ پر چل نکلتا ہے۔ جیسے اکیسویں صدی میں تیسری دنیا کے ادب کو انتہائی جگرکاوی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا جارہا ہے یا ماضی میں عربی، فارسی اور ترکی ادب کو اردو میں منتقل کیا گیا۔

ہمارے ہاں ادبی تراجم کی تاریخ میں ''راسلس'' از ڈاکٹر سیموئل جانسن کے ترجمہ ''تواریخ راسلس، شہزادہ حبش کی'' از سید محمد میر لکھنوی مطبوعہ: آگرہ طبع اوّل 1839 کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ بلاکسی شک وشبہ کے، مغرب کی کسی بھی زبان سے اردو میں ہونے والا، کتابی صورت میں یہ پہلا ادبی ترجمہ ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اپنی کتاب ''ہندستانی زبان کے قواعد'' مطبوعہ: کلکتہ: طبع اوّل 1796 میں ولیم شیکسپیئر کے دو ڈراموں

''ہملٹ'' اور ''ہنری ہشتم'' کے دو چیدہ اقتباسات کا اردو ترجمہ پیش کیا تھا۔

واضح رہے کہ ہمارے اوّلین دیسی مترجم سید محمد میر لکھنوی، ریورنڈ چارلس کی چھ جلدوں میں کیمسٹری سے متعلق کتاب 1828 میں طبع کروا چکے تھے اور یہی وہ زمانہ ہے جب میر امن دلی والے نے ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' کے بعد ریورنڈ چارلس کی سات جلدوں پر مشتمل کتاب ''ستہ شمسیہ'' کا ترجمہ غلام محی الدین متین حیدر آبادی، مسٹر جونس اور موسیو تندوسی کے ساتھ مل کر مکمل کیا۔

1857 کی ناکام جنگ آزادی کے ہنگام تک اردو میں زیادہ تر علمی تراجم سامنے آئے، جن کی تفصیل وقت چاہتی ہے۔ لیکن یہی وہ زمانہ ہے جب علمی اور ادبی سطح پر ہمارے ہاں ایک داخلی کشمکش دکھائی دی۔ اس دور کے ادبا و شعرا کے ایک گروہ کے خیال میں پیروئ مغرب ہی زندہ رہنے کی واحد صورت تھی، اور دوسرا گروہ مغرب کے پہیّے کا زیر بارِ احساں رہتے ہوئے ابن العربی اور ابنِ رشیق پر گزارا کرنا چاہتا تھا جبکہ تیسرا گروہ مغرب سے بھی صاحب سلامت کا خواہاں تھا اور مشرق تو تھا ہی اپنا۔ سو 19 ویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور 20 ویں صدی کے نصف اوّل میں ہم مشرق اور مغرب کے فکری ابعاد کے درمیان ڈگمگاتے پھرے۔

لیکن یہ دوطرفہ آگ تھی۔ ہمارا ادیب ترجمے کی معرفت، مغرب کی سمت تجسس کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور مغرب نے مشرقی لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی تھی۔

مغرب میں اس میلان کے ابتدائی نقوش مارلو اور شیکسپیئر کے ڈراموں میں دکھائی دیتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں 1880 کے قریب رڈیارڈ کپلنگ اپنے مشرقی حوالوں کے ساتھ ابھرا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ باطنی سطح پر اس نے انگریز راج کے ہی تصور کو تقویت بہم پہنچائی۔

کپلنگ سے پہلے میکنزی نے 1885 میں مسز مشروم اور کرنل میڈوز ٹیلر نے امیر علی ٹھگ کی ذات کے حوالے سے ہندوستان کے باسیوں کا خوب خوب مضحکہ اڑایا اور ہمارے رتن ناتھ سرشار نے اصل حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر میکنزی کی کتاب ''اعمال نامۂ روس'' کا ترجمہ کیا۔ سو کہا جا سکتا ہے کہ کپلنگ کی ذہنیت پیدا کرنے کو 1785 سے زمین ہموار کی جا رہی تھی۔ آگے چل کر بقول محمود ہاشمی: ''ایزرا پاؤنڈ، میگنا کارٹا کے ساتھ ساتھ مشرقی فلسفے اور

مشرقی شاعری کے تراجم اور حوالوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس لیے ایلیٹ اپنے ''خرابے'' اور ''کارتھیج'' کے خوابوں کے بعد ''اوم شانتی شانتی'' کی منزل تک آتا ہے۔ اسی لیے سارتر، بدھ سے قریب دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے بیشتر نئے مغربی ادیب بدھسٹ بن گئے تھے۔ اسی لیے ایلن جنسبرگ (Allen Ginsberg) امریکہ سے ہندوستان کا سفر کرتا ہے۔''

(''ایک خطرناک میلان''، مطبوعہ: اوراق، لاہور، شمارہ: 4، 1966، ص: 119)

20ویں صدی تک یہ تو تھی مجمل صورت حال، البتہ اردو میں مغربی زبانوں سے ادبی تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور تکنیکی سطحوں پر گہرائی و گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا، نئے طرز احساس کو ابھارا، پیرائیہ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال کو بڑھاوا دیا اور پیرائیہ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے۔ یوں اردو ادب میں تذکرہ کی جگہ تنقید، داستان اور تمثیل کی جگہ ناول، رہس اور نوٹنکی کی جگہ ڈراما اور کہانی کی جگہ افسانہ جیسی جدید اصناف نے لے لی، اور ادبیاتِ عالم کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کا خواب ہم نے پہلی بار دیکھا۔ اور یہ سب اس وقت ہوا، جب ہم نے سو سے زائد آپ بیتیاں، ڈیڑھ سو افسانوی مجموعے، درجنوں ادبی تاریخ سے متعلق کتب، دوسو پچاس ڈرامے سے متعلق کتب، ساٹھ سفرنامے، ایک سو اٹھارہ سوانحی کتب اور ڈیڑھ ہزار ناول کتابی صورت میں نہ صرف ترجمہ کر لیے بلکہ یہ سب کچھ کتابی صورت میں شائع بھی ہوا۔ قصے، رزمیے، کہانیاں، روزنامچے، مضامین، خطوط، تنقیدی کتب اور شعری مجموعوں کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔

اکیسویں صدی میں دیگر ترجمہ شدہ غیر مدون مواد طباعت کے وقت کئی لاکھ صفحات گھیرے گا۔

ابتدا میں ادبی سطح پر، ترجمے کی معرفت ہیئت، تکنیک اور موضوعی کروٹوں سے آشنائی نئی نئی تھی اور مغربی ادبیات کی روایت کا شعور تقریباً ناپید تھا۔ جس کے نتیجہ میں تراجم ہوئے تو، لیکن انتہائی بے سلیقگی کا مظاہرہ بھی دیکھنے میں آیا۔

ایسے تراجم کا بڑا نقص یہ ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے، وہ مستند اور اہم کتب

کے ترجمے نہیں تھے۔ مثلاً جارج ولیم۔ ایم رینالڈز کے کتابی صورت میں چھپن سے زائد ترجمے ہوئے اور مختلف مترجمین نے کیے۔ اور اس پر غضب یہ کہ ترجمہ در ترجمہ ہوئے اور مترجمین نے اصل متن دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

یہی صورت ''آزاد ترجمہ'' میں سامنے آئی اور ہمارے مترجمین نے ''ڈان کیخوتے'' کو ترجمہ کرتے ہوئے ہسپانیہ کے بازاروں میں لکھنؤ کے بانکوں کو جدی پشتی دہیں کا ثابت کر دیا۔ کرداروں کے نام اور جگہوں کے آثار تو تبدیل ہوئے ہی، ان کی عادات و خصائل تک بدل گئے۔

ابتدائی مترجمین کی ترجمے کے فن سے ناواقفیت اور تن آسانی نے تراجم میں ایک نیا طرز تحریر بھی ایجاد کیا۔ جس کے لیے انگریزی میں Journalese کی اصطلاح موجود ہے۔ یعنی ایک ایسی ناقص زبان لکھی گئی، جو نہ تو خیالات کے اظہار پر قادر تھی اور نہ ہی معنی کی ترسیل پر۔ یہ اس لیے بھی ہوا کہ مشرق میں ''لفظ'' خاصیت یا داخلی شیئت کا نمائندہ ہے۔

محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں لکھا تھا کہ:

> ''ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے، جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی، دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی۔''

اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے مہدی جعفر لکھتے ہیں:

> ''ملحوظ خاطر رہے کہ بات پانی لانے کی ہے، کناروں پر تیرتے ہوئے الفاظ اکٹھا کرنے کی نہیں۔ تخلیق اور ترجمے میں بہرحال فرق ہے۔ خیر مغرب والوں نے تو اپنے پانی سے ہم مزاج الفاظ نکالے ہیں۔ ہم نے ترجمے کے ذریعے انہیں الفاظ سے شعبدہ بازی یا چونکانے کا کام لیتے ہوئے بے اعتمادی کا ثبوت دیا ہے۔''

(''اردو افسانے کے افق''، اوراق، لاہور، مئی جون 1983، ص: 357)

مہدی جعفر نے محولہ بالا مضمون میں مشرق اور مغرب کے مزاجوں کی سطح پر فرق کو ''کیمیا گری''

اور ''کیمیا دانی'' کا فرق قرار دیا ہے۔ اردو ادب کو تراجم کی معرفت کیمیا گری سے کیمیادانی کی طرف لانے کا کام یوں تو فورٹ ولیم کالج میں ہونا قرار پایا تھا لیکن اس میں بھی سرسید احمد خاں بازی لے گئے۔ عقلیت، اجتماعیت، مادیت اور حقائق نگاری سرسید ہی کی عطا ہے۔

سرسید کی معرفت مشرق کے لیے مغرب کی اس عطا کی کھوج میں نکلیں تو پتا چلتا ہے کہ ''لفظ'' کی سطح پر ہم ''داخلیت'' سے اسی زمانے میں دست کش ہونا شروع ہو گئے تھے جب سے یورپی اقوام نے ہمارے ساحلوں پر اوّل اوّل قدم رکھا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''نئے'' اور ''جدید'' ادب تک آتے آتے نہ ہماری زمینی بُو باس اپنا پتا دیتی ہے اور نہ ہی ہمارے ہاں کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حوالوں کا نشان ملتا ہے۔ اردو میں مغربی تراجم کے زیر اثر ہمارے افسانوی ادب کو مخصوص نوع کی مغربی روش کا سامنا رہا جس کے باعث ہمارے افسانوی ادب کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ اسے بڑی آسانی سے ''اینگلو انڈین ادب'' کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ادبا کو اوائل 20 ویں صدی کی قومی تحریکوں کا ہمنوا بن کر ہی ترجمے کی طرف آنا چاہیے تھا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہمیں زرق برق مغربی تہذیب اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ مخصوص معاشرتی اور سیاسی حوالوں، ذہنی رویوں، ضرورتوں اور انگریزی زبان نیز مغربی ادبیات کے پس منظر میں رکھ کر کرنا چاہیے تھا، اور یہ بھی کہ اردو زبان کے نئے عہد سے مطابقت رکھنے والی لسانی تشکیل اور اسلوبیاتی دائرہ عمل کے بارے میں منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ جس کی ضرورت اکیسویں صدی میں محسوس کی جا رہی ہے۔

محمد حسن عسکری نے مذکورہ بالا عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے اردو ترجمے کی روایت کو کھنگال ڈالا اور اس کا ردِ عمل خود ان کے تراجم ہیں۔ ادبی تراجم کے حوالے اکیسویں صدی میں عسکری صاحب کو ماڈل بنانے کی ضرورت ہے۔

ترجمہ نگاری نے مروجہ چلن پر عسکری صاحب نے سب سے بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ مجموعی طور پر ترجموں کے ذریعے ہمارے تخلیقی ادب کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ جس کی وجہ سے بڑی وجہ یہ رہی کہ ہمارے مترجمین، ترجمے کی اہمیت سے ناواقفیت کی بنا پر اسے تخلیقی مسئلہ نہیں

سمجھتے۔ ترجمے کا جواز محض موضوع یا کہانی کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں۔ اصل بات تو ترجمے کے ذریعے ترقی یافتہ زبانوں کے اسالیب کو اپنی زبان میں ڈھالنے اور رائج کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

رتن ناتھ سرشار کا سروانتیس سے ترجمہ ''خدائی فوجدار'' ہو یا قیسی رام پوری کا رینالڈز سے ترجمہ ''فسانۂ لندن''، ہمارے ہاں آزاد ترجمے کی روایت نے بڑے بڑے گُل کھلائے ہیں اور ترجمے کے مذاق کو خراب کرنے میں انہی آزاد ترجموں کا ہاتھ رہا ہے۔ پھر اردو نثر اور بالخصوص افسانے پر آسکر وائلڈ اور دیگر مغربی جمال پرست ادبا کے غالب اثر کی مذمت کی جاتی ہے اور اسے اردو نثر کی اسلوبیاتی روایت کے لیے نقصان دہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بات مکمل طور پر قبول نہیں کی جاسکتی۔ جہاں تک تراجم کے زیر اثر زبان کو بڑھاوا دینے کا معاملہ ہے تو اس میں مولانا حامد علی خاں، لطیف الدین احمد، جلیل قدوائی، مجنوں گورکھپوری اور خواجہ منظور حسین جیسے جمال پرست ادیبوں کی عطا سے انکار کیسے ممکن ہے؟

سجاد حیدر یلدرم سے تاحال ترجمے کے عمل پر اخفائے حال کی تہمت بھی لگتی آئی ہے لیکن ہر دور میں بعض مترجمین نے جب سیاسی یا سماجی جبر کے خلاف (تخلیقی سطح پر) براہ راست قدم نہیں اٹھایا تو وہ ایسے ادب پاروں کے ترجمہ کرنے کا سہارا لیتے آئے ہیں جن میں اس نوع کی پابندیوں کے خلاف باغیانہ لحن موجود تھا۔ البتہ مترجم کی نیک نیتی کو پرکھنے کی ایک کسوٹی اور بھی ہے، دیکھنا چاہیے کہ اس نے کس نوع کے تصورات و نظریات کی درآمد کو ضروری سمجھا اور کس نوع کے اسالیب بیان کو اپنے ادب کی بالیدگی و بلوغت کے لیے ضروری خیال کیا۔ یہ دو نکات زمانۂ حال میں پیشِ نظر رہیں تو اچھا ہے۔

ہم خواہ ترجمہ کو طبع زاد نہ ہونے کے سبب ثانوی درجہ ہی کیوں نہ دیں، اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ اقوامِ عالم میں اختلاط کا نہایت عمدہ وسیلہ ہے۔ یہ باہمی لین دین کا ایک اٹوٹ سلسلہ ہے جو ہمیشہ بنی نوع انسان کے لیے سودمند ثابت ہوا۔ مثال کے طور پر اگر مذہبیات میں ہم اناجیل، قرآن اور وید، ادبیات میں الف لیلہ، رباعیات عمر خیام، حکایات سعدی، شیکسپیئر اور ابسن کے ڈراموں اور فلسفہ کی سطح پر، افلاطون و ارسطو کی فلاسفی سے روشناس

نہ ہوتے تو ہم کتنے ہی طبقات کی فکری اور تمدنی حیثیتوں سے قطعاً ناواقف رہتے۔ اس طرح اگر عمر خیام اور رابندر ناتھ ٹیگور کو مغرب میں تراجم کے ذریعے روشناس نہ کروایا جاتا تو مغربی اذہان، مشرق سے کماحقہ واقفیت حاصل کرنے میں ایک طویل وقت لیتے۔ لہٰذا آج ہمیں ہاکنگ، باختن اور رولاں بارت سے قربت اختیار کرنا پڑے گی۔

دِیے سے دِیا جلتا ہے۔ تمام انسانیت آج کہیں زیادہ روشن فضا میں سانس لے رہی ہے اور باہمی طور پر اس طرح آپس میں جڑی ہوئی ہے جیسے شہ رگ کے ساتھ بدنی نظام۔ تراجم کے اس تمدن کے ہمہ گیر اثرات عالمی سطح پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ ہر زبان و ادب کے امتیازی جوہر خود اس کے اپنے زبان و ادب ہی میں نمو پاتے ہیں کہ وہ براہ راست اس زبان و ادب کے قومی شعور کی پیداوار ہوتے ہیں لیکن ترجمہ اس کی حدود کو لامحدود کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے اور ہر زبان کی ادبیات کے محدود و مخصوص دھارے میں ایک اور زبردست دھارے کا اضافہ کر دیتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو پریم چند کے فوراً بعد مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں ایڈگر ایلن پو کے زیر اثر تحیر اور اسرار کی جو انوکھی فضا بندی دیکھنے میں آتی ہے وہ تکنیکی اور موضوعی حوالوں کے ساتھ اسلوبیاتی سطح پر بھی خاصے کی چیز ہے جبکہ مجنوں کے افسانے جہاں اسلوبیاتی سطح پر فکر محض کی زبان کو اردو فکشن میں پہلی بار متعارف کروانے کے سلسلے میں یادگار ہیں وہیں پر ان کی گہری سنجیدگی اور 'محسوسات کے بیان پر قدرت' انگریزی اور دیگر مغربی ادبیات سے گہرے شغف پر دال ہے۔ خیر یہ تو ہوئیں اثر و قبول کی دو ایک امثال۔ لیکن جہاں تک اسلوبیاتی سطح پر ردّ و قبول کا معاملہ ہے تو ہمارے ہاں کے مترجمین نے ہمیشہ ''روانی'' اور 'سلاست' کی ہی تمنا کی ہے اور ہمارے اکثر ناقدین نے اسی روانی اور سلاست کو ترجمے کی خوبی گنوایا ہے۔

بڑا مترجم وہ ہے جو متمول زبانوں سے ترجمہ کرتے وقت یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی اپنی مفلس زبان کے رہے ہوئے کھانچے بھر جائیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے محمد حسن عسکری نے فلابیر، ظ۔ انصاری اور شاہد حمید نے روسی لانگ فکشن، محمد سلیم الرحمن نے ہومر اور ممتاز شیریں

نے جان سٹین بک کو ترجمہ کرتے وقت گنجلک اور طویل جملوں کو اردو جیسی قدرے نئی زبان میں منتقل کرنے کا جتن کیا۔

حیران کن بات یہ ہے کہ ہمارے بیشتر مترجمین نے روانی اور سلاست کی دوڑ میں یہ نہیں سوچا کہ اردو نثر کا بڑا مسئلہ تو طویل اور پیچیدہ جملہ لکھنے کا ہے اور اگر کسی ترقی یافتہ زبان کے فن پارے میں تخلیق کار نے پیچیدہ تر احساسات و جذبات کو لفظوں میں منتقل کرتے وقت یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو کوشش کر کے اسے انہی قواعد وضوابط کے ساتھ اردو میں کیوں نہ منتقل کر لیا۔ اس سے ہماری زبان میں بھی اسلوبیاتی سطح پر کوئی نئی راہ سوجھنے کا امکان پیدا ہوتا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ اردو نثر میں گنجلک تجربات اور پیچیدہ جذبات و تجربات کو سہارنے کی قوت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ''اور''، ''اگر''، ''لیکن'' وغیرہ لگا کر جملوں کو جوڑتے چلے جانے سے بڑا جملہ نہیں بنتا ہے۔ سو کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان اور ادبیات نے ترجمے کے ایک عظیم جوکھم سے نبرد آزما رہنے کے باوجود خاطر خواہ حد تک فائدہ نہیں اٹھایا۔

نذیر احمد دہلوی کی تمثیلیں اسٹی ون سن کے ''ٹریژر آئی لینڈ'' کی طرح کی ہیں۔ نذیر احمد پر دوسرا بڑا اثر جارج ایلیٹ کے ناولوں کا تھا خصوصاً کردار کی پیشکش میں نفسیاتی تجزیہ نگاری جو جارج ایلیٹ ہی سے مخصوص ہے۔

رتن ناتھ سرشار کا ''فسانۂ آزاد'' اور ''خدائی فوجدار'' ہر دو تحریریں سروانتیس کے ''ڈان کیخوتے ڈی لامانشا'' سے جنم لیتی ہیں اور کچھ یہی معاملہ سجاد حسین کے ''حاجی بغلول'' کا ہے۔ ہم نے اخذ و استفادہ کا یہ سلسلہ آگے ہی نہیں بڑھایا۔

ہمارے اولین ناول نگار عبدالحلیم شرر کی تاریخی ناولوں کی عمارت سر والٹر اسکاٹ اور رچرڈسن کی فراہم کردہ بنیادوں پر کھڑی ہے۔ جبکہ انھوں نے ایک ترجمہ رینالڈز کے ناول کا ''خوبیٔ قسمت'' کے نام سے بھی کیا۔ اسلوبیاتی سطح پر شرر نے بے قافیہ شاعری کے مصرعوں کو ایک آزاد تسلسل میں مربوط رکھنے کا جتن کیا ہے جو سراسر اسکاٹ سے مخصوص ہے۔ سر والٹر اسکاٹ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اسلوبیاتی سطح پر اسکاٹ کے اثرات شرر سے حکیم محمد علی خاں تک پہنچے۔

مرزا ہادی رسوا نے ماری کوریلی کے پانچ جاسوسی ناولوں کو''خونی بھید''،''خونی جورو''، ''خونی مصور''،''خونی عاشق'' اور''بہرام کی رہائی'' کے نام سے 1928 تک ترجمہ کر کے طبع کروا دیا تھا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ انھوں نے اپنی طبع زاد فکشن میں جاسوسی عنصر کو شامل نہیں ہونے دیا۔ البتہ جاسوسی ادب سے اثر پذیری، ظفر عمر کے ہاں باقاعدہ سراغرسانی کے ادب میں ڈھل گئی۔ اور تیرتھ رام فیروز پوری کے طبع زاد ناول اس سے اگلا قدم ہیں۔ جبکہ بطور مترجم تیرتھ رام فیروز پوری نے ایک سو دس ناولوں کے تراجم مطبوعی کتابی صورت میں یادگار چھوڑے۔

مغرب کے معروف ناول نگاروں میں آر ایل۔اسٹیونسن (مترجم: مولانا عبدالمجید سالک) ارنسٹ ہیمنگوے (مترجم: شاہد حمید، اشفاق احمد، ابن سلیم، بشیر ساجد) اروِنگ سٹون (مترجم: سید قاسم محمود) اسٹیفن کرین (مترجم: انتظار حسین) اشروڈ اینڈرسن (مترجم: محمد حسن عسکری) اگناٹ ہرمن (مترجم: حمید اختر)، البرتو موراویا (مترجم: ایس۔ اختر جعفری)، البیر کامیو (مترجم: بشیر چشتی۔ ڈاکٹر افضل اقبال۔ محمد عمر میمن۔ انیس ناگی)، الفرڈ نیومین (خواجہ عبدالکریم)، الگزینڈر ڈوما (مترجم: تیرتھ رام فیروز پوری)، الگزینڈر کپرن (ن۔م۔راشد)، اناطول فرانس (مترجم: مولوی عنایت اللہ دہلوی۔عبدالرزاق ملیح آبادی)، او۔ہنری (مترجم: ابن انشا۔سلیم صدیقی)، ایڈگر ایلن پو (مترجم: ابن انشا)، ایڈگر رائس (مترجم: ایم۔ جے عالم)، ایرچ سیگل (مترجم: ستار طاہر)، ایرک میریا ریمارک (مترجم: احسن طاہر)، ایف۔ایل۔گرین (مترجم: ابو سعید قریشی)، ایلزبتھ کوئس ورتھ (مترجم: مولانا عبدالمجید سالک)، ایمائل زولا (مترجم: سید حسن رضوی)، ایوان بنین (مترجم: نذر صدیقی)، بالزاک (مترجم: سیدہ نسیم ہمدانی۔ یوسف عباسی) پرل۔ ایس۔ بک (مترجم: اختر حسین رائے پوری۔ ابو سعید قریشی۔ قمر نقوی۔ احسان علی۔ یوسف ظفر)، ٹامس ہارڈی (مترجم: مجنوں گورکھپوری۔ رئیس احمد جعفری۔ شفیق بانو منہاج)، جارج ایلیٹ (مترجم: محمد سعید)، جارج ولیم۔ ایم رینالڈز (مترجم: تیرتھ رام فیروز پوری۔ مولانا ظفر علی خاں۔ عبدالحلیم شرر۔ امیر حسن کاکوروی۔ کندن لال شرر۔ صدیق احمد۔ اثر لکھنوی۔ نوبت رائے نظر۔ بابو پرشاد۔ شمیم بلہوری۔ لالہ دیناناتھ)، جان سٹین بک (مترجم:

ابن انشا۔ ممتاز شیریں۔ زہرا سیدین۔ مظہر انصاری)، جان ماسنرز (مترجم: سید قاسم محمود)، جوہان ہنرج پستالوزی (مترجم: غلام حسین)، جے۔ بی وڈ ہاؤس (مترجم: ستار طاہر)، جیک شیفر (مترجم: شان الحق حقی۔ غلام حسین)، چارلس ڈکنز (مترجم: خان احمد حسین خاں۔ فضل الرحمن)، ڈی۔ ایچ لارنس (مترجم: سیدہ نسیم ہمدانی)، رڈیارڈ کپلنگ (مترجم: مولانا ظفر علی خاں۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی)، ساؤمنگ (مترجم: محمد خلیق)، ستاں دال (مترجم: محمد حسن عسکری)، سمرسٹ ماہام (مترجم: ڈاکٹر سید محمد عقیل) سنکلیئر لوئیس (مترجم: عابد علی عابد)، سروانتس (مترجم: رتن ناتھ سرشار۔ سجاد حسین)، شارلٹ برانٹے (مترجم: سیف الدین حسام) فرانسوا ساگاں (مترجم: ستار طاہر) گستاؤ فلابیئر (مترجم: محمد حسن عسکری۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی)، فیلکن سالٹن (مترجم: ظہور الحسن ڈار)، کرسٹوفر اشروڈ (مترجم: محمد حسن عسکری) کلیئرنس ڈے (مترجم: جاوید شاہین)، کینتھ رابرٹس (مترجم: سید قاسم محمود)، گوڈفرے لیاس (مترجم: شاہد احمد دہلوی)، گوئٹے (مترجم: ڈاکٹر محمد افضل)، لوئیز السکاٹ (مترجم: حجاب امتیاز علی۔ اشرف صبوحی)، لوئیس بروم فیلڈ (مترجم: مولوی عنایت اللہ دہلوی)، جین آسٹن، لیوٹالسٹائی (مترجم: شاہد حمید)، مس کون کوئسٹ (مترجم: صادق الخیری)، موپاساں (مترجم: سید قاسم محمود۔ نصیر حیدر۔ نوح فاروقی۔ سخی حسن نقوی۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ طاہر قریشی)، میڈوز ٹیلر (مترجم: محمد رئیس الزماں خاں رئیس)، نیتھنیل ہاتھارن (مترجم: سیدہ نسیم ہمدانی)، نٹ ہیمس (مترجم: عشرت رحمانی)، سر والٹر اسکاٹ (مترجم: عبدالحلیم شرر)، وکٹر ہیوگو (مترجم: سعادت حسن منٹو۔ رام سروپ شرما۔ بشارت انور)، والٹیئر (مترجم: سجاد ظہیر۔ بشیر ساجد)، ولیم سرویاں (ن۔ م۔ راشد۔ شفیق الرحمن۔ سید رضی ترمذی)، ہال کین (مترجم: ایم۔ اسلم)، دوستوفسکی (شاہد حمید)، (ہاورڈ فاسٹ (مترجم: انیس اعظمی۔ احسن علی خان)، ہرمن میلول (مترجم: محمد حسن عسکری)، ہنری جیمز (مترجم: قرۃ العین حیدر)، ہنری رائڈر ہیگرڈ (مترجم: سلمیٰ تصدق۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مظہر الحق علوی۔ آغا اقبال۔ بشیر احمد اختر۔ منشی خلیل الرحمن۔ عاصم صحرائی۔ ثریا اقبال۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی)، ہیرلڈ لیم (مترجم: عزیز احمد۔ گلزار احمد۔ احمد یوسف عباسی۔ جمیل نقوی۔ اختر عزیز اختر۔ غلام رسول مہر۔ وزیر الحسن عابدی۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔ محمد ہادی حسین)۔ یہ چند ایسے نام ہیں جن کے اردو

میں ترجمے سے ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ ناول کا چلن عام ہوا بلکہ ناول کے عناصر ترکیبی کو بھی سمجھنے میں مدد ملی۔ اور اب جو سٹائن گارڈ، عمر ریو ابیلا، رفیق شامی، ہائزش بوئیل اور حوزے سارا ماگو تک کے نئے نام ترجمہ ہو گئے۔

پارسی اسٹیج کے فروغ کے ساتھ ہی انگریزی اسٹیج ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع ہوا اور ولیم شیکسپیئر کی عالمگیر شہرت سے باکس آفس پر کامیابی کا تصور بندھا لیکن افسوس کہ شیکسپیئر کے بیشتر تراجم ناقص ہیں۔ ان میں پلاٹ کی تبدیلیاں کی گئیں۔ مقامی رنگ میں اس قدر رنگ دیا گیا کہ پہچان مشکل ہو گئی۔

اس فعل قبیح میں ڈرامے کا اولین دیسی مترجم احسان اللہ شامل تھا۔ جس نے شیکسپیئر کے ''اوتھیلو'' کا ترجمہ 1890 میں شائع کروایا۔

سو ڈراما کے باب میں ہمارا پہلا قدم ہی غلط پڑا۔ کہا جا سکتا ہے کہ باکس آفس پر کامیابی کی خواہش نے ہمیں مغربی ڈرامے کی فنی خوبیوں سے دور رکھا۔

سوائے ''جولیئس سیزر'' کے دو ترجموں از عزیز احمد اور سید فیضی ''رومیو جولیٹ'' کے دو ترجموں از عزیز احمد اور مولوی عنایت اللہ دہلوی، ''اوتھیلو'' کے ایک ترجمے از عزیز حامد مدنی اور ''انطونی و قلوپطرہ'' کے ایک ترجمے از شان الحق حقی کے کسی ترجمے کی داد نہیں دی جا سکتی جبکہ شیکسپیئر کے ہمارے ہاں دو سو سے زائد ترجمے ہوئے اور مارس میتر لنک کے ترجموں کی بھی کم و بیش یہی صورت ہے۔

دیگر ڈراما نگاروں کے ترجموں میں ''فاؤسٹ'' از گوئٹے (مترجم: ڈاکٹر عابد حسین)، ''بگڑے دل'' از مولیئر (مترجم: محمد عمر و نور الٰہی)، سلمیٰ از آسکر وائلڈ (مترجم: انصار ناصری)، ظاہر و باطن از شیریڈن (مترجم: فضل الرحمن) چند ایسے ترجمے ہیں جن کے طفیل آگے چل کر اردو ڈرامے کو رفیع پیر، خواجہ معین، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور اسد محمد خاں جیسے اچھے ڈراما نگار مل گئے۔

مغرب کے معروف ڈراما نگاروں میں آسکر وائلڈ (مترجم: مجنوں گورکھپوری، تمکین کاظمی، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو و حسن عباس)، آندریف (مترجم: ابو سعید قریشی)، ٹی ایس ایلیٹ

(قرۃ العین حیدر)، تھارنٹن وائلڈر (مترجم: انتظار حسین، عشرت رحمانی)، ٹالسٹائی (مترجم: مجنوں گورکھپوری)، جارج برنارڈ شا (مترجم: مخدوم محی الدین و مولوی میر حسین، مجنوں گورکھپوری، محمد اکبر وفا قانی، خورشید نگہت)، جان گالزوردی (مترجم: سید قاسم محمود، منشی جگت موہن لال رواں، دیانرائن نگم)، جے۔ بی پرسٹیلے (مترجم: اظہار کاظمی، محمد خلیق)، آر چرڈ (مترجم: مخدوم محی الدین) دوستوفسکی (مترجم: کمال احمد رضوی، شاہد حمید)، رچرڈ بٹن (مترجم: بدر جہاں آراء)، سمرسٹ ماہام (مترجم: محمد اکبر وفا قانی)، سموتوف (مترجم: عبداللہ ملک)، سوفوکلیز (مترجم: شاہدہ حمید خان)، شلر (مترجم: محمد عمر و نور الٰہی)، گوئٹے (مترجم: شاہد احمد دہلوی، منشی جوالا پرشاد برق، عبدالقیوم خان باقی، منور لکھنوی، عزیز احمد)، لیسنگ (مترجم: منشی جگت موہن لال رواں، منشی محمد نعیم الرحمان)، مارس میترلنک (مترجم: نور الٰہی و محمد عمر، مجنوں گورکھپوری، وحشی محمود آبادی، شاہد احمد دہلوی)، ماس ہارٹ و جارج ایس کافمین (مترجم: سید رضی ترمذی، کمال احمد رضوی)، مولیئر (مترجم: وہاج الدین، محمد عمر و نور الٰہی)، میری چیز (مترجم: کمال احمد رضوی)، ہنرک ابسن (مترجم: عبدالشکور، فضل الرحمن، عزیز احمد، محمد صفدر)، ہنری رائیڈر ہیگرڈ (مترجم: آغا اقبال) کے تراجم قابل ذکر ہیں۔

افسانے کی صنف میں تین نام بہت ترجمہ ہوئے یعنی چیخوف، موپاساں اور رابندر ناتھ ٹیگور۔ ٹیگور کو انگریزی کی معرفت اردو میں متعارف کروانے میں پریم چند پیش پیش تھے اور یہ سلسلہ منٹو تک چلا آیا۔ منٹو نے چیخوف اور موپاساں کو نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ ان کے طرز تحریر کو عام کرنے میں حصہ لیا۔ اسی طرح ٹالسٹائی اور گورکی بھی منٹو کی معرفت اردو میں متعارف ہوئے۔

چیخوف، موپاساں اور مارس میترلنک کے ترجموں کی عطا، راجندر سنگھ بیدی، منٹو اور غلام عباس ہیں۔ ایڈگر ایلن پو اور او۔ ہنری کو بھی ہمارے ہاں خصوصی توجہ دی گئی۔ یہی سبب ہے کہ ایڈگر ایلن پو کے ابتدائی تراجم کے فوراً بعد اسی طریقہ کار کی جھلک مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کے ہاں دیکھنے کو ملی۔

سمرسٹ ماہام کو بطور افسانہ نگار ہمارے ہاں سادہ زبان اور سہل اندازِ نگارش کے باعث مقبولیت حاصل ہوئی۔ ماہام سے اثر پذیری کی سب سے بڑی مثال کرشن چندر کے افسانے

ہیں۔ روسی افسانہ نگاروں کا واضح اثر پروفیسر محمد مجیب کے اولین افسانوی مجموعے ''کیمیا گر اور دوسرے افسانے'' (مطبوعہ 1932) میں دیکھنے کو ملا۔ لطیف الدین احمد اور جلیل قدوائی ترجمہ اور طبع زاد افسانے کی ملی جلی صورتیں سامنے لاتے رہے۔ اختر حسین رائے پوری کا افسانوی مجموعہ ''محبت اور نفرت'' واضح طور پر روسی افسانوں کے اثر کے تحت رکھا گیا اور افسانوں کی انتھالوجی ''انگارے'' مرتبہ: احمد علی (1932) میں جیمز جوائس، ڈی۔ ایچ لارنس اور گستاؤ فلابیئر کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ اختر شیرانی نے شہرت تو رومانی شاعر کے طور پر سمیٹی لیکن ان کا سب سے اہم کام انتھالوجی ''دھڑکتے دل'' میں شامل آسکر وائلڈ، موپاساں اور گالز وردی کے افسانوی تراجم ہیں۔

معروف افسانہ نگاروں میں اسٹیفن کرین (مترجم: جاوید صدیقی)، ایڈگر ایلن پو (مترجم: ابن انشا)، اینڈرسن (مترجم: ریاض جاوید)، سروانتیس (مترجم: رحیم)، پریس ایس۔ بک (مترجم: قمر نقوی، یوسف ظفر)، ٹامس ہارڈی (مترجم: مجنوں گورکھپوری)، جیک لنڈن (مترجم: انور عنایت اللہ)، رابندر ناتھ ٹیگور (مترجم: منصور احمد، حامد اللہ افسر، پرتھوی راج نشتر)، اسٹیفن کرین (مترجم: جاوید صدیقی)، موپاساں (مترجم: نصیر حیدر)، مورس لیول (مترجم: امتیاز علی تاج)، واشنگٹن ارونگ (مترجم: نیاز فتح پوری، غلام عباس، سید وقار عظیم) کے کتابی صورت میں مطبوعہ تراجم نمایاں ہیں اور اب یہ سلسلہ خالد سہیل اور جاوید دانش کی مرتب کردہ کتاب ''ورثہ'' (طبع اوّل: 1993ء) تک چلا آیا۔ اس کتاب میں بھارت، قدیم مصر، ترکی، جمیکا، افریقہ، برما، جرمنی، آئیس لینڈ، سپین، کوریا، آسٹریلیا، لاؤس، برازیل، ناروے، اسرائیل، سویڈن، میکسیکو اور ایتھوپیا کی چیدہ لوک کہانیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ اس پر بس نہیں منیر الدین احمد نے جرمن ادب کے تراجم سے متعلق دو کام اس سلیقے سے کیے کہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ انہوں نے ''معاصر جرمن ادب'' کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی اس میں فرانز کافکا، برتھولٹ بریشٹ، بے نراون، ارنسٹ بلوخ، ولف گانگ بورشرٹ، بانریش ہیل، یواخیم، ایف۔ سی وائس کوپف اور ایرش فریڈ جیسے انیس (19) اہم جرمن افسانہ نگاروں کے چیدہ افسانوں کے اردو تراجم پیش کر دیئے۔ اس طرح منیر الدین احمد کی جرمن افسانہ نگاروں

سے متعلق ایک کتاب ''آدمی جس نے اپنے آپ کو بھلا دیا'' کے عنوان سے سامنے آئی۔ اس کتاب میں فرانز کافکا، بی۔ ٹراون، برتھولٹ، بریشٹ، اناز یگرس اور وولف گانگ بورشرٹ کے افسانوں سمیت تیس افسانہ نگاروں کے افسانے دیکھے جاسکتے ہیں۔

لاطینی امریکہ کے افسانوں کے تراجم پر مبنی آصف فرخی کی کتاب ''موت اور قطب نما'' میں گریگوریولوپیز، ای۔فونٹیس، رابن داریو، بورخیس، مارکیز، اوکتایو پاز اور کارلوس فونٹیس سمیت کئی ایک اہم افسانہ نگاروں کے افسانے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

سفرنامہ کی صنف ہمارے ہاں نئی نہیں اور نہ ہی ہمارے ہاں ''سفرناموں کے تراجم خاطر خواہ حد تک ہوئے۔ لیکن ہمارے سفرنامہ لکھنے والوں پر مغربی سفرنامے کے اثرات نمایاں ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ جدید سفرناموں کی مغربی فضا بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا اردو سفر نامہ اپنی قدیم روایت کے مقابلے میں سفرنامہ کم اور 'ویوکارڈ' زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

خالد سہیل اور جاوید دانش نے اس خصوص میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور دنیا بھر کے سیاہ فام شعراء، افسانہ نگاروں اور ڈراما نگاروں کی چیدہ تخلیقات پر مبنی ایک انتخاب ''کالے جسموں کی ریاضت'' کے عنوان سے شائع کر دیا۔ اس انتخاب میں یگاندا (یوگنڈا)، باولی اور برنارڈ ڈاڈی (کوٹی ڈی آئیوری)، ہوسا (نائجر)، باشی (زائر)، کین تھیمبا (ازانیہ)، ارنی ڈنگو، مورین وانسن، میری ڈورو، شرمین گرین، کیتھ واکر، پینزی نیپل جاری، ایوا جانسن، سٹیون کلیٹن (آسٹریلیا)، نیبو مونیوکوزو اور کلن موسناش (ناروے) نیز مارٹن لوتھر کنگ، مایا انجیلو اور زہرا ہرسٹن (امریکہ) کی تخلیقات کے تراجم یکجا کر دیے گئے۔

منیر الدین احمد نے جرمن شعرا پر بھی توجہ مرکوز کی اور یوں ان کی کتاب ''معاصر جرمن ادب'' میں ایریش کیسٹنر، برتھولٹ بریشٹ، ایریش فریڈ، ہانس ماگنس اینسنز برگر، گنتھر آئش، پیٹر شیٹ، گنتھر کونرٹ، روزے آؤ سلینڈر، اُلاہان، کرسٹوف میکل، انگے بورگ باخمان، ایف۔سی ڈے لیئر اور دوبوفلوئیر وغیرہم کی شاعری دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ منیر الدین احمد کے منظوم تراجم سے متعلق کتاب ''جیون سائے'' اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں ہمیں مشہور جرمن شاعر ایرش فریڈ کی ایک سو نظمیں یکجا مل جاتی ہیں۔

اردو میں منظوم تراجم کے باب میں انور زاہدی کی کتاب ''بارشوں کا موسم'' معروف جرمن ناول نگار اور ''سدھارتا'' کے خالق ہرمن ہیسے کی شاعری کو اردو میں متعارف کروانے کے حوالے سے یاد رکھی جائے گی۔ جبکہ آسٹریا کی جدید شاعری کو ''ایک نظر کافی ہے'' کے عنوان سے اردو میں پہلی بار متعارف کروانے کا سہرا محمد اکرام چغتائی اور اسلم کولسری کے سر ہے۔

○

اطلاع اساس معاشرہ کا تصور اور اردو زبان

پروفیسر شافع قدوائی

شعبۂ ترسیل عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تجسس اور ترسیل نہ صرف فطرت انسانی کا لازمی خاصہ ہیں بلکہ یہی خصوصیات انسان کو دیگر نوامیس فطرت کے بالمقابل ایک منفرد تشخص بھی عطا کرتی ہیں۔ اکیسویں صدی میں تعقل اور علم پر انحصار کے بجائے اطلاع اور معلومات کی فوری اور بے محابا خواہش نے ایک نئے اجتماعی آشوب کو جنم دیا ہے جہاں اطلاع اقتدار کے کھیل کا بنیادی آلۂ کار بن گئی ہے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس کے پاس خریدنے اور بیچنے کی قوت کے علاوہ اطلاعات کا ایک سیلِ بے پایاں ہے۔ اب اطلاعاتی تکنالوجی سے کسبِ فیض کر کے عالمی سطح پر ایک متجانس معاشرہ کے خواب کو اب بڑی حد تک شرمندۂ تعبیر کر لیا گیا ہے۔ اطلاعاتی تکنالوجی اور کمپیوٹر کے حوالے سے صورت پذیر ہونے والا معاشرہ اصلاً مابعد صنعتی معاشرہ ہے جسے ماہرین بشریات عمرانیات اور اقتصادیات نے اطلاع اساس معاشرہ کا نام دیا ہے۔ اس عہد کا شناس نامہ خارجی اور داخلی ہر دو سطحوں پر ذرائع ترسیل کا نفوذ ہے۔ ہمارے تمام اعمال و افعال ذرائع ابلاغ کی فراہم کردہ

اطلاعات پر منحصر ہوتے ہیں۔ حسن و قبح اور رد و قبول کے فیصلے ذرائع ابلاغ علی الخصوص ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے رہینِ منت ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی کی بنیادی اقدار اور رسومیات کا تعین بھی ذرائع ابلاغ کرنے لگے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ہمیشہ تیوہاروں اور تقریبات کا انعقاد یا تو مذہب یا پھر معاشرتی رسومیات اور تہذیبی روایات کا تابع ہوتا ہے۔ تاہم اب ہم ایسے تیوہار بڑے جوش و خروش کے ساتھ مناتے ہیں جن کی اشاعت و ترویج ذرائع ابلاغ کرتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ اساس حقیقت ہی اصل حقیقت بن گئی ہے۔ Media Generated Events نے روایتی تقریبات پر سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔ سینٹ ویلینٹائن ڈے، مدرس ڈے، فادرس ڈے وغیرہ اس اجمال کی تفصیل پر گواہ ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے معاشرے کو عالمی سطح پر بعض استثنائی مثالوں سے قطع نظر اطلاع اساس معاشرہ (Information Society) کہا جانے لگا ہے۔ کمپیوٹر مرکوز معاشرہ کو اطلاع اساس معاشرہ کے لقب سے نوازے جانے کے علاوہ ہمارے دور کے امتیازات کو نشان زد کرنے کے لیے بعض دیگر اصطلاحیں مثلاً مابعد صنعتی معاشرہ (Post Industrialist Society)، مابعد جدید معاشرہ (Post Modern Society)، علم اساس معاشرہ (Knowledge Society)، ٹیلی ٹیک سوسائٹی، اطلاعاتی انقلاب اور نیٹ ورک معاشرہ بھی استعمال کی جاتی ہیں اور ان اصطلاحوں میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے، ان سب اصطلاحوں میں اس امر پر اتفاق ہے کہ گزشتہ چار دہائیوں میں عالمی سطح پر جس نئے معاشرے کے خدوخال واضح ہوتے ہیں اس میں بنیادی اہمیت اطلاع کے مسلسل بہاؤ کو حاصل ہے۔

اس مختصر سے مقالے میں اولاً اطلاع اساس معاشرہ کلے امتیازی عناصر اور تشکیلی عوامل کو نشان زد کرنے کی کوشش کی جائے گی اور پھر عالم کاری (Globalization) کے تناظر میں زبان و ادب کے امکانات کو مختصراً موضوع مطالعہ بنایا جائے گا۔ اس امر پر بھی توجہ مرکوز کی جائے گی کہ اطلاع اساس یک ثقافتی معاشرے (Unicultural Society) میں جہاں یک زبانیت (Monolingulaism) روز بروز مرکزیت حاصل کرتی جارہی ہے، اردو زبان و ادب کے بقا

اورفروغ کی کیا صورت ہوگی۔

ہمارے موجودہ معاشرے میں اطلاع، اطلاعاتی تکنالوجی، ذرائع ابلاغ اور تعاملی ذریعۂ ترسیل (Interactive Media) کا کیا رول ہے اور ذرائع ابلاغ ہماری خارجی و داخلی زندگی میں کس حد تک نفوذ کر چکے ہیں، یہ ایک اہم تہذیبی اور عمرانی سوال ہے۔ اطلاع اساس معاشرہ کی اصطلاح سب سے پہلے امریکہ کے مشہور ماہر اقتصادیات Fritz Machlup نے 1962 میں شائع ہونے والی اپنی کتاب The Production and Distribution of Knowledge in the USA میں استعمال کی تھی۔

Machlup نے تحقیق پر Patent کے اثرات کو خاطر نشان کرتے ہوئے علم بطور صنعت (Knowledge as Industry) کا تصور پیش کیا۔ ان کے مطابق علم کو پانچ زمروں تعلیم، تحقیق، زبان، عوامی ذرائع ابلاغ اور اطلاعاتی تکنالوجی میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ مصنف کے مطابق 1959 میں امریکہ کا Gross National Product نالج انڈسٹری کا پیداواری حصہ 29 فی صد تھا۔ چھٹی اور ساتویں دہائی سے پیداوار مرکوز اقتصادی نظام علم کی طرف راجع ہونے لگا اور اس کے نتیجے میں اطلاع اساس معاشرہ صورت پذیر ہوا۔

اطلاع اساس معاشرہ سے مراد ایک ایسا سماج ہے جہاں اطلاع کی تخلیق، تقسیم، نفوذ، استعمال اور پھر اس کا Manipulation ایک اہم اقتصادی، سیاسی، تہذیبی سرگرمی سمجھی جاتی ہے۔ اس معاشرہ میں پیداواری ذرائع سے زیادہ اہمیت اطلاعاتی تکنالوجی کو حاصل ہوتی ہے۔ ڈینیئل بیل (Daniel Bell) کے مطابق اطلاع زمرہ میں کام کرنے والے ملازمین کی تعداد سے معاشرہ کے اطلاعاتی کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مابعد صنعتی معاشرہ کا انحصار خدمات (Services) پر ہے۔ اب محض جسمانی قوت یا توانائی درکار نہیں ہے کہ ''اطلاع'' سب سے زیادہ قابلِ قدر شے ہے۔ اطلاع اساس معاشرہ میں زیادہ تر ملازمت پیشہ افراد مرئی اشیا کی پیداوار سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ ان کا تعلق اطلاعاتی تکنالوجی اور ذرائع ابلاغ یعنی کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبار اور دیگر ترسیلی ذرائع سے ہوتا ہے۔

ایلون ٹیورائن (Alain Touraine) کے مطابق مابعد صنعتی معاشرہ میں ایسی علامتی اشیا

منصۂ شہود پر آتی ہیں جنھوں نے اقدار، ضروریات اور نمائندگی کے تصور کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ صنعتی معاشرہ نے ذرائع پیداوار کی تقلیب کر دی تھی مگر مابعد صنعتی یا اطلاع اساس معاشرہ نے پیداوار کے حتمی نتیجے یعنی ثقافت کی تقلیب کر دی ہے۔ ثقافت کا سب سے بڑا مظہر زبان اور ادب ہے۔ اطلاع اساس معاشرہ میں اقتصادی نظام ذرائع ابلاغ کے محور پر گردش کرتا ہے اور یہ ہمیشہ معاشرہ کی مداخلت کا ہدف بنا رہتا ہے۔ اسی باعث اسے Programmed Society بھی کہا جاتا ہے۔ یہ معاشرہ، پیداوار، تنظیم، تقسیم اور صارفیت کے ایسے نئے ماڈل کی تشکیل کرتا ہے جو ثقافتی تشخص سے یکسر عاری ہوتا ہے۔ اس معاشرہ میں تحقیق، تعلیم، زبان اور ادب انفرادی تجربہ کو محیط ہونے کے بجائے Industrialized ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اطلاع مرکوز معاشرہ سرمایہ دارانہ نظام کی Self-referential Economy کی ایک نئی تعبیر کو سامنے لاتا ہے۔

لیوتار نے اپنی کتاب Post Modern Conditions میں لکھا ہے کہ گزشتہ چند دہائیوں میں علم پیداوار کے ایک خاص ذریعہ کے طور پر سامنے آیا ہے۔ علم بھی ایک commodity بن گیا ہے۔ اطلاع مرکوز معاشرہ میں علم کے دروازے عام آدمی پر بھی کھول دیے جاتے ہیں کہ اطلاعاتی تکنالوجی معاشرہ میں وسیع پیمانے پر نفوذ کر جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں مرکزی اداروں اور تنظیموں کے مہابیانیہ (Grand Narratives) شکست سے دو چار ہو جاتے ہیں۔

فلپ سونٹاک کے مطابق اطلاع اساس معاشرہ میں ملازمین کی اکثریت اطلاع زمرہ سے متعلق ہوتی ہے یعنی ان کا تعلق اطلاعات، علامات اور سگنلوں سے ہوتا ہے۔ اطلاع مرکوز معاشرہ ایک ایسی سائنسی تہذیب کو جنم دیتا ہے جہاں خدمات، تعلیم اور تخلیقی سرگرمیوں کو آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس معاشرہ میں زبان اور ادب بھی ذرائع پیداوار کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔

نکوسٹر (Nicosther) کے مطابق معاصر معاشرہ اطلاع اساس اس لیے ہے کہ سائنسی اور تکنالوجی علم زندگی کے ہر شعبۂ حیات پر حاوی ہو گیا ہے۔ مصنف کے مطابق نالج سے مراد

سماجی علم کی صلاحیت سے ہے۔ اب معاشرہ کے مختلف ترجیحات اور پروگراموں کے تحت علم از سرنو نظم کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے ایسے نئے پیشے منصۂ شہود پر آجاتے ہیں جن کا تعلق اطلاع اور knowledge کی ترسیل سے ہوتا ہے۔

ایلون ٹوفلر کا خیال ہے کہ اطلاع اساس معاشرے کی معیشت میں Knowledge مرکزی قوت کی حامل ہوتی ہے۔

گزشتہ کئی برسوں میں ہمارے معاشرہ میں نیٹ ورک سوسائٹی کے تصور کو مقبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ نیٹ ورک منطق کی اساس اطلاع، ہمہ گیری، لچک اور اطلاعاتی تکنالوجی کے ارتکاز پر قائم ہوتی ہے۔ نیٹ ورک ہمارے معاشرہ کی نئی معاشرتی (Morphology) کا استعارہ بن جاتا ہے۔ نیٹ ورک اصلاً اطلاعیت (Informationalism) پر مبنی ہوتا ہے اور یہ معاشرہ کے اعصابی نظام کی صورت رکھتا ہے۔

اطلاع اساس معاشرہ اطلاعاتی تکنالوجی اور ذرائع ابلاغ کے توسط سے ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کا خواہاں ہوتا ہے جو اپنی اصلاً میں متجانس یعنی Homogenous ہو حتی کہ ثقافتی مظاہر بھی وحدت کی کڑی میں پروئے ہوئے ہوں۔ اطلاع مرکوز معاشرہ کمپیوٹر اور انٹر نیٹ کے توسط سے جس نئی دنیا کی تخلیق کر رہا ہے وہاں اصل حقیقت سے کہیں زیادہ اہمیت virtual reality کو حاصل ہے۔ عالم کاری کے تصور کو فروغ حاصل ہوا ہے، اب دنیا کے تمام بڑے شہر ایئر پورٹ، شاپنگ مال اور فوڈ اسٹور کی بہتات کی وجہ سے اپنے انفرادی تشخص سے محروم ہو چکے ہیں۔ دہلی کا فائیو اسٹار ہوٹل ہو یا نوئیڈا کے شاپنگ مال، اب ان میں اور لندن اور ہانگ کانگ کے شاپنگ مال میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ لہٰذا اب لذت کوشی کے لیے سیاحت کے کوئی معنی نہیں رہ گئے ہیں۔ کسی مقام پر گئے بغیر وہاں پر موجود ہونے کا تجربہ کمپیوٹر کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں تروپتی کے مندر میں Virtual Visit کے ذریعہ چڑھاوا بھی چڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ پروہت کس طرح یہ چڑھاوا چڑھا رہا ہے اور مندر کے اندر بلکہ اس کے گربھ گرہ میں بھی ہونے کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

عالم کاری کی روز افزوں مقبولیت نے ثقافتی امتیازات کے تصور کو بھی مشتبہ بنا دیا ہے۔

ثقافت کا سب سے موثر اور طاقت ور مظہر ''زبان'' اس یورش کی زد پر ہے۔ موبائل فون کے ایس ایم ایس اور انٹرنیٹ کے ذریعہ یک زبانیت (Monolingualism) ایک تلخ حقیقت کے طور پر سامنے آئی ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں بعض ماہرین عمرانیات اور لسانیات کے مطابق 4 سو زبانیں اور بولیاں صفحۂ ہستی سے مٹ گئی ہیں اور آنے والے 5 برسوں میں صرف چھ زبانیں انگریزی، فرانسیسی، چینی، جرمن، ہسپانوی اور عربی ہی بطور زبان باقی رہیں گی اور بقیہ زبانیں بڑی حد تک طاق نسیاں کی زینت بن جائیں گی۔

اطلاع اساس معاشرہ میں جب زبان کا وجود ہی خطرہ میں ہے تو ادب کے فروغ کی کیا صورت ہوگی یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ اطلاع اساس معاشرہ میں تخلیقی انفرادیت یا تخلیقی نبوغ کے اظہار کی کیا شکل ہوگی یہ ایک اہم سوال ہے۔ اطلاع اساس معاصر معاشرہ جو اصلاً نیٹ ورک معاشرہ بھی ہے تخلیقی فن کاروں کی کثرت پر قدغن عائد کر کے ایک اسٹار پرفارمر پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرتا ہے اور پھر ذرائع ابلاغ اپنی تمام تر ترغیبی قوت کے ساتھ اس کی تخلیقات کی تشہیر کرتا ہے۔ ہیری پوٹر سیریز کی کتابوں کی مقبولیت اس اجمال کی تفصیل پر دال ہے۔ کتاب چھپنے سے پہلے اس کی فروخت اور مارکیٹنگ کا عمل مکمل ہو جاتا ہے اور صرف مقبول عام ادب لکھنے والوں کو زیادہ تر اشاعتی ادارے اہمیت دیتے ہیں۔ میلان کنڈیر اور مارکیز نے Knowledge Economy کی اس اوش کی مذمت کی ہے۔ ادب ہی نہیں بلکہ دیگر فنون ہائے لطیفہ میں حسن و قبح کا معیار قبول عام ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس کے پاس خریدنے اور بیچنے کے سوا کوئی اور قوت نہیں ہے، سنجیدہ اور نہائی اعتبارات (Ultimate Concerns) پر استوار ادب کو توجہ کا مرکز شاذ ہی بناتا ہے۔

اطلاع اساس معاشرہ میں انسان کی دلچسپی اور توجہ کے مختصر وقفہ کے تمام تر امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ٹیلی ویژن سیریل اور نیوز پروگرام میں بھی قاری کی توجہ کو گرفت میں رکھنے کے لیے ہمیشہ آویزش یا Fight کو پیش منظر میں رکھا جاتا ہے۔ ادب سے بھی فوری ردعمل کو برانگیخت کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ زبان کے مقبول عام تصور یعنی عام بول چال کے الفاظ کو سکہ بند معیاری الفاظ پر ترجیح دی جاتی ہے۔

زبان اور ادب تہذیب نفس کا وسیلہ بننے کے بجائے مادی حصول اور تجارتی رابطہ کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مزاح اور جرائم ایسے موضوعات ہیں جن میں عوام کی توجہ مبذول کرانے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔حقیقت کی بصری پیش کش کے لیے پلاٹ کے بجائے Storyboard پر اصرار کیا جانے لگا ہے۔اطلاع مرکوز معاشرہ ادب کے ایسے تصور کو توجہ کا مرکز بناتا ہے جو خیالات، علامات، کوڈ، متن، لسانی امتیازات، پیکر اور تاثراتی اظہار کے باہمی ادغام پر مبنی ایک مخلوط پیکر پیش کرتا ہے جس سے سکون، خوشحالی، فلاح، اطمینان، جوش، مسرت اور حرماں نصیبی کا بیک وقت احساس ہو۔زبان کی تعلیم و تفہیم کمپیوٹر اساس لسانی کھیلوں کی رہین منت ہوتی ہے۔زبان اور ادب کو اقتصادی تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔اطلاع مرکوز معاشرہ یہ باور کراتا ہے کہ ادب نہ صرف تہذیب و ثقافت کی تشکیل کرتا ہے بلکہ ایسے نئے امکانات کو بھی سامنے لاتا ہے جو معاشرہ کی تقلیب کرتے ہیں۔

اطلاع اساس معاشرہ کے تصور زبان و ادب کو ہدف تنقید بنایا جا رہا ہے۔کہا جا رہا ہے کہ یہ معاشرہ انسانی تاریخ کے تسلسل سے عمل انقطاع کی خبر دیتا ہے کہ اس کا 150 برس کی انسانی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ قدیم معاشرہ سے کسی بھی سطح پر مماثلت نہیں رکھتا ہے۔ اطلاع مرکوز معاشرہ کی نوعیت بنوز سرمایہ دارانہ ہے اور اس کا بنیادی مقصد اقتصادی، سیاست اور تہذیبی وسائل کو مجتمع کرنا ہے۔فریڈ وبسٹر نے اسے اکیسویں صدی کی اطلاعاتی سرمایہ داری (Informational Capitalism) سے تعبیر کیا ہے۔

اطلاع اساس معاشرہ میں زبان اور ادب کی صورت حال یقیناً مایوس کن اور حوصلہ شکن ہے مگر اس معاشرہ میں زبان اور ادب کے تفاعل کو بھی خاطر نشان کیا جا رہا ہے اور ان کے جواز کو منطقی دلائل کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

اردو زبان و ادب اطلاع اساس معاشرہ سے یکسر لاتعلق نہیں رہ سکتا ہے۔اردو زبان و ادب ایک مخصوص آبادی کی تہذیبی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے اور انسانی آرزومندیوں کے داعیوں کو متحرک کرتا ہے۔اطلاع اساس معاشرہ یکسانیت پر مبنی عالم کاری (Globalisation) پر زور دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ادب Glocalisation یعنی Global+Local کے

امکانات ہویدا کرتا ہے۔ادب ثقافتی کوڈ کو موضوع بحث بنا کر یہ باور کراتا ہے کہ Local ہی Global ہے۔ ادب دیسی واد(Nativity) کے تخلیقی اظہار کے حوالے سے جو رویہ خلق کرتا ہے وہ نہ صرف تہذیبی اور حسی مطالبات کی تکمیل کرتا ہے بلکہ زبان کے حوالے سے تہذیبی ضروریات کی تکمیل کرنے والی حقیقت کو بھی پیش کرتا ہے۔حقیقت خارج میں موجود کوئی شے نہیں بلکہ یہ وہی ہے جسے کوئی زبان اپنے مخصوص تہذیبی حوالے سے خلق کرتی ہے۔ زبان و ادب کا تخلیقی امکان اطلاع اساس معاشرہ میں اس کے وجود کا ضامن ہے اور اردو زبان و ادب بھی اس سے مبرّا نہیں ہے۔

○

اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں اردو تراجم کا رول

ڈاکٹر سید سجاد حسین

پروفیسر وصدر، شعبہ اردو، مدراس یونی ورسٹی

اردو کو عالمی زبانوں میں اس لیے ایک منفرد وممتاز مقام حاصل ہے کہ اسے مختلف قوموں نے اپنا خون جگر دے کر پروان چڑھایا ہے۔ اس کے پس منظر میں صدیوں کی ادبی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی تاریخ بھی ہے جو ہماری قومی وحدت کی میراث اور کثرت میں وحدت کی علامت ہے۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ؛

"اردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی کمائی ہے۔ ایسی کمائی جس سے کوئی انصاف پسند، نظر نہیں چرا سکتا۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا ایک سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اردو محض زبان نہیں ایک طرز زندگی، ایک اسلوب زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں بنایا اور سنوارا ہے اور شکل دی ہے جسے ہم آج اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔"

اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی لسانی تاریخ بہت دلچسپ ہے اس دلچسپ تاریخ میں اس

کی انفرادیت بھی پوشیدہ ہے۔ یہ سنسکرت کے بطن سے پیدا ہوئی لیکن فارسی کا خون بھی اس میں شامل ہے اور بعد میں سامی زبانوں میں بالخصوص عربی سے بھی اس نے استفادہ کیا۔ ان تمام زبانوں کے زیر اثر جب اردو پروان چڑھی تو اس میں اظہار بیان کی ایک طاقت وتوانائی آ گئی۔ اس طرح یہ لسانی جمالیات کا ایک خوبصورت نمونہ بن گئی۔ فارسی اور عربی کے بعد جب یورپی اقوام یہاں آئیں تو اردو نے انھیں بھی خوش آمدید کہا اور یوروپی زبانوں کے ذخیرہ سے بھی اثرات قبول کئے۔ اردو نے ہمیشہ سے اپنے گھر کی ساری کھڑکیاں کھلی رکھیں اور ہر تازہ ہوا کے جھونکے کو قبول کیا۔ صوتی، صرفی، لفظی اور معنیاتی سطحوں پر اردو نے جو دوسری زبانوں کے اثرات قبول کئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس نے ابلاغ و اظہار کی توانائی سے اپنا دامن بھر لیا۔ اس کے صوتی نظام میں سنسکرت اور دراوڑی زبانوں کی آوازوں کے ساتھ فارسی اور عربی کی آوازیں اور الفاظ اس کا جز بن گئیں۔

اکیسویں صدی کی سائنسی ایجادات اور جدید تکنالوجی کی بدولت دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں میں ارتباط اور اختلاط روز بروز بڑھتا جارہا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ضرورتاً ایک دوسرے کی زبان سیکھنی پڑتی ہے اور ملوکیت میں وہ افراد یا طبقے ہمیشہ ممتاز رہے جنھوں نے حاکموں کی زبان سیکھنے میں سبقت کی۔ حاکموں نے بھی محسوس کیا کہ امن و استحکام کے لیے صرف زور بازو کافی نہیں بلکہ عوام الناس کے دلوں کو بھی مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے محکوم قوموں کی زبان اور ثقافت سے بھی آشنائی ضروری ہے۔ اس ضمن میں اجنبیت اور مغائرت کو کم کرنے کے لیے ترجموں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

زبان کی لسانی و ادبی نشو ونما اور پھیلاو میں دوسری زبانوں کے علمی و ادبی شہ پاروں کے تراجم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ترجموں کے ذریعے ہی دنیا کی قدیم وجدید زبانوں میں فکری ونظری مماثلت و ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور ان کی وسعت مضامین اور تعمق فکر کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں اور انسانی طبقات میں جغرافیائی فرق اور آب و ہوا کے اختلاف سے پروان چڑھنے والے مزاج و ماحول کے زیر اثر جو گوناگوں، نوع بہ نوع علم وفن اور ادب وانشا کے جواہر پارے وجود میں آئے ہیں ان کا

تبادلہ صرف ترجموں کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ اگر یہ تبادلہ نہ ہوتو دنیا کے تمام ادبیات اور زبانیں اپنے جغرافیائی حدود میں محدود اور صرف ان ہی عوامل ومحرکات کی پیداوار بن کر رہ جائیں گی جن میں ان کی نشو ونما ہوئی۔ ان کے اندر فکری ونظری بوقلمونی، اسالیب کی رنگارنگی نیز اصناف شعروادب کی وسعت کے امکانات تقریباً ختم ہوجائیں گے اسی احساس کے پیش نظر ہمارے ممتاز دانشور قاضی سلیم نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمارے تمام تخلیقی فنکاروں کو چاہیے کہ وہ تھوڑے عرصے کے لیے تخلیقی کام سے منہ موڑ کر ترجموں میں لگ جائیں کیونکہ دیگر ادبیات کے ترجموں کے ذریعے ہی کسی بھی زبان و ادب میں وسعت و پھیلاؤ کی گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے۔

زبان وادب کی ابتدائی نشوونما سے لے کر عہد بہ عہد ارتقا تک فکر ونظر کی بالیدگی، الفاظ ومصطلاحات اور فنون کی وسعت، اسالیب بیان کا تنوع، اصنا500دب کی ہمہ گیری میں ترجموں کا عمل کافی مفید ومعاون ثابت ہوتا ہے اور یہ امر ادبی ولسانی ترقی کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی ادب بلکہ خود عربی زبان وادب میں گوناگوں تنوع اور بکثرت فنون کا شیوع دنیا کی قدیم زبان وادب اور علوم وفنون کی کتابوں کے ترجموں کے ذریعے ہوا۔ عباسی خلفا نے اس جانب خاص توجہ کی۔ مامون الرشید کا دار الترجمہ 'بیت الحکمہ' جس کے لائق مترجمین نے ہند، ایران، یونان وروم، مصر وشام کے علم وادب، ہیئت و نجوم، ریاضیات وطب، سیاسیات وساجیات، منطق وفلسفہ سے عرب دنیا کو روشناس کرایا جو سنسکرت، پہلوی، عبرانی، سریانی اور دیگر زبانوں کی ملکیت تھے۔ عربوں نے مذکورہ فنون میں ترجموں کی مدد سے دستگاہ بہم پہنچائی اور ان کی اپنی جولانی طبع اور تحقیق وجستجو سے بام عروج تک پہنچایا۔

اردو میں ترجموں کا آغاز داستانوں، قصے کہانیوں اور علمی وتاریخی تصانیف سے ہوتا ہے۔ امیر خسرو کی مشہور مثنوی "ہشت بہشت" کا ترجمہ ملک خوشنود نے 1065 ہجری میں مکمل کیا۔ نظامی کی 'ہفت پیکر' کا ترجمہ 'بہرام وگل اندام' کے نام سے 1081 ہجری میں تکمیل کو پہنچا۔ 'سب رس' جس کا سنہ تصنیف 1635 عیسوی ہے اردو میں ادبی نثر کا پہلا نمونہ ہے جسے فتاحی

نیشاپوری کی تصنیف 'دستور عشاق' کے نثری خلاصہ 'قصہ حسن و دل' کا شمار اردو کہا جاتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی انگریزی سے مقامی زبانوں میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریزی سے کسی کتاب کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا لیکن عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں سے کئی تراجم ضرور ہوئے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ پہلی کتاب بنجمن شلر کی "انجیل مقدس" ہے جو 1740 عیسوی میں شائع ہوئی۔ بعدہ مرزا فطرت نے دل ہیز کی مدد سے 1805 عیسوی میں انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ شائع کیا۔ انیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں یورپ کے علمی ورثہ کو اردو میں منتقل کرنے کا عمل باقاعدہ طور پر ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ذریعے شروع ہوا۔ یہ سوسائٹی 1842 عیسوی میں قائم ہوئی۔ ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی اس انجمن کے روح رواں تھے۔ اس سوسائٹی کی ترجمہ شدہ کتابیں طلبہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ان تراجم سے ایک طرف تو اردو نثر بہت صاف سادہ اور بے تکلف ہو گئی تو دوسری طرف مغربی علوم کے سائنسی و فلسفیانہ افکار سے ہندوستانی طلبہ کو براہ راست واقفیت حاصل ہوئی۔ اس سوسائٹی کے قیام سے پہلے اردو زبان دکن اور دلی میں ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکی تھیں لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے اس وقت یہ ابھی ابتدائی حالت میں تھی گو فورٹ ولیم کالج کے ادیب اس سلسلے میں کچھ کام کر چکے تھے مگر یہ کام محدود اور قابل اعتنا نہیں تھا۔ زبان کو سادہ اور کارآمد بنانے کا کام جو میر امن، شیر علی افسوس، رجب علی بیگ سرور، کاظم علی جوان، حیدر بخش حیدری اور اکرام علی کے ہاتھوں شروع ہوا تھا دلی کالج میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس کے بعد امرا اور نوابین نے جو جدید علوم کی اشاعت اور فروغ میں دلچسپی رکھتے تھے ترجموں کی سرپرستی کی جیسے حیدرآباد کے نواب فخر الدین خان شمس الامرا اور شاہان اودھ کی کوششوں سے بعض رسالے شائع ہوئے جن میں رسالہ 'کسورات اعشاریہ'، 'رسالہ ہیئت'، 'رسالہ جر ثقیل'، 'رسالہ علوم طبیعہ'، 'رسالہ قوت مقناطیس'، 'رسالہ علم الحرارۃ' اور 'رسالہ علم الناظر' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن علوم و فنون کے ترجموں کی سب سے منظم اور باضابطہ کوشش جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے قیام 1917 عیسوی کے بعد شروع ہوئی کیونکہ جامعہ عثمانیہ نے ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا تھا اس لیے سررشتہ تعلیم و ترجمہ قائم ہوا جس کے تحت

500 کے قریب کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ یہ کتابیں آرٹس اور سائنس، انجینیرنگ اور میڈیسن کے علاوہ تقریباً تمام جدید علوم پر حاوی تھیں۔ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو بحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

اردو میں سب سے بڑا سرمایہ عربی تراجم کا ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ تفسیر و احادیث کے تراجم کا ایک بڑا ذخیرہ بھی اردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ عربی چونکہ علم وفن کی زبان ہے اس لیے اس کا اثر اتنا گہرا اور دیرپا ہے کہ اس نے بیشتر زبانوں کو اپنی تہذیب کے ساتھ ساتھ مغلوب کیا ہے۔ فارسی زبان کی پوری تربیت عربی کے زیر سایہ ہوئی اور فارسی نے اردو کی سرپرستی کی۔ قرآن اسلام کا اصل الاصول ہے اس لیے اس اہم ترین صحیفہ آسمانی کے مفاہیم کو عوام تک پہنچانے کے لیے ہمیشہ ان تھک محنت کی جاتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں قرآن کریم کے سینکڑوں تراجم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہمارے علمائے کرام نے اردو میں قرآن کریم کے تراجم اور تفاسیر کا جو بیش قیمت سرمایہ فراہم کیا ہے اس کا اندازہ 'سیارہ ڈائجسٹ' پاکستان کے قرآن نمبر میں شامل فہرست سے لگایا جاسکتا ہے جسے محمد عالم مختار حق نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ اس فہرست کے مطابق مکمل تراجم و تفاسیر کی تعداد 275 ہے اور غیر مکمل کی تعداد 366 ہے۔ قرآن مجید کے اردو تراجم میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے شاہ مراد اللہ انصاری کی 'تفسیر مرادیہ' کو پہلا ترجمہ کہا جاسکتا ہے جو 1185 ہجری کی تصنیف ہے جس میں قرآن مجید کے آخری پارہ کا ترجمہ اور تفسیر ملتی ہے۔ اردو قرآن مجید کے مکمل تراجم میں شاہ عبدالقادر کی تفسیر اور ترجمہ قرآن مجید 'موضح القرآن' کو اولیت حاصل ہے یہ سات جلدوں میں ہے۔ 'موضح القرآن' تاریخی نام ہے جس سے سال تصنیف 1205 ہجری برآمد ہوتا ہے۔ شاہ عبدالقادر کا یہ ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبولیت کا حامل رہا ہے۔ اس کے بعد سید شاہ حقانی کے ترجمہ قرآن مجید کا ذکر آتا ہے جس کا سنہ تصنیف 1206 ہجری ہے۔ ان کے علاوہ شاہ رفیع الدین، سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی عبدالحق، شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ابوالکلام آزاد، فتح محمد جالندھری، ابوالاعلیٰ مودودی، عبدالماجد دریابادی، احمد رضا خان بریلوی اور احمد سعید دہلوی کے ایڈیشن اور تعداد اشاعت کی کثرت سے ان کی

مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ تفسیر ابن کثیر جسے آزادی سے قبل محمد عمر جونا گڈھی نے اور آزادی کے بعد انظر شاہ کشمیری نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ قرآن کو ادب و انشا کے اسالیب میں ڈھالنے کی یہ قابل تحسین کوشش ہے۔

تراجم قرآن کے بعد اردو کے دامن میں حدیث کا جو سرمایہ محفوظ ہے اس کا مقابلہ علم و ادب کا کوئی دوسرا موضوع نہیں کرسکتا۔ اردو میں زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں مواد موجود ہے لیکن کمیت و کیفیت کے لحاظ سے سرمایہ حدیث وقیع اور گراں مایہ ہے۔ حدیث کی کتابیں اردو میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اسالیب کی تبدیلی کے ساتھ ہر بار ایک نئے ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے نتیجہ میں صرف بخاری شریف کے ایک درجن سے بھی زیادہ اردو ترجمے کئے گئے اور ہر ترجمہ ایک دوسرے سے بلحاظ اسلوب منفرد ہے۔ اردو نے حدیث کے ذریعے احسان اور حسن سلوک، عفو و درگذر، سخاوت و صداقت، صبر و استقامت، انسان دوستی اور مساوات اور حقوق العباد جیسے موضوعات کو عام کیا اور ایک صحت مند معاشرہ کے تحفظ و بقا کے لیے مثبت کردار ادا کیا ہے۔ بخاری شریف کے تراجم کے ساتھ ساتھ صحاح ستہ کے دیگر مجموعوں کو بھی اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ مشکوۃ شریف، ترمذی شریف، سنن ابن ماجہ، صحیح مسلم شریف، موطا امام مالک، موطا امام محمد، مسند امام مسلم، کتاب الآثار اور کتاب الصالحین اردو کے چند منتخب ترجمے ہیں۔ قرآن و حدیث کے بعد تاریخ و سیر کو فوقیت حاصل رہی ہے۔ اردو میں سیرت النبی پر ایک گرانمایہ ذخیرہ موجود ہے لیکن مولانا شبلی کی سیرۃ النبی اور زمانہ حال میں نعیم صدیقی کی تصنیف 'محسن انسانیت' کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ کی 'حجۃ اللہ البالغہ' اور 'قصیدہ بردہ شریف' اب اردو میں بھی دستیاب ہیں۔ یہ اردو کی جامعیت اور ہر دلعزیزی ہے کہ 'مثنوی مولانا روم' اور سعدی کی 'گلستان' اور 'بوستان' کے کئی تراجم اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ اردو نے مشرقی وسطی کے افکار و عقائد کی نشر و اشاعت میں بھی اہم رول ادا کیا ہے اور یہ فخر یہاں کی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں۔ وید، پران، اپنشد، گیتا، مہابھارت اور رامائن کے علاوہ دیگر اخلاقی اور مذہبی تصانیف کے قابل ذکر اردو تراجم 1861 سے ملنے لگتے ہیں۔

اردو میں یوں تو دوسری زبانوں سے ترجموں کا کام بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا لیکن مغربی ادب سے مختصر افسانوں کے ترجموں کی نوبت بہت دیر میں آئی۔ جب لاہور سے 'مخزن' کانپور سے 'زمانہ' آگرہ سے 'نگار' دلی سے 'صلائے عام' وغیرہ نکلنے شروع ہوئے تو یوروپی افسانوں کے ترجمے بھی ان میں شائع ہونے لگے۔ ان ترجموں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان کے اثر سے خود اردو کے ادیب افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ شروع میں ظفر علی خان، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری نے مختلف زبانوں سے افسانوں کو اردو میں منتقل کیا لیکن 1930 کے بعد کئی اچھے لکھنے والے باقاعدہ افسانوں کے ترجمے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان مترجمین میں خواجہ منظور حسین، حامد علی خان، جلیل قدوائی، محشر بدایونی، فضل حق قریشی، اختر حسین رائے پوری، قاضی عبد الغفار، مجنون گورکھپوری اور اعظم کریوی نے روسی، فرانسیسی، جرمنی، انگریزی اور ہندی ترجموں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ خواجہ منظور حسین اور جلیل قدوائی نے روسی افسانہ نویس چیخوف کے یہاں سے اعظم کریوی نے ہندی سے اور مجنون نے انگریزی کہانیوں اور خاص کر ہارڈی کی کہانیوں پر اپنے افسانوں کی عمارت کھڑی کی۔ 1930 کے بعد میں اردو میں حقیقت پسندی اور نفسیاتی رومانی رجحان دونوں کے لیے جگہ بن چکی تھی۔ سعادت حسن منٹو نے خود طبع زاد افسانے لکھنے سے پہلے ترجموں کی طرف توجہ کی اور اپنے ترجموں کا مجموعہ روسی افسانے کے نام سے لاہور سے شائع کیا۔ فرانسیسی افسانہ نگاروں میں موپاسان کے افسانے سب سے زیادہ اردو میں ترجمہ ہوئے۔ افسانوی ادب کے مشہور مترجم منشی تیرتھ رام فیروز پوری نے موپاسان کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ "رنگین افسانے" کے نام سے شائع کیا۔ سید نصیر حیدر نے بھی موپاسان کے افسانے کے نام سے ایک مجموعہ اردو میں شائع کیا۔ انگریزی کے جن افسانہ نگاروں کے افسانوں کو اردو میں منتقل کیا گیا ان میں گولڈ اسمتھ، سامرسیٹ مام، اسکاٹ ایڈیسن کے علاوہ ڈیکنس، ہارڈی، اسٹیونسن، آسکر وائلڈ، کپلنگ، ایچ۔ جی۔ ویلز، نیس فیلڈ کے افسانے شامل ہیں۔ اس ضمن میں ابن انشا، حامد علی خان، ظفر علی خان اور قاضی عبد الغفار کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یورپ کی زبانوں میں جرمنی، ہسپانوی اور پوش زبان کے افسانوں کے ترجمے بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد قابل لحاظ نہیں ہے۔ عربی مصنفوں

میں مصطفی المنفلوطی اور خلیل جبران کے ناولوں اور افسانوں کے متعدد ترجمے اردو میں موجود ہیں۔ سرخ کتاب کے نام سے ضیاء الحسن نے چند عربی افسانوں کا ترجمہ کیا ہے۔ حامد حسن قادری نے ایرانی افسانے کے نام سے اور منیب الرحمن نے جمال زادہ کے کئی فارسی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ترکی سے ترجموں کی ابتدا سجاد حیدر یلدرم نے کی تھی جسے نامق کمال اور خالدہ ادیب خانم نے برقرار رکھا۔ ہندوستانی زبانوں میں ہندی، بنگالی اور مرہٹی افسانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد کو اردو میں منتقل کیا جاچکا ہے۔ ٹیگور کے تقریباً تمام افسانے اردو میں مل جاتے ہیں۔ دھیرے دھیرے تامل، کشمیری، گجراتی، تلگو، کنڑ اور ملیالم کے مختصر افسانوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کے میلان میں اضافہ ہورہا ہے۔ افسانوں کی طرح ناولوں کے سینکڑوں اردو تراجم بھی ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مغربی ناول نگاروں میں خصوصاً زولا، بالزاک، اناطول فرانس، ویکٹر ہیوگو، سر والٹر اسکاٹ اور ٹامس ڈے کے ناولوں کو اردو کا جامہ پہنایا گیا۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے تاریخی ناولوں کی تمام تر عمارت سر والٹر اسکاٹ اور رچرڈسن کی بنیادوں پر کھڑی کی ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے ماری کوریل کے پانچ جاسوسی ناولوں کو خونی بھید، خونی جورو، خونی مصور، خونی عاشق اور بہرام کی رہائی کے نام سے 1938 تک ترجمہ کر کے شائع کیا جب کہ بطور مترجم تیرتھ رام فیروز پوری نے 136 ناولوں کے تراجم مطبوعہ صورت میں یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کے علاوہ سرشار، منشی سجاد حسین، اختر حسین رائے پوری، کندن لال شرر، شاہد احمد دہلوی، محمد حسن عسکری، خواجہ عبدالکریم، عشرت رحمانی، عزیز احمد وغیرہ یہ چند ایسے نام ہیں جن کے اردو ترجموں سے ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ ناول کا چلن عام ہوا بلکہ نئے افکار واسالیب کے ساتھ ناول کے فنی تقاضوں کو سمجھنے بھی کافی مدد ملی ہے۔

اسی لیے یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی ادب کے سرمایہ کی قدر و قیمت کا تعین بین الاقوامی زبانوں کے ادبی سرمایہ کی مدد سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ زبان وادب کے ارتقا میں ترجموں کی اہمیت کا اندازہ ڈاکٹر قمر رئیس کے اس قول سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> ''انسانوں کے درمیان باہمی ارتباط واتحاد اور یگانگت کی راہ میں جو سب سے اہم فطری رکاوٹ حائل رہی ہے شاید زبانوں کا فرق ہے۔ اس فرق کو

مٹانے اور انسان کے علم و عرفان اور ادب کو بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث بنانے میں ترجمے نے جو اہم اور نتیجہ خیز رول ادا کیا ہے انسانی تہذیب کی تاریخ کا ہر ورق اس کا گواہ ہے۔ ترجمے نے ہی ایک قوم کے ذخیرہ علم و ادب کو دوسری قوموں تک پہنچایا ہے۔ ایک انسانی گروہ کے تجربات سے دوسری جماعتوں کو فیض اٹھانے کا موقع دیا ہے۔ لہذا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انسانی علوم کو فروغ دینے میں جہاں اور بہت سے اسباب و عوامل رہے ہیں وہاں ترجمہ بھی ایک طاقتور محرک کا رول ادا کرتا ہے۔''

دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زبانوں کی طرح اردو ادب کا دامن بھی ابتدا اور آغاز کی منزل اولین سے لے کر آج تک دنیا کی دوسری ترقی یافتہ علمی و ادبی زبانوں کے اہم سرمایہ کے ترجموں سے مالا مال نظر آتا ہے اور اس زبان نے الفاظ، اصطلاحات علمیہ، صرف و نحو، اسالیب بیان، اصناف ادب بلکہ ہر شعبہ میں ترجموں کی مدد سے حظ وافر حاصل کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو نے اپنی آفرینش سے لے کر نشو و نما کے تمام مراحل اور علمی و ادبی زبان بننے تک دوسری زبانوں کی تحقیقات، تجربات، لفظی و معنوی محاسن اور بدلتی ہوئی ادبی قدروں کا قدم قدم پر سہارا لیا ہے۔ جس طرح زبان کے تخلیقی عناصر، اجزائے ترکیبی اور شعری و فنی اسالیب و طرز ادا، اصناف ادب، نقد و نظر کے معیار ہر جگہ دوسری زبانوں کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر ظ انصاری لکھتے ہیں:

''اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت ورنہ وہ جب تک کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلمکار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔''

ڈاکٹر محمد حسن تحریر کرتے ہیں کہ:

''اردو کی خوش بختی ہے کہ اس نے ترجموں کی روایت کو ابتدا ہی سے اپنایا اور اپنے دریچے باہر سے آنے والی ہواؤں کے لیے کھولے اور بین الاقوامی کلچر

کے نقوش سے اپنی محفل کو آباد کیا۔"

متذکرہ بالا اقوال کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہوجاتی ہے کہ اردو زبان و ادب کا سرمایہ دوسری زبانوں کے علمی و ادبی ذخیروں کے تراجم سے بیشتر مستفاد ہے۔ اس ذخیرہ میں شعری و ادبی، کتابوں کے علاوہ مذہبی تصانیف کے ترجمے لسانی و ادبی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ زبان کی ابتدا سے لے کر آج تک شعری و ادبی کتابوں کے ساتھ ساتھ مذہبی، تصانیف کے تراجم کا سلسلہ بھی برابر جاری ہے۔ علمائے اسلام، عیسائی پادریوں اور ہندو دھرم کے نمائندوں نے اپنے مذہب کی مقدس کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی ہمیشہ کامیاب کوشش کی ہے اور ان میں سب سے زیادہ اہم، وقیع اور گراں بہا خدمات علمائے اسلام کی رہی ہیں جنھوں نے تبلیغ و اشاعت دین کے بے لوث جذبات سے سرشار ہوکر قرآن، حدیث، سیرت، فقہ، تاریخ و سوانح کے گنج ہائے گراں مایہ کو اردو کی ملکیت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے بھی ان الفاظ میں اعتراف حقیقت کیا ہے:

> ''ترجموں کے سلسلے میں ہمارے علما و فقہا کا بڑا حصہ رہا ہے جب ان کو دینی خیالات نئی نسلوں تک پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی علمی زبان (عربی و فارسی) اور ان کے طرز بیان سے ناآشنا تھے تو انھوں نے ان خیالات کو عوام کی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح عربی اور فارسی کی علمی کتابوں کا عوامی زبان میں ترجمہ ہوا۔''

الغرض ترجمے کے بغیر آج کوئی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی اور ترجمہ نے ہی نسلوں اور قوموں کے درمیان حائل بہت سی دیواروں کو نہ صرف توڑا ہے بلکہ اس نے ہر عہد میں نئے نئے افکار و نظریات کو ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچایا ہے۔ ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے روشناس کرایا ہے۔ ترجمے کے ذریعے ہی ایک زبان دوسری زبان کے اظہارات، اس کے مزاج اور اس کی نحوی ساخت سے متعارف ہوکر اپنا روپ رنگ بدلتی اور وسعت حاصل کرتی ہے۔

اردو والوں کے لیے ترجمہ محض ایک چیلنج نہیں زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر ہم علمی

آگہی اور عالمی بصیرت کو اردو میں منتقل نہیں کریں گے تو ہم عالمی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے اور اردو ایک غیر مفید، ناکارہ اور مردہ زبان بن کر رہ جائیگی۔ اردو میں ترجمہ کی پوری روایت گواہ ہے کہ وہ اس چیلنج کو قبول کرسکتی ہے اور اس سے عہدہ برآ بھی ہوسکتی ہے۔

○

ہندوستان میں اردو صحافت آئینۂ ایّام میں

(ایک مختصر جائزہ)

معصوم عزیز کاظمی

آئی۔پی۔ایس (ریٹائرڈ)، گیا، بہار

''صحافیوں کی ذمہ داری بہت زیادہ اور نازک ہے۔ان کے قلم کی ذرا سی لغزش سے بعض اوقات قوموں اور ملکوں کے متعلق بڑے بڑے فیصلے ہوجاتے ہیں اور ان کی تحریریں ہزاروں لاکھوں افراد کو صحیح یا غلط سوچنے پر مجبور کردیتی ہے۔میرا خیال ہے کہ قلم کی طاقت تلوار سے کہیں زیادہ مؤثر اور کارگر ہوتی ہے۔ اس کے پیدا کردہ اثرات کہیں زیادہ دوررس اور دیرپا ہوتے ہیں۔'' (مولانا ابوالحسن ندوی)

صحافت کی تاریخ قدیم ہے۔صحافت نے ہر عہد میں معاشرہ کی تشکیل وتعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔عہدِ قدیم میں خبروں کے آدان پردان کا کام تربیت یافتہ کبوتر انجام دیا کرتے تھے۔وقت کے ساتھ ترسیل کے ذرائع میں اضافہ ہوا اور ایک سلطنت سے دوسری سلطنت تک

خبریں،اطلاعات،اعلانات اورخفیہ احکام کا کام مخبر یا تربیت یافتہ مخصوص ہرکارے انجام دیا کرتے تھے۔ ہردور میں حکومتوں نے مصدّقہ یا غیر مصدّقہ خبروں یا اطلاعات کو اہمیت دی ہے۔ارتھ شاستر کے مصنف چانکیہ نے بھی حکمرانوں کو تمام اقسام کی اطلاعات پہ گہری نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔عہد مغلیہ میں بھی خفیہ اطلاعات اور اہم معاملات کی فراہمی کا منظم انتظام تھا۔ ہرعلاقہ سے اہم خبریں اور اطلاعات کے حصول کا منظم طریقہ رائج تھا۔شہنشاہِ وقت کو ان خبروں اور اطلاعات کی پوری واقفیت ہوا کرتی تھی۔دیگر ممالک میں بھی خبروں کے حصول کا نظم تھا اوران کی بنیاد پر حکومت کے منصوبے عمل میں لائے جایا کرتے تھے۔کاغذ کی ایجاد اور طباعت کی سہولت سے خبروں کی تشہیر اور ترسیل میں انقلاب آ گیا۔شہنشاہوں کے احکام جو پتھروں پہ کندہ کرائے جاتے تھے یا بآواز بلند تشہیر کرائے جاتے تھے کو کتابت اور طباعت کرا کر تقسیم کیا جانے لگا۔ایک غیر مصدّقہ خیال یہ ہے کہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح چین میں دنیا کے سب سے پہلے اخبار کی اشاعت ہوئی،لیکن اب تک اس کا کوئی تاریخی ثبوت دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔اس کے برخلاف یہ حقیقت شواہد پہ مبنی ہے کہ جولیس قیصر روم نے ایک صدی قبل مسیح روزانہ اخبار جاری کیا تھا۔اس کا نام ''اوکٹاڈی ارنا'' تھا۔اس میں مختلف قسم کے اطلاعات،احکامات اور واقعات کی تفصیل درج کی جاتی تھی۔یہ اخبار چوتھی صدی عیسوی یعنی پانچ سو برس تک جاری رہا۔اس کے بعد یورپ کو اخبار کی اشاعت اور فروغ کا شرف حاصل ہوا۔یورپ میں اخبار کی اشاعت پندرھویں صدی میں شروع ہوئی۔جرمنی کے اوس برگ، ویزبرگ اور راٹسیون سے اخبارات کا اجرا ہوا۔اس کے بعد وینس (Venus) سے Vanis اخبار کی اشاعت شروع ہوئی۔ 1621 میں لندن سے ایک ہفتہ وار اخبار'' ویکلی نیوز'' کی اشاعت شروع کی گئی۔فرانس میں 1622 میں ''فرانسیسی گزٹ'' کا اجرا ہوا۔ 1702 میں لندن سے روزانہ ''دی لندن ڈیلی کورنٹ'' کی اشاعت ہوئی۔امریکہ میں اخباروں کی اشاعت 1704 میں شروع ہوئی اور ہندوستان میں سب سے پہلا ہفت روزہ اخبار'بکیز بنگال گزٹ'29 رجنوری 1780 کو انگریزی زبان میں شائع ہوا۔یہ اخبار جیمس اگسٹن ہکی،جو کمپنی حکومت کا برطرف ملازم تھا،کی ذاتی ملکیت تھا۔عربی میں سب سے پہلا اخبار 1830 میں مصر سے شائع ہوا جس

کا نام'' الوقایع المصر'' تھا۔1857 میں حکومت عثمانیہ نے بیروت سے اخبار''حدیقت الاخبار'' جاری کیا۔1880 میں ٹیونس سے پہلا غیر سرکاری اخبار''اخبار الجوائب''عربی زبان میں جاری کیا گیا۔اس کے بعد مختلف ممالک سے مختلف زبانوں میں مختلف مقاصد کے لیے اخبارات جاری کیے گئے۔اخبارات نے ہر عہد میں ملک وقوم کو بیدار رکھ کر بیش بہا خدمات انجام دیں ہیں۔

صحافت کی افادیت اور اہمیت مسلم ہے،لیکن ایک اہم سوال یہ ہے کہ صحافت ہے کیا؟ یہ سوال نہ صرف مشکل بلکہ اذیت ناک ہے۔صحافت کیا عجلت میں پیدا کردہ ادب ہے یا یہ تاریخ کا پہلا مسودہ ہے۔معاشرہ اور مملکت سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ایک مملکت جہاں صحافت کے مثبت کردار کی باتیں ہوتی ہیں اس کی طرف صحافت اور صحافی کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ان اہم سوالات پہ کافی خامہ فرسائی ہو چکی ہے لیکن یہ آج بھی حتمی جواب کے منتظر ہے۔

صحافت سماج کا آئینہ دار ہے اور صحافی اپنے عہد کا داستان گو ہوتا ہے۔صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا گیا ہے۔اس تعریف کو اگر کچھ وسعت دی جائے تو صحافت کو معاشرہ اور مملکت کے اعتماد کا ستون ہونا چاہیے۔اس تعریف کو من وعن قبول کرنے سے پہلے شاید یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہ کون سی اوصاف وخصوصیات ہیں جو صحافت کو فنون لطیفہ کے دیگر اصناف سے ممتاز کرتی ہیں۔سوال یہ بھی ہے کہ اکیسویں صدی میں کیا صحافت بالخصوص اردو صحافت اپنے درخشاں ماضی کا احترام کرتے ہوئے بلاخوف وخطر ملک وملت کی ایماندارانہ ومخلصانہ رہنمائی کر رہی ہے۔اکبر الہ آبادی صحافت کی اہمیت وافادیت سے پوری طرح واقف تھے۔انھوں نے کہا ہے:

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

نپولین بوناپارٹ کے درج ذیل الفاظ کی اہمیت آج بھی ہے:

''میں لاکھوں سنگینوں سے زیادہ ملک کے تین اخبارات سے خوفزدہ رہتا ہوں۔''

مہاتما گاندھی کا درج ذیل قول صحافت کے منصب اور صحافی کے کردار کو پوری طرح اجاگر کرتا ہے:

''اخبار کا مقصد عام آدمیوں کے احساسات کو پوری طرح سمجھنا اور ان کو ظاہر کرنا ہے۔ دوسرا مقصد عام لوگوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا ہے اور انھیں ابھارنا ہے جن کی (ملک وقوم) کو ضرورت ہے۔ اور تیسرا مقصد عام زندگی کی کمزوریوں اور خرابیوں کو بے جھجک ظاہر کرنا ہے۔''

محمد علی جوہر نے 14 جنوری 1911 کو کمپنی حکومت کے دارالحکومت کلکتہ سے انگریزی ہفتہ وار 'کامریڈ' کا اجرا کیا تھا۔ 6 جنوری 1913 کے کامریڈ میں انھوں نے صحافت کے تعلق سے لکھا تھا:

''صحافی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ واقعات کو پوری صحت سے درج کرے۔ اسے خیال رکھنا چاہیے کہ واقعاتی صحت کا معیار اتنا بلند ہو کہ مؤرخ اس کی تحریروں کی بنیاد پہ تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا کر سکے۔ صحافی رائے عامہ کا ترجمان ہی نہیں رہنما بھی ہوتا ہے۔ اسے صرف عوام کی تائید اور حمایت نہیں کرنی چاہیے بلکہ صحافت کے منبر سے عوام کو درس بھی دینا چاہیے۔''

محمد علی جناح نے صحافت کی اہمیت اور افادیت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''صحافت قوم کی ترقی و بہبود کے لیے اشد ضروری ہے، کیونکہ اسی کے ذریعے زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرمیاں بڑھانے کے لیے قوم کی رہنمائی اور رائے عامہ کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔''

مسٹر بی۔ بی۔ میر چندانی، سابق جنرل منیجر یو۔ ان۔ آئی کے الفاظ میں

''صحافت ملک وقوم کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ صحافت تہذیب و تمدن، ثقافت وسماجی قدروں کی عکاسی کرتی ہے۔''

فرینک کینڈلن نے اپنی کتاب 'Teach yourself journalism' میں صحافت کا دائرہ اور اہمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"Journalism covers a very wide field and it is not easy to frame a defination which will embraces all the uses of the term, Perhaps the nearest we shall get it to say

that journalist is one who contributes reguralry to the periodicals."

صحافت کا ایک مقبول عام تعارف ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"The central purpose of the journalism is to provide the citizen the accurate and reliable information. They need to function in a free society."

بیسویں صدی میں صحافت کے وسیع دائرہ عمل، دائرہ کار اور اثرات کے پیش نظر صحافت کی تعریف معروف سیاست داں اور مدیر روزنامہ 'سنگم' پٹنہ، جناب غلام سرور نے اپنے شاعرانہ انداز میں ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''صحافت بیک وقت ادب، شاعری، داستان گوئی، سیاست بازی، خطابت کی شعلہ بیانی سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ صحافی کا قلم کبھی شعلے بھڑکاتا ہے، کبھی شبنم ٹپکاتا ہے، کبھی سماج کے ناسور پر نشتر لگاتا ہے، کبھی دُکھے دلوں کے زخم تازہ پر مرہم رکھتا ہے۔ سیاست مکٹ دھاری سمراٹ ہے، اخبار نویس بے تاج بادشاہ ہے۔ سیاست کے حدود متعین ہیں، صحافت ہفت اقلیم پر بسیط ہے۔''

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے تیسرے صدر تھامس جیفرسن نے ملک کی بقا اور معاشرہ کی صحت مند فروغ کے لیے صحافت کی اہمیت اور ضرورت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اگر اس بات کا فیصلہ صرف مجھ پر چھوڑا جائے کہ کیا ہمیں بغیر اخباروں کی حکومت منظور ہے یا کوئی ایسی صورت کہ جس میں اخبارات موجود ہوں اور حکومت نہ ہو، تو میں دوسری صورت کے حق میں فیصلہ سنانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کروں گا۔''

صحافت کے متفقہ مقاصد اطلاعات رسانی، ذہن سازی اور لطف رسائی ہے، لیکن کسی بھی زبان کی صحافت ایک مخصوص معاشرہ و مملکت میں فروغ پاتی ہے اس میں اس خطہ کے حالات، احساسات، جذبات اور ضروریات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اسے حق بینی اور حق گوئی کا علمبردار رہنا ہے۔ یہ بلاتفریق مذہب و ملت زندگی کے داخلی و خارجی لطافتوں

اور کثافتوں کو عریاں کرتا ہے۔ کائنات اور خالق کائنات کی اوّلین تخلیق انسان واقوام کے تعلقات بھی صحافت کے موضوعات ہیں کیونکہ یہ تہذیبی وسماجی تعلقات واثرات کے پیدا کردہ ہیں۔ خالص ادب کی طرح صحافت میں تخیلات وتصورات کی گنجائش صفر ہے۔ صحافت خلا میں جنم نہیں لیتی ہے۔ معاشرہ ومملکت کی سچائیاں، تلخیاں، خوشگوار و ناخوشگوار واقعات، سیاست، مذہب، حادثات، تجربات، شکستہ خواب صحافت کے محرکات ہیں۔ یہ سماج کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سب کچھ عیاں ہوتا ہے۔ صحافت جب اپنی زمین، تہذیب، معاشرہ اور تاریخ سے کنارہ کشی اختیار کرتی ہے تو اسے عرش سے فرش پر آنے میں دیر نہیں لگتی ہے۔

صحافت کا میدان عمل روز اوّل سے آج تک وسیع وعریض رہا ہے۔ اسے کسی دائرہ یا خانہ میں محدود کرنا ممکن نہیں ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ اب صحافت کے دائرہ میں ہے۔ صحافت جو کل تک صرف اطلاع واعلان تک محدود تھی آج نظریہ سازی کا دعویٰ کر رہی ہے۔ عوامی رجحانات کو پروان چڑھانے کے ساتھ یہ معاشرہ کی ذہنی تربیت، نگرانی اور تفتیش کے ساتھ فیصلہ صادر کرنے کا حق بھی تلاش کر رہی ہے۔ صحافت کا یہ عمل ملک وملّت کو باخبر رکھنے کے ساتھ اس سے خراج بھی وصول کر رہا ہے۔

عہدِ حاضر میں صحافت کی کئی جہتیں ہیں جن میں مطبوعہ صحافت اور الیکٹرونک صحافت سرِ فہرست ہے۔ مطبوعہ صحافت میں روز نامہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہانہ اخبار وسائل کا شمار کیا جاتا ہے۔ مطبوعہ صحافت کو سہولت کے لیے اخباری صحافت، ادبی صحافت، سائنسی صحافت، عدالتی صحافت، فلمی صحافت، تفریحی صحافت، صحافت نسواں، صحافت کھیل، صحافت اطفال اور نظری صحافت وغیرہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس مقالہ کا دائرہ صرف اخباری صحافت تک محدود ہے کیونکہ دیگر اقسام پہ گفتگو کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنا شاید مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک سلسلہ ہے جو مسائل ومشکلات کے باوجود جاری رہا ہے۔ سہولت کے لیے 1823 سے 1857 کے دور کو اردو صحافت کا دور اوّل کہا جاسکتا ہے۔ کمپنی حکومت نے 13 رفروری 1911 کو دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان کیا۔ اس سے قبل کلکتہ کو ہر طرح کی مرکزیت حاصل رہی۔ یہ شہر ہندوستان کا بغداد تھا۔ غالبؔ نے بھی اس کی عظمت ومحبوبیت کا اعتراف ایک

عاشق کی طرح ان اشعار میں بیان کیا ہے:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
ایک تیر میرے سینے میں مارا کے ہائے ہائے

شہر کلکتہ کو ہی ہندوستان کے پہلے اخبار کی اشاعت کا شرف حاصل ہے۔ کمپنی حکومت ملک میں نظم ونسق برقرار رکھنے کے لیے جابرانہ قوانین وضع کر رہی تھی۔ زباں بندی کے لیے ہر قدم کو جائز قرار دیا جا رہا تھا لیکن یہ امر حیران کن ہے کہ اخبارات کی اشاعت کے لیے کوئی ضابطہ یا قانون حکومت نے وضع نہیں کیا تھا۔ ہندوستان میں طباعت کا پہلا کام سب سے پہلے مسیحی مبلغوں نے شروع کیا تھا۔ 1557 میں تبلیغی مشن کے کارکنوں کے لیے عیسائی مذہب کی اہم معلومات پر مبنی ایک کتابچہ شائع کیا۔ 1684 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بمبئی میں ایک پریس قائم کیا۔ اٹھارھویں صدی کے پہلے عشرے تک کلکتہ اور مدراس میں چھاپہ خانے لگ چکے تھے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت کی تشہیر کے لیے کسی اخبار کے اجرا میں کوئی دلچسپی نہیں لی' کیونکہ کمپنی کے عہدہ داروں کو اپنے بداعمالیوں اور بدفعلیوں کے تشہیر کا خطرہ تھا۔ ہندوستان میں اخبار نکالنے کا خیال انھیں لوگوں کے ذہن میں آیا جنھیں کمپنی حکومت سے شکایت تھی۔ تاج مغلیہ کے اختتام تک ہندوستان میں دستی اخبار کا چلن تھا اور یہ کافی مقبول تھے۔ لارڈ ٹی۔ بی۔ یا نے نے اپنی خصوصی رپورٹ میں یہ اعتراف کیا ہے کہ عام طور پر ملک کے باشندے ایسے اخبارات (دستی اخبارات) پڑھتے ہیں جو ہاتھ سے لکھے ہوتے ہیں۔ ایسے اخبارات مرتب کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ یہ کچہری اور دیسی راجاؤں کے درباروں کے آس پاس خبروں کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔ دہلی کے شاہی محل اور ریسیڈنسی کے مقامات پر ہر وقت بیس یا تیس وقائع نگار موجود رہتے ہیں۔ بہت سارے قصاص الامراء ان وقائع نگاروں کے خریدار ہیں۔ یہ ہر روز کچہری اور شہر کی چلتی پھرتی خبریں، افواہیں اپنے سرپرستوں کو مہیا کرتے ہیں۔ دہلی سے ہر روز قلمی اخبار باہر بھیجے جاتے ہیں اور جانکاروں کا اندازہ ہے کہ ایسی قلمی اخباروں کی تعداد 120 / ہے۔ ایسے اخباروں میں عموماً حکومت اور اس کے عملا کو رسوا کیا جاتا تھا اور بھپکیاں کسی جاتی تھیں۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ عوام میں حکومت اور اس کے عملہ کے خلاف

غم وغصہ تھا جس کا اظہار ہٹک آمیز الفاظ میں ہوا کرتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سے برخاست ولیم بولسٹن نے 1766 میں اخبار نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ کمپنی کے ہی ایک سابق ملازم اگسٹن ہکی جو حکومت اور اس کے طریقہ کار سے شاکی تھا نے 29 رجنوری 1780 کو ہندوستان میں مطبوعہ صحافت کی بنیاد رکھی۔ اس نے کلکتہ سے انگریزی زبان میں ہفت روزہ 'ہکیز بنگال گزٹ' جاری کیا۔ یہ اخبار کچھ حد تک زرد صحافت کا قائل تھا۔ اس اخبار نے کلکتہ کے سیاسی، سماجی، اور انتظامی زندگی میں تلاطم پیدا کر دیا۔ گورنر جنرل سے اس اخبار کی شکایت کی گئی۔ اس پر عدالت نے ہٹک عزتی کا دعویٰ درج کیا اور جیمس اگسٹن ہکی کو چار ماہ قید اور 500 روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ ہکی نے اپنی روش نہ بدلی اور لگاتار اپنے جرأت مندانہ عزائم کا ثبوت دیتا رہا۔ 1781 میں ہکی کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔ عدالت نے اسے ایک سال قید اور 5000 رہزار روپے کے جرمانہ کی سزا سنائی۔ ان حوصلہ شکن حالات میں بھی ہکی نے اخبار کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ظلم واستبداد کے خلاف وہ حق وصداقت کا علم بلند کرتا رہا۔ 1782 میں حکومت نے ہکی کا پرنٹنگ پریس بحق سرکار ضبط کرلیا۔ 1782 میں ہکی کو ہندوستان بدر ہونا پڑا۔ اس طرح حکومت وقت نے ہندوستان کے اوّلین اخبار کا سر قلم کر دیا، لیکن ہکی ملک میں بے باک صحافت کی مثال قائم کر گیا۔

''ہکیز بنگال گزٹ'' کی اشاعت کے بعد 1780 میں (1) ''ہفت روزہ انڈیا گزٹ'' (2) 1784 میں ''ہفتہ وار کلکتہ گزٹ'' (3) 1793 میں ہفت روزہ ''ہرکارو'' (4) 1795 میں ہفت روزہ ''مدراس گزٹ'' (5) 1795 میں 'انڈیا ہیرالڈ' (6) 1789 میں ہفت روزہ 'ہیرالڈ بمبئی' (7) 1790 میں ہفت روزہ 'بامبے کوریئر' (8) 1790 میں ہفت روزہ 'بمبئی گزٹ' (9) 1791 میں 'بمبئی امروز' (10) 1795 میں 'مدراس گزٹ' (11) 1795 میں 'بنگال ہرکارو'، کلکتہ (12) 1799 میں 'ایشیاٹک میرر'، کلکتہ کا اجرا ہوا۔ ہندوستان کے دیگر مراکز سے بھی اخبار کی اشاعت کا سلسلہ مختلف اوقات میں جاری رہا۔ (1) شملہ اخبار، شملہ۔ 1847 (2) دریائے نور، لاہور۔ 1850 (3) گلزارِ پنجاب، گجرانوالہ۔ 1850 (4) خورشید عالم، سیالکوٹ۔ 1850 (5) وکٹوریہ پیپر، سیالکوٹ۔ 1850 (6) چشمۂ فیض، لاہور۔ 1850 کی اشاعت شروع

ہوئی۔اس دور میں شائع ہونے والے تمام اخبارات کی اشاعت محدود تھی۔اٹھارھویں صدی میں شائع ہورہے اخبارات حکومت کی مراعات سے محروم اور سنسر کی پالیسی سے نالاں تھے۔ ان اخبارات میں بالخصوص ایشیاٹک میرر اور بنگال ہرکارو نے کمپنی حکومت کے ظلم واستحصال، بدعنوانیوں اور بدفعلیوں پر سخت لفظی حملہ کیا جو حکومتِ وقت کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا۔لارڈ ویلزلی نے ان حالات کے پیشِ نظر 1799 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب اقتدار کو یہ درج ذیل ہدایت دی:

> ''ایڈیٹروں کی پوری قوم کے لیے میں جلد ہی ایک قانون مرتب کرنے والا ہوں۔فی الحال آپ اس اخبار (ایشیاٹک میرر) کے ایڈیٹر اور اس قسم کے دوسرے اخباروں کے ایڈیٹروں کی روک تھام اگر نہیں کر سکتے ہیں تو ان اخباروں کا خاتمہ کر کے ان کے ایڈیٹروں کو یورپ روانہ کر دیجیے۔''

لارڈ ویلزلی نے مئی 1799 میں ''دی سنسر شپ آف دی پریس ایکٹ'' لاگو کر اخبارات پر پابندی عائد کر دی اور سنسر شپ کا محکمہ قائم کر دیا۔ 1784 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ملازم جو مشرقی زبان کے اسکالر تھے نے 'کلکتہ گزٹ' جاری کیا۔اس اخبار میں سرکاری اعلانات واحکامات شائع ہوا کرتے تھے اور اسے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔کافی عرصے تک یہ اخبار سرکار کی واحد آواز سمجھا گیا۔(1) بنگال جنرل 1785 (2) دی اورینٹل میگزین 1785 (3) دی کلکتہ کورونیکل 1786 (4) دی مدراس کوریئر 1788 (5) دی بمبئی ہیرالڈ 1789 کی اشاعت کے ساتھ'' کلکتہ گزٹ'' کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔1861 میں ''بنگال گزٹ'' جو بنگالی زبان میں شائع ہوا کرتا تھا کی اشاعت شروع ہوئی۔20/اپریل 1822 کو راجہ رام موہن رائے نے فارسی کا پہلا اخبار ''معراۃ الاخبار'' کلکتہ سے جاری کیا۔اس اخبار میں عوام کی دلچسپی کے لیے سیاسی، سماجی، تجارتی اور ثقافتی خبروں کو جگہ دی جاتی تھی۔1823 میں گورنر جنرل جان ایڈلن نے ''دی لائسنسنگ ریگولیشن ایکٹ'' نافذ کر بغیر لائسنس کے اخبار جاری کرنے کو ایک جرم قرار دے دیا۔راجہ رام موہن رائے نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور 1823 میں معراۃ الاخبار بند کر دیا گیا۔ اردو کا پہلا ہفت روزہ ''جامِ جہاں نما'' 17/مارچ 1822 سے شائع

ہونا شروع ہوا۔اس اخبار کے مالک ہری دت،طابع و ناشر ولیم ہوپ کنگ اور مدیر لالہ سداسکھ لال تھے۔یہ اخبار فارسی کے ساتھ اردو کا ضمیمہ بھی نکالتا تھا جس پہ یہ درج ہوا کرتا تھا کہ اردو کا ''جامِ جہاں نما'' باذوق افراد کی تسکین کے لیے جاری کیا گیا ہے۔''جامِ جہاں نما'' کو آج بھی اردو کا پہلا اخبار گردانا جاتا ہے،لیکن جدید تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ 1810 میں مولوی اکرم علی نے کلکتہ سے ''اردو اخبار'' نامی اخبار جاری کیا تھا جو نامساعد حالات کی بنا پہ جلد بند ہوگیا۔'جامِ جہاں نما' ابتدا میں حکومت کا ہمنوا تھا لیکن جب ہری دت نے اس کی ادارت سنبھالی تو یہ حکومت کا خوشہ چیں بن گیا۔کمپنی حکومت نے بطور تادیبی کارروائی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔یہ اخبار 25 رسال تک جاری رہا اور تاریخ رقم کر گیا۔ 1826 میں ہندی ہفتہ وار ''اورنت مارتنڈ'' کا اجرا ہوا جو بعد میں روزنامہ ہوگیا۔1830 میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی اور 1835 میں اخبارات نکالنے کے سرکاری احکام بھی جاری کیے گئے۔لارڈ ولیم بینٹینک کے مشورہ پر کارگزار گورنر جنرل چارلس مٹکاف نے 1823 کے 'دی لائسنسنگ ریگولیشن ایکٹ' کو کالعدم قرار دے دیا اور 1835 میں ''دی لبریشن آف دی انڈین پریس ایکٹ'' کو نافذ کیا گیا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

اردو صحافت کے ابتدائی دور 1823 سے 1857 تک اردو میں 122 راخبارات کے شائع ہونے کا ریکارڈ موجود ہے۔اس دور میں شائع ہونے والے بیشتر اخبارات کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔کمپنی حکومت ان کی اشاعت کا تقریباً نصف حصہ لائبریریوں اور تحصیلوں کے لیے خرید لیا کرتی تھی۔اس لیے اس دور میں شائع ہونے والے بیشتر اردو اخبارات صرف احکامات اور اعلانات شائع کرنے تک محدود تھے۔بعض اخبارات برطانوی افسران کی سرپرستی اور ایما پر شائع کیے گئے تھے'اس لیے ان اخبارات کے مدیران مصلحت پسندی سے کام لیا کرتے تھے۔زمانے نے جب کروٹ بدلی اور پہلی جنگِ آزادی کا شعلہ بھڑکا تب کچھ اخبارات نہ صرف کمپنی حکومت کے ظلم وستم کی داستان بیان کرنے لگے بلکہ اپنی تحریروں سے درپردہ انقلابیوں کا حوصلہ بھی بڑھانے لگے۔کمپنی حکومت کی یہ صورتحال ناقابلِ قبول تھی اس لیے ایسے اخبارات کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی گئی۔بطور سزا بڑی رقم کے ساتھ پریس کو بھی ضبط

کرلیا گیا۔کمپنی حکومت نے 1908 میں ''نیوز پیپرا یکٹ''اور 1910 میں ''دی انڈین پریس ایکٹ'' نافذ کر اخبارات پہ شکنجہ کس چکی تھی۔ان حالات میں ایسے اخبارات جنھوں نے حوصلہ وہمت کا ثبوت دیا ان میں (1) سلطان الاخبار، آگرہ، (2) عمدۃ الاخبار بمبئی (3) صدرالاخبار آگرہ (4) حبیب الاخبار بدایوں (5) خیرخواہ ہند مراد پور (6) نورالاخبار، الہ آباد (7) کریم الاخبار دہلی (8) طلسم لکھنؤ (9) آفتاب ہند، بنارس (10) صادق الاخبار دہلی (11) اردواخبار دہلی اور (12) پٹنہ ہرکارو شامل تھے۔

ان اخبارات میں دو اخبار (1) دہلی اردو اخبار (2) کوہِ نور، لاہور کا مختصر تعارف لازمی جان پڑتا ہے۔شمالی ہند میں 1852 میں دہلی کالج، دہلی میں قائم ہوا۔دہلی اردو اخبار کے مدیر وناشر محمد باقر ولد محمد حسین آزاد اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے انھوں نے 1837 میں اس اخبار کا اجرا کیا۔3 رمئی 1840 کو اس اخبار کا نام ''دہلی اخبار'' سے ''دہلی اردو اخبار'' ہوگیا۔یہ ایک مکمل اخبار تھا۔اس کے مشمولات میں عالمی واقعات، ملکی حالات، ریاستی معاملات، کمپنی حکومت کے اقدامات وفتوحات، قلعہ معلیٰ کے روز وشب کی تفصیلات کے علاوہ غالب، مومن، ذوق، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کا کلام بھی شائع ہوا کرتا تھا۔محمد باقر مقصدی صحافت پہ یقین رکھتے تھے۔راست بینی وحق گوئی ان کا نصب العین تھا۔1857 کے جنگِ آزادی میں انھوں نے سرفروشانِ آزادی کی کھل کر حمایت کی۔اس جرم کے پاداش میں کمپنی نے 74 رسالہ محمد باقر کے جسد خاکی کو 16 رستمبر 1857 کو توپ کے گولے سے اُڑا دیا۔اس طرح محمد باقر ہندوستان کے پہلے صحافی تھے جنھوں نے آزادیٔ ہند کے لیے جامِ شہادت نوش کیا۔

ہفت روزہ کوہ نور لاہور، مدیر ہرسکھ لال، کی اشاعت 1850 میں شروع ہوئی۔اس اخبار میں ملک میں ہونے والے معرکے، مجاہدین آزادی کی سرگرمیاں، حکومت کی جابرانہ، سفاکانہ اور غیر منصفانہ کارروائیوں کی تفصیل شائع ہوا کرتی تھی۔یہ اخبار عوام میں بہت مقبول تھا۔تحریک آزادی کے پروانوں کو پشت پناہی کرنا اس اخبار کی پالیسی تھی۔کچھ عرصے بعد اس کے مدیر ہرسکھ لال نے اخبار کی پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے علاحدگی اختیار کرلی۔

جے نٹراجن کی تصنیف ''ہسٹری آف انڈین جرنلزم'' کے مطابق پہلی جنگِ آزادی کی

ناکامی کے بعد اردو میں صرف بارہ اخبار اپنی اشاعت برقرار رکھ پائے اور ان پہ کمپنی حکومت کی برابر کڑی نگاہ رہی۔ سچ کو اجاگر کرنا اس وقت جرم تھا' اس لیے جو اخبارات شائع ہو رہے تھے وہ بے خوف و خطر اپنے خیالات اور نظریہ کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ 1823 سے 1857 تک ہندوستان کے مختلف مراکز سے اردو اخبارات جس تعداد میں شائع ہو رہے تھے اس کی شہروار تفصیل مودود صدیقی نے فراہم کی ہے جو درج ذیل ہے:

آگرہ	18	دہلی	14
کلکتہ	10	بنارس	10
لکھنؤ	7	نامعلوم	8
مدراس	7	لاہور	6
بمبئی	5	سیالکوٹ	5
میرٹھ	3	ملتان	3
پشاور	3	لدھیانہ	2
گوالیار	2	آرہ	2
مرادپور	1	بریلی	1
بھوپال	1	اندور	1
بدایوں	1	گجرانوالہ	1
بھرت پور	1	الہٰ آباد	1
راول پنڈی	1	کراچی	1
شاہ جہاں پور	1	گجرات	1
گیا	1	سورت	1
رامپور	1	علی گڑھ	1
بٹالہ	1		

1823 سے 1857 تک جن اردو اخبارات کی اشاعت عمل میں آئی اس کی تفصیل

ڈاکٹر افضل مصباحی نے اپنی کتاب 'اردو صحافت آزادی کے بعد' میں فراہم کی ہے۔اس فہرست کے مطابق اس دور میں ملک کے مختلف شہروں سے 122 راخبارات شائع ہوتے تھے۔

1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی نے ہندوستان میں اردو صحافت کی کمر توڑ دی۔اس جنگ کا انجام ایک قوم کے لیے عروج اور دوسری قوم کے لیے زوال کا پیغام لے کر آیا۔ملک وملت کے ہر شعبہ کو اس شکست کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ 1 رنومبر 1858 کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمے کے بعد ہندوستان کی حکومت کے سارے اختیارات حکومت برطانیہ کو منتقل ہو گئے۔تاریخ کے اس دور کا آغاز صحافت پر نئی پابندیوں اور بندشوں سے ہوا۔گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اخباروں کی آزادی سلب کرنے کے لیے نئے قوانین نافذ کیے۔ان قوانین کو تاریخ میں قوانین زباں بندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔''دی لائسنسنگ ایکٹ۔1857'' کے تحت پریس کے لیے لائسنس حاصل کرنا لازم ہو گیا۔حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ بغیر وجہ بتائے جس اخبار پہ چاہے سنسر بٹھا دے اور پابندی عائد کر دے۔اس ماحول میں بھی اردو صحافت حکومت انگلشیہ کی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتی رہی۔1858 سے 1860 تک بمبئی، کلکتہ، لکھنؤ، مدراس، جونپور، اجمیر، کانپور، کوٹہ، سورت اور فتح گڑھ سے گیارہ اخبار جاری ہوئے۔ 1857 سے 1900 تک صرف بہار سے 29 راخبار ورسائل کا اجرا ہوا۔ان سبھی کا مزاج علمی، نظریہ اصلاحی اور انداز مدبرانہ تھا۔

1857 سے 1947 تک کا دور اردو صحافت کا عہد زریں ہے۔اس عہدِ جبر وقہر کی ابتدا میں اردو صحافت کا پودا کمہلایا ضرور لیکن پورے طور پر مرجھایا نہیں۔اردو میں شائع ہونے والے اخبارات درپیش حالات میں نہ صرف محتاط بلکہ صحیح معنوں میں خوفزدہ ہو کر اعتدال پسند ہو گئے تھے۔اس فضا میں سرسید کی شخصیت ایک مینارۂ نور کی طرح نمودار ہوئی۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے صحافت اور حکومت پہ یہ حقیقت واضح کی کہ بے اطمینانی کی فضا حکومت اور اردو صحافت دونوں کے لیے سم قاتل ہے۔سرسید کے خیال میں صحافت کے کچھ اہم فرائض ہیں۔

> ''اخبار کے لکھنے والے کے فرائض تین قسم کے ہوتے ہیں۔یعنی وہ صلاح دینے والا، تربیت کرنے والا، اور لوگوں کی حالت و معاشرت کی اصلاح کرنے والا ہوتا ہے۔'' (سرسید)

1857 کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد 1858 میں اردو کا ایک ہفت روزہ ''اودھ اخبار'' منشی نول کشور نے لکھنؤ سے جاری کیا۔ یہ اخبار 1874 میں روزنامہ بن گیا۔ یہ اردو کے مقبول ترین اخباروں میں تھا۔ اس اخبار میں ملکی اور بین الاقوامی خبروں کے علاوہ ہر قسم کے معاشرتی، ثقافتی، ادبی موضوعات پر گراں قدر مقالے چھپتے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد اس میں قسط وار چھپا۔ یہ اخبار 90 رسال تک جاری رہا۔ سرسید نے 1866 میں علی گڑھ سے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور 14 ردسمبر 1870 کو 'تہذیب الاخلاق' کا اجرا کیا اور یہ اپنے مشن میں کامیاب ہوا'۔ سرسید مشرکانہ رسومات، تہمات، اندھی تقلید اور بے جا ٹکراؤ کے مخالفین میں تھے۔ ان دونوں رسائل کا مقصد کلّی طور پر سماجی، تہذیبی، تعلیمی، نظریاتی اور ثقافتی تبدیلی لانا تھا۔ منشی سجاد حسین نے پنچ (لندن) کی طرز پر 1877 میں لکھنؤ سے ''اودھ پنچ'' نکالا۔ یہ اخبار ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار اور مغربی تہذیب کا ناقد تھا۔ اس اخبار کو بھی کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان اخبارات کے علاوہ ملک کے مختلف مراکز سے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے اردو اخبارات کی اشاعت ہو رہی تھی۔ یہ سارے اخبارات حکومت کے احکام کے پابند تھے، لیکن 1875 میں صوبہ بہار کا قحط اور جنگِ افغانستان (1839۔1842) میں حکومت کو جب ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تو اردو اخبار ات میں ان کی خبریں شائع ہوئیں۔ حکومت کو اردو صحافت کی یہ جرأت رندانہ پسند نہ آئی' اس لیے 1867 میں ''دی رجسٹریشن ایکٹ'' اور ''سر جارج کیمپبیل'' کی سفارش پر 1878 میں ''ورناکولر پریس ایکٹ'' نافذ کیا گیا۔ یہ ایکٹ صرف دیسی زبان کے اخبارات کی زباں بندی کے لیے لاگو کیے گئے تھے۔ انگریزی میں شائع ہونے والے اخبارات اس سے مستثنیٰ تھے۔ ورناکولر پریس ایکٹ' 1878 کے نفاذ سے قبل ملک کے مختلف مراکز سے کثیر تعداد میں اردو اخبارات کی اشاعت ہو رہی تھی۔ ان میں (1) ہفت روزہ شمس الاخبار، مدراس (2) دس روزہ طلسم حیرت، مدراس (3) قاسم الاخبار، بنگلور (4)، ہفت روزہ آگرہ اخبار، آگرہ (5)، ہفت روزہ خیر خواہِ عالم، دہلی (6) نصرت الاخبار، دہلی، (7) ریاض الاخبار، گورکھپور (8) ریاض الاخبار، مدراس، (9) ہفت روزہ روزگار مدراس (10) مدراس، ہفت روزہ نیر اعظم مرادآباد (11)، ہفت روزہ مہر و نیم روز بجنور، دہلی (12) پنچ لاہور،

عوام میں مقبول تھے۔ یہ سبھی اخبار حکومت کے احکام کے پابند تھے۔ان کے لیے سیاسی، تحریکی، خبریں شجر ممنوعہ تھیں۔ان کی تعداد اشاعت قلیل اور سماج میں ان کا اثر کچھ حد تک محدود تھا۔ورنا کولر پریس ایکٹ کے خلاف سریندرناتھ بنرجی نے ایک مہم چلائی اور رائے عامہ تیار کی۔ بالآخر 1881 میں لارڈ رپن کی سفارش پر حکومت برطانیہ نے اس ایکٹ کو منسوخ کر دیا۔اس قدم سے اخبار اور حکومت کے بیچ تعلقات کچھ بحال ہوئے۔

1876 میں انڈین ایسوسی ایشن، 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس، 1893 میں محمڈن اینگلو انڈین ایسوسی ایشن،1903 میں محمڈن پالیٹیکل ایسوسی ایشن اور1906 میں انڈین مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہندوستان کی سیاسی فضا میں تبدیلی آئی۔ابتدا میں یہ جماعتیں حکومتِ برطانیہ کی خیر خواہوں میں شمار کی جاتی تھیں،لیکن کچھ عرصے بعد ان جماعتوں کے اجلاس میں حکومت کی پالیسی، ملک کے سیاسی و معاشی حالات اور ملکی قوانین وغیرہ پر کھل کر گفتگو ہونے لگی۔اہم بات یہ تھی کہ ان اجلاس میں کیے گئے اظہار خیال کی رپورٹنگ اردو اخبارات میں ہونے لگی۔اس طرح مصلحت پسندی کے رویے پر ایک ضرب لگی۔اس عرصہ میں انگریزی زبان میں شائع ہو رہے اخبارات حکومت انگلشیہ،ارباب حکومت اور والیان ریاست سے مراعات حاصل کرنے کے لیے مدح سرائی میں مصروف رہے۔اس کے برخلاف 1885 سے 1900 کے عرصے میں اردو اخبارات نے قابل قدر صحافت کا مظاہرہ کیا۔ اور حقیقت کو اجاگر کرنے میں پوری جرأت کا ثبوت دیا۔جن اردو اخبارات نے ملک و ملت کے حالات وحقائق کو بیان کر نظریہ سازی میں اہم رول ادا کیا ان میں (1) ہفت روزہ سراج الاخبار جہلم،(2) ہفت روزہ اپیچ پٹنہ(3) ماہنامہ زمیندار گجرانوالہ(4)، ہفت روزہ پیسہ گجرانوالہ/ لاہور،(5) ہفت روزہ امپیریل پیپر لاہور(6)، ہفت روزہ سول اور ملیٹری نیوز لدھیانہ،(7) ہفت روزہ افضل الاخبار دہلی، (8) ہفت روزہ دہلی پنچ دہلی،(9) ہفت روزہ چودھویں صدی راول پنڈی (10) سہ روزہ وکیل امرتسر،(11) ہفت روزہ تہذیب نسواں لاہور،(12) ہفت روزہ صدائے ہند لاہور، (13) ہفت روزہ کرزن گزٹ دہلی شامل تھے۔ان اخبارات میں اپیچ مدیر رحیم الدین، پیسہ اخبار مدیر محبوب عالم، چودھویں صدی مدیر سراج الدین، وکیل مدیر مولانا ابوالکام آزاد،

تہذیب نسواں مدیر محمدی بیگم/ امتیاز علی تاج، صدائے ہند مدیر منشی دین محمد، کرزن دہلی مدیر مرزا حیدر دہلوی، بے باک اور تعمیری صحافت کے قائل تھے اور اس کا ثبوت دے رہے تھے۔ اس بنا پر خیر خواہانِ حکومت ان اخبارات کے نشانہ پر رہا کرتے تھے۔ ان اخبارات نے ہندوستان کے مختلف اقوام کی باہمی ہم آہنگی، باہمی اتحاد، مشترکہ وراثت، مشترکہ عزائم اور فرقہ وارانہ اتحاد کی اہمیت اور سیاسی بازی گری کو اپنے انداز میں پیش کیا۔ 1871 میں بہار اور بنگال کے گورنر سرجان کیمپبیل نے جب اردو کے لیے جانب دارانہ رویہ اختیار کر ہتک آمیز الفاظ کا استعمال کیا تب اردو اخبارات نے بلاخوف وخطر انھیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل مغربی تعلیم اور فلسفہ نے ہندوستانیوں بالخصوص انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ پر جدید سیاسی افکار، نئے سماجی اقدار اور تبدیل شدہ معاشی نظریہ کے دروازہ کھول دیے گئے تھے۔ اس طرح اعتدال پسندی اور مصلحت پسندی پہ کاری ضرب لگی اور حق خود اختیاری کا نظریہ پروان چڑھا۔ 20 ویں صدی کے آغاز کے ساتھ اردو صحافت میں بھی انقلاب برپا ہوا۔ دبی ہوئی چنگاری شعلہ بنی، خوابیدہ ذہن بیدار ہوئے۔ اس بیداری کا سہرا سیاسی رہنماؤں کے ساتھ اردو زبان میں شائع اخبارات کے مدیروں کے سر بھی جاتا ہے۔ اس دور میں جن اخبارات نے جذبۂ آزادی کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کر اپنی شناخت بنائی ان میں (1) ہفت روزہ اخبار وطن، 1901 (2) زمیندار لاہور 1903 مدیر ظفر علی خاں (3) اردوئے معلیٰ علی گڑھ، 1903 مدیر حسرت موہانی (4) سوراجیہ الہ آباد، 1907، الہلال کلکتہ 1912 مدیر مولانا ابوالکلام آزاد (5) ہمدرد دہلی 1913، مدیر محمد علی جوہر (6) مدینہ بجنور، 1912، مدیر نصراللہ غازی (7) (8) جمہور کلکتہ، 1917 مدیر قاضی عبدالغفار، (9) اخوت لکھنؤ 1918 مدیر نواب ضوار القدر (10) جنگ، رعیت دہلی، 1920 مدیر خواجہ حسن نظامی (11) بندے ماترم لاہور، 1921 مدیر میلا رام وفا (12) خلافت بمبئی، 1921 مدیر چودھری عبدالغنی، تیج دہلی، 1923 مدیر لالہ دیش بندھو گپتا (13) ہفتہ وار رن ویر جموں، 1924 مدیر لالہ ملک راج (14)، ہفت روزہ سچ 1925 مدیر ظفر الملک/ عبدالماجد دریا آبادی (15)، ہفت روزہ الجمیعت، دہلی 1925 مدیر مولانا محمد عرفان/ مولانا ابو لاعلیٰ مودودی (16) الہند کلکتہ، 1931 مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

(17) پرتاپ لاہور 1919 مدیر مہاشہ کرشن (18) ملاپ لاہور، 1923 مدیر مہاشہ، خوشحال چند خورشند، (19) ہفتہ وار مسلم پٹنہ 1936 مدیر سید منظر علی ندوی (20) رہبر وطن بھوپال، 1938 مدیر محمود الحسن صدیقی (21) سیاست لاہور مدیر سید حبیب (22) انقلاب بمبئی 1938 عبدالحمید انصاری نے نئی تاریخ رقم کی۔ان اخبارات کے مدیروں وناشروں نے ہرطرح کی صعوبتیں برداشت کیں۔ذہنی ومالی پریشانیوں کے ساتھ قیدوبند کی مشقت ان کا مقدر بنا۔اردوصحافت نے عوام الناس کے دل ودماغ میں پیدا جذبہ آزادی کو نہ صرف فروغ بخشا بلکہ ایثاروقربانی کی مثال قائم کرنے کی ترغیب دی۔ایک اندازہ کے مطابق 1940 میں اردو اخبارات کی تعداد 500 تھی اوران میں سے ایک بڑی تعداد حصول آزادی کے لیے کمربستہ تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز کا باضابطہ اعلان 1914 میں اور اختتام کا اعلان 1918 میں ہوا۔ حکومت برطانیہ کی قیادت میں اتحادی افواج نے فتح حاصل کی۔جرمنی وترکی کو شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔20 راگست 1920 کو ترکی کے خلیفہ نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے معاہدہ سروس پر دستخط کردیے۔ترکی کے کمال اتاترک نے خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا اعلان کردیا۔ہندوستانی عوام بالخصوص ہندوستانی مسلمان اس سے بے حد مضطرب ہوئے اور ایک ہیجان میں مبتلا ہوگئے۔انجام کار ہندوستان کی پہلی عوامی تحریک جو ''خلافت تحریک'' کے نام سے مشہور ہوئی کی ابتدا ہوئی۔اس تحریک کے طفیل ہندوستان نے ہندومسلم اتحاد کا وہ نظارہ دیکھا جس کی دید کو اب آنکھیں ترستی ہیں۔ہندوستان کی سیاست نے اس تحریک کے طفیل ایک نئی کروٹ لی۔گفت وشنید کو ترک کر سیاسی پارٹیوں نے گاندھی جی کی قیادت میں یکم اگست 1920 کو عدم تعاون تحریک کا اعلان کردیا۔عدم تعاون تحریک کی وجہ کر پورے ملک میں حکومت انگلشیہ مفلوج ہوکر رہ گئی۔اس دور میں اردو اخبارات نے بے باکانہ صحافت کا ثبوت دیا۔انجام سے بے خبر اردو صحافت ببانگ دہل ملک وقوم سے تیاگ وقربانی کی اپیل کررہا تھا۔ 1900 سے 1940 تک جن اردو اخبارات نے ملک میں آزادی کے جذبہ کو پروان چڑھایا ان میں سے چند اہم اخبارات وان کے مدیران کا ذکر یہاں لازمی جان پڑتا ہے۔

''اردوئے معلّٰی'' دہلی ان اخبارات میں شامل ہے۔مولانا حسرت موہانی نے جولائی

1903 میں علی گڑھ سے اس کی اشاعت شروع کی۔ مولانا حسرت کی صحافتی زندگی چار دہائیوں پہ محیط ہے۔ وہ صرف صحافی نہیں تھے بلکہ باکمال شاعر و ادیب اور بے خوف سیاست داں بھی تھے۔ دورانِ تعلیم علی گڑھ کالج میں انھیں ''خالہ جان'' کے خطاب سے نوازا گیا اور جب وہ سیاست وصحافت میں داخل ہوئے تو دیوانہ ملا پکارے گئے۔ ''اردوئے معلّٰی'' ایک ادبی، انقلابی اور بے باک صحیفہ تھا۔ اس میں ادب، سیاستِ عالم، جغرافیہ، عصری مسائل، مذہبیات، سماجیات، حیاتیات، صحت عامہ، تعبیرِ خواب اور کھیل وغیرہ کی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانہ میں کوئی دوسرا رسالہ ایک غیر یقینی ماحول میں اتنے جوش وجذبہ کے ساتھ خبریں شائع نہیں کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس اخبار میں معتبر شعراء کا کلام بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ 1908 میں ''اردوئے معلّٰی'' میں ایک مضمون بعنوان مصر میں ''انگریزوں کی پالیسی'' شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کی جرم میں مولانا حسرت کو دو سال قید اور پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ مولانا حسرت 23 رجون 1908 سے 19 رجون 1909 تک جیل میں رہے۔ اس عرصہ میں اردوئے معلّٰی کی اشاعت بند رہی۔ جولائی 1909 میں حسرت کی رہائی کے بعد اردوئے معلّٰی کی اشاعتِ ثانی کا آغاز اکتوبر 1909 میں ہوا۔ دسمبر 1909 سے اردوئے معلّٰی میں حسرت کی قید و بند کی روح فرسا داستان بعنوان ''مشاہداتِ زنداں'' کی اشاعت شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ جنوری 1910 تک چلا۔ حسرت کے درج ذیل اشعار اسی زمانہ کی یادگار ہے:

(1) ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

(2) کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

13 راپریل 1916 کو حسرت کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ یہ گرفتاری سر جیمس مشن کے حکم پر ''دی انڈین پریس ایکٹ، 1910'' کے تحت کی گئی۔ گرفتاری کے ساتھ تین ہزار کی ضمانت بھی طلب کی گئی۔ قید سے رہائی کے بعد اردوئے معلّٰی 1917 سے 1924 تک شائع ہوتا رہا۔ 15 راپریل 1924 کو حسرت پھر گرفتار کیے گئے۔ اور ''اردوئے معلّٰی'' کی اشاعت بند ہو گئی۔ 12 راگست 1924

کو جیل سے رہائی کے بعد حسرت نے اسے پھر جاری کیا۔ کچھ عرصہ کے لیے یہ کانپور سے بھی شائع کیا گیا۔ اشاعت کا سلسلہ 1942 تک جاری رہا۔ ''اردوئے معلّٰی'' کے آخری شمارے میں حسرت نے لکھا ہے کہ

> ''اگرچہ اردوئے معلی بند کر دیا گیا مگر میری زبان، میرا دل، میری قوت بنوز آزاد ہے اور میں جس طرح پہلے کام کرتا تھا اب بھی خدائی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لوں گا۔''

حسرت تا عمر ادب و صحافت کی بے لوث خدمت کے ساتھ آزادیٔ کامل کے حصول کے لیے برسر پیکار رہے۔ حسرت کا مزاج درویشانہ اور عمل مجاہدانہ تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی ضمیر کی آواز پہ لبیک کہا۔ اردو کا درویش صفت صحافی جو مصلحت پسندی سے نا آشنا تھا کا انتقال 14 رمئی 1951 کو لکھنؤ میں ہو گیا تھا۔

ہفت روزہ ''الہلال'' کا اجرا مولانا ابوالکلام آزاد نے 13 رجولائی 1912 کو کلکتہ سے کیا۔ صحافت سے مولانا آزاد کا دیرینہ تعلق تھا۔ ''الہلال'' سے قبل وہ ہفت وار المصباح، احسن الاخبار، الندوہ، سہ روزہ وکیل، ہفتہ وار دار السلطنت اور لسان الصدق سے وابستہ رہ چکے تھے۔ صحافت کے تجربے کی ساتھ ان کا تعلق ایک معزز علمی و مذہبی خانوادے سے تھا۔ وہ خود ایک مستند و معتبر عالم دین تھے اور بعد میں مفسر قرآن ہوئے۔ مولانا آزاد نے ''الہلال'' کی اشاعت کے ساتھ استحکام کے لیے کسی طرح کا عطیہ لینے سے انکار کر دیا تا کہ اخبار کو کسی طرح کے دباؤ اور سمجھوتہ سے آزاد رکھا جائے۔ 27 رجولائی 1912 کے ''الہلال'' میں انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ یہ لکھا:

> ''اخبار نویسوں کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے اور چاندی و سونا کا سایہ بھی اس کے سم قاتل ہے۔ جو اخبار نویس رئیسوں کے ضیافتوں اور امیروں کے عطیہ کو قومی عطیوں، قومی امانت، اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نور ایمان کو بیچیں، بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر قلندروں کی کشتی

کی جگہ قلمدان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پہ گشت لگائیں اور گلی کوچہ
''قلم ایڈیٹری کا'' صدا لگا کر خود کو اپنے تئیں فروخ کرتے رہیں۔''

''الہلال'' کے تیز و تند اداریوں کی وجہ کر حکومتِ انگلشیہ کی نیندیں اُڑ گئیں۔ الہلال نے آزادی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں میں دیگر اقوام کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوکر حصولِ آزادی کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ بیدار کیا۔ عام ہندوستانیوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ مختلف اقوام بالخصوص ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی حاصل کرنا ایک خواب ہے۔ ہفتہ وار ''الہلال'' عام و خواص میں یکساں مقبول تھا۔ اس نے اردو صحافت کو ایک نیا انداز بخشا۔ اس دور میں اس کی اشاعت 26000 رتھی۔ ''الہلال'' کی اشاعت کے چند مہینہ بعد حکومت نے اس سے ضمانت طلب کی۔ ضمانت داخل کر دی گئی لیکن اخبار کا انداز اور مدیر کا تیور برقرار رہا۔ 21 راکتوبر 1912 کو ''الہلال'' کا مشترکہ شمارہ نکلا جسے حکومتِ بنگال نے ضبط کر لیا۔ حکومت نے دس ہزار کی ضمانت طلب کی جسے داخل کرنا ممکن نہ تھا۔ ''الہلال'' 18 رنومبر 1912 تک جاری رہا۔ ''الہلال'' کے بند ہوجانے کے بعد مولانا آزاد نے 12 رنومبر 1915 کو ''البلاغ'' جاری کیا۔ یہ اخبار 21 رمارچ 1916 تک صرف پانچ مہینے جاری رہا۔ 11 رسال کے بعد 10 رجون 1927 کو ''الہلال'' پھر جاری کیا گیا، لیکن سات مہینے بعد 9 ردسمبر 1927 کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ صحافت مولانا آزاد کے لیے ایک مشن تھا۔ وہ اس مشن کی کامیابی کے لیے اپنی تمام قوت و صلاحیت کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جس زمانے میں حق گوئی جرم تھی اس زمانے میں اس کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور انھوں نے بلا خوف و خطر حق کا پرچم بلند کیا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مولانا آزاد کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے

''جاذبیت کا یہ عالم کہ نکلتے ہی سکۂ رائج الوقت بن گئے۔ حالی و شبلی کی سادگی سر پیٹتی رہی اور اکبر الہ آبادی اور عبدالحق، موجودہ بابائے اردو، سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔''

محمد علی جوہر نے 14 رجنوری 1911 کو انگریزی ہفت روزہ ''کامریڈ'' کا اجرا کیا۔ اسے

غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے صرف کامریڈ کی کامیابی پر اکتفا نہیں کیا کیونکہ انھیں علم تھا کہ ہندوستان میں رابطے کی زبان اردو ہے۔ 21/اپریل 1929 میں محمد علی جوہر نے خود لکھا ہے:

''میں نے دیکھا کہ اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرنے کا موقع ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ میں اردو زبان میں ایک روزنامہ جاری کروں۔ 27/اپریل 1912 کے کامریڈ میں انھوں نے مجوزہ اردو روزنامہ کے خدوخال کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اردو روزنامہ کے لیے انھوں نے ایک واضح منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامع پہنانے کے لیے کامریڈ کے قارئین سے تعاون کی اپیل کی۔ پندرہ سالہ مدت کے لیے قریب 25000/روپے کے Debentures جاری کیے گئے۔ اخبار کے لیے بیروت سے نسخ ٹائپ منگایا گیا۔ 23/فروری 1913 سے 31/مئی 1913 تک ''ہمدرد'' بھی ایک صفحہ، کبھی دو صفحے پر چھپتا رہا۔ یکم جون 1913 سے ''ہمدرد'' 16/صفحات پر مشتمل ایک مکمل اخبار کی شکل میں نمودار ہوا۔ بطور مدیر محمد علی کا نام لوح پر ہی درج تھا۔ ہمدرد کے پہلے شمارے میں خواجہ الطاف حسین حالی کی درج ذیل رباعی شائع ہوئی تھی۔

عزت کی تمنا نہ خطابوں کی طلب
ایک قوم کی خدمت کی ہے خواہش یارب
ہمدرد کو اسم بامسمّٰی کیجیو
اس نام کی لاج ترے ہاتھ ہے یارب

ہمدرد کے لیے مشہور بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیوں ''رائٹر'' اور ''ایسوسی ایٹیڈ پریس'' کی خدمات حاصل کی گئیں۔ روزنامہ'' ہمدرد'' کی سب سے بڑی خوبی اس کی جامعیت تھی۔ یہ اخبار خبر رسانی کے ساتھ خبر گیری، شعروادب کے ساتھ طنز وظرافت، مذہب کے ساتھ سیاست، تاریخ واکابر کے ساتھ اسلام ومشاہیر عالم کے بارے میں معلومات فراہم کرتا تھا۔ محمد علی ہنگامی صحافت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے ان تمام خوبیوں کی بنا پہ'' ہمدرد'' ایک سنجیدہ اور پاکیزہ اخبار ثابت ہوا۔ اس کی اشاعت قریب 25000/تک پہنچ گئی۔ یہ اخبار محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی معرکہ آرائی کا بھی شاہد بنا۔ محمد علی کی ذات بقول رئیس احمد جعفری آتش فشاں تھی اور باغ ارم بھی۔ ''ہمدرد'' بھی اس کا شکار ہوا۔ محمد علی کی مصروفیتوں اور بے ضابطگیوں کی وجہ کر

''ہمدرد'' کی اشاعت بھی متاثر ہوئی۔ 20/اپریل 1915 کو محمد علی نظر بند کر دیے گئے اور 10/اگست 1915 کی اشاعت کے بعد ہمدرد بھی بند کر دیا گیا۔28/دسمبر 1919 کو محمد علی جیل سے رہا ہوئے لیکن ''ہمدرد'' نو سال تک جاری نہ ہو سکا۔''ہمدرد'' کے دورِ ثانی کا پہلا پرچہ 9/نومبر 1924 کو منظرِ عام پر آیا۔دورِ ثانی میں وہ قارئین کے مزاج ومعیار پہ کھرا نہ اتر سکا کیونکہ اس عرصہ میں ملک کا سیاسی، سماجی اور مذہبی منظر نامہ بدل چکا تھا۔بالآخر 12/اپریل 1929 کو روزنامہ ہمدرد بند کر دیا گیا۔محمد علی نے ان الفاظ میں الوداعیہ لکھا:

> ''اب میں قارئین ہمدرد کو الوداع کہتا ہوں۔میں نے جس کسی کا قصور کیا ہے
> اس سے استدعا ہے کہ مجھے معاف کرے،نہیں تو اسے اختیار ہے کہ جو جی
> چاہے کہہ دے مگر میرے لیے دعا ضرور کرے کہ خدا مجھے حق گوئی حق نگاری
> اور حق پرستی کی توفیق عطا فرمائے اور میرے بے شمار گناہوں کو معاف فرمائے۔''

روزنامہ ہمدرد مرحوم ہو گیا لیکن اردو صحافت کا مقام ومعیار متعین کر گیا۔ ہمدرد کو نظر انداز کر اس عہد کی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی تقریباً نصف صدی اردو صحافت سے وابستہ رہے۔صحافت ان کے لیے ایک مقدس فریضہ تھی۔جنوری 1925 سے ان کا تعلق اردو صحافت سے قائم ہوا۔وہ ہفتہ وار ''سچ'' لکھنؤ کے مدیر مقرر ہوئے۔انھیں مذہبی اور جدید علوم کی گہری واقفیت تھی۔ان کے انشاء پردازی کی دھوم تھی۔انھوں نے انگریزی اور اردو میں قرآن کریم کا ترجمہ بھی کیا۔وہ محمد علی جوہر کے جانثاروں میں تھے۔ ان کے ادارت میں شائع ہونے والا ہفتہ وار'' سچ'' کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن میں مشرقی تہذیب وعلم کے وقار ووقعت کو اجاگر کیا۔مولانا دریا آبادی نے صحافت میں ایک مصلح کا کردار ادا کیا ہے۔ ہفتہ وار'' سچ'' میں انھوں نے بلاخوف وخطرت بے جا رسومات،توہمات،اعتقادات،نظریات کے خلاف آواز اٹھائی۔عقد بیوگان، جائیداد میں عورتوں کا حصہ کی وکالت اور بے جا اصراف اور نمائش کے خلاف مولانا دریا آبادی تاحیات سینہ سپر رہے۔انھوں نے بااصول صحافت کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحافت کے ذریعہ خدمت دیں،خدمت ملت

اورخدمت خلق کی جائے۔صحافی عوام کے جذبات کونہ صرف اجاگر کرے بلکہ عوام کے مزاج، مذاق اور جذبوں کی تربیت واصلاح بھی کرے۔مولانا کی نظر میں مخالف پہ ذاتی حملہ نہ کرنا صحافی کا فرض اولین ہے۔صحافی کوخود کے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے اپنے رپورٹ میں شگفتگی، شائستگی، میانہ روی کا انداز اختیار کرنا لازمی ہے۔مولانا کے خیال میں صحافت میں خبر کے ساتھ خبر کی سرخی کی بھی یکساں اہمیت ہے۔ہفتہ وار ''سچ'' ہمیشہ مظلوم کی آواز بلند کرتا رہا۔ہندو مسلم اتحاد، ہندوستانی سیکولرزم، مذہبی رواداری اورصالح ادب کا حامی رہا۔سچ کی ایک انفرادیت یہ بھی تھی کہ مغربی اخباروں، رسائل اور مذہبی کتابوں سے اخذ کردہ معلومات کو صحیح پس منظر میں پیش کرتا تھا۔سچ میں مولانا دریا آبادی کے کتابوں پہ بے لاگ تبصرہ شائع ہوتے تھے۔''سچ'' مولانا دریا آبادی کے شستہ وشگفتہ زبان، برجستہ سرخیوں، برمحل مصرعوں اوردلنشیں عبارتوں کی بنا پر ادب عالیہ کا نمونہ بن گیا۔سنجیدہ قارئین میں اسے شرف قبولیت حاصل ہوئی۔ ''سچ'' نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا۔سول نافرمانی تحریک 1930 کے زمانے میں سچ میں شائع بعض مضامین حکومت انگلشیہ کی نظر میں قابل اعتراض قرار دئے گئے۔اخبار سے ضمانت طلب کی گئی اورداخل نہ کرنے کی وجہ کر اخبار کی اشاعت کئی ہفتہ بند رہی۔اپنی نو سالہ زندگی میں ہفتہ وار سچ ہمیشہ سچائی کا علمبردار رہا۔1933 میں اس کی اشاعت بند ہوگئی۔

ہفتہ وار ''زمیندار'' لاہور 1903 میں منشی معراج الدین احمد خاں نے کرم آباد سے جاری کیا تھا۔ان کے فرزند مولانا ظفر علی خاں جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور پائے کے خطیب، نثر نگار اور شاعر تھے نے 1910 میں ''زمیندار'' کو بطور روزنامہ لاہور سے نکالنا شروع کیا۔یکم جون 1910 کو اپنے اداریہ میں انھوں نے اپنے عزائم اور اخبار کی پالیسی پر ان الفاظ میں خامہ فرسائی کی ہے۔

> ''ہماری کوشش یہ ہوگی کہ یہ اخبار اپنے آپ کو گورنمنٹ کا ایک وفادار اور مخلص مشیر اور رعایا کی خواہشوں اور آرزوؤں کا صحیح ترجمان اور ملک و ملت کی حفاظت کا ایک مضبوط ذریعہ ثابت ہو سکے۔''

ظفر علی خاں کا مزاج ابتدا سے باغیانہ تھا۔صبر وضبط سے انھیں یارانہ تھا۔زندگی اور سیاست میں انھوں نے مصالحت کو تسلیم نہ کیا۔ وہ یقیں محکم اور عمل پیہم کے قائل تھے۔

روزنامہ زمیندار نے تحریک آزادی کی زبردست حمایت کی۔اس کے ہر صفحہ پر حکومت انگلشیہ کے سیاہ کارناموں کا ایک باب درج رہا کرتا تھا۔ظفر علی خاں دار ورسن کی ہر آزمائی سے گزرے۔ اخبار کے لیے ضمانت کی طلبی اور پریس کی ضبطی کی آزمائشوں سے انھیں بارہا گزرنا پڑا۔حکومت انگلشیہ نے اس کی اشاعت پر 1961 میں پابندی لگادی۔ چار سال کے وقفہ کے بعد 1920 میں دوبارہ اس کی اشاعت شروع ہوئی۔بقول عتیق احمد صدیقی:

''غیر ملکی تسلط اور ان کے جبر واستبداد کے خلاف جنگ اور استخلاص وطن مسلسل جدوجہد جاری رکھی۔سب سے زیادہ قربانیاں دیں۔اس کے ضمانتیں بار بار ضبط ہوئیں اور اس کا پریس کئی بار ضبط ہوا۔ادارتی عملہ کے افراد کو یے بعد دیگرے قید وبندکی صعوبتیں بھگتنی پڑیں لیکن حکومت کا کوئی جبر واستبداد نا آواز دبا سکا اور نا اسے اپنے موقف سے ہٹا سکا۔''

خود ظفر علی خاں کا اعتراف ہے:

دل ضبط، زباں ضبط، فغاں ضبط، قلم ضبط
ایسے بھی ہوتے ہیں دنیا میں کہیں سامانِ ضبط
برطانیہ کا یہی شیوہ رہا کر کچھ اور
سن لوگے عزیزو ہو گئے سب دیر وحرم ضبط

ظفر علی خاں کا انداز تحریر ولہجہ بے باک اور تیر ونشتر سے لیس ہوا کرتا تھا۔ان کا جلال آتش فشاں کی مانند تھا۔ان کی زد میں آنے والا شخص،ادارہ یا حکومت کو درگزر کرنا ناممکنات میں تھا۔ ظفر علی خاں صنم پرست نہیں صنم شکن تھے۔انھوں نے حکومت انگلشیہ کے ساتھ اہم شخصیات بشمول اخبار،مولانا آزاد،گاندھی جی،اور مولانا محمد علی جناح وغیرہ کو اپنا حدف بنایا۔ ''زمیندار'' کی روزانہ اشاعت 30،000ر(تیس ہزار) تھی جو اس کی بے پناہ مقبولیت کا ثبوت ہے۔روزنامہ ''زمیندار'' نے بے زبانوں کو زبان دی اور عوام کو صدائے احتجاج بلند کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

20 رویں صدی کے ابتدائی دور میں جن اخبارات نے اپنی پہچان بنائی ان میں ہفتہ وار

'پیسہ اخبار، گجرانوالہ/ لاہور شامل ہے۔اس کے مدیر محبوب عالم تھے۔''پیسہ اخبار''1887 سے نکلنا شروع ہوا۔ابتدا میں اس کو مقبولیت نہ ملی۔اس کی اشاعت وقت پر نہیں ہوتی تھی۔ اس چارورقی اخبار کی کتابت وطباعت بھی معیاری نہ تھی۔1889 سے اسے عوام میں مقبولیت ملنی شروع ہوئی۔یہ گجرانوالہ سے لاہور منتقل ہوگیا۔ہفتہ وار سے ایک روزنامہ بن گیا۔ 20رویں صدی میں بھی اس کی مقبولیت قائم رہی۔یہ اخبار اپنے دم خم پہ جاری تھااوراس نے صحافت کوتجارت کی انداز میں لیا۔اشتہارات کے حصول پہ اس اخبار نے خصوصی توجہ دی اوردیگراخبارات سے اس کی قیمت کافی کم تھی۔اس دور میں اس اخبار کی اہمیت یہ رہی کہ اس نے اہل علم کوصحافت کی طرف راغب کیا۔قارئین کواس نے ذہن نشیں کرایا کہ کوئی صاحب علم ہی اخبار کی ادارت کے قابل ہوسکتا ہے کیونکہ اخبار کے اہم فرائض میں ملک وقوم کی رہنمائی بھی ہے۔''پیسہ اخبار'' کے ہمعصروں میں'' وکیل''، امرتسر (1889) اور''وطن''، لاہور (1921) شامل تھے۔ان دونوں اخبارات کی بھی کافی پذیرائی ہوئی لیکن پیسہ اخبار کو ان پہ برابر سبقت حاصل رہی۔یہ اخبار مختلف وجوہات کی بناپر 1924 میں بند ہوگیا۔''پیسہ اخبار'' نے اپنے دور میں اردوصحافت کوایک سمت عطا کی اوراس لیے اسے تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

1940 کے دہے کے آغاز پراردو پریس کی حیثیت ملک گیر ہوچکی تھی۔حکومتِ انگلشیہ کی نظر میں اردواخبارات کی اہمیت نسبتاً زیادہ تھی۔ملک کے انتظامیہ کی ضرورت اورنگرانی کے لیے حکومت نے اردو کے مقبول اورمعتبر اخبار کی فہرست تیارکرائی جوطویل تھی۔اس فہرست میں (1) تیج،دہلی (2) انقلاب، لاہور (3) وطن، دہلی (4) خلافت، بمبئی (5) حق، لکھنؤ (6) حیات، کراچی (7) عصرجدید، کلکتہ (8) ندیم، بھوپال (9) الکلام، بنگلور (10) اتحاد، پٹنہ (11) پیام، حیدرآباد (12) البرہان، اکولا (13) مجاہد ڈیرا اسمعیل خاں (14) ناظم، رام پور (15) پرتاپ، لاہور (16) زمیندار، لاہور (17) احسان، لاہور کا نام شامل تھا۔

20رویں صدی کی چوتھی دہائی کے خاتمے کے بعد جواردواخبارات وجود میں آئے اوراپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے ان میں (1) جنگ، دہلی۔1942، مدیر خلیل الرحمن (2) روزنامہ صدائے عام، پٹنہ، 1942، مدیر سید رضی حیدر (3) پربھات، لاہور، 1943، مدیر

لالہ نانک چندناز (4) اجیت،لدھیانہ،1943،مدیر سادھوسنگھ ہمدرد(5)قومی آواز،لکھنؤ، 1945، مدیر حیات اللہ انصاری(6)ہفتہ واردعوت،دہلی،مدیر محمد مسلم (7) امروز، لاہور، 1942 مدیر میاں افتخارالدین(8)اتحاد،دہلی،1940،مدیر مولانا امداد صابری(9)نوائے وقت، لاہور، 1940، مدیر حمید نظامی(10)روزنامہ ملّت،پشاور،1944(11)ہفتہ وارنئی دنیا، دہلی، 1946،مدیر عبدالوحید صدیقی شامل ہیں۔ان اخبارات کے علاوہ ملک کے مختلف مقامات سے اردو ہفت روزہ اور روزنامہ شائع ہوئے لیکن اپنی شناخت بنانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اردوصحافت نے جدوجہد آزادی میں جوکردارادا کیااس کا ذکر سنہرے الفاظ میں کیا جائے گا۔

آزادی خون میں نہا کر نمودار ہوئی ہے۔ملک تقسیم ہوگیا۔لاکھوں افراد اور خاندان تباہ و برباد ہوگئے۔اردوصحافت پر وقت پیغمبری آ گیا۔ ایک طبقہ نے تقسیم ہند کاالزام اردوزبان اوراردوصحافت پر بھی لگایا۔اردو کے کئی اخبار بند ہوگئے کچھ تمام سازوسامان کے ساتھ پاکستان منتقل ہوگئے۔تقسیم ہند کے بعد جوآبادی لاکھوں کی تعداد میں منتقل ہوئی اس کا75 فیصد اردوخواں تھااوراردواخبارات کا قاری تھا۔اس طرح اردواخبارات کے قاری میں کمی آئی۔اردو ایک فرقے کی زبان قراردے دی گئی اوراردوصحافت کادائرہ تنگ ہوگیا۔قاری کی کمی کے ساتھ اردواخبارات کو وسائل کی کمی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔وقت گزرنے کے ساتھ حالات کچھ معمول پہ آنے لگے۔آزادی کے بعداردوصحافت کامقصد ملک میں جمہوریت اورسیکولرزم کواستحکام پہنچانا قرار پایا۔اردوکی ملک گیر حیثیت ختم ہوجانے کے بعد 1949 میں صوبہ پنجاب سے ''ہندسماچار''،صوبہ بنگال سے''آزادی ہند''اورصوبہ اترپردیش سے''آزاد'' کا اجرا ہوا۔ آہستہ آہستہ ملک کے مختلف صوبوں سے بھی اردواخباروں کی اشاعت شروع ہوئی۔ اردو صحافت نے پھرانگڑائی لی۔1952 کا زمانہ اردوصحافت کے نشاۃ ثانیہ کا عہد کہا جاسکتا ہے۔ حالات کی بہتری کی تائید اعدادشمار سے ہوتی ہے۔اردوصحافت کوسب سے بڑی خوشخبری 1981 میں ملی جب برصغیر میں کمپیوٹر کی کتابت کا آغاز ہوا۔ہندوستان میں اردوصحافت کوایک اوراہم کامیابی اس وقت ملی جب انگریزی خبررساں ایجنسی یو۔ان۔آئی نے اردو سروس کا آغاز کیا۔1993 کے رجسٹرارآف نیوز پیپر کی رپورٹ کے مطابق 1992 کے اختتام تک ملک

میں اردو زبان میں 373 روز نامہ اور 960 ہفت روزہ شائع ہو رہے تھے۔1997 میں تعداد کے اعتبار سے اردو اخبارات کا مقام ہندی اور انگریزی کے بعد تیسرا تھا۔اس عرصہ میں اردو صحافت کا المیہ یہ رہا کہ قاری کی تعداد گھٹنے لگی۔تعلیمی اداروں میں اردو کے طالب علموں کی تعداد میں کمی آئی۔اس کے باوجود (1) ہفت روزہ اردو بلٹز بمبئی (2) ہفت روزہ آئینہ بمبئی (3) ہفت روزہ نشیمن بنگلور اور (4) ہفت روزہ نئی دنیا نئی دہلی جیسے اخبارات اردو خواں طبقے میں از حد مقبول ہوئے۔حکومت ہند نے 1951 میں ''The Press objectionable Act'' پاس کیا۔اس ایکٹ کی رو سے پہلے سے نافذ مرکز اور صوبے کے نافذ کردہ تمام ایکٹ کالعدم قرار دے دیے گئے۔اس ایکٹ سے مرکزی حکومت کے اختیارات میں کافی اضافہ ہوا۔اس سے ہندوستانی پریس بالخصوص اردو پریس کے لیے بھی مسائل کھڑے ہوئے۔1971 میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد پریس کی آزادی چھن گئی اور اخبارات پہ سنسر شپ بٹھادی گئی۔اس صورتِ حال نے اردو صحافت کی ساکھ کو بھی مجروح کیا۔اردو اخبارات اپنی بقا کے لیے تماشہ بیں سے تماشہ بن گئے۔وقت اور حالات میں تبدیلی کے ساتھ ہندوستانی اخبارات بشمول اردو اخبارات کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور ان کے طریقہ کار میں قابل قدر تبدیلی آئی۔

آزادی کے بعد کے عرصہ میں ہفت روزہ آئینہ بمبئی، ہفت روزہ اردو بلٹز، بمبئی، ہفت روزہ نشیمن، بنگلور اور ہفت روزہ نئی دنیا نئی دہلی نے مقبولیت کا نیا ریکارڈ قائم کیا اور ملک گیر شہرت حاصل کی۔ماہنامہ شمع دہلی کے ادارے سے شائع ہفت روزہ '' آئینہ'' کا اجرا 1965 میں ہوا۔ظ۔انصاری جو اردو، فارسی، انگریزی اور روسی زبانوں کے عالم تھے اس کے مدیر مقرر ہوئے۔وہ اپنی طرز تحریر اور نادر اسلوب کے لیے معروف و مقبول تھے۔آئینہ میں انھوں نے حالات حاضرہ، تاریخی وراثت، ملکی سیاست اور عالمی ادب وغیرہ پہ اپنے منفرد انداز میں لکھا۔ آئینہ کی کتابت وطباعت مثالی تھی اور تصاویر کے استعمال نے اسے ایک انفرادیت عطا کی تھی۔کچھ ہی عرصے میں ہفت روزہ آئینہ اپنے دور کا ایک مثالی اخبار بن گیا۔اردو صحافت کے مدیر آئینہ ظ۔انصاری، کو یہ اعزاز حاصل رہا کہ بغیر لاگ لپیٹ اہم موضوعات پہ یہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔''کانٹوں کی زبان'' ان کے اداریوں کا انتخاب ہے۔ اردو

اخبارات کی صورتحال پہ ان کا یہ دیانت دارانہ اعتراف آج بھی قابل غور ہے:

''چند اخبار اتنے خوشحال ہوئے اور ایسے خوشحال اداروں سے نکلے کہ اردو صحافت کی چھلنی سے بھی اصل مدیر کی صحافت چھن گئی۔ اور مینیجنگ ایڈیٹر کو ہی اصل ایڈیٹر سمجھا جانے لگا۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے کہ مالک و مدیر کی شب ہجر دراز ہوگئی۔ دوسری وجہ مشینری اسپرٹ رکھنے والے اہم قلم کار صحافت کے بڑھتے ہوئے تام وجھام میں دب کر رہ گئے۔ تیسری وجہ کامیاب اخباروں، رسائل کی یہ کوشش کہ انھیں مقررہ سیاسی یا ادبی نظریہ سے منسوب نہ کیا جائے۔ چوتھے ملازمت پیشہ، بے نظریہ، بے آدرش نوجوانوں کا صحافت کو صرف ایک درمیانی زینہ کے طور پر استعمال کرنا، نتیجہ ظاہر ہے۔ اردو صحافت خود صحافیانہ اصول وضابطہ سے بے بہرہ ہوتی چلی گئی۔''

اردو صحافت کا یہ آئینہ اپنی تمام صفات کے باوجود ٹوٹ گیا اور اپنی یاد چھوڑ گیا۔

ہفتہ وار اردو ''بلٹز''، بمبئی کا اجرا 1963 میں ہوا۔ اپنے زمانے کا یہ مقبول ترین اخبار تھا۔ کالج کے طلبا، اساتذہ اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے اسے حاصل کرنا اور لے کر چلنا ایک فیشن تھا۔ ابتدا میں انور عظیم اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1968 تک انھوں نے مدیر کا قلمدان سنبھالا۔ ان کے بعد اختر حسین کو ایڈیٹری کا منصب عطا ہوا لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ملی۔ اخبار کا سرکولیشن کم ہوتا گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اسے بند کرنے کا خیال آر۔ کے۔ کرنجیا کے ذہن میں آیا۔ اس وقت حسن کمال نے کچھ شرطوں کے ساتھ اس کی باگ ڈور سنبھالی۔ ہفت روزہ اردو ''بلٹز'' کی ادارتی ٹیم میں قیصر مظہر حسن، اختر حسن محمد ایوبی اور ہارون رشید شامل تھے۔ ان سب کی محنت رنگ لائی۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کی اشاعت ایک لاکھ سات ہزار ہوگئی۔ اس اخبار کے سیاسی تبصرے اور اسپورٹس کی خبریں ہر طبقہ کے قارئین میں بہت مقبول ہوئے۔ حسن کمال کی ادارت میں شروع کیا گیا کالم ''عالم اسلام'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اخبار کا آخری صفحہ خواجہ احمد عباس ''آزاد قلم'' کے عنوان سے لکھتے تھے۔ اس صفحہ پر وہ قومی، بین الاقوامی، سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، فلمی موضوعات پر اظہار خیال فرماتے تھے۔ یہ

کالم قاری کے دل و دماغ پر یکساں طور پر دستک دیتا تھا۔خواجہ احمد عباس نے انتقال سے قبل یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اخبار کے'' آزاد قلم'' کے صفحات کے ساتھ ان کی تدفین کی جائے۔ یہ ایک خوش کن خبر ہے کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم'' آزاد قلم'' کو مرتب کر کے شائع کرنے کے منصوبہ پہ کام کر رہے ہیں۔اس اخبار کے دو خصوصی شمارے (1) ہند، پاک، بنگلہ دیش (2) کرکٹ نمبر کی حیثیت آج بھی دستاویزی ہے۔اردو بلٹز ترقی پسند نظریات کا حامی تھا لیکن اس کی پذیرائی ہر حلقہ میں ہوئی۔

ہفتہ وار نشیمن، بنگلور کا اجرا 26 رجنوری 1962 کو ہوا۔اس کے صفحہ اول پر یہ شعر درج ہوا کرتا ہے۔

نشیمن پہ نشیمن اس قدر تعمیر کرتا جا
کہ بجلی گرتے گرتے آپ خود بیزار ہو جائے
(جگر مرادآبادی)

اس کے بانی و مدیر عثمان سعید مرحوم صحافت کے اسرار و رموز سے واقف تھے۔ان کے پیش نظر اردو صحافت کا روشن ماضی تھا۔ وہ کھوٹا کو کھرا کہنے کے قائل نہ تھے۔ صحافت کو انھوں نے ایک مقدس فریضہ سمجھا۔ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کے طفیل ہفت روزہ ''نشیمن'' کو ایک الگ شناخت ملی۔یہ ملک کی طول و عرض میں مقبول ہو گیا۔اس اخبار کے تیور ابتدا سے ہی باغیانہ تھے۔اس کے شذرات کے مطالعہ سے ''ہمدرد، دہلی'' کی یاد تازہ ہو جایا کرتی تھی۔بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے وقت اس میں پوری دیانت داری کے ساتھ بہاری مسلمانوں کے مسائل کو اٹھایا اور اس کے حل کا مطالبہ کیا۔اس اخبار میں عموماً مسلم مسائل اور عالم اسلام کے خبروں کو فوقیت دی جاتی تھی۔ ہفت روزہ نشیمن آٹھ صفحات میں شامل ہوا کرتا تھا' لیکن اسے یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ اپنے دورِ شباب میں بیالیس صفحات پہ بھی شائع ہوا ہے۔بی بی سی لندن اور وائس آف امریکہ، واشنگٹن اس کے حوالہ سے خبریں نشر کیا کرتے تھے۔دیگر ممالک کے اخباروں میں نشیمن میں شائع خبروں کو حوالہ کے ساتھ جگہ ملا کرتی تھی۔ بیجا جذباتیت اور انتہا پسندی کی وجہ کر آہستہ آہستہ اس اخبار کا اثر و دائرہ تنگ ہوتا گیا۔اب یہ اخبار محترمہ منیر النسا کی ادارت

میں گاہے بہ گاہے نکلتا ہے۔

ہفت روزہ نئی دنیا دہلی کی شروعات بطور روزنامہ 16 رجولائی 1951 کو ہوئی۔ مولانا عبدالوحید صدیقی اس کے مدیر تھے انھوں نے 1939 میں ''جاوید'' دہلی اور 1924 میں ''مہاجر'' دیوبند سے جاری کیا تھا۔ انھیں ''زمیندار''، ''مساوات'' اور ''الجمیعت'' میں بطور صحافی کام کرنے کا تجربہ تھا۔ ''نئی دنیا'' اپنے باغیانہ تیور، اسلام پسند نظریہ اور حکومت مخالف رویہ کی بنا پر مسلم طبقے میں مقبول ہوگیا۔ 1951 میں نئی دنیا سے ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ تمام اخباروں نے حکومت کے اس اقدام کی مذمت کی اور بالآخر حکومت کو اپنے اس حکم کو واپس لینا پڑا۔ اس کے بعد بھی نئی دنیا کی پالیسی میں تبدیلی نہ آئی۔ اس کے مدیر کو اخبار میں شائع اداریہ کی وجہ کر کئی بار جیل جانا پڑا۔ اخبار کی اقتصادی حالت کمزور ہوگئی اور 1964 میں اسے بند کرنا پڑا۔ 1973 میں نئی دنیا ہفت روزہ کی شکل میں پھر نمودار ہوا۔ اخبار کا انداز نیا تھا لیکن تیور وہی پرانا تھا۔ اخبار جلد ہی مقبول ہوگیا اور اس کی اشاعت لاکھ کے قریب پہنچ گئی۔ شاہد صدیقی بطور معاون اخبار سے جڑے۔ اسے نامور صحافیوں کا بھی تعاون ملنے لگا۔ ''نئی دنیا'' نے مسلم مسائل کو ترجیح دی اور عالم اسلام کے نازک اور جذباتی مسائل کو پرجوش انداز اور پرشکوہ الفاظ میں پیش کیا۔ مسلم پرسنل لا، بابری مسجد کا انہدام، افغانستان پر غیر ملکی تسلط اور عراق کے مسئلہ کو اخبار میں خوب اچھالا گیا۔ جس کی وجہ کر اس کے قارئین ہیجان میں مبتلا ہوگئے اور اگلے شمارے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ مولانا عبدالوحید صدیقی کے بعد شاہد صدیقی اس کے مدیر ہوئے۔ انھوں نے صحافت کے ساتھ سیاست کا بھی دامن تھاما۔ اخبار کی مقبولیت اور تعداد اشاعت میں کمی آئی۔ آج بھی یہ اخبار پابندی سے شائع ہو رہا ہے لیکن قارئین اب دیدہ دل بچھائے اس کے منتظر نہیں رہتے ہیں۔

اردو میں شائع دیگر اخبارات کو قاری کی تعداد میں بتدریج کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ وسائل کی کمی، تربیت یافتہ صحافیوں کی کمی کی وجہ کر اردو اخبارات کا حلقہ سکڑنے لگا۔ اس کے باوجود (1) روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی (2) روزنامہ انقلاب، بمبئی (3) روزنامہ سیاست، حیدرآباد (4) روزنامہ سالار، بنگلور (5) روزنامہ ہند سماچار، جالندھر جیسے اخبارات اب لاکھوں کی تعداد

میں شائع ہونے لگے یہ ایک حوصلہ افشار جحان ہے۔

ملک کی معروف کمپنی سہارا انڈیا پریوار کے زیر اہتمام روزنامہ راشٹریہ سہارا جون 1999 سے شائع ہورہا ہے۔اس کی اشاعت کی ابتداد ہلی اور لکھنؤ سے ہوئی۔اس کے بعد گورکھپور اور 07۔2006 کے درمیان بمبئی،کولکتہ،حیدرآباد، پٹنہ،کانپور اور بنگلور سے یہ اخبار شائع ہونے لگا۔فی الوقت ہندوستان کا یہ ایک اہم روزنامہ ہے جو بارہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔جس زمانے میں عزیز برنی اس اخبار کے گروپ ایڈیٹر ہوا کرتے تھے اُس زمانے میں اسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔اس اخبار کی خصوصی اشاعتوں مثلاً عید میلاد النبی نمبر،غریب نواز نمبر، اعلیٰ حضرت نمبر،عظیم شہادت نمبر،علی سردار جعفری نمبر وغیرہ کی کافی پذیرائی ہوئی۔یہ اخبار اعتدال پسند ہے۔سنسنی خیزی اور ہیجان انگیزی اس کا مزاج نہیں رہا ہے۔عزیز برنی کے دورادارت میں اس اخبار نے ایسے مسائل کو شدت سے اٹھایا اور ابھارا جو مسلم مزاج اور نفسیات سے جڑے ہوئے تھے۔ہندوستان کے انتہاپسند افراد اور تنظیموں پر اس اخبار میں کڑی تنقید شائع ہوا کرتی تھی۔بمبئی بلاسٹ کے موقع پر اس اخبار نے کچھ ایسے حقائق کو منظر عام پہ لایا جو سنسنی خیز لیکن اہم تھے۔جب سے سید فیصل علی اس کے گروپ ایڈیٹر اور اسد رضا ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں اس اخبار نے خبر کو صرف خبر تک محدود رکھا۔اخبار کی کتابت و طباعت ہر اعتبار سے دیدہ زیب اور مشمولات متاثر کن ہیں۔اخبار نے غیر جانب داری اور میانہ روی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے خود کو اشتعال انگیزی اور سنسنی خیزی سے دور رکھا ہے۔اس ادارہ سے ہفتہ وار عالمی سہارا (2003) بھی شائع کیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' بمبئی کا اجرا 1938 میں ہوا۔وہ ایک ہنگامی دور تھا۔دنیا پر دوسری جنگِ عظیم کی آمد کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ہندوستان کی تحریک آزادی شباب پر تھی۔ہندو مسلم اتحاد مسلم لیگ کی سیاست کی وجہ کر مجروح ہو چکا تھا۔اس فضا میں روزنامہ انقلاب نے اعتدال پسندی کا رویہ اپنایا۔تقسیم ہند کے بعد اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔روزنامہ انقلاب اس آزمائش میں کھرا اترا۔اس نے وقت کے ساتھ صحافت کی دنیا میں نہ صرف اپنے قدم مضبوطی سے جمائے بلکہ اوروں کے لیے ایک مثال قائم کی۔اس ادارے سے اردو اخبار کی اشاعت کے ساتھ

انگریزی میں ''مڈ ڈے'' اور ''گجراتی مڈ ڈے'' اخبار بھی نکالے گئے۔اس کے علاوہ انگریزی میں اسپورٹس ورلڈ اور اردو میں فلمی میگزین'' کہکشاں'' بھی جاری ہوا۔ اخبار میں خبروں کی تصدیق تصاویر سے بھی کرائی جاتی ہے۔اس کی کتابت وطباعت نہ صرف جاندار بلکہ شاندار ہوتی ہے۔انقلاب سے ہر دور میں نامور صحافی اور دانشور وابستہ رہے۔ خالد انصاری، خلش احمد جعفری، ظ۔ انصاری، فضیل جعفری، ہارون رشید، خوشونت سنگھ، برینددر ناتھ، منور مادیوان، عبدالمغنی، انور عظیم، سید حامد، حسن کمال، برکھادت، نجیب جنگ، یوسف ناظم، اختر الواسع جیسے قابل قدر افراد بحیثیت کالم نگار اور مقالہ نگار اس سے وابستہ رہے۔ 2011 میں یہ اخبار نئی منزلوں سے ہمکنار ہوا۔معروف میڈیا گروپ 'دینک جاگرن' نے اس کے مالکانہ حقوق خرید لیا۔ اس طرح ایک ندی سمندر سے ہمکنار ہوگئی۔فی الحال اس اخبار کا بارہ ایڈیشن بمبئی، لکھنؤ، دہلی، علی گڑھ، آگرہ، مرادآباد، بریلی، کانپور، گورکھپور، وارانسی، الہ آباد اور پٹنہ سے شائع ہوتے ہیں۔یہ اخبار غیر جانب دار اور نیشنلسٹ نظریہ کا حامی ہے۔ہندوستان کی سالمیت' تہذیب' ادب وتاریخ اسے عزیز ہے۔قارئین سے قریبی رابطہ اختیار کرنے کے لیے اس اخبار نے پہلی بار SMS سے پیغامات منگوانے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ ملک کا ایک کامیاب اخبار ہے۔اس کا حلقہ کافی وسیع ہے۔

حیدرآباد میں اردو صحافت کا آغاز کب ہوا؟ یہ امر آج بھی تحقیق طلب ہے، انیسویں صدی سے آج تک حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبارات کی فہرست طویل ہے۔ان اخبارات میں روزنامہ ''سیاست'' نے جو مقام حاصل کیا وہ قابل تقلید ہے۔اس اخبار کا اجرا 15 راگست 1949 کو ہوا۔اسی سال حیدرآباد سے'' رہنمائے دکن'' اور روزنامہ'' ملاپ'' کا بھی اجرا ہوا۔1949 کے پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد میں ایک بے چینی اور کشیدگی کا ماحول تھا۔اس ماحول میں روزنامہ'' سیاست'' نے رہبری کا کام کیا۔میر عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کی ادارت میں اس اخبار نے اردو صحافت کے سنگلاخ زمین پہ قدم رکھا۔اعلیٰ انسانی قدروں کی ترجمانی، عالمی اخوت اور جمہوری اقدار کے فروغ کو اس اخبار نے ابتدا سے بطور اصول اپنایا۔ اخبار کو شروعاتی دور میں ہی کامیابی مل گئی۔ اخبار میں ہر طبقہ کے مزاج

اور مذاق کے لیے مواد ہوا کرتا ہے۔ اشتعال انگیزی اور سیاست بازی سے اسے پرہیز ہے۔ دیگر زبانوں کے اخبارات کی طرح اس نے اپنے کالم نگاروں اور مقالہ نگاروں کو معاوضہ ادا کیا۔ اس وجہ کر اسے اہم اور معتبر قلم کاروں کا تعاون ملا۔ یہ اخبار ادبی خبروں اور ادبی تخلیقات کو ایک خاص انداز سے پیش کرتا رہا ہے۔ اس میں تمام فنون کی شمولیت کا اہتمام ہوا کرتا ہے۔ اہم موضوعات پہ مشتمل کالم فکر و نظر، مزاحیہ کالم شیفتہ و حیستہ، سیاسی تبصرے، کتابوں پر تبصرے، ادبی موضوعات، کھیل کی خبریں، ریاستی، ملکی اور بین الاقوامی خبروں کے ساتھ قارئین کے تاثرات کو مناسب اور حسب ضرورت جگہ دی جاتی ہے۔ یہ اخبار غیر جانب دار اور آزاد صحافت کا علمبردار رہا ہے۔ ''سیاست'' کے بانی مدیر عابد علی خاں کا 1992 میں انتقال ہو گیا۔ محبوب حسین جگر جو اپنے آپ میں صحافت کی درس گاہ تھے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے باوجود یہ اخبار آج بھی زاہد علی خاں کی ادارت میں اسی آب و تاب کے ساتھ نکل رہا ہے۔ یہ اردو کا ایک کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن بنگلور سے بھی نکلتا ہے۔

ریاست کرناٹک میں اردو خواں کی آبادی کثیر ہے۔ کرناٹک میں باضابطہ طور پر اردو صحافت کا آغاز ہفتہ وار قاسم الاخبار سے شروع ہوا جو 1854 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد کئی اخبار وجود میں آئے لیکن دم توڑ گئے۔ 2 رفروری 1964 کو اردو کے نامور ادیب، شاعر، ناقد، محمود ایاز نے روزانہ سالار نکالا جس نے کرناٹک میں اردو صحافت کی نئی تاریخ رقم کی۔ محمود ایاز اس سے پہلے ایک ادبی رسالہ'' سوغات'' نکال چکے تھے جو اردو ادب میں جدیدیت کا نقیب رہا۔ محمود ایاز ''سالار'' کے بانی تھے۔ انھوں نے حسب منشا اس کے خدوخال طے کیے۔ اپنی لیاقت، صلاحیت اور روایت سے انحراف کرنے کی قوت سے کام لے کر انھوں نے اس اخبار کو ایک نئی سمت عطا کی۔ ڈیمائی سائز کے چھ صفحات پر شائع ہونے والا یہ اخبار یو۔ این۔ آئی' پی۔ ٹی۔ آئی اور دیگر نیوز ایجنسیوں کی فراہم کردہ خبروں کو مرقع بنا کر پیش کرتا رہا۔ یہ پیش کش متاثر کن تھی اور عوام میں مقبول ہوئی۔ اپنی خوبیوں اور جداگانہ انداز کی بنا پر یہ ریاست کرناٹک کا مقبول ترین اخبار بن گیا۔ اپنے ادبی ایڈیشن کی بنا پر یہ پوری اردو دنیا کا منظورِ نظر بنا۔ 1980 میں محمود ایاز ادارت سے دست بردار ہو گئے۔ اس کے بعد بی۔ شیخ نے نگراں مدیر کے

فرائض انجام دیے۔کچھ عرصہ بعد یہ اخبار الامین تحریک کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی زیرِ سرپرستی آ گیا۔اخبار روزانہ دس صفحات اور اتوار کو بارہ صفحات پہ مشتمل ہوتا ہے۔اخبار میں روزانہ مختلف موضوعات پر ایک گوشہ شائع کیا جاتا ہے۔اس اخبار کی اشاعت کی تعداد راشٹریہ سہارا کی بنگلور میں آمد کے بعد کچھ متاثر ہوئی ہے۔ملت کے تحفظ کا وقت بے وقت نعرہ، شخصیت پرستی، مسلم مسائل اور مذہب تک اخبار کو محدود کر دینے کی وجہ کر اس اخبار کی مقبولیت متاثر ہوئی ہے۔ اس اخبار میں جو مقالات شائع ہوتے ہیں وہ عموماً تراجم ہوتے ہیں۔خبریں باسی اور فیچرس پہ اوس پڑی دکھائی دیتی ہے۔یہ اخبار بھی معاوضہ ادا کرنے کے معاملے میں دیگر اردو اخبار سے مختلف نہیں ہے۔ان تمام کمیوں کے باوجود اخبار کا اپنا ایک حلقہ ہے۔ روزنامہ کے ساتھ ہفت روزہ ''سالار'' کی اشاعت بھی 2001 میں شروع کی گئی ہے۔

4/مئی 1948 کو لالہ جگت نارائن نے جالندھر سے اردو روزنامہ 'ہند سماچار' کی اشاعت شروع کی۔اس اخبار کی اشاعت کے ساتھ روزنامہ ملاپ، روزنامہ تیج بھارت، روزنامہ اجیت کی اشاعت جالندھر سے شروع ہوئی۔ان سب میں ''ہند سماچار'' نے اپنی الگ شناخت بنائی۔1949 میں اس کی اشاعت کی تعداد 1800 تھی جو 1965 میں 70000 پہنچ گئی۔اس ادارہ سے ''ہند سماچار'' (اردو) کے ساتھ 'پنجاب کیسری' (ہندی) اور 'جگ بانی' (پنجابی) بھی شائع ہو رہے ہیں۔ان تینوں اخبارات کی مشترکہ اشاعت ABC کی رپورٹ کے مطابق دس لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔''ہند سماچار'' اردو بھارت کا پہلا اخبار ہے جس نے کتابت وطباعت کے لیے 1987 میں نوری نستعلیق کا استعمال کیا۔ابتدا سے یہ اخبار ایک خاص فرقہ کی بنیاد پرست نظریات کا حامی رہا۔اس بنا پر اس کے دو مدیر لالہ جگت نارائن، جو کانگریس حکومت میں وزیر بھی رہ چکے تھے اور رمیش چند دہشت گردوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ہند سماچار کو اپنے خاص سیاسی نظریات کی بنا پر برابر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔اخبارات کو حاصل ہونے والے اشتہارات کے بند ہونے کے علاوہ ادارہ کو ہتک عزتی کا سامنا کرنا پڑا۔ایک موقع پر اخبار کے دفتر کی بجلی بھی کٹوا دی گئی۔ہند سماچار کی ٹیم نے ان مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور سرخرو سرفراز رہا۔اخبار کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں وہی خبریں زینت بنتی ہیں جو واسو دیو کٹمب اور

عالم کل کے نظریہ کی تائید نہیں کرتی ہیں۔اخبار کی زیادہ تر خبریں ہندی اور پنجابی اخبار کا ترجمہ ہوتی ہیں۔اخبار میں وہی کچھ چھپتا ہے جو مزاج یار میں آئے۔اس اخبار کی خصوصی اہمیت اس لیے ہے کہ اردو مخالف دور میں اس کا اجرا کیا گیا اور 56 سال گزر جانے کے بعد بھی یہ جاری ہے۔

بیسویں صدی کے اختتام تک ملک کے مختلف صوبوں سے جو اردو اخبارات شائع ہوئے اور انھوں نے اپنی شناخت بنائی اس کی ایک مختصر فہرست ڈاکٹر افضل مصباحی نے اپنی کتاب 'اردو صحافت آزادی کے بعد' میں فراہم کی ہے۔یہ فہرست کچھ اضافے کے ساتھ درج ذیل ہے۔

آندھرا پردیش: (1) روزنامہ دہقان دکن۔1949 (2) روزنامہ سیاست۔1949 (3) روزنامہ ملاپ، 1967-1949 میں بند ہوگیا (4) روزنامہ منصف۔1979 (5) روزنامہ اعتماد۔2005 (6) مضافات۔1060-1955 میں بند ہوگیا (7) ہفتہ وار تصحیح 1988-1959 میں بند ہوگیا۔(8) ہفتہ وار شعور۔1972-1964 میں بند ہوگیا۔(9) ہفتہ وار گواہ۔1999۔پندرہ وسیلہ۔

اتر پردیش: (1) روزنامہ عزائم دشت 1969، روزانہ 1979 بند ہوگیا ہے۔(2) روزنامہ قومی آواز 2008-1965 میں بند ہوگیا (3) روزنامہ راشٹریہ سہارا۔1999 (4) روزنامہ انقلاب۔2011 (5) ہفتہ وار پیغام۔بند ہو چکا ہے۔(6) پندرہ روزہ تعمیر حیات۔(7) تعلیمات جدید۔

اڑیسہ: (1) روزنامہ آج تک۔1998 (2) ہفت روزہ سہارا 1988-1985 میں بند ہوگیا۔

بہار: (1) روزنامہ ساقی۔1948 (2) صدائے عام 1942۔بند ہو چکا ہے۔(3) ہفت روزہ/روزنامہ سنگم۔1969/1953 (4) ہفت روزہ/روزنامہ قومی تنظیم۔1975/1965 (5) روزنامہ قومی آواز۔2008-1981 میں بند ہوگیا (6) روزنامہ ایثار۔1987-1985 میں بند ہوگیا (7) ہفت روزہ/روزنامہ فاروقی تنظیم۔1986/1984 (8) ہفت روزہ/روزنامہ پندار۔1988/1974 (10) روزنامہ انقلاب جدید۔1995 (11) روزنامہ/ہفت روزہ ہمزاد۔1938-1973 بند ہوگیا (12) روزنامہ راشٹریہ سہارا۔2006 (13) روزنامہ انقلاب 2013۔

پنجاب: (1) روزنامہ ملاپ۔1949 بند ہوگیا ہے (2) روزنامہ اجیت 1949۔بند ہوگیا ہے (3) روزنامہ جے بھارت۔بند ہوگیا ہے۔(4) روزنامہ ہند سماچار۔1949۔(5) روزنامہ پرتاپ۔بند ہوگیا ہے۔

تمل ناڈو: (1) مسلمان۔ 1927 (2) پندرہ روزہ/ ہفت روزہ آزاد نوجوان 1939/1960 (3) ہفت روزہ شاکر۔ 1953-1960 میں بند ہوگیا ہے۔ (4) ہفت روزہ اتحاد۔ 1968۔ 1985 میں بند ہوگیا ہے۔

جموں کشمیر: (1) رنبیر۔ 1924-1950 میں بند ہوگیا ہے۔ (2) روزنامہ خدمت۔ 1939 (3) روزنامہ روشنی۔ 1943 (4) روزنامہ آفتاب 1957 (5) روزنامہ صبح۔ 1994 (6) روزنامہ وادی کی آواز۔ 1985 (7) روزنامہ سری نگر ٹائمس۔ 1967 (8) روزنامہ صبح۔ 1994 (9) ہفت روزہ آئینہ۔ 1964-1980 میں بند ہوگیا ہے۔ (10) اُڑان۔

جھارکھنڈ: (1) روزنامہ فاروقی تنظیم۔ 1992 (2) روزنامہ قومی تنظیم۔ 2004 (3) روزنامہ راشٹریہ سہارا۔ 2003-2013 میں بند ہوگیا ہے۔ (4) روزنامہ مشرق۔ 2009 (5) روزنامہ جمہوریت ٹائمس۔ 2013

دہلی: (1) روزنامہ پرتاپ۔ 1948۔ (2) روزنامہ ملاپ 1947 (3) سہ روزہ/ روزنامہ الجمیعت۔ 1925/1947۔ 1984 میں بند ہوگیا ہے۔ (4) اخبار مشرق۔ یکم مئی 1996 (5) روزنامہ قومی آواز۔ 2008 میں بند ہوگیا ہے۔ (6) روزنامہ تیج (7) روزنامہ فیصل جدید، 1995-1986 میں بند ہوگیا ہے۔ (8) روزنامہ راشٹریہ سہارا۔ 1999 (9) روزنامہ/ ہفت روزہ نئی دنیا۔ 1951/1973 (10) سہ روزہ/ روزنامہ دعوت 1955/1960۔ روزنامہ دعوت بند ہوگیا ہے (11) ہفت روزہ عوام (12) روزنامہ انقلاب۔ 2011 (13) ہفت روزہ عالمی سہارا۔ 2003

راجستھان: پندرہ روزہ ہماری طاقت۔ 2010

مغربی بنگال: (1) روزنامہ عصر جدید۔ 1919-1992 میں بند ہوگیا۔ (2) روزنامہ آزاد ہند۔ 1948-2013 میں بند ہوگیا۔ (3) روزنامہ آبشار۔ 1954-1983 میں بند ہوگیا (4) ہفت روزہ/ روزانہ عکاس۔ 1968 / 1979 (5) روزنامہ اخبار مشرق۔ 1980 (6) روزنامہ رہبر اعلیٰ۔ 1970 میں بند ہوگیا۔ (7) اقرا۔ 1982 میں بند ہوگیا ہے۔ (8) شانِ ملت 1979 میں بند ہوگیا ہے۔ (9) روزنامہ راشٹریہ سہارا

مہاراشٹر: (1) روزنامہ انقلاب۔ 1938 (2) روزنامہ اردو ٹائمس۔ 1960 (3) ہفتہ وار

بلٹز۔ 1963 ۔ بند ہوگیا ہے۔(4) اورنگ آباد ٹائمس (5) ایشیا اکسپریس (6) رونامہ کاتب (7) روزنامہ ہندوستان 1936 (8) ہفت روزہ اخبار عالم۔1980-1996 میں بند ہوگیا ہے۔(9) ہفت روزہ آئینہ۔1965ء۔ یہ بند ہوگیا ہے۔

کرناٹک: (1) روزنامہ سالار۔ 1964 (2) روزنامہ پاسبان۔ 1946 (3) روزنامہ آزاد۔1946-1975 میں بند ہوگیا ہے۔(4) روزنامہ رہنمائے کرناٹک۔1949-1990 میں بند ہوگیا ہے۔(5) ہفت روزہ/روزنامہ کوثر۔ 1966 (6) روزنامہ جوہر گفتار۔ 1928 (7) روزنامہ بہمنی نیوز۔ 1983 (8) روزنامہ سلطان۔ 1990 (9) روزنامہ سیاست (10) روزنامہ راشٹریہ سہارا (11) ہفت روزہ نشیمن۔1962

مدھیہ پردیش: (1) روزنامہ آفتاب جدید۔ 1978-1986 میں بند ہوگیا ہے۔ (2) بھوپال ٹائمس (3) روزنامہ افکار۔ 1951-1987 میں بند ہوگیا۔(4) ہفت روزہ /روزنامہ اردو ایکشن۔ 1983 / 1993۔(5) الحمراء۔ 1966-1977 میں بند ہوگیا۔ (6) روزنامہ ندیم۔1938۔

کیرالا: (1) پندرہ روزہ ملی باری آواز۔1993-1994 میں بند ہوگیا۔

گجرات: (1) ہفت روزہ روشن ستارہ۔ 8/مارچ 1996۔ 29/مارچ 1996 کو بند ہوگیا۔

چھتیس گڑھ: (1) روزنامہ المقدس۔2009 (2) روزنامہ ذوالفقار۔2011

(نوٹ: اس فہرست میں اکیسویں صدی میں شائع اخبارات بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔)

بیسویں صدی کے خاتمہ تک اردو صحافت کے حالات خوش کن نہ صحیح لیکن قابل اطمینان رہے۔ اکیسویں صدی میں بھی اردو صحافت پرعزم ہے ملک و ملت کی رہنمائی و رہبری کا جذبہ رکھتی ہے۔ اس صدی میں بھی اردو صحافت کو ماضی میں درپیش مسائل اور حال کے چیلنجیز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سب سے بڑا چیلینج دیگر زبانوں میں الکٹرونک میڈیا کا عروج ہے۔ اس صورتِ حال میں اردو صحافت کے قارئین کو بھی اپنا مداح بنالیا ہے۔ وسائل کی کمی، غیر تربیت یافتہ صحافی و کالم نگار، محدود دائرہ اثر، اردو صحافت کے فروغ کو متاثر کر رہا ہے۔ رسائل

واخبارات کی تعدادِ اشاعت میں بتدریج کمی آرہی ہے' یہ یقیناً سنجیدگی سے لیے جانے کا سوال ہے۔سرکاری اکادمیوں کی امداد سے کچھ ادارے فعال ہوئے ہیں لیکن یہ اردو صحافت کے فروغ کے لیے ناکافی ہے۔اردو صحافت کا آج کا سب سے بڑا چیلینج عوام کا وہ اعتماد ہے جس پر ہر طرح کے سوالات کھڑے کیے جارہے ہیں۔آج کی صحافت بشمول اردو صحافت خالص مادّی مفادات پر مبنی ہے۔ملک میں شائع ہونے والے اردو کے بیشتر اخبار کا نہ اب کوئی نصب العین ہے نہ نظریہ۔صحافت تجارت بن چکی ہے۔سرمایہ داروں اور Corporate World کی دلچسپی،سرپرستی اور شرکت کی بناپہ اردو اخبارات اب صوری اعتبار سے دیگر زبانوں سے آنکھ ملا سکتے ہیں'لیکن معنوی اعتبار سے وہ روشن راہ پر گامزن نہیں ہیں۔اردو صحافت میں اب اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کا نظریہ کارفرما ہے۔اجارہ داری کا ایک ماحول فروغ پارہا ہے جہاں آزادانہ سانس لینا بھی مشکل ہے۔خبریں تلاش نہیں کی جاتی ہیں بلکہ تیار کی جاتی ہیں۔اشتہار،عنایت کے حصول میں صحافت سرنگوں ہوگئی ہے۔کمیٹیڈ صحافت کی بناپہ سطحی باتیں،سطحی خیال،سطحی نظریے اب اخبار کی سرخیاں بن رہے ہیں۔صحافت کے پیروں میں مصلحت ومصالحت کی بیڑیاں ہیں۔صحافی اب بے مقصد ایسی راہ پر گامزن ہے جہاں منزل کے نشان نہیں ملتے ہیں۔اردو کے نامور صحافی، روزنامہ سنگم پٹنہ کے مدیر،سابق وزیر حکومت بہار،غلام سرور مرحوم نے کہا تھا:

''ہندوستان کی صحافت رانڈ اور بیوہ ہوگئی اور اردو صحافت یتیم اور مسکین۔''

یہ ایک انتہاپسندانہ خیال ہے جس سے اختلاف کی گنجائش ہے' لیکن یہ سچ ہے کہ اردو زبان اور اردو صحافت اکیسویں صدی میں بھی عصبیت کا شکار ہے۔یہ عصبیت ہر سطح پہ ہے۔اردو کے جو اخبارات لاکھوں کی تعداد میں شائع ہورہے ہیں وہ بھی آج اشتہارات سے محروم ہیں۔یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اشتہار کی دستیابی کے بغیر اخبار کو استحکام نصیب نہیں ہوتا ہے۔اردو صحافت کی زبوں حالی کے اسباب اظہر من الشمس ہیں۔ان کا کچھ تعلق اردو خواں طبقہ کی سیاسی،سماجی،معاشرتی اور اقتصادی بصیرت کی کمی ہے۔آج عالم بے حس، دانشور بے عمل اور تعلیم یافتہ طبقہ سہل پسند ہو چکا ہے۔ان سب کی واحد وجہ مادّی منافعت ہے۔ ان اسباب کی بناپر اردو زبان وصحافت کی جڑیں کمزور ہو چکی ہیں۔اسے اپنوں نے ہی الوداع

کہہ دیا ہے۔خطرہ اس بات کا بھی ہے کہ کچھ عرصہ بعد اردو کہیں قصہ ماضی نہ بن جائے۔جب اردو زبان ہی نہیں رہے گی تو اردو صحافت کا ذکر کیوں اور کس بنا پر ہوگا۔اردو صحافت آج سنسنی خیزی اور جذباتیت کا شکار ہے۔بے جا مصالحت اور مفاد پرستی کی آغوش میں پروان چڑھ رہی ہے۔اس کا بھیانک انجام لسانی، احساس کمتری، تہذیبی پامالی، فرقہ وارانہ تنگ نظری اور مستقبل سے بے نیازی کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔

اکیسویں صدی کے ابتدا سے کچھ قبل اردو صحافت ایک خاموش انقلاب سے آشنا ہو چکی تھی۔اس صدی کو اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اکیسویں صدی میں اردو صحافت کو جدید ٹیکنالوجی مثلاً ٹیلی پرنٹر، کمپیوٹر، ڈیجیٹل کیمرہ، ورڈ پروسسنگ، موبائل، لیپ ٹاپ، اور انٹرنیٹ وغیرہ کی سہولتیں دستیاب ہو چکی ہیں۔ان ساری سہولتوں کے بعد بھی اردو صحافت کا وہ معیار آج بھی نہیں بن پایا ہے جو ملک کے دیگر زبانوں میں شائع اخبار کا ہے۔اس کے کئی وجوہات ہیں۔سب سے اہم وجہ ہے اردو صحافی کو مناسب معاوضہ اور حق محنت نہ دے کر اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔دیگر اہم وجہ یہ ہے کہ اردو کے صحافی تربیت یافتہ اور سند یافتہ نہیں ہوتے ہیں۔وہ ترجمہ کو ہی صحافت سمجھ کر خوش اور مطمئین ہیں۔صحافی کی اجرت میں اضافہ کا سب سے تاریک پہلو یہ ہے کہ اردو صحافت سے جڑے لوگ ہی اس کے مخالفین میں ہیں۔ بقول قیصر تمکین:

> ''اس سلسلہ میں انتہائی شرمناک ان کی (حیات اللہ انصاری، مدیر قومی آواز) کی وہ شہادت تھی جو انھوں نے پریس کمیشن کے اجرت بورڈ کے سامنے دی اور کہا کہ اردو صحافیوں کے لیے ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ ضرورت سے زیادہ کافی ہے۔انھوں نے یہ گواہی 1958 میں دی تھی۔''

آج اردو کے صحافی کے سامنے نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی منزل۔وہ مالکان کے حکم کی تکمیل کے لیے ہر دم کمر بستہ ہیں۔آج بھی اردو اخباروں میں مجلس، چہلم، سالگرہ، وفات اور مبارک باد جیسی غیر اہم خبریں شائع ہوتی ہیں۔زرد صحافت اب اردو میں سکہ رائج الوقت ہے۔اس کی وجہ عالموں اور دانشوروں کی اردو صحافت سے دوری اور عدم وابستگی ہے۔اردو صحافت کا نہ اب

کوئی منفرد اسلوب رہا ہے نہ اسٹائل۔ مولانا آزاد، مولانا دریا آبادی، مولانا مودودی، ظ۔انصاری، سلامت علی مہدی، رضوان احمد کی تحریروں کا انداز و آداب ماضی میں گم ہو چکا ہے۔ اردو کا وہ طبقہ جس کا وجود اردو کے نام اور کام پہ ہے یعنی مدرسہ، اسکول، کالج، یونیورسیٹی کے اساتذہ کرام وادیب کی نظر میں اردو بے وقعت ہے۔ اردو کے توسط سے سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی اردو ان کی بے اعتنائی کا شکار ہے۔ ان میں سے بیشتر افراد کے گھروں کے لوگ اردو سے نابلد ہیں۔ ان کے گھروں میں اردو اخبارات ورسائل کی خریداری ممنوع ہے سب اعزازی کاپی کے طالب ہیں۔ آج درسگاہوں، کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں اردو کی تعلیم وتدریس کا جو حال ہے وہ نا قابل بیان ہے۔ بیشتر اردو اساتذہ کی لیاقت ماشاء اللہ اور طالب علم کی صلاحیت سبحان اللہ۔ ان دونوں نے اردو کے مستقبل پر فاتحہ پڑھ دیا ہے۔ مستند ادیب وناقد شمس الرحمن فاروقی نے پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ جن مقالوں پر اردو کی پی ایچ۔ڈی کی ڈگری عطا کی جارہی ہے ان پہ چوتھے کلاس کی سند دینا بھی محال ہے۔ پی ایچ۔ڈی کی ڈگری میں حصولیابی میں امیدوار کے ضمیر اور قوت زر کو کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ معروف ادیبہ ترنم ریاض کا خیال ہے کہ:

> ''اردو کی دنیا میں کہرام سا مچا ہوا ہے، نوکری اور اسناد میں بندر بانٹ جیسا مسئلہ ہے اور کسی بھی اہم نشست پر کوئی بھی نااہل براجمان ہو کر اردو کی بربادی کا مزید سامان کرنے پر قادر نظر آتا ہے۔''

کافی عرصے سے اردو زبان وصحافت کے زوال کو روزگار فراہم کرنے کے ذریعہ کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔ یہ ایک افسوسناک امر ہے۔ زبان کا تعلق روزگار سے نہیں، جذبات واحساسات سے ہوتا ہے۔ صرف ایک گونگا ہی زبان کی اہمیت سے ناواقف ہوسکتا ہے۔ ایک قول ہے کہ اگر کسی قوم کو تباہ کرنا ہے تو سب سے پہلے اس سے اس کی زبان چھین لی جائے۔ ایسی حالت میں وہ قوم اپنی تہذیب، ثقافت، تاریخ، مذہب اور ادب سے محروم ہوجائے گی۔ آج انگریزی پڑھنا، لکھنا، بولنا فخر کی بات ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو خواں طبقہ اردو کے علم کو باعث افتخار وامتیاز سمجھے اور اس کا اظہار کرے۔

اردو کی سربلندی میں ہی اردو صحافت کا مستقبل پنہاں ہے۔تمام مشکلات کے بعد بھی اردو اخبارات ورسائل کا مقام ہندوستان میں تیسرا ہے۔RNI کی 2010 کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ہندی میں 7910،انگریزی میں1406 اوراردو میں938 اخبارات ورسائل شائع ہو رہے تھے۔ہندی اخبارات ورسائل کی تعداد اشاعت 15 کروڑ 54 لاکھ 94 ہزار 770،انگریزی 5 کروڑ 53 لاکھ 70 ہزار 184،اوراردو کی 2 کروڑ 16 لاکھ 39 ہزار 230 تھی۔یہ صورتِ حال کسی حد تک اطمینان بخش ہے لیکن سنجیدگی سے حالات پہ غور وفکر کرنے کی طالب ہے۔ہمیں شاید اب کانفرنس،مشاعرہ،قوالی اور فلمی گانوں کی بھول بھلیوں سے نکل کر اردو زبان وصحافت کے تحفظ کے لیے سنجیدہ اقدام کرنے ہوں گے۔ایک ایسی مہم شروع کرنی ہوگی جو نہ صرف ذہن کو بیدار کرے بلکہ دل پر دستک دے۔ایک ایسی تمنا پیدا کرنی ہوگی جو دلوں کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے۔یہ مہم صرف سرکاری اعانت سے نہیں بلکہ اردو خواں طبقہ کے یقیں محکم اور عمل پیہم سے ہی کامیاب ہوگی۔زندہ قومیں ہی اپنے میراث کی حفاظت کرتی ہیں۔ہم زندہ ہیں ہمیں اس کا ثبوت دینا ہوگا۔

○

نوٹ:(1) غیر مطبوعہ وغیر نشر شدہ۔کتابت کے بعد اس کی تصحیح کی جا چکی ہے۔

(2) اس مقالہ کی تیاری میں درج ذیل کتب ورسائل سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(الف) صحافت پاک وہند میں از عبدالسلام خورشید

(ب) اردو صحافت آزادی کے بعد از افضل مصباحی۔

(ج) اردو صحافت آزادی کے بعد مرتب عثمان انجم۔

(د) اردو صحافت بہار میں از سید احمد قادری

(ر) محمد علی جوہر ایک عہد ساز شخصیت از معصوم عزیز کاظمی

(ز) رسالہ نیا دور لکھنؤ کا اردو صحافت نمبر

(س) رسالہ آج کل نئی دہلی کا اردو صحافت نمبر۔

جاپان میں آن لائن اردو میڈیا کی صورت حال

ناصر ناکاگاوا

چیف ایڈیٹر، اردو نیٹ جاپان

1822 میں ''جام جہاں نما'' (اردو کا پہلا اخبار) کی اشاعت کے وقت کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اخبارات اسم بامسمّٰی ''جام جہاں نما'' ہوں جائیں گے۔ 21ویں صدی میں سائبر ورلڈ کی دریافت نے اخبارات و رسائل کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ دنیا اب ہماری انگلیوں کے اشاروں پر گھوم رہی ہے۔ سائبر ورلڈ کی کھوج اور اس کی ترقی نے نہ صرف سرحدوں کے فرق کو مٹا دیا ہے بلکہ تہذیبی و لسانی افتراق کی دیواریں بھی مسمار کر دی ہیں۔ سائبر کی دنیا میں سفر کرنے کے لیے نہ تو کسی پاسپورٹ کی ضرورت ہے اور نہ ہی ویزے کی، بس چند کلِک اور انگلیوں کے اشارے پر دنیا ہماری اسکرین کے سامنے ہوتی ہے۔ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے جب ہوائی سفر کا تصور نہیں تھا، ایک ملک سے دوسرے ملک جانے میں مہینوں اور برسوں لگ جایا کرتے تھے۔ اُس وقت انسان تصور کی دنیا میں نئے نئے ملکوں کی تخلیق کیا کرتا تھا اور ان سے ہی دل بہلایا کرتا تھا۔ اردو فارسی کی قدیم داستانوں

میں آپ کو بے شمار ایسے ملکوں کے نام مل جائیں گے جن کا کرۂ ارض پر کوئی وجود ہی نہیں۔ ٹیکنالوجی کی ترقی نے تصوراتی دنیا کے بجائے حقیقی دنیا کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔حقیقت کی دنیا میں انسان ہر دن اور ہر لحظہ نت نئی منزل کی تلاش میں منہمک ہے۔اس تلاش وجستجو اور اس کے نتائج نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان خدا کا حقیقی نائب وخلیفہ ہے۔انسان کی ترقی کی ابتدا تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔خدا نے انسان کو اُس کی تخلیق کے ساتھ ہی علم اور شعور دو ایسی نعمتیں عطا کر دی تھیں جو اس کے اشرف واعلیٰ ہونے کی دلیل تھی۔اسی علم وشعور کی بدولت انسان نے ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے کائنات کی تسخیر کی۔

21 صدی میں داخل ہونے تک انسان پورے طور پر سائنس کے زیر اثر آ چکا تھا اور اب صورت حال یہ ہے کہ سائنس وٹکنالوجی کے بغیر ہمارا سانس لینا بھی مشکل ہو چکا ہے۔ 21ویں صدی میں سائنس کی سب سے بڑی کامیابی ترسیل (Communication) کے جدید ذرائع (ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، موبائل اور انٹرنیٹ) کا فروغ ہے۔ان میں آخر الذکر ایجاد نے انسانی دنیا میں ایسا عظیم انقلاب برپا کیا جس کا تصور بھی ناممکن تھا۔ٹکنالوجی کے معاملے میں جاپان اس وقت دنیا کے چند ممالک میں ایک ہے۔انٹرنیٹ کے استعمال کی بات کی جائے تو سب سے زیادہ انٹرنیٹ استعمال کرنے والے ممالک کی فہرست میں جاپان کا چوتھا مقام ہے۔تقریباً چودہ لاکھ اسکوائر میٹر رقبہ اور 12 کروڑ کی آبادی والا یہ چھوٹا سا ملک ہر دن ترقی کی نئی منزلیں طے کر رہا ہے۔جاپان کی خوبصورتی اور روز افزوں ترقی نے دنیا کی نظریں جاپان کی طرف مرکوز کر رکھی ہیں۔جاپان کی برق رفتار ترقی میں اتنی کشش ہے کہ اس کشش کی بدولت ہر سال نہ صرف ہزاروں سیاح جاپان آتے ہیں بلکہ بے شمار غیر ملکی (غیر جاپانی) جاپان کی شہریت بھی حاصل کر رہے ہیں۔جاپان میں مختلف ممالک کے بے شمار افراد ملازمت، تجارت اور مختلف دوسرے پیشوں سے وابستہ ہیں۔جاپان کی شہریت حاصل کرنے والوں میں کثیر تعداد ہندوستانی اور پاکستانی افراد کی بھی ہے۔یہ خاکِ جاپان کا ہی جادو ہے کہ جاپان آنے کے بعد غیر ملکیوں پر جلد ہی جاپانی رنگ غالب آ جاتا ہے اور وہ بھی جاپان کی ترقی کا حصہ بن جاتے ہیں۔جاپانی قوم کے غیر معمولی جذبے سے متاثر ہوئے بغیر وہ نہیں رہ سکتے۔

ہند و پاک سے آکر جاپان میں بسنے والے افراد بھی نہ صرف جاپان کی ترقی میں اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں بلکہ اپنے آبائی وطن کی تہذیب وتمدن اور زبان و ادب کے فروغ میں مثالی کردار ادا کر رہے ہیں۔ جاپان میں مقیم اردو داں طبقہ انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ طبقہ اپنی حد درجہ مصروفیات کے باوجود اپنے آبائی وطن کی زبان وتہذیب کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ جاپان میں مقیم اردو آبادی کو اپنی زبان سے کس قدر محبت ہے اس کا اندازہ جاپان سے شائع ہونے والے آن لائن اردو اخبارات سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ چند ہزار اردو آبادی والے ملک جاپان سے درجنوں آن لائن اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ یہ اخبارات نہ صرف ساری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ ہر دن سیکڑوں کی تعداد میں دنیا بھر سے قارئین کے تاثرات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا بھر میں پھیلی اردو آبادی انٹرنیٹ کی وسیع وعریض دنیا میں بھی جاپان کی ہی سیر کرنا چاہتی ہے۔ جاپان سے شائع ہونے والے آن لائن اردو اخبارات اور ویب سائٹ کا ایک مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

اردو نیٹ جاپان۔ جاپان سے شائع ہونے والے آن لائن اردو اخبارات اور ویب سائٹ میں سب سے نمایاں نام اردو نیٹ جاپان ہے۔ اس اخبار کی اشاعت سنہ 2008 سے پابندی سے ہو رہی ہے۔ یہ اخبار بھی دیگر جاپانی اردو اخبار کی طرح کمیونٹی آن لائن نیوز پیپر کی حیثیت سے شروع ہوا تھا لیکن جلد ہی اس اخبار نے انٹرنیٹ کی دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت بنالی۔ 2008 سے اردو نیٹ جاپان پابندی کے ساتھ بلا ناغہ اپڈیٹ ہو رہا ہے۔ یہاں آپ کو دنیا بھر کی اہم خبروں کے علاوہ علمی، ادبی، مذہبی، سائنسی، سیاسی اور تاریخی مضامین کے علاوہ انٹرویوز، مراسلے، لطائف اور دلچسپ معلومات اور جاپان سمیت دنیا بھر میں ہونے والی ادبی نشستوں اور مشاعروں کی روداد بھی ملیں گی۔ دنیا کے کئی بڑے ممالک میں اردو نیٹ جاپان کے نمائندے بھی مقرر ہیں، ہندوستان میں نوجوان معلم کامران غنی، پاکستان میں جاوید اختر بھٹی اور زہرہ عمران سید اس کے اعزازی مدیر ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان و پاکستان اور دنیا بھر کے تقریباً 55 ممالک میں مقیم شعرا، ادبا، صحافی اور کالم نویس حضرات کی تحریریں اردو نیٹ جاپان کی زینت بنتی ہیں۔ ان تحریروں پر قارئین کے تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ

قارئین اردو نیٹ جاپان کو نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ ہر دن سائٹ اپڈیٹ ہونے کا انھیں بے چینی سے انتظار بھی رہتا ہے۔ اردو نیٹ جاپان نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہاں ایک طرف عالمی شہرت یافتہ صحافی، شعرا، ادبا کی تخلیقات ہوتی ہیں تو دوسری طرف دنیا بھر کی جامعات میں زیر تدریس طلبا کی تحریروں کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ اردو نیٹ جاپان ہر سال بہترین قلم کاروں کو اعزاز سے نواز کر ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ سنہ 2011 میں اردو نیٹ جاپان نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام کو انٹرنیٹ کی دنیا میں ان کی گراں قدر خدمات کے لیے انھیں خصوصی طور پر جاپان مدعو کیا اور خصوصی اعزاز سے نوازا تھا ان کے ہمراہ فارسی کے استاد ڈاکٹر اشتیاق احمد بھی تھے۔ اردو نیٹ جاپان کا مقصد اردو زبان و ادب کا فروغ اور اردو آبادی کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ہے۔ 2013 میں اورنگ آباد سے معروف ادیبہ ڈاکٹر ہاجرہ اور پٹنہ سے کامران غنی کو خصوصی اعزازات دیے گئے، سالِ رواں میں ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبۂ مطالعاتِ خارجی میں پاکستان کے اردو پروفیسر ڈاکٹر سہیل عباس خان کو ایوارڈ دیا گیا اور قطر کے معروف ادیب و شاعر شوکت علی ناز کو خصوصی طور پر جاپان مدعو کیا گیا اور انھیں اعزاز سے نوازا گیا۔

جاپان کی تین معروف جامعات جن میں ٹوکیو یونیورسٹی، اوساکا یونیورسٹی اور دائتو بُنکا یونیورسٹی کے شعبۂ مطالعاتِ خارجی میں اردو زبان سیکھنے کے لیے سیکڑوں جاپانی طلبا و طالبات ہر سال اردو داں بن کر نکلتے ہیں اور جاپان کے مختلف اداروں میں اردو زبان کی خدمت بھی کر رہے ہیں، اردو زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ یہ طالب علم برِصغیر کی تہذیب و ثقافت کو بھی فروغ دینے کا سبب بن رہے ہیں۔ جاپان میں اردو شاعری کو آن لائن مقبول کرنے میں محمد مشتاق قریشی کا نام سرِ فہرست ہے موصوف ہر روز عالمی و مقامی پل پل بدلتی ہوئی صورتِ حال پر برجستہ شاعری کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، محمد مشتاق قریشی کی شاعری جاپان کے ہر آن لائن نیٹ پر نظر آتی ہے اور اردو سے شغف رکھنے والے ان کی خوبصورت شاعری سے محظوظ ہوتے ہیں، ان کے علاوہ جاپان میں ادب کو فروغ دینے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی کی خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں، انھوں نے جاپان میں کئی مشاعرے منعقد کروائے وہ خود بھی ایک

بڑے تخلیق کار اور شاعر ہیں جن کی تحریریں آن لائن اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔اسی طرح حسین خان،طیب خان، ملک حبیب الرحمان، رئیس صدیقی، شاہد رحمان، ملک خالد منور، شاہد جمیل، سید کمال حسین رضوی اور راشد حسین بھی ہیں جن کی تحریریں، تجزیے اور شاعری مختلف آن لائن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اردو نیٹ جاپان کے علاوہ بھی کئی معروف آن لائن اردو اخبارات ہیں جن کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی ان میں جاپان اردو اخبار ہے جو جاپان کے شہر سائتاما پریفیکچر سے اردو یونیکوڈ میں شائع ہوتا ہے یہ اخبار بھی پابندی سے اپڈیٹ ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر خاور کھوکھر ہیں جو اپنے اخبار کو مزید معلوماتی بنانے کے لیے اس میں ہر روز جاپان کی مقامی خبریں بھی اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرتے ہیں۔

اردو ورلڈ نیوز۔اردو ورلڈ نیوز کے ایڈیٹر راشد صمد خان ہیں، یہاں آپ کو یونیکوڈ ورژن میں خبروں کے علاوہ ویڈیوز بھی مل جائیں گی جس میں جاپان کی اردو آبادی میں منعقد ہونے والی تقریبات کی تصویریں اور ویڈیوز جاری کی جاتی ہیں۔

جنگ اوورسیز جاپان۔عرفان صدیقی اس کے بیورو چیف ہیں جو جاپان کی پل پل کی خبریں براہ راست اپڈیٹ کرتے ہیں جاپان میں بسنے والے پاکستانی، انڈین، نیپالی اور بنگلہ دیشی کمیونٹی کی خاص تقریبات کے حوالے سے مضامین بھی روزنامہ جنگ اور آن لائن جنگ میں شائع ہوتے ہیں۔

پاک جاپان نیوز۔ پاک جاپان نیوز جاپان میں مقیم پاکستانی کمیونٹی کا سب سے پرانا آن لائن اخبار ہے جس کے روحِ رواں چوہدری شاہد ہیں۔ یہاں آپ کو خبروں کے علاوہ پاک کمیونٹی سے متعلق ویڈیوز بھی مل جائیں گے۔جاپان میں کسی بھی غیر ملک سے کوئی سیاسی، سماجی یا مذہبی شخصیت جس کا تعلق اردو زبان سے ہو اس کے لیے پاک جاپان نیوز اور اردو نیٹ جاپان مشترکہ طور پر مختلف مقامات پر خصوصی نشستوں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

اردو نیٹ پوڈ کاسٹ۔اردو نیٹ پوڈ کاسٹ کے مدیر اعلیٰ محمد زبیر ہیں۔یہ اخبار بھی اردو نیٹ جاپان کی طرح تصویری فارمیٹ میں شائع ہوتا اور پوری دنیا میں پڑھا جاتا ہے گزشتہ چند

ماہ سے باقاعدگی سے اپڈیٹ نہیں ہو رہا ہے تاہم یہ اخبار بھی کمیونٹی کا جانا پہچانا آن لائن اخبار ہے۔ اس کے علاوہ بھی جاپان سے کئی چھوٹے بڑے آن لائن اخبار اور ویب سائٹ کی اشاعت ہوتی ہے۔ ان میں این ایچ کے ورلڈ اردو سروس ہے جو دنیا بھر میں آن لائن نیٹ کے ذریعے جاپان کے قومی ریڈیو این ایچ کے کے زیرِ نگرانی اردو زبان میں نشریات پیش کرتا ہے۔

قیادت، عوام نیوز، نوائے ٹوکیو، آوازِ حق، آوازِ ملت، شانِ پاکستان، آوازِ جاپان، پاکستانی جے پی، شانِ پاکستان، وطن، منزل نیوز اپنا اوکشن اور وائس آف جاپان وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جن میں کچھ آن لائن اخبارات مکمل طور پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے نمائندگان کے طور پر صرف اپنی جماعت کی سیاسی سرگرمیوں تک ہی محدود ہیں اور اپنی اپنی سیاسی پارٹی کو دیارِ غیر میں مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ جاپان سے اردو اخبارات اور ویب سائٹس کی اس قدر بھرمار، یہاں مقیم اردو آبادی کے خلوص، محنت اور جذبے کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ درست ہے کہ جاپان میں برصغیر ہندو پاک جیسا علمی و ادبی ماحول نہیں، یہاں افراد کی بھی کمی ہے، لیکن ان سب کے باجود جاپان کی اردو آبادی اردو کی شمع کو اس طرح روشن کیے ہوئے ہے کہ ساری دنیا اس کی ضوٗ پاش کرنوں سے منور ہو رہی ہے۔ حالیہ چند سالوں میں موبائل فون کی اعلیٰ ٹیکنالوجی کی وجہ سے اب ہر وہ شخص جسے آئی فون کی سہولت میسر ہے وہ چند منٹوں میں ہی اپنی پسند کے آن لائن اخبار کھنگال ڈالتا ہے اور اس ٹیکنالوجی کے سبب وہ نہ صرف اپنے ملک کے موجودہ حالات بلکہ پوری دنیا میں ہونے والے واقعات اور خبروں سے اپنی زبان اردو میں باخبر رہتا ہے۔ آن لائن اخبارات سے قبل اتنی سہولتیں میسر نہ تھیں لوگوں کو اپنے ممالک سے اخبارات منگوا کر پڑھنا پڑتے تھے جو جاپان پہنچتے پہنچتے باسی ہو جایا کرتے تھے، جبکہ جاپان کے مقامی اخبارات کی تعداد بھی زیادہ تر جاپانی زبان میں ہے اور ایک دو انگریزی اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں مگر اردو دان طبقہ اب آن لائن اخبارات کے ذریعے اپنے آبائی ممالک کے بارے میں آگاہ رہتا ہے۔

جاپان جہاں غیر ملکی میڈیا کی پزیرائی کم ہی ہوتی ہے تاہم آن لائن اخبارات اور موبائل فون کی بدولت غیر ملکی میڈیا بھی جاپان میں اتنا ہی مقبول ہے جتنا کہ جاپانی میڈیا، آپ آن لائن

اخبارات کے ذریعے اردو کی فلمیں، ٹی وی ڈرامے، اسٹیج پروگرام، مذہبی و ادبی تقریبات کی ویڈیو جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں، یہاں پر قائم انڈین و پاکستانی ریستوران جو جاپانی عوام میں بہت مقبول ہیں وہاں پر انٹرنیٹ کے ذریعے بھارتی و پاکستانی فلمیں اور ڈرامے بھی جاپانی گاہکوں کے لیے تفریح مہیا کرتے ہیں۔حالیہ سالوں میں آن لائن اخبارات نے جاپانی عوام میں اردو کو مقبول کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اب جاپان کے بڑے بڑے ہوٹلوں، تفریحی مقامات یا سرکاری اداروں میں بھی اردو داخل ہو چکی ہے اور اہم معلومات بہم پہنچانے کے لیے دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو بھی نظر آنے لگی ہے، یہاں کی عدالتوں، پولیس اور امیگریشن جیسے محکموں میں بھی اردو زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہے جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والے ترجمانوں کو دیگر زبانوں کے مقابلے میں بھاری فیس ادا کر کے ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔جاپان میں اردو زبان کی تاریخ کم و بیش سو سال سے بھی زائد ہے مگر حالیہ چند سالوں میں اردو کو پزیرائی یا مقبولیت آن لائن اخبارات سے حاصل ہوئی۔جاپان کی علمی صورتِ حال اور یہاں کی جامعات اور علمی و تحقیقی اداروں میں ہونے والے علمی کاموں اور تحقیقات و مطالعات کے بارے میں بیرونِ جاپان خصوصاً اردو دنیا اور برِ اعظم پاک و ہند کے باشندوں کو بہت کم علم ہوتا تھا۔ اردو زبان و ادب کے تعلق سے یہاں جو سرگرمیاں مختلف صورتوں میں دیکھنے میں آتی تھیں اب کسی بھی سرگرمی کے بعد اس کی خبر آن لائن اخبارات کے ذریعے چند لمحوں میں دنیا کے کونے کونے تک پہنچ جاتی ہے۔ہم پُر امید ہیں کہ مستقبل میں آن لائین میڈیا کے ذریعے اردو زبان کو مزید فروغ ملے گا۔

○

ماریشس میں الیکٹرانک میڈیا اور اردو

عنایت حسین عیدن، ماریشس

ماریشس بحر ہند کے جنوبی مغربی حصے میں مڈگاسکر سے تقریباً ساڑھے پانچ سو میل پر واقع ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ ڈچ، فرانسیسیوں اور انگریزوں کی حکومت میں رہی اور 1968 میں اسے آزادی ملی۔ اس جزیرے میں کوئی آبادی نہیں تھی۔ اسی لیے جب عرب جہاز راں چودھویں صدی میں آئے تو غیر آباد دیکھ کر چلے گئے۔ ڈچ والوں نے اسے بسانے کی کوشش کی مگر اسے فائدہ نہیں پایا البتہ جزیرے کو ماریشس کا نام دیا۔ فرانسیسیوں نے اس جزیرے کو بسایا اور افریقہ کے مختلف علاقوں سے غلاموں کو لا کر گنے کی کھیتی شروع کی۔ انگریزوں نے اس جزیرے کو ہندوستان جانے کے لیے بحری جہازوں کے لیے ایک اچھا پڑاؤ سمجھا اور 1810 میں انگریزوں نے فرانسیسیوں سے ایک جنگ کے بعد اس جزیرے پر قبضہ کرلیا۔ پیرس کے ایک معاہدے کے بعد فرانسسی زبان، قانون اور تہذیب کو برقرار رکھا گیا۔ اسی لیے آج بھی وہاں فرانسسی ایک اہم زبان ہے۔ 1834 میں غلامی کا خاتمہ ہوا۔ افریقی غلاموں نے گنے کے کھیتوں میں کام کرنا چھوڑ دیا۔ انگریزی سرکار نے گنے کے کھیتوں میں کام کرنے

کے لیے ہندوستان سے مزدوروں کو لانے کی پیشکش کی اور بہار کے ضلع چھپرا آرا اور یوپی کے مشرقی ضلعوں کے علاوہ جنوبی ہندوستان کے مدراس اور ورنگل سے مزدور لائے گئے۔

ان مزدوروں کی اکثریت ہندوستان واپس نہیں گئی اور رفتہ رفتہ یہ لوگ اپنی زبان، تہذیب اور مذہب کو برقرار رکھنے کے لیے کوششیں کرنے لگے۔ اسی لیے آج ماریشس میں ہندی، اردو، تمل، تلگو، مرہٹی اور بھوجپوری پائی جاتی ہے حالانکہ یہ زبانیں آبائی زبان کی حیثیت سے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت شمالی ہندوستان سے ہے۔ وہ بھوجپوری یا پوربی بولتے تھے مگر تہذیبی اور مذہبی کاموں میں اردو کا استعمال ہوتا تھا۔ گجرات اور کچھ سے آئے ہوئے مسلمان تاجروں نے بھی اسی ضمن میں اردو کا استعمال کیا۔

مسلمان اور اردو

اردو زبان کی موجوگی کے پہلے سراغ دستخطوں اور کتبوں سے ملتے ہیں۔1880 کے بعد مسجدوں کی تعمیر سے اردو کی تدریس عام ہونے لگی۔1953 سے سرکاری پرائمری اسکول میں اردو کی پڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ دراصل عیسائی بچوں کے لیے روزانہ ایک مقررہ وقت تھا جس کے دوران ایک پادری ان کو اپنے مذہب کے بارے میں بتاتا تھا۔ بہت کوششوں کے بعد ہندو اور مسلمان بچوں کو ان کے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم کے لیے ہندی اور اردو کی تدریس کا انتظام ہوا۔ گویا یہ دو زبانیں مذہبی تعلیم کی جگہ پڑھائی جاتی تھیں۔ مدرسوں میں بھی اردو کی پڑھائی ہوتی تھی جہاں دین سے منسلک اردو کتابوں کا استعمال ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسکولوں میں اردو کی تدریس ثانوی زبان کی حیثیت سے ہونے لگی مگر اس کی تدریس کے مختلف مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اردو مذہبی علوم حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

ماریشس میں اردو مسلمانوں سے جڑی ہوئی ہے جس طرح ہندی شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے ہندوؤں سے جڑی ہوئی ہے چاہے وہ سناتن دھرم والے ہوں یا آریہ سماج والے۔ سیاسی اعتبار سے ہر پارٹی ان زبانوں کی ترویج و اشاعت کے حق میں ہے۔ اسلام کو برقرار رکھنے میں اس جزیرے میں اردو نے اہم رول ادا کیا ہے۔ مدرسوں میں بچوں کو اردو میں

مذہبی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ محفل میلاد میں اردو ہی میں لکھی ہوئی نعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ محرم کی پہلی دس راتوں میں واقعات کربلا اردو زبان میں پڑھے اور سنائے جاتے تھے۔ اسی طرح ربیع الاول کی پہلی بارہ راتوں میں مجلس ہوتی تھی جس کے دوران رسول اکرم ﷺ کی سیرت اردو میں پڑھی جاتی تھی اور ربیع الآخر کی پہلی گیارہ راتوں میں غوث پاک یعنی حضرت عبد القادر جیلانی کی زندگی، ان کی تعلیمات اور ان کی کرامتوں کے بارے میں اردو میں لکھی ہوئی ایک منظوم کتاب سے بیان سنایا جاتا تھا۔ برصغیر سے ابھی تک دین کی تبلیغ اور وعظ و نصیحت کے لیے علماء آتے ہیں اور اردو ہی میں اپنی تقریریں کرتے ہیں۔ پچھلے آٹھ دس برسوں سے ہندوستان اور پاکستان کے مشہور نعت خواں آتے ہیں۔ ان کی محافلِ نعت میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ اب مقامی ٹیلی وژن پر ہر سال اردو اسپیکنگ یونین کے تعاون سے نعت خوانی کا مقابلہ جاری کیا گیا ہے۔ اس سال بچوں کی نعت خوانی کا مقابلہ ہوا تھا۔

ریڈیو میں اردو

ماریشس میں ریڈیو کی تاریخ میں نہ جاتے ہوئے صرف عرض یہ ہے کہ پچھلی صدی کی پانچویں دہائی میں ریڈیو پر ہر جمعہ کی شام پانچ سے ساڑھے پانچ بجے تک اردو میں ایک پروگرام نشر کیا جاتا تھا۔ اس پروگرام کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوتا تھا۔ تلاوت (live) ہوتی تھی اور تلاوت کرنے والا کوئی مقامی شخص ہوتا تھا جس کی تجوید اچھی ہوتی تھی۔ تلاوت کے بعد مذہبی قوالی کے ریکارڈ بجائے جاتے تھے۔ بعض اوقات کوئی مختصر مذہبی تقریر بھی ہوتی تھی۔ کبھی کبھار مقامی حضرات کے لکھے ہوئے ریڈیو ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ جب نشریات کا وقت بڑھا دیا گیا تو اردو پروگرام کا وقت بھی بڑھایا گیا۔

آج ٹیکنالوجی میں ترقی ہونے کی وجہ سے ریڈیو میں اے ایم اور ایف ایم کے کئی چینل ہو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ریڈیو میں اردو کے لیے زیادہ وقت مل گیا ہے۔ آج کل اے ایم اور ایف ایم میں کل ملا کر روزانہ تین گھنٹے بیس منٹ اردو کے لیے وقف ہے جو اس طرح ہے۔

1۔ پیر سے جمعہ تک۔۔۔ گیارہ سے بارہ بجے تک۔

2۔ سنیچر اور اتوار کو دس سے گیارہ بجے تک۔

3۔ ہر رات نو بجے سے نو بج کر بیس منٹ تک۔

4۔ ہر جمعہ کی شام چار سے پانچ بجے تک خاص پروگرام۔اسی روز پونے چار سے پانچ بجے تک اردو اسپیکنگ یونین کی جانب سے پندرہ منٹ کا پروگرام ہوتا ہے۔

5۔ ایف ایم میں ہر صبح چھ سے سات بجے تک اور ہر شام پانچ سے چھ بجے تک

اس کے علاوہ خاص موقعوں پر مذہبی تقریبات کی براہ راست نشریات ہوتی ہیں۔ پورٹ لوئس کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز سے پہلے پندرہ بیس منٹ تک امام صاحب جو تقریر کرتے ہیں وہ ریکاڈ کی جاتی ہے اور جمعہ ہی کے روز چار سے پانچ بجے کے خاص اردو پروگرام میں نشر کی جاتی ہے۔

اب آیئے دیکھتے ہیں ان پروگراموں میں کیا ہوتا ہے۔

اے ایم کے گیارہ سے بارہ بجے والے پروگرام کا آغاز پندرہ یا بیس منٹ تک قرآن شریف کی تلاوت سے ہوتا ہے۔بعض اوقات اردو میں ترجمہ کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ یہ ہر پروگرام پیش کرنے والے پر ہوتا ہے۔چونکہ اردو کا پروگرام ہے روزانہ اردو میں ترجمہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔اس کے بعد پروگرام پیش کرنے والے کے پاس کسی مقامی مولانا کی تقریر ہوتو اس کی ریکارڈنگ چلا دیتا ہے یا بعض اوقات اس کے پاس دوسرے ملک کے کسی اسلامی مذہبی رہنما کی تقریر ہوتو چلا دیتا ہے۔اگر تقریر نہیں تو حمد اور نعتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔کبھی کبھار پروگرام پیش کرنے والا قوالی،منقبت یا کوئی نصیحت آمیز گانا پیش کرتا ہے۔ابھی حال ہی میں بچوں کی چھٹی کے دوران ایک پروگرام پیش کرنے والے نے پانچ کلموں پر مبنی ایک ریکارڈ چلایا تا کہ کلموں کا اعادہ ہو جائے اور اس کے بعد دس سورتوں کی تجوید کے ساتھ پڑھنا سکھانے کے لیے ایک ریکارڈ پیش کیا۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس پروگرام میں اردو کے ذریعے مذہب پر زور دیا جا رہا ہے۔

سنیچر کے پروگرام کی نوعیت مختلف ہے۔اسے دو حصوں میں بانٹا گیا ہے اور اس کے لیے دو الگ الگ اناؤنسر ہیں۔ پہلے حصے میں مذہبی اردو یعنی تلاوت قرآن شریف، ایک

مذہبی تقریر یا نعتیں، ایک قوالی یا منقبت یا کوئی نصیحت آمیز گانا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ادبی موضوع بات چیت یا تقریر نشر ہوتی ہے۔ پروگرام کے دوسرے حصے میں فرمائشی گانے ہوتے ہیں اور کبھی طالب علموں کے ساتھ بات چیت یا ان کا کوئی فیچر ہوتا ہے۔ اس پروگرام کے اناؤنسر اردو کم انگریزی زیادہ بولتا ہے۔ مثلاً ''یہ گانا is playcd being for.....'' اس کے تبصرے بھی زیادہ تر انگریزی میں ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے جو پروگرام ہوتا تھا اس کا عنوان تھا ''ہمارے پسندیدہ اشعار اور فلمی نغمے''۔ یہ پروگرام کئی دہائیوں سے چلتا آرہا۔ اس میں اردو کے مشہور اور دلچسپ اشعار سنائے جاتے تھے اور خالص اردو کے فلمی گانے پیش کیے جاتے تھے۔

اتوار کا پروگرام دس سے گیارہ بجے تک ہوتا ہے۔ اس میں بھی پندرہ یا بیس منٹ تک قرآن کی تلاوت ہوتی ہے۔ کبھی اردو ترجمہ کے ساتھ۔ ایک مذہبی تقریر ہوتی ہے یا اس کی جگہ پر نعتیں یا منقبت۔ مہینے میں ایک بار اسلام سے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ سننے والے جواب بھیجتے ہیں۔ ان میں سے صحیح جواب دینے والوں کو انعام دیا جاتا ہے۔ آخری دس پندرہ منٹ میں قوالی یا غزلیں ہوتی ہیں۔ یہ پروگرام ایک ہی اناؤنسر کے سپرد ہے۔

اے ایم ریڈیو پر خاص تقریبات یا مذہبی تہواروں کی رکارڈنگ یا براہ راست نشریات پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن ہر جمعہ کو چار سے پانچ بجے تک پورٹ لوئس کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ اور خطبے سے قبل امام صاحب کی تقریر کی ریکارڈنگ پیش کی جاتی ہے۔ یہ پروگرام مذہبی نشریات کے نام سے منسوب ہے۔ اس کا آغاز قرآن کریم کی تلاوت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد امام صاحب کی تقریر ہوتی ہے اور آخر میں پڑھے گئے خطبے۔ مذہبی جلسوں اور اردو کی سرگرمیوں کے سلسلے میں اعلانات ہوتے ہیں۔ ایک یا دو نعتوں سے پروگرام کا اختتام ہوجاتا ہے۔

اس مذہبی نشریات سے پہلے یعنی پونے چار سے چار بجے تک اردو اسپیکنگ یونین کی طرف سے ایک نیم ادبی پروگرام ہوتا ہے۔ دراصل اس پروگرام کا مقصد اردو سے متعلق بین الاقوامی اہم خبروں کا جائزہ لینا تھا۔ وسائل کی کمی سے ایسا نہیں ہوسکا۔ پھر بھی پروگرام پیش کرنے والے کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ پروگرام تفریح اور معلومات کا باعث بنے۔ اس میں ماریشس

تشریف لائیے ہوئے دانشوروں کا انٹرویو ہوتا ہے اور کبھی نوجوانوں کو اردو سے مزید دلچسپی دلانے کے لیے کچھ پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اقبال اور غالب کی برسی پر ایک فیچر پیش کیا جاتا ہے۔

ایف ایم کا اردو پروگرام

یہ پروگرام ہر روم صبح کے چھ بجے سے سات بجے تک کا ہوتا ہے۔ اسے بھی مذہبی یا (Urdu Religious) میں شامل کیا گیا ہے۔ قرآن شریف کی علاوت سے اس پروگرام کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں بھی اکثر اردو ترجمہ بھی ہوتا ہے۔ ایک اناؤنسر اپنے پروگرام میں ایک مقامی حافظ کی مذہبی تقریر نشر کرتا ہے۔ ایک دوسرا ہندو پاک کے علما کی تقریریں نشر کرتا ہے اور ایک تیسرا خود کی۔ رمضان کے مہینے میں ہر روم دس منٹ کے لیے پورٹ لوئس کی جامع مسجد کے امام صاحب کی تقریر ہوتی ہے۔ اسی طرح محرم کے دس دنوں تک واقعات کربلا، ربیع الاول کے بارہ دنوں تک رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور ربیع الآخر کے گیارہ دنوں تک حضرت عبدالقادر جیلانی پر دس منٹ کی تقریر ہوتی ہے۔ باقی دنوں میں ہر پروگرام پیش کرنے والا اپنے مزاج کے مطابق پروگرام پیش کرتا ہے۔ کوئی ایک مذہبی یا اخلاقی موضوع پر بات کرتا ہے اور متعلقہ احادیث یا علماء اور دیگر بزرگان دین کے اقوال پیش کرتا ہے اور بیچ بیچ میں نعتیں یا منقبت کی رکارڈنگ۔ کسی کے یہاں مقامی یا ہندو پاک کے علماء کی تقریریں ہوتی ہیں اور اس کے بعد نعتیں پیش کی جاتی ہیں۔

اکثر نعتیں جو سنائی جاتی ہیں وہ ہندو پاک کے مشہور نعت خوانوں کے سی ڈی سے لی جاتی ہیں۔ ان نعت خوانوں کی تقلید میں مقامی نعت خوانوں نے اپنی سی ڈی بنائی ہے۔ کچھ عرصے سے مقامی نعت خوانوں کی گائی ہوئی نعتیں بھی اس پروگرام میں چلائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کچھ عرصے پہلے کے مقابلے میں نسوانی آواز میں بہت کم نعتیں سننے میں آتی ہیں۔ پروگرام پیش کرنے والا خود اپنا اسکرپٹ اور مواد تیار کرتا ہے۔ نعتوں کا انتخاب بھی اسی کا ہوتا ہے۔ اسی لیے ہر پروگرام پیش کرنے والے نے اپنی شناخت بنالی ہے۔

ایف ایم کا دوسرا پروگرام شام کے پانچ بجے سے چھ بجے تک چلتا ہے۔ یہ پروگرام مذہبی اردو کے نہیں بلکہ تفریحی اردو کے ضمن میں آتا ہے اور ہر روز پروگرام پیش کرنے والا الگ ہوتا ہے۔اور ہر ایک اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق غزلیں اور گانے نشر کرتا ہے۔کسی کو غیر فلمی اور مشہور شاعروں کی غزلیں بجانے کا شوق ہے تو کسی کو فلمی غزلیں اور پرانے فلمی نغمے سنوانے کا۔اس میں چند نوجوان بھی پروگرام پیش کر رہے ہیں۔

ٹی وی پر اردو پروگرام

ماریشس میں ٹی وی 1965 ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ایک ہی چینل تھا۔مگر اب متعدد چینل ہیں جن میں ایک اردو کا بھی ہے۔ یہ چینل دہلی دوردرشن سے ریلے ہوتا ہے اور اس میں پاکستان ٹی وی سے لیے گئے اردو سیریل بھی نشر ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ مقامی چھ ایسے چینل ہیں جن کے پروگرام خود ماریشس براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے تحت تیار اور پیش کیے جاتے ہیں۔ اس میں ایک چینل ہے جو مختلف ہندوستانی زبانوں اور ماندرین (چینی زبان) کے لیے وقف ہے۔اردو کے لیے دو گھنٹے ہیں جو ہر جمعے کی رات کو نو سے گیارہ بجے تک مقرر ہے۔اس پروگرام کو پیش کرنے کے لیے دو حضرات ہیں۔ اس میں عموماً کسی شخص کا انٹرویو ہوتا ہے یا اس سے بات چیت ہوتی ہے۔ اکثر کوئی مولانا یا نعت خواں کا انٹرویو ہوتا ہے۔ بہت کم موقعوں پر کسی ادیب یا شاعر سے بات چیت ہوتی ہے۔ چونکہ اردو بولنے والوں میں سے اکثر مذہب سے تعلق رکھنے والے ہی ماریشس آتے ہیں اسی لیے انھیں سے بات چیت ہوتی ہے اور اس کے علاوہ مذہب سے تعلق رکھنے والے امور پر ہی مبنی باتیں پروگرام میں شامل ہوتی ہیں۔ مقامی نعت خواں اور باہر سے آئے ہوئے نعت خواں اپنی نعتیں پیش کرتے ہیں۔بعض اوقات مدرسے کے بچوں کا بھی پروگرام ہوتا ہے جس میں قرآن شریف کی تلاوت، نعت خوانی اور مکالمے ہوتے ہیں۔ کسی مسجد یا کسی علاقے میں کسی مذہبی تقریب جیسے عرس، نعت خوانی یا جشن میلاد کی ریکارڈنگ پر مبنی ایک فیچر تیار کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھار کسی مسجد کی جمعے کی نماز ، خطبے اور امام کی تقریر ریکارڈ کی جاتی ہے اور اسے پیش کیا جاتا ہے۔

ٹی وی پر کئی موقعوں پر اردو میں براہ راست براڈ کاسٹ ہوتا ہے جو مذہبی ہوتا ہے۔مثلاً عید میلاد النبی ﷺ یعنی بارہ ربیع الاول کا پروگرام جس میں صدر جمہوریہ ماریشس، وزیر اعظم اور دیگر عظیم شخصیات تشریف فرما ہوتے ہیں۔کسی مسجد سے عید کی نماز براہ راست نشر کی جاتی ہے۔اسی طرح گیارہویں ربیع الآخر، شب معراج، شب برات، رمضان کی ستائیسویں رات، اور عاشورہ کے موقعوں پر پورٹ لوئس کی جامع مسجد میں جو تقریبیں ہوتی ہیں انھیں بھی براہ راست براڈ کاسٹ کیا جاتا ہے۔

خواتین کی چند تنظیموں کی طرف سے بھی مذہبی یا کوئی خصوصی پروگرام ہو تو اس کی بھی رکارڈنگ ٹی وی پر اسی پروگرام کے دوران پیش کی جاتی ہے۔

○

اردو صحافت

روبینہ فیصل، کینیڈا

اپنی بات پہنچانا اور دوسرے کی بات جاننے کی خواہش رکھنا انسانی فطرت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے صحافت دنیا میں متعارف ہوئی۔ پہلا اخبار ''ٹی پاؤ'' چین کے حکمران خاندان'' تانگ'' کے تحت جاری ہوا۔ مارکو پولو نے پیکنگ گزٹ کو پہلا اخبار کہا۔

اگر یورپ کو لیں تو وہاں ایک بادشاہ سے دوسرے باشاہ تک خبریں لے جانے والے گشتی درویش ہوتے تھے اور بادشاہ سے انعام واکرام وصول کرتے تھے۔ پرنٹنگ مشین کی ایجاد کے بعد پہلے کتابچہ اور پھر اخبار کی شکل میں لوگ خبریں پڑھنے لگے۔ سیدھے سادے خبرنامے ہوتے تھے۔ بعد میں لوگوں نے نجی طور پر خبر رسانی کا کام شروع کر دیا۔ انگلستان میں ملکہ الزبتھ اور ہندوستان میں اکبر کے زمانے میں اخبار نویس کے وقار میں اضافہ ہونے لگا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں بھی ڈھول پیٹ کر سرکاری فرمان سنائے جاتے تھے اور شہنشاہ جاسوسوں کے ذریعے یا دوسرے ممالک کے سربراہان سے خط وکتابت کے ذریعے یا اپنے وزیروں سے بات چیت کر کے عوام کے حال اور خیال سے آگاہ رہتے تھے۔ بعد میں

ہندوستانی بادشاہ نے خبر رسانی کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر ضلع میں ایک اخبار نویس مقرر کیا۔ان رپورٹ لکھنے والوں سے ہی اخبار نویسی کے فن کو عروج ملا۔''اورنگ زیب کے زمانے میں اخبار نویسوں کا جال سا بچھ گیا تھا''۔

صحافت کی تعریف ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے اپنی کتاب ابلاغیات میں کچھ یوں کی ہے۔ ''یہ خبر ہے، اطلاع ہے جانکاری ہے۔عوام کے لیے عوام کے بارے میں تخلیق کیا گیا مواد ہے''۔ جارج برناڈ شاہ نے تو صحافت کو اعلیٰ ادب کا درجہ دیا۔ ایک صحافی اچھا ادیب بھی ہوتا ہے اور ایک اچھا ادیب اچھا صحافی بھی ہوسکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ اردو صحافت کی بات کریں، کچھ روشنی اردو زبان پر ڈالتے ہیں:

میر امن کی باغ و بہار میں اردو کی ابتدا اکبر کے دور سے ہوئی۔ جب مختلف نسلوں کے لوگ آکر ادھر آباد ہو گئے تو باہمی میل جول، لین دین اور رشتے ناطوں کے لیے سب زبانیں ملتی گئیں اور اردو کا جنم ہوا۔ سب زبانوں کا حسن اکٹھا کرنے والی یہ زبان یتیم ہی رہی۔ مغل بادشاہ، امرا اور علما تو اسے فارسی کی وجہ سے منہ نہ لگاتے تھے اور یہ درویشوں، سنتوں اور تاجروں کی زبان بن گئی۔اور اسی سہارے یہ برصغیر کی سب سے بڑی زبان بن گئی۔ جب انگریز نے 1830 میں مغلوں کے نقوش مٹانے کے لیے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان قرار دیا تو تب اس کے وارے نیارے ہو گئے۔ آج جسے صرف مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے اس کا نام انگریز اور رسم الخط پنڈت تلک کاشمیری کی دین ہے۔

ہندوستان میں دیسی اخبارات پہلے بنگالی اور فارسی زبان میں شائع ہونے لگے۔مگر اردو اخبار بھی جلد ہی میدان میں اتر آئے اور کسی فارسی، انگریزی یا بنگالی کا ضمیمہ بننے کی بجائے اپنے علیحدہ تشخص کے ساتھ ابھرے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو صحافت ہندوستان کی قدیم ترین اور تاریخی اعتبار سے موثر صحافت ہے۔ ملک کی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں اس کا کردار بہت گہرا اور اہم رہا ہے۔ کچھ لوگ اردو کا پہلا اخبار منشی سدا سکھ ہزار پوری کے ''جام جہاں نما'' اور کچھ مولوی محمد باقر کے ''دہلی اردو اخبار'' کو قرار دیتے ہیں۔ پہلے اخبار پر مورخ کا جھگڑا ہوسکتا ہے مگر اردو صحافت کے پہلے شہید بلاشبہ مولوی باقر تھے۔ مولوی صاحب کا ''دہلی اردو اخبار''

انگریز حکومت کے قصیدے نہیں پڑھتا تھا بلکہ لوگوں کے اعلیٰ ادبی ذوق کی نشوونما بھی کرتا تھا۔ اس اخبار کو 13 ستمبر 1857 کو بند کر دیا گیا اور مولوی باقر کو گولی مار دی گئی۔ اس شہادت نے اردو صحافت کو وقار اور عزم بخشا۔

کوہِ نور، اودھ اخبار، علی گڑھ گزٹ، تہذیب الاخلاق، ہندوستانی، پیسہ، زمیندار، ہمدرد، الہلال اور اردوئے معلیٰ ان سب نے ہندوستان کے لوگوں کی نہ صرف سیاسی تربیت کی بلکہ صحافیوں نے قلم کو شمشیر بنا کر آزادی اور لوگوں کے حقوق کی جنگ لڑی۔ منشی نول کشور، منشی محبوب علی، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور سرسید احمد خان ان سب کی صحافت ایک عزم اور ایک مشن تھی۔

اگرچہ آج اردو صحافت ہی نہیں ہر صحافت پر سوالیہ نشان ہے۔ مگر اردو میں تفریح، اور سنسنی کا پہلو زیادہ نظر آنے لگا ہے، اردو زبان اور صحافت کی تاریخ بھول کر ہم اسے پس ماندہ اور غیر معیاری زبان سمجھ کر تحقیق اور سنجیدگی سے ہٹ رہے ہیں۔ آج بھی دنیا میں لگ بھگ ساٹھ کروڑ لوگ اردو بولتے سمجھتے اور پڑھتے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، نارتھ امریکہ، یورپ، اور گلف میں دھڑا دھڑ اردو اخبار نکل رہے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے اردو پروگرام ہو رہے ہیں۔ وہ زبان جس نے اپنا وجود ہر مشکل حالات میں بھی برقرار رکھا، آج بھی سر اٹھائے کھڑی ہے مگر اردو کا صحافی چاہے وہ پرنٹ میڈیا کا ہو یا الیکٹرونک کا اس کا کام زیادہ مشکل ہے۔ ایک تو اردو لکھنے والے کو مالی فوائد اور پذیرائی کم ملتی ہے دوسرے اسے اس زبان میں لکھتے ہوئے اس احساس میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی دوڑ میں پیچھے ہے۔ اردو لکھنے والوں کا مشن آج بھی وہی ہونا چاہیے جو ماضی میں تھا۔ کیونکہ اس نے جن لوگوں تک اپنی بات پہنچانی ہے وہ پسماندہ اور دبا ہوا طبقہ ہے جس کی جنگ آج بھی ختم نہیں ہوئی۔ زمانہ منزلیں طے کر گیا مگر اردو کا قاری آج بھی وہیں کھڑا ہے اس لیے اردو صحافت کانٹوں کا میدان ہے اور اردو صحافی اس میدان کا مردِ مجاہد ہونا چاہیے نہ کہ خبر بیچنے والا ایجنٹ۔

○

اردو زبان اور برقی میڈیا

(ٹیلی ویژن کے حوالے سے)

پروفیسر محمد زماں آزردہ

سری نگر، کشمیر

ٹیلی ویژن کے لیے اردو زبان اپنے اندر ایسی صلاحتیں رکھتی ہے، جن کو اگر صحیح معنوں میں بروئے کار لایا جائے تو نہ صرف ٹیلی ویژن سے پیش کیے جانے والے پروگراموں کے ناظرین میں اضافہ ہوگا بلکہ خود اردو زبان کی ترویج اور ترقی میں مدد ملے گی۔ عوام اور خواص دونوں کو اردو تہذیب اور ثقافت سے واقفیت بھی ہوگی اور اس سے فیض یاب بھی ہوں گے۔

آج گجراتی، مراٹھی وغیرہ کے بولنے والے اردو سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل گائکی کے پروگرام دیکھے ہیں۔ وہ اس میں اپنا کیریر بنانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے اس میں تفریح کا سامان بھی ہے مگر لوگوں کی اس بھوک، لوگوں کے اس شوق، لوگوں کی اس عادت سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے ایک راستہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عمل میں غزل گائکی نے ایک محرک کا کام کیا ہے مگر اردو سیکھنے والے کا مقصد کچھ اور بھی ہے۔

اردو والوں کو غلط فہمی ہے کہ اردو شاعری اور اردو ادب ہی ٹیلی ویژن کے پردے پر اردو میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ وہ اس زبان کے ادنیٰ سے کرشمے ہیں، جو لوگوں کو مسحور تو کر دیتے ہیں مگر یہ دیر پا نہیں ہوتے۔

اردو چینلز میں ڈی ڈی اردو، ڈی ڈی کشمیر ان چینلز پر اردو زبان و ادب سے متعلق براہ راست پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو دوسرے چینلز اردو زبان کا استعمال بالواسطہ کرتے ہیں مگر ان کا طریقۂ کار زیادہ متاثر کن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سونی (Sony) چینل پر پیش کیے جانے والے سیریئل 75% اردو زبان میں ہوتے ہیں۔ تھوڑی ہندی ان میں ملی ہوتی ہے مگر زیادہ تر مکالمے اردو کے ہوتے ہیں اور اپنا اثر رکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ چینلز جو ہندی فلمیں دکھاتے ہیں۔ جن میں اردو زبان کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے لیے زبان کا سرٹیفکیٹ ہندی ہوتا ہے مگر سننے اور دیکھنے والے تو سمجھ جاتے ہیں کہ یہ اردو ہے۔ آپ سمندر میں اپنا چھوٹا سا لوٹا الٹ دیجیے اور کہہ دیجیے کہ سمندر میرا ہے تو آپ کو کوئی نہیں روک سکتا ہے۔ مگر دیکھنے والی آنکھ اور سمجھنے والا ذہن تو آپ کے لوٹے کو لوٹا اور سمندر کو سمندر ہی کہے گا۔ ایک بچے سے پوچھا گیا کہ اردو اور ہندی زبان میں کیا فرق ہے تو اس نے بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا کہ نیوز NEWS ہندی میں ہوتی ہے اور سیریل اردو میں۔ یہ اس کی بات ہے جب صرف ڈی ڈی نیشنل ہوا کرتا تھا۔ اب تو چینلز کی باڑھ بھی آ چکی ہے۔ غرض وہ اگر اپنی ہندی میں اردو ملاتے ہیں یا اردو میں اپنی زبان جوڑتے ہیں تو وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے پروگرام کو مقبول بنانا چاہتے ہیں۔ اپنے کام کو آسان بنانا چاہتے ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔

مجھے یاد ہے جب ہم نویں دسویں میں پڑھتے تھے تو سوشل اسٹڈیز یعنی۔ تاریخ اور جغرافیہ والے پرچوں کا جواب ہندی والے بھی اردو میں لکھتے تھے۔ یہ سب اردو کی محبت میں نہیں ہوتا تھا بلکہ محض اس لیے کہ اردو میں وہ تیز تیز لکھ سکتے تھے۔ دیوناگری میں اس رفتار سے وہ سوالوں کے جواب نہیں لکھ سکتے تھے۔ مطلب یہ کہ اردو زبان میں یہ خصوصیت ہے کہ انھیں یہ فائدہ پہنچا سکتی تھی، اس لیے وہ اس کا استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح برقی میڈیا خصوصاً ٹیلی ویژن

پر پروگرام پیش کرنے والے اپنے فائدے کے لیے اردو کا بقدر ضرورت استعمال ضرور کرتے ہیں۔

اصل میں اردو کے نام پر جس طرح کے پروگرام ڈی ڈی اردو، ڈی ڈی کشمیر اور ای ٹی وی اردو پر آتے ہیں ان سے ناظرین کو اردو زبان و ادب کے بارے میں غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اردو کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کے علاوہ کسی اور بات سے اس زبان کا سروکار نہیں۔ اس زبان میں مشاعرے، قوالی اور اردو کی ادبی تقاریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ اردو چینلز کو مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں پیش ہونے والے مذہبی اور سماجی پروگرام ایک خاص طبقے سے متعلق ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دیکھنے والے یہ تاثر لیتے ہیں کہ اردو میں صرف ایک خاص طرح کے معاشرے کی ہی عکاسی ہو سکتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ چینلز اسی مخصوص طبقے میں دیکھے بھی جاتے ہیں۔ اور باقی آبادی ان مسائل سے بھی ناواقف رہتی ہے۔ اور وہ مقصد بھی پورا نہیں ہوتا جو ان پروگراموں کے پیش کرنے کا اصلاً ہوتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اردو برصغیر کی ایک ایسی زبان ہے جو یہاں کے ہر خطے اور یہاں کی ہر تہذیب سے جڑی رہی ہے۔ اسی زبان نے ایک زمانے میں شمال اور جنوب مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے سے قریب لایا۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ اردو کی گود میں برصغیر کے مختلف خطوں کی تہذیبیں نہ صرف پلتی رہیں بلکہ اس کی وجہ سے آگے بڑھیں اور ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہیں۔ آج دکن کے ادبی سرمایہ کو اٹھا کے دیکھیے، مشرق کے فنون لطیفہ پر ایک نظر ڈالیے، مغرب کے تھیٹر اور فلم میں ابھرنے والے خدو خال ملاحظہ کیجیے یا اور علاقوں کے قابل فخر کارناموں کے جزیات کی تفصیل میں جایئے تو آپ کو اردو زبان کی قوت، اس کی معاونت، اس کی امانت داری اور خوش سلیقگی ہر جگہ نظر آئے گی۔ البتہ آج جب ہم ڈی ڈی اردو، ڈی ڈی کشمیر، ای ٹی وی اردو سے پیش کیے جانے والے اردو پروگراموں کو دیکھتے ہیں تو تاثر یہ ملتا ہے کہ اردو صرف مشاعروں، قوالیوں اور ایک خاص طبقے کی زندگی سے جڑے مسائل کی عکاسی ہی کی متحمل ہو سکتی ہے۔ جب دوسرے چینلز پر پیش کیے جانے والے پروگراموں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ان کو کسی خاص بات پر زور دینا ہے، کسی

خاص واقعے کو نمایاں کرنا ہے، کسی خاص پیغام کو دوسروں تک پہنچانا ہے تو وہاں اردو زبان ہی کی قوت ترسیل ان کا سہارا بنتی ہے۔ یہاں تک کہ پورے ڈرامے میں جس مکالمہ کو پر اثر بنانا ہے، اس کو اردو کا لباس پہنایا جاتا ہے۔ البتہ اردو والے اردو زبان کی اس خاص خصوصیت سے کام نہیں لے پاتے، جس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ گنے چنے لکھنے والوں، چنندہ پرڈیوسروں ہی سے کام لیا جا سکتا ہے اور اکثر وہی لوگ یہ کام کرتے ہیں جن کا یہ اصلی پیشہ نہیں بلکہ سائڈ بزنس ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کتنے ہی پراجیکٹ سب لیٹ Sub lat کیے جاتے ہیں۔ جن کے پاس ہنر ہے، جو تربیت یافتہ ہیں جو اس کو پیشہ بنانا چاہتے ہیں جو اپنی reputation کے ساتھ lightly نہیں لے سکتے، ان کو یا تو کام نہیں ملتا یا پھر کسی ایسے آدمی کے لیے کام کرنا پڑتا ہے، جو خود محض ایک بار سوخ ٹھیکیدار ہوتا ہے۔ آج ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنھوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا، کبھی کیمرہ ہینڈل نہیں کیا، کبھی کوئی سکرین پلے لکھنا تو دور کی بات، پڑھا بھی نہیں، ان ہی کے نام سے سینکڑوں دستاویزی فلمیں، فکشن پر مشتمل سیریل، بیسیوں خط والے ڈرامے بنے اور پیش ہوئے ہیں۔ اور اصل میں جن لوگوں نے یہ کام کیا ہے وہ محض اپنا پیٹ پالنے کے لیے اپنا کام بیچتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے پروگراموں میں زندگی نہیں ہوتی۔ کردار محض لاشوں کے مانند ہوتے ہیں۔ لوگ زندگی کے واقعات کو دیکھنا چاہتے ہیں اور ان پروگراموں کے کرداروں میں اپنے آپ کو تلاش کرنا چاہتے ہیں، ان کے مکالموں میں اپنی زمین اور اپنے خدمات ڈھونڈتے ہیں مگر جب مصنف نقلی ہو، ہدایت کار مصنوعی ہو، باقی سب مصنوعی ہوں تو ایسے پروگراموں میں زندگی آئے گی کیس آج اگر ہم اعداد و شمار کو دیکھیں تو اردو چینلوں کے لیے لکھنے والے، اداکاری کرنے والے اور دوسرے پیشہ ور شاذ ہی ایسے ہوتے ہیں جو این ایس ڈی، آئی ایف ٹی دوراس، آئی ایف ٹی پونے یا اہم ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹس سے متعلقہ شعبے یا ڈسپلن میں فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج اور یونیورسٹی کا ہر اردو ٹیچر کیسے سیریل رائٹر اور فلم رائٹر بن جاتا ہے۔ اتنا تو خیر ٹھیک تھا کہ ہر ٹیچر ناقد بن جاتا ہے وہ یوں کہ اس کو کلاس میں جا کے کچھ نہ کچھ تو پڑھانا ہے اور بیشتر وہی کلاس لیکچرس کے نام پر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس پر کوئی اعتراض

نہیں کہ یونیورسٹی یا کالج کا یا اسکول کا ٹیچر کیوں لکھتا ہے، البتہ اعتراض کی بات یہ ہے کہ اپنے کو اس طرح کی اسکرپٹنگ کے لیے تربیت کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے شارٹ ٹرم ورکشاپس یا ریفرشر یا Orientation کورسز کی ضرورت ہے۔

غرض genuine لوگ محض تماشائی یا مزدور کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ ادھر اردو سے محنت کرنے والے اس قدر جذباتی ہیں کہ ان میں حد درجہ احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کوئی لیڈر یا وزیر اپنی تقریر کو موثر بنانے کے لیے مکمل اردو کا کوئی شعر پڑھ دیتا ہے تو ہم بچھ جاتے ہیں۔ جیسے اس نے ہم پر ہماری زبان پر ہمارے آباواجداد پر کوئی احسان کیا ہو۔ ہم اس کو اپنے قد سے اونچا کر کے دوسروں کے کندھوں اس طرح ایستادہ کرتے ہیں کہ اس کے بغیر کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔ ایسے لیڈر پھر شاعر بھی ہو جاتے ہیں، ادیب بھی ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کے سب کچھ ہو جاتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار ایک سرکاری چینل میں ایک سرکاری افسر کا نیوز کی سیکشن سونپا گیا۔ سرکار کی پالیسی یہ تھی کہ تمام زبانوں میں ہر گھنٹے میں ایک مختصر نیوز ملٹی ٹیلی کاسٹ ہو۔ کسی زبان کے بولنے والوں نے متعلقہ پروڈیوسرس یا ڈائریکٹرس کو اس کام کے لیے اتنا کریڈٹ Credit نہیں دیا جتنا اردو والوں کے احساس کمتری نے اردو سے متعلق افسر کو اس کے قد سے اتنا اونچا کر کے دیکھا کہ وہ خود بہت چھوٹے ہو گئے۔ ارے بھائی اس کا یہ کام ہے، اس نے اردو پر کوئی احسان نہیں کیا، اس کی اپنی روزی روٹی کا معاملہ ہے، اور زبانوں میں بھی ایسا ہو رہا ہے تو آپ اس کو اس کا احسان کیوں مانتے ہیں۔ دیکھیے کسی پروگرام کی تحسین کرنا الگ بات ہے اور کسی انسان کے لیے یہ خیال کرنا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو یہ کام نہ ہوتا، نہایت غلط بات ہے۔ ٹیلی ویژن چینل کا ڈائرکٹر یا پروڈیوسر پروگرام نہیں بنائے گا تو کیا کرے گا۔ ظاہر ہے کہ کتابوں کی بائنڈنگ نہیں کرے گا، پارلیمنٹ میں جا کے تقریر نہیں کرے گا۔ اس کا یہی کام ہے یہی کرے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر سرکاری چینل ہے تو وہ کسی پالیسی کے Implement کرنے کے لیے وہاں ہوتا ہے۔ اس کا کام ہی یہی ہے۔ اگر پرائیویٹ چینل ہے تو وہاں بھی کوئی نہ کوئی پالیسی اس کو اپنانا پڑتی ہے۔ کوئی چینل چلانا آج گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ جب

علاقائی زبانوں کے لیے اتنے چینل پرائیویٹ کے طور پر چلتے ہیں تو اردو تو اس کے مقابلے میں برصغیر کے طول وعرض، برطانیہ، یو اے ای اور کتنے ہی ملکوں میں نئی بستیوں کی شناخت ہوگئی ہے۔ البتہ جو بات کھٹکنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اردو کے نام پر چلائے جانے والے چینلوں پر جب باٹم لائن پر نظر پڑتی ہے تو املا کی غلطیاں ان چینل چلانے والوں کی سنجیدگی کی پول کھول دیتی ہیں۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو ہندوستان کی قومی زبانوں میں ایک ہے، یہ ہمارے دستور کے آٹھویں شیڈول میں شامل ہے۔ اگر کوئی اس زبان کے ساتھ متعصبانہ برتاؤ کرتا ہے تو وہ سریحاً دستور ہند سے منہ پھیرتا ہے، اور اگر کوئی اس زبان کے تئیں نیک خیال رکھتا ہے، اس کو اس کا حق دیتا ہے تو وہ اپنا فرض پورا کرتا ہے۔ ہمارے یہاں تو اگر تنقید نگار کسی تخلیق کار پر مضمون لکھتا ہے تو وہ تخلیق کار اس عمل کو اپنے اوپر کیا ہوا احسان سمجھتا ہے اور اس ناقد کو ایسی نظروں سے دیکھتا ہے کہ وہ خود بھی گمراہ ہو کے اپنے آپ کو اس تخلیق کار کا فن سمجھنے لگتا ہے۔ جبکہ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اچھے ادیب پر لکھے، اگر اب خود اپنی شناخت بناتا ہے۔ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ تخلیق کار، تنقیدات کے بغیر بھی اپنا وجود رکھتا ہے لیکن ناقد کا وجود بغیر تخلیق کار کے ممکن نہیں۔ بہر کیف یہ موقعہ ان مباحث میں پڑنے کا نہیں ہے۔ البتہ اردو زبان اور برقی میڈیا کے رشتے خصوصاً ٹیلی ویژن کے غائیت اور معنویت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دونوں کے رشتے کی احساس کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور دونوں کے آپسی تعلق کی بنیاد پر کون سے مثبت اقدام کیے جاسکتے ہیں۔ جو دونوں کے لیے فائدہ مند ہوں، پر بات کی جاسکتی ہے۔

حق تو یہ ہے کہ کسی بھی چینل پر جب اردو کے نام پر پروگرام پیش ہو تو اسے زندگی سے جوڑا جائے۔ زندگی کے قریب لایا جائے۔ صرف مشاعرے، قوالی، شاعروں اور ادیبوں کے انٹرویوز بیت بازی اور ادبی مناظرے نہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ چیزیں بھی زندگی کا حصہ ہیں مگر اب نہیں کہ بس یہی زندگی ہے۔ اس میں عوام اور خواص دونوں کی زندگی چاہیے۔

آج ہی، آج یعنی 26 ستمبر 2006 ٹائمز آف انڈیا کے بمبئی ایڈیشن کے صفحہ 15 پر رام لیلا کے حوالے سے ایک چہار کالمی پرچھی ہے، جس میں رام لیلا اور اردو کے رشتے سے بات ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ رام کی زبان سے اردو شعروں میں کچھ باتیں پیش کی گئی ہیں۔ اس

کے بعد پھر ڈائرکٹر، پروڈیوسر، کہانی اور کرداروں کے حوالے سے اردو کے بارے میں باتیں ہوئی ہیں۔ اس سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کے مسائل، مذہبی عقائد کی عکاسی تک ہی محدود نہیں۔

آج کل سب ''زندگی'' چینل کیوں دیکھتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ اس میں اردو ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں زندگی بھی ہے۔ لوگ کسی زبان کو چھوڑ بھی سکتے۔ آپ اردو میں ''زندگی'' کو پیش کیجیے تو لوگ آپ کے ساتھ رہیں گے۔ زندہ چینل کی شناخت زندگی ہے اور اگر آپ اپنی زبان میں زندگی کو پیش کرتے ہیں تو لوگ آپ کو چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔ پھر ایک منزل ایسی آئے گی جب آپ کی زبان اور زندگی ایک دوسرے کا نئے لازم و ملزوم ہو جائے گا۔ جہاں زندگی ہوگی، وہاں آپ کی زبان ہوگی، جہاں آپ کی زبان ہوگی وہاں زندگی ہوگی، سب کی زندگی ہوگی، بھرپور زندگی ہوگی۔ چاہے وہ ناٹک ہو، سائنس کی باتیں ہوں، تعلیمی مسائل ہوں، تفریح ہو، سنجیدہ مباحث ہوں۔ زبان اور زندگی ایک دوسرے کو سہارا بھی دیں گے اور ایک دوسرے کی شناخت بھی بنیں گے۔ آپ زبان کو ذریعہ ہی رہنے دیں، منزل نہ بنائیں۔ منزل تو زندگی ہی بنی چاہیے، البتہ آپ ایسی ٹیکنیک سے کام لیجیے کہ زندگی کو پانے، سیکھنے اور کرنے کا اہم اور موثر ذریعہ آپ کی زبان بنے۔

○

اردو اور ذرائع اِبلاغ

رضا علی عابدی، لندن

ذرا سوچیے، زبانِ اردو کا مستقبل کس کے ہاتھ میں ہے؟

جواب صاف ہے۔ ابلاغِ عامہ کے ہاتھ میں، میڈیا کے ہاتھ میں۔

آپ چاہیں تو اس میں ایک اضافہ کرلیں۔ موبائل فون کے ہاتھ میں۔ مگر اس کی بات پھر کبھی۔

دنیا اتنی تیزی سے بدل رہی ہے کہ ہمیں اس کے بدلنے کا احساس تک نہیں ہو رہا ہے۔ کل جو گزر گیا، اُس خواب کی مانند ہے جو صبح جاگنے پر یاد نہیں رہتا۔ اور کل جو آنے والا ہے، اُس خواب کی طرح ہے جس کا کسی کو پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ نئی نئی ایجادات زندگی میں یوں دبے پاؤں چلی آتی ہیں کہ ان کے آنے کی آہٹ تک نہیں ہوتی۔ بس، آجاتی ہیں اور نہ صرف ہماری زندگی پر چھا جاتی ہیں، ہمارے رویوں کو بدل ڈالتی ہیں۔

ٹیلی وژن بالکل نئی ایجاد ہے، ابھی پچاس سال پہلے تک پاکستان ٹیلی وژن، کراچی کی نشریات زیادہ سے زیادہ بھینس کالونی، لانڈھی تک دیکھی جاسکتی تھیں۔ ٹھٹھہ کے باشندے

اپنے ٹیلی وژن انٹینا پر المونیم کے لوٹے لٹکاتے تھے تو بمشکل ان کے ٹی وی پر تصویر آتی تھی وہ بھی مرجھلی سی۔

اور اب جو صورتِ حال ہے اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ ساری دنیا کی نشریات ساری دنیا میں نظر آ رہی ہیں، کابل اور ممبئی کو تو جانے دیجیے۔ برطانیہ میں دھماکہ ہوتا ہے تو اس سے اڑنے والی گرد اُسی لمحے گوجر خان میں نظر آنے لگتی ہے۔

اس تیز رفتاری کو تو چھوڑیے۔ ٹیلی وژن جو کمال کر رہا ہے، یا دوسرے لفظوں میں جو غضب ڈھا رہا ہے وہ یہ کہ بڑی آہستگی سے اور نہایت پیار سے اپنے نظریات ہمارے دل و دماغ میں اتارے جاتا ہے اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نظریات پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں یا زہر میں ڈوبے ہوئے۔

جو بات کہنے کی ہے وہ یہ کہ ٹیلی وژن پر تصویر لاکھ نظر آئے، مگر اپنے دل کی بات ہمارے دل میں اتارنے کے لیے ٹی وی کا بھی جس چیز کے بغیر گزارہ نہیں اُس چیز کو کہتے ہیں: لفظ۔

لفظ اُسے نہیں کہتے کہ جو منہ میں آئے اور کہہ دیا جائے۔ لفظ وہ ہے جو اہتمام مانگتا ہے، لفظ وہ ہے جو احترام مانگتا ہے۔ ایک لفظ اپنے پیچھے ایک پوری تہذیب اور ایک پورا تمدن لیے ہوتا ہے۔ اپنی ادائیگی سے پہلے وہ شائستگی کی شکل میں اپنی قیمت مانگتا ہے۔ اسی لیے زبان اردو میں لٹریچر کو ادب کہتے ہیں۔

یہ بات اخبار کا کام بھی مشکل بناتی ہے۔ یہ بات ریڈیو کے لیے بھی دشواریاں پیدا کرتی ہے، اور رہ گیا ٹیلی وژن، وہ صرف اچھی زبان اور عمدہ اظہار ہی کا تقاضا نہیں کرتا، وہ حرکات و سکنات، چہرے کے اتار چڑھاؤ، ہونٹوں کی جنبش اور سچ پوچھیے تو لباس اور پہناوے میں بھی شائستگی کا مطالبہ کرتا ہے۔

میں اپنی بات زبان تک محدود رکھوں گا۔ یہ بات طے ہے کہ ابلاغِ عامہ عوام کے ذہن کی تربیت بھی کرتا ہے۔ اخبار یا پرنٹ میڈیا املا اور ہجے سکھاتا ہے۔ ریڈیو لفظوں کا تلفظ اور ادائیگی کا انداز سکھاتا ہے اور ٹیلی وژن ان ساری چیزوں کی تربیت کرتا ہے کیونکہ اب اُس پر تحریری پٹیاں چلتی رہتی ہیں جو کبھی کبھی ایڈیٹر صاحب کی زبان دانی کی پول کھولتی رہتی ہیں۔

میں ایک مرتبہ شمالی علاقہ جات میں وہاں اوپر پہاڑوں پر گیا۔ وہاں ایک چائے خانے کی ان پڑھ بیرے سے بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس علاقے میں زندگی کیسے گزرتی ہے؟ اس نے جواب دیا: صاحب یہاں تو زندگی اجیرن ہے۔

یہ لفظ اُس نے کسی اسکول یا جماعت میں نہیں سیکھا۔ یہ لفظ اس نے نیلی وژن سے سیکھا۔

کیا اس سے یہ ثابت ہوا کہ جیسی زبان ٹی وی والے بولیں گے، ویسی ہی زبان عام لوگ بھی بولیں گے چاہے وہ پہاڑوں پر رہتے ہوں چاہے میدانوں میں، چاہے وادیوں میں، چاہے ریگستانوں میں۔

ہاں، اس سے یہی ثابت ہوا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آپ پر ایک بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ آپ کے کاندھوں پر ایک بڑا بوجھ رکھا ہے اور ہم سب کی نگاہیں آپ پر لگی ہیں کہ دیکھیں اب آپ کیا بولتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ منہ کھولیں تو اس سے ادب کے موتی جھڑیں۔ ہمارا یہ مطالبہ نہیں کہ آپ یوں لکھیں کہ دلّی، لکھنو اور دکن والے بھی شرما جائیں۔

ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اچھی، سادہ، سہل، سلیس، شستہ اور دل و دماغ میں گھر کر لینے والی زبان استعمال کریں۔ اس میں آپ کی بھی عزت ہے اور اسی میں آپ کے پیشے کا بھی بھرم ہے۔

اُس وقت ہم آپ کے سامنے تو نہ ہوں گے، مگر جہاں بھی ہوں گے آپ کو وہیں سے سلام کریں گے۔

○

دیارِ مغرب میں اردو: اکیسویں صدی کے تناظر میں

صدف مرزا، ڈنمارک

لسانیات کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے، زبان کوئی بھی ہو اسے اپنی ترقی اور عروج کے لیے تدریجی مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔

اسکینڈے نیویا میں زبان کی ابتدا بڑی شاہراہوں پر اور پانی کے کنارے ایستادہ پتھر کی تختیوں پر لکھی تحریروں سے ہوئی۔ حروفِ تہجی کے شوشے بنانے اور پتھر پر کندہ کرنے کے لیے ان کی ہیئت میں سادگی ہوتی تھی۔ ارتقا اور ترقی کے دوران زبان سے والہانہ محبت کرنے والے شیدائیوں نے اس پر محنت کی۔ چھاپہ خانے کی ایجاد نے کتب کو عام کر دیا اور زبان روز افزوں ترقی کرنے لگی۔

گزشتہ صدی کے آخری عشرے اور نئی صدی کی ابتدا میں سائنسی کرشمات نے الف لیلوی انداز میں زبان کی ترقی کی رفتار بڑھا دی۔ کمپیوٹروں نے قلم اور کاغذ کو طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیا، انٹرنیٹ تک بآسانی رسائی نے دنیا کو سمیٹ کر فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے کے مصداق افلاک کو بھی سعی اور جستجو کرنے والوں کے قدموں میں لا بچھایا۔

ویب سائٹس، بلاگز، معاشرتی رابطوں کے سلسلے، فیس بک۔ٹویٹر نے سمندروں کو قطرہ شبنم اور کوہساروں کو رائی کر دیا۔

سب علوم و دانش کے خزانے اور انسانی تعلقات و روابط محض کلک کا کھیل ٹھہرے۔

لسانیات کے شعبے میں بھی اس ترقی کی دوڑ نے بے شمار تبدیلیاں پیدا کیں۔ اب زبان کی ساخت و پرداخت اور اس کی ترقی و ترویج کے بارے میں سائنسی انداز میں تحقیق ہونے لگی۔

لسانی ڈھانچے اور لغتیاتی تجزیے کے لیے بھی جدید سائنسی انداز فکر اپنایا گیا۔

انٹرنیٹ پر کسی بھی زبان تک رسائی کو سہل کر دیا گیا۔

اور اکیسویں صدی کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے سمارٹ موبائل فونوں نے عالمی زبانوں تک رسائی کو مسلسل پھیلتی کہکشاں میں بدل دیا۔

موبائل پر صوتی نظام نے اور پیغامات ریکارڈ کرنے کی سہولیات نے تلفظ کے بہت سے مسائل حل کرنے میں مدد دی اور پرانے رائج نظام The International Phonetic —IPA Alphabet

کو طاق نسیاں کی زینت بنا دیا۔ اب کسی بھی لفظ کا مقامی تلفظ اور انگریزی تلفظ صرف ایک بٹن دبانے پر یا زبانی حکم دینے پر سماعتوں کے حضور پیش کر دیا جاتا ہے۔

موبائل پر انٹرنیٹ کی سہولت نے کمپیوٹر کے سامنے ہمہ وقت دست دراز کرنے سے بچا لیا۔

جیب میں رکھے موبائل پر محفوظ لغات، ویب سائٹس، یوٹیوب، انسائیکلو پیڈیا نے علوم کے ایک سیل بے پناہ کو ایک کوزے میں مقید کر کے لوگوں کی دسترس میں کر دیا۔

اردو زبان بھی اس برق رفتار ترقی کے ساتھ ہم قدم و ہمرکاب ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ گو اس کے قدم سست رفتار رہے لیکن کمپیوٹر پر بہت سے مراحل میں سے گزرتی، ان پیج و تصویری اردو کی بیساکھیاں سنبھالتے سنبھالتے آج اردو زبان کے شیدائیوں نے اسے یونی کوڈ کی صورت میں باقی زبانوں کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔

عالمی منڈی میں مائیکروسافٹ جو بھی پروگرام تخلیق کرتا ہے اس میں تین زبانیں شامل

ہوتی ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور عربی کو معیشت اور اقتصادیات کے سہارے کی وجہ سے یہ فوقیت حاصل رہی۔ عربی زبان نے اپنے نسخ فونٹ کے سہارے بھی بہت ترقی کی اردو زبان کی طرح وہ نوری نستعلیق کی محتاج ومنتظر نہیں رہی۔

سیمسنگ موبائل کمپنی اور آئی فون میں مسابقت کی ایک فضا نے بھی اردو زبان کی راہ ہموار کی۔ سیمسنگ کمپنی نے اپنے صارفین کو اردو کی سہولت بہم پہنچا کر ایک اضافی قدم اٹھایا۔ اس سے اردو کی دنیا میں ایک بڑا انقلاب یہ آیا کہ انتہائی سرعت کے ساتھ اردو براہ راست موبائل پر لکھی جانے لگی اور ای میل اور پیغامات کی صورت میں کسی بھی دشواری کے بغیر ہر جگہ پڑھی جانے لگی۔ مغربی ترقی اور سہولیات سے ہٹ کر اردو کی دنیا کی طرف دیکھیے تو اردو زبان کو اکیسویں صدی کے ہم رکاب ہونے میں تاخیر تو ہوئی لیکن اس میں آہستہ روی سے پیشرفت ہوتی رہی۔ 2006 میں ڈاکٹر حافظ صفوان نے اردو کارپس پر ایک مفصل مضمون پیش کیا جس میں انھوں نے برمنگھم یونیورسٹی کی سیاحت کے بعد انگریزی کارپس کی طرز پر اردو کارپس کا تعارف اور تجاویز پیش کیں۔

جدید سائنسی لسانی تحقیق ولغتیاتی تجزیے کے لیے ماہر لسانیات، تکنیکی ماہرین اور انگریزی زبان پر قدرت رکھنے والے افراد کے ایک گروپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان کی صورت میں اردو زبان کو تینوں خصوصیات فرد واحد میں مجتمع مل گئیں۔

ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان کی جانب سے مرکز فضیلت برائے اردو اطلاعیات، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد میں ''دی بینک آف اردو'' کے موضوع پر کام شروع کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔

اردو کارپس: تکنیکی تعارف، اہمیت، ضرورت اور دائرہ و لائحۂ عمل میں لکھتے ہیں:

> ''دی بینک آف انگلش'' کے نام سے انگریزی زبان کا ایک بڑا مال خانہ (Repository) جس کے روح رواں آنجہانی پروفیسر جان میک ہارڈی سنکلیئر (John McHardy Sinclair) تھے، اس وقت برمنگھم یونیورسٹی

برطانیہ میں قائم ہے اور دنیا بھر میں جاری لسانیاتی تحقیقات کے لیے موزوں لسانی متون محققین اور تحقیقی اداروں کو فراہم کر رہا ہے۔ اسی طرح کا ایک بڑا مواجہ ''امریکن انگریزی کارپس'' (Corpus of:COCA Contemporary American English) ہے۔ زیر نظر مقالے میں انھی کارپسوں کے ڈھب پر اردو کارپس بنانے کی ضرورت اور لائحۂ عمل کے بارے میں بتایا گیا ہے اور اس اردو کارپس کو ''دی بینک آف اردو'' کا نام دیا گیا ہے۔''

1: کارپس اور دی بینک آف انگلش/ امریکن انگریزی کارپس (COCA): مختصر تعارف

کارپس کیا ہوتے ہیں؟ مختصر جواب یہ ہے کہ یہ مشین ریڈ ایبل متن ہوتے ہیں جنھیں لسانیاتی تحقیقات کے لیے اکٹھا اور جمع کیا گیا ہو۔ ملاحظہ کیجیے آکسفرڈ کی تعریف:

A corpus is a collection of written material in machine-readable form that has been put together for linguistic research

اپنے اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے مشین ریڈ ایبل الفاظ یکجا کر کے فہرست بھی بنائی اور ان کے ترتیب کردہ اٹھارہ ہزار الفاظ کی یہ فہرست گوگل کی اردو ٹرانسلیشن میں استعمال کی جاتی ہے۔

اردو کارپس کے متوازی دوسری سائنسی پیش قدمی

اردو او سی آر OCR

پر مسلسل محنت و عرق ریزی سے ہوئی۔

or OCR, Optical Character Recognition

اردو او سی آر

بصری حرف شناسی یا نویسہ خوانی

اس سے مراد چھپے ہوئے متون اور عبارات کو خواہ وہ ہاتھ سے تحریر کی گئی ہوں یا اسکین کی گئی ہوں، کسی کتاب یا اخبار سے لی گئی ہوں، سب کو ایک سافٹ ویئر کے ذریعے خودکار باز

شناسی کے قابل بنانا ہے تا کہ کمپیوٹر اس مواد کو جس میں الفاظ، علامات اور اعداد شامل ہیں از خود شناخت کر سکے۔

بصری حرف شناسی کا یہ تکنیکی عمل مرحلہ وار ہوتا ہے۔

انگریزی زبان اور وہ زبانیں جن کے حروف زیادہ خم دار نہیں ہوتے با آسانی اس گلوبل دوڑ اور مسابقت کی فضا میں شامل ہوتے گئے اور لسانی انجینئرنگ اور لسانی ترقی وفروغ کے اس منظر نامے میں اپنا واضح مقام بنالیا۔

جبکہ اردو زبان جسے دنیا کی چوتھی بڑی زبان کہا جاتا ہے ابھی اس میدان میں ابتدائی زینے طے کر رہی ہے۔

اگر چہ اردو کمپیوٹر اور نیٹ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس شعبے میں جس ذوق وشوق اور جستجو اور لگن سے کام ہونا چاہیے تھا وہ ابتدا میں اس کے مسائل اور مشکلات کے تذکرے ہی میں گزر گیا۔

اردو زبان کے حروف تہجی، اس کے دائروں، شوشوں، قوسوں اور اس کے باہمی ربط اور پیوستگی کی صورتوں کو کمپیوٹر کی ترقی کی راہ میں روکاوٹ سمجھا جاتا رہا۔ جبکہ اگر اس کا موازنہ چینی زبان کے ساتھ کیا جائے جسے ابتدائی طور پر اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں پڑھا جاتا تھا تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں پر بھی تساہل پسندی اور آئین نو سے ڈرنے کے عوامل ہی پیش نظر رہے۔

اگر اردو زبان کو فارسی اور عربی کے بالمقابل بھی لا کھڑا کیا جائے تو بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں زبانوں نے نسخ پر ہی قناعت کرتے ہوئے اپنی بنیادی اور مرکزی توجہ زبان کی ترویج اور تشہیر پر رکھی جب کی اردو دنیا اپنے ذوق جمالیات کی تشفی میں نوری نستعلیق کے ظہور تک ساکن اور تن بہ تقدیر رہی۔

بصری شناخت کے لیے جب پہلے سے تیار شدہ متن، عبارت، یا اسکین کی ہوئی چیز کو کمپیوٹر میں شناخت کے عمل سے گزارا جاتا ہے تو یہ عبارات اور تصاویر خود کار شناخت اور ایسے متن میں شامل ہو جاتی ہیں جن میں ایک عام متن کی طرح ترمیم وتصحیح کی گنجائش ہوتی ہے۔ صبر آزما اور تخلیقی اور تکنیکی صلاحیتوں کا امتحان دینا پڑتا ہے۔ کمپیوٹر پر یہ شناخت دو انداز میں ہوتی ہے:

مجموعی طور پر

تجزیاتی طور پر

نستعلیق کی صورت میں حروف کی ساخت اور ان کے بل کھاتے انداز کو تکنیک سانچے میں ازسرنو شناخت کے قابل بنانا ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔

اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دنیا بھر کے ویب سے زیادہ استعمال ہونے والے لگیچر جمع کیے گئے۔

بی بی سی کی سائٹ کو اس عمل کے لیے منتخب کیا گیا کیونکہ بی بی سی اردو کی ویب سائٹ نے اردو نسخ ایشیا ٹائپ فانٹ کو اس کی افادیت اور سہولت کی وجہ سے زیادہ اہمیت دی اور اس کی تقلید میں اکثر ویب سائٹس نے اسی فونٹ کو اختیار کیا۔ نستعلیق کے مقابلے میں اس کو کھولنا اور ڈاؤن لوڈ کرنا بھی نسبتاً آسان ہے۔

اوسی آر پر تحقیق کرتے ہوئے ماہرین کا اردو کے فونٹس کا مطالعہ بھی ضروری تھا۔ ایک طرح سے اردو کی ترقی نہ صرف کمپیوٹر کے ماہرین کی شب و روز کی عرق ریزی کی طلبگار ہے بلکہ اس کے ساتھ ماہرین لسانیات پر بھی ایک بھاری فریضہ عائد کرتی ہے کہ وہ جدید پیش رفت کے شانہ بشانہ اپنی تحقیقی کاوشوں کو تیز تر کرتے ہوئے تکنیکی میدان میں بھی قدم جمائیں تاکہ جستجو کا سفر کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔

اردو زبان جب مسلسل تحریر کی صورت اختیار کرتی ہے تو اپنی اشکال بدلتی جاتی ہے۔ الفاظ کی ابتدا، وسط اور اختتام پر ایک ہی حرف خم کھاتا اپنی صورت تبدیل کرتا جاتا ہے۔

اردو میں ایسے حروف بھی ہیں جو دونوں اطراف سے منسلک نہیں ہوتے جیسے

"الف ※※"

دوسرے وہ حروف ہوتے ہیں جو دونوں اطراف سے دوسرے حروف کے ساتھ جڑ جاتے ہیں مثلاً "ب، اورت" "ان الفاظ کی صورتیں ملاحظہ فرمایئے" "تدبیر، اور بتدریج""

ان حروف کی تیسری قسم وہ ہوتی ہے جو بائیں جانب کے حروف میں ضم نہیں ہوتے مثال کے طور پر، "※※ر※※ اور ※※و" جیسے، "※※امیر، راگ" "یا جیسے" "جیو، والا" "وغیرہ

اس کے بعد بیس سب سے زیادہ مستعمل حروف یکجا کیے گئے جن میں ا، ر، نے، کی، میں، کا، ہے، کر، کو، سے، ہو وغیرہ شامل تھے۔

الخوارزمی انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر سائنس نے یکم مارچ 2002 میں ڈاکٹر سرمد حسین کی زیر نگرانی اردو اوسی آر کی تحقیق و ترقی کا پروجیکٹ شروع کیا۔ جس نے جستجو اور تجربات کے اس طویل سفر کے بعد 2014 جنوری میں تجرباتی طور پر آن لائن ایک سافٹ ویئر پیش کیا اور یاران نکتہ داں کو اسے استعمال کرنے کی صلائے عام دی۔

کلام سے متن تک

Speech-to-Text Software، Talk to Text, Voice-to-text

عالمی سطح پر انگریزی زبان میں ترقی کا عالم کن فیکون کی سطح کو چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ کلام سے متن تک یا متن سے کلام تک کا سفر بٹن دبائے بغیر صوتی احکامات کے تابع بھی کر دیا گیا ہے۔ آپ اپنے کمپیوٹر یا موبائل کی سیٹنگ ایسے کر دیتے ہیں کہ آپ کو بٹن دبانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی اور آپ زبانی احکامات کی صورت میں برق رفتاری سے اپنا کام کر سکتے ہیں۔

Speech recognition

صوت شناسی کی سہولت سے کمپیوٹر یا موبائل کو اتنی دانشمندی سکھائی جا چکی ہے کہ وہ مختلف لب و لہجے میں کہی گئی بات کو شناخت کر کے اسے متن کی قبا دے سکے۔

مختلف ویب سائٹس پر ابتدائی حالت میں ایسے سافٹ وئر ملتے ہیں جن سے اردو ای میل یا اردو خبریں سننے کا تجربہ کیا جا رہا ہے گو کہ نتائج تسلی بخش نہیں ہیں۔

اسکینڈے نیویا میں اردو

اسکینڈے نیویا میں اردو کے حوالے سے یہ موضوع نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ حیران کن بھی ہے

سویڈن میں مقیم اردو زبان سے محبت نہیں بلکہ مجنونانہ عشق کرنے والے ایک نوجوان نے نئی صدی کے اوائل میں اردو لائف ڈاٹ کوم کی بنیاد رکھی اور اردو ای میل کو ترویج دیا۔

لندن کے اخبار، عالمی اخبار'' نے آن لائن اردو صحافت کو معتبر انداز میں دنیا سے متعارف کروایا۔ صفدر ہمدانی صاحب نے صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ فراست ہونے کا ثبوت بھی دیا آئین نو سے ڈرنے کی بجائے نگاہیں چار کر کے اسے اپنی دسترس میں کیا اور یونیکوڈ کے ذریعے اردو دنیا کو ایک جامع اخبار پیش کیا۔

برطانیہ ہی کے ایک نوجوان عرفان نواز نے 2004 میں اردو سائٹ اردو پیجز بنا کر اردو زبان میں کمپیوٹر کی تعلیم دینے کا آغاز کیا جس سے ہر خاص و عام مستفید ہوا۔ خود مجھے کئی مرتبہ جب اردو لکھنے کے مسائل پیش آتے تو ہر وقت آن لائن رہنمائی دستیاب ہوتی۔

آج بھی تیز رفتار ترقی میں جدید سافٹ ویئرز اور جدید تکنیکی معلومات کے مضامین اس سائٹ پر فوراً پیش کیے جاتے ہیں۔ بے شمار لوگوں نے یہاں سے گرافک سیکھا اور اردو لکھنا اور اس کو فوٹو شاپ میں ڈیزائن کرنا سکھانے کی باقاعدہ ابتدائی تدریسی پروگرام یہاں پیش کیے گئے۔

یورپ میں ہونے والی اس برقی ترقی کو قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان'' کا تعاون بھی حاصل رہا۔ دیارِ غیر میں رہنے والے ہمیشہ مڑ کر ان شہروں کی طرف دیکھتے رہے جس کے گلی کوچوں میں وہ اپنی زبان ولب و لہجے کو چلتے پھرتے محسوس کر سکتے تھے۔

اسکینڈے نیویا میں بھی اردو کی بڑی بستی یعنی برطانیہ کی طرح اردو کی وسعت اور تشہیر بہت ہوئی اگرچہ آبادی کے تناسب کی وجہ سے برطانیہ کے برابر نہ ہو سکی۔

ڈنمارک کی تعلیمی حکمت عملی نے ہمیشہ اردو زبان کے فروغ اور ترویج و تشہیر کے لیے سہولیات بہم پہنچائی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اردو جماعتوں کا انتظام ہوتا رہا اور اردو پڑھنے کے خواہشمند طالب علموں کے پہلی تا دسویں مفت تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دیے گئے۔

ڈینش تہذیب و ثقافت نے ہمیشہ دوسری تہذیبوں کے ساتھ وسطی پل کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کیا ہے۔

اس کی ایک روشن مثال ڈنمارک میں تقریباً پندرہ برس سے اردو پروگرام پیش کرنے کے لیے ٹی وی لنک اور تین برس تک صرف غیر ملکی خواتین کے مسائل پر گفت وشنید کے لیے ''ٹی وی نساء'' کی سرپرستی کی گئی تھی جسے اس سال نئی حکمت اور پالیسیوں کے تحت عارضی طور پر

ملتوی کر دیا گیا تا ہم ویب ٹی وی کی صورت میں وہ آج بھی قائم ہیں اور ان پر کام کرنے والوں کو صحافتی کارڈ فراہم کیا جاتا ہے۔

ان ممالک میں جدید سہولتوں اور ترجمانوں کو مہیا کی جانے والی رعایتوں سے اردو زبان کا مستقبل تابناک دکھائی دیتا ہے۔موبائل پر اردو کی سہولت اور ریکارڈنگ نے تدریس کو بے حد آسان اور سہل دسترس میں رکھا ہے۔

یہ صدی اپنی محیر العقول ترقی اور آسائشوں کی بنیاد پر لسانی ترقی کے امکانات سے بھر پور ہے جس میں جستجو کرنے والوں کے لیے شش جہات کھلی ہیں۔

○

اکیسویں صدی میں اردو اور صحافت

(یورپ، امریکا اور کناڈا کے تناظر میں)

ڈاکٹر ثوبان سعید

خواجہ معین الدین اردو، عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

جب اردو کی نئی بستیوں کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے عام طور سے وہ نسل مراد ہوتی ہے جس نے برصغیر سے باہر دوسرے ممالک میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ یہ نسل آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے روزی روٹی کے انتظام اور بہتر زندگی کی تلاش میں نامعلوم منزلوں کی طرف پگڈنڈیوں کے سہارے محوِ سفر ہوئی تھی، وہ پگڈنڈیاں اب شاہراہ بن چکی ہیں۔ نئی زمینوں کے مہاجرین کو فکرِ معاش سے فرصت ہوئی تو روح کی طراوت، مذاقِ سلیم کی آسودگی، وجود کے احساس کی ضرورت، فنونِ لطیفہ خاص طور سے شعر وادب کی دنیا آباد کرنے اور اپنی زبان وتہذیب کے تحفظ کا خیال ان کے دلوں میں جاگزیں ہوا۔ یہ مسئلہ شناخت اور پہچان سے بھی جڑا ہوا تھا۔ چنانچہ پہلے پہل ملاقاتوں، ادبی نشستوں، مشاعروں اور مجالس کی شکل میں تہذیبی ارتقا کی جانب پیش رفت ہوئی۔ نئی بستیوں میں اردو کے فروغ سے قطعاً یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ

کسی ایک علاقے نے اچانک اردو کو اپنی زبان بنانے کا فیصلہ کرلیا اور اردو وہاں چشم زدن میں رائج کردی گئی۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زبانیں خارجی طاقت کے بل بوتے نہیں اندرونی قوت کے سہارے فروغ پذیر ہوتی ہیں۔ اسی فطری اصول کے تحت اردو زبان بھی اپنے وطن سے نکل کر نئی نئی بستیاں بسانے میں کامیاب ہوئی ہے اور اپنے ادب اور کلچر کو فروغ پذیر بنارہی ہے۔ موجودہ وقت میں دنیا کے کئی ممالک ایسے ہیں جہاں اردو کی بستیاں باقاعدہ طور سے قائم ہوچکی ہیں۔ یورپ، امریکا، کنیڈا، خلیجی ممالک اور ماریشس چند ایسے پڑاو ہیں جہاں اردو قدم قدم آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

وقت گزرنے اور آبادی میں اضافے کے ساتھ ماس کمیونی کیشن کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا چنانچہ کتابوں اور اخباروں کی مانگ میں اضافے کی صورتِ حال نے صحافت کی جانب بھی لوگوں کو توجہ دلائی۔ اب تو خیر سے اردو صحافت مغربی ملکوں میں بھی ساٹھ برس کی ہوچکی ہے ورنہ ابتدائی دور میں صورتِ حال یہ تھی کہ مشرقی ملکوں خصوصاً پاکستان سے اخبارات مغربی ملکوں میں بھیجے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ شعور نے جب بلوغت کے زینے طے کرنے شروع کیے اور مہاجرین نے نئی زمین اور نئی دنیا کے مسائل وموضوعات میں دلچسپی لینا شروع کی اور وطن سے مانگے کی صحافت بہت دور تک ان کے ذہن وشعور اور عصری آگہی کا ساتھ نہ دے سکی تو جلد ہی نئی صحافت نے اپنے پیروں پر آپ چلنے کا گر سیکھ لیا۔ ٹکنالوجی اور انٹرنیٹ کے اس دور میں اخبار، صحافت، پرنٹ میڈیا کی شکلیں اس قدر تبدیل ہوچکی ہیں، ان کے تصورات میں اتنے تغیرات واقع ہوگئے ہیں کہ معلومات حاصل کرنا تو آسان تر ہوگیا ہے لیکن صحیح معلومات حاصل کرنا، انھیں سمیٹنا اور ان کو ایک لڑی میں پرونا درحقیقت موجودہ زمانے کے سب سے بڑے چیلنج کے طور پر سامنے آیا ہے۔

اردو صحافت نے سب سے پہلے برطانیہ میں اپنے وجود کا احساس کرایا۔ اپریل 1961 سے ہفت روزہ مشرق کا آغاز ہوا، محمود ہاشمی اس کے پہلے مدیر تھے۔ بہت جلد یہ اخبار سیاسی، سماجی، تجارتی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا جس سے اردو زبان کو بھی فیض پہنچتا رہا۔ مشرق کی اشاعت سے یورپ میں اردو کی تعلیم وترویج کا دور بھی شروع ہوگیا کیوں کہ یہ یورپ کا

پہلا ہفت روزہ تھا جو ملکی خبروں کی وجہ سے اردو کی صحافت کی شہ رگ بن گیا۔ فی الحال تین روزنامے، چار ہفتہ وار، چھ ماہنامے، چار سہ ماہی اخبارات برطانیہ سے شائع ہو رہے ہیں۔

جناب محمد صمد شکیب مرحوم اور جناب معین الدین شاہد مرحوم نے مغرب میں اردو صحافت اور مجری ادب کی بنیاد ہی نہیں ڈالی بلکہ اس کو ایک ارفع معیار و وقار بھی عطا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ بدقسمتی سے جب 1968-69 میں مشرق بند ہو گیا تو ایک اور ہفت روزہ اخبارِ وطن کے اجرانے کامیابی کے ساتھ اردو صحافت کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

1971 میں جنگ لندن کی اشاعت نے اردو اور اردو صحافت کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ اس کے علاوہ لندن کی ایک تنظیم اردو عالمی تحریک نے ایک ترجمان جریدے کی شروعات کی جس کا مقصد تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنا اور شائقین شعر و ادب کو روحانی تسکین فراہم کرنا تھا۔ اسی مقصد کے تحت اردو تحریک کے تین شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ لندن سے ایک اور روزنامہ ملت جاری ہوا تھا۔ اس اخبار نے صحافت کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا لیکن افسوس اس کا سفر بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ یہ حقیقت رہی ہے کہ اخبارات و رسائل جس حوصلے اور لگن اور خلوص سے شروع کیے جاتے ہیں بعض نامساعد اور ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے ان کی اشاعت عارضی یا مستقل طور سے بند بھی کرنی پڑتی ہے۔ عاشور کاظمی کا ایک شعر غالباً اسی پس منظر میں کہا گیا ہے:

گل اسی شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اور اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

اخبارات کے علاوہ رسائل کی خدمات بھی عظیم رہی ہیں۔ 1980 کے اواخر میں پہلا ماہنامہ معین الدین شاہ نے اپنی ذاتی محنت، لگن اور سرمایے سے 'اردو ادب' کا شمارہ نکالا تھا۔ اس کا غالب نمبر بے حد جامع، وقیع اور یادگاری کارنامہ رہا اور ابھی تک بعض خوبیوں کی بنیاد پر مثالی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1990 کے عشرے میں ماہنامہ صدا کا اجرا ہوا اور ابھی اس کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی نے ماہنامہ پرواز 2001 سے جاری کیا۔ 2003 میں اس تنظیم

نے ایک اور سنگ میل عبور کیا۔ سہ ماہی سفیر اردو کا ودیا ساگر آنند نمبر نکال کر شعروادب کے بڑھتے ہوئے رجحان کو پیش کرنے کی ذمہ داری بھی بحسن وخوبی انجام دی۔ یہ رسالہ ابھی بھی پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔

پرواز کے علاوہ چند اور اخبارات ورسائل ہیں جو اپنی اپنی اہمیت کے پیش نظر سماج اور ادبی دنیا میں اپنی شناخت اور پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں، ان میں نیشن، پاکستان پوسٹ، انصاف، اورنوائے وقت کا ذکر کیے بغیر اردو ادبی صحافت کا بیان نامکمل رہ جائے گا۔ یہ تمام اخبارات ورسائل لندن اور برطانیہ کے دوسرے شہروں سے شائع ہوتے ہیں۔

برطانیہ کے علاوہ یورپ کے ملک جرمنی سے ششماہی رسالہ جدید ادب حیدر قریشی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ یہ خالص ادبی میگزین ہے جس میں مشاہیر ادب پر معیاری تنقیدی مضامین شامل کیے جاتے ہیں۔ اقبال، حالی جیسے ادیبوں اور فن کاروں پر مضامین کے علاوہ اردو کی دیگر ادبی تحریکات ورجحانات پر بہترین مضامین شائع ہوئے ہیں۔ جدید ادب کا میراجی نمبر میراجی کی شخصیت اور شاعری کے مختلف گوشوں پر بہتر روشنی ڈالتا ہے۔

یورپ کے علاوہ کناڈا میں اردو کا پہلا رسالہ صبا حفظ الکبیر قریشی نے 1968 میں نکالا تھا۔ اس کے بعد پاکیزہ، امروز، الہلال، پیغامبر اور ملاقات نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ اب یہ تمام رسائل بند ہوچکے ہیں صرف پاکیزہ باقی ہے، اسے صبیح الدین منصور گذشتہ تیس برسوں سے پابندی سے نکال رہے ہیں۔

گذشتہ بیس برسوں میں کناڈا کا شہر ٹورنٹو اردو رسائل وجرائد کا ایک بڑا مرکز بن گیا ہے۔ ٹورنٹو کو شہر اردو کا خطاب بھی اہل ادب نے دے رکھا ہے۔ پاکیزہ کے علاوہ پاکستان اسٹار، اردو ٹائمز، عوام، کارواں، اخبار پاکستان، سنڈے ٹائمز، پاکستان ٹائمز، ایسٹرن نیوز، صداقت، پاکستان پوسٹ، ٹورنٹو ٹائمز ایسے اخبارات ہیں جو ہفتہ واری اخبار کی حیثیت سے پابندی سے شائع ہورہے ہیں۔ کناڈا میں اردو ٹائمز ایسا پہلا اخبار تھا جس کی سلور جبلی 2005 میں منانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ 14 مختلف شہروں سے شائع ہوتا ہے۔ اردو ٹائمز 1980 میں نکلا۔ فی الوقت نیویارک سے آٹھ ہفت روزے اور ٹورنٹو سے تقریباً ایک درجن چھوٹے بڑے ہفت روزہ

اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ٹورنٹو کی صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ دوسہ ماہی رسالے ادبی نگارشات سے بھرپور ہیں۔ان میں معیاری تخلیقات شائع کی جاتی ہیں۔ میں ذکر کر رہا ہوں اشفاق حسین کے اردو انٹرنیشنل کا اور ولی عالم شاہین کے اردو کناڈا کا۔ یہ وہی اشفاق حسین ہیں جنھوں نے فیض پر قابل قدر کام کیا ہے ان کی حیثیت ادبی صحافی کے علاوہ ایک افسانہ نگار اور فیض شناس کی بھی ہے۔ یہ دونوں رسائل انگریزی میں شائع ہوتے ہیں لیکن ان کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ ان کا دائرۂ کار اردو زبان وادب ہی ہے۔اس لیے کناڈا میں اردو زبان وادب اور صحافت پر گفتگو ان کے ذکر کے بغیر ناتمامیت کا شکار ہو جائے گی۔

ماہنامہ آفاق ٹورنٹو سے سجاد حیدر کی ادارت میں کامیابی سے نکل رہا۔ ہے۔اس کا انٹرنیٹ ایڈیشن بھی دستیاب ہے۔ اس میگزین میں زندگی کے کئی اہم شعبوں کو مناسب جگہ دی جاتی ہے۔ سیاست اور معیشت، عالمی مسائل اور اسلامی دنیا، خاص طور سے مغربی ایشیا کی سیاسی سرگرمیوں اور مغربی ممالک کی ریشہ دوانیوں کا بہترین تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ادبی موضوعات خصوصی طور سے اقبال پر ماہرین قلم کاروں کے مضامین شامل کیے جاتے ہیں۔اسی طرح سے مذہبی فرامین واحکامات پر مشتمل ایک گوشہ مخصوص کیا گیا ہے۔

ٹورنٹو کے ایک اور میگزین شعروسخن کے ذکر کے بغیر یہ کہانی ناتمام رہ جائے گی۔شعروسخن سردار علی کی ادارت میں 2003 سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔اس میگزین کو اردو کا پہلا کناڈائی ویب میگزین ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔میگزین میں دیگر رسائل کی طرح ہی اسلامیات، نعت، تنقیدی اور اصلاحی مضامین، افسانے، شاعری، طنزومزاح اور ادب کی دیگر اصناف پر تخلیقات شائع کی جاتی ہیں۔مغربی ملکوں سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل میں ایک دلچسپ چیز یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ بیشتر رسائل میں مضامین اور موضوعات کی رنگارنگی رہتی ہے۔ خالص ادبی رسائل میں بھی مذہبی موضوعات ومسائل جگہ پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ان میں حمد ونعت اور اسلامیات کے ساتھ ساتھ مارکس اور فرائڈ کے نظریات پر بھی بحث ہوتی رہتی ہے۔ظاہر ہے اس کا معاشی اور تجارتی پہلو بھی ہے کہ ان میں ہر طبقے کے مذاق کے اعتبار سے مضامین شائع کیے جاتے ہیں جس میں مذہبی فکر رکھنے والے بھی ہیں اور ادبی اور

سیاسی نقطۂ نظر سے سماج کو دیکھنے والے دانشور بھی۔ ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ مغربی معاشرے میں کوئی بھی موضوع یا کوئی بھی مسئلہ شجرِ ممنوعہ کے سایے میں نہیں آتا وہاں زندگی کے ہر موضوع پر اظہارِ خیال کی پوری آزادی ہے، آزادیِ اظہار کی اس نعمت کی ترجمانی مختلف ادبی رسالوں میں بہت واضح طور سے دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ ان رسالوں کے قلم کاروں میں برصغیر کے معروف قلم کاروں کے علاوہ یورپ، امریکا اور کناڈا کے مہاجر ادیبوں کی تخلیقات بھی نمایاں طور سے شائع کی جاتی ہیں جن سے اردو صحافت اور اردو قارئین کو مغربی ممالک کے تہذیبی مظاہر اور اس کے مختلف رویوں کے بارے میں براہِ راست معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

امریکا کے نیویارک سے ایک رسالہ پاکیزہ انٹرنیشنل 1970 کے وسط سے منظور صاحب نکالتے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ دیدہ ور میگزین اردو تہذیب وثقافت کا مظہر ہے۔ صہیب صدیقی اور رضیہ مشکور میاں، امریکا سے یہ میگزین شائع کرتے ہیں۔ یہ سہ ماہی رسالہ 2008 سے اشاعت پذیر ہے۔ یہ بھی ایک ادبی نوعیت کا رسالہ ہے جس میں ہندو پاک اور مغربی ممالک کے ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ حمد ونعت کے علاوہ ادبی مضامین اور اصناف کا احاطہ اس میگزین میں کیا جاتا ہے۔ مجری ادب سے متعلق بھی تخلیقات کو بھی خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ لاس اینجلز سے قمر نقش بندی کا ماہنامہ روشنی شائع ہو رہا ہے۔ جوہر میر نیویارک سے ماہنامہ زاویہ نکال رہے ہیں۔ کبھی کبھی مغربی ممالک کے ان اخبارات میں بھی معاصرانہ چشمک کی لے اونچی ہو جایا کرتی ہے، غالباً یہ صحافت کا مزاج ہے۔

ادبی رسائل خواہ وہ یورپ، کناڈا اور امریکا کے کسی گوشے سے شائع ہو رہے ہوں وہ ادبی صحافت کو بال و پر عطا کرنے میں اپنا اپنا کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ رسائل سے قطع نظر اخبارات کی معنویت اور ادبی صحافت میں ان کے مقام کا تعین کرتے ہوئے اس نتیجے تک بآسانی پہنچا جا سکتا ہے کہ یہ اخبارات بنیادی طور سے فنونِ لطیفہ اور ادب سے براہِ راست کوئی رشتہ نہیں رکھتے بلکہ سیاسی خبروں، سماجی موضوعات اور تجارتی اغراض ومقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر نکالے جاتے ہیں، ان کے مواد کا تعین اخباری اور کاروباری نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاتا کہ ان کا تعلق ادبی تنظیموں اور تہذیبی وثقافتی

سرگرمیوں سے بہت مضبوط رہتا ہے۔ ادبی اور ثقافتی پروگراموں کی روداد کو یہ اخبارات اہمیت دیتے ہیں اور پروگراموں کی تفصیلات کو نمایاں طور سے اپنے کالموں میں جگہ دیتے ہیں، تقریبات کی خبریں شہ سرخیوں کی شکل میں شائع کی جاتی ہیں اس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اخبارات اگرچہ براہ راست ادبی نوعیت کے حامل نہیں ہوتے لیکن بالواسطہ طور سے ادبی وتہذیبی عناصر کو پیش کرنے اور ادبی صحافت کو آگے بڑھانے میں اپنا اپنا کردار بخوبی ادا کرتے ہیں۔ شکریہ!

○

اداریہ نویسی کے فنّی اور ثقافتی عوامل

پروفیسر صغیر افراہیم

مدیر 'تہذیب الاخلاق' علی گڑھ، یوپی

فن اداریہ نویسی صحافت کا اہم موضوع ہے۔ اس کو اخبارات، رسائل و جرائد میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی تعریف، تعبیر و تفسیر وقت کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ صحافتی تحریر کا ایسا انداز جس میں مُشاہدۂ ذات اور کائنات کو کام میں لاتے ہوئے اپنے تجربات کی روشنی میں ہر قسم کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے اختتامی مرحلہ میں مشوروں سے نوازا جائے تو ایسی تحریر کو ''اداریہ'' قرار دیا جائے گا۔ اس کو نہ تو مضمون کی حیثیت سے قبول کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کا تعین خاکہ، انشائیہ یا سفرنامہ کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ ایسی تحریر میں عالمی مسائل کے علاوہ انسانی ہمہ جہت سے قریب ہونے کی بے حد صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ ایسا فنی حربہ ہے کہ اس کے ذریعہ محض قاری کو متاثر یا محظوظ ہی نہیں کیا جاتا ہے بلکہ منفی رویوں کی شدت کو کم کرتے ہوئے مثبت حقائق کو خوش گوار انداز میں پیش کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ صحافتی حدود کی پابندیوں کا لحاظ کرتے ہوئے اخبار، رسالہ اور جریدے کا اداریہ کچھ الگ انداز کا ہوتا

ہے۔ مثلاً اخبار کا اداریہ کسی پالیسی کے طابع ہو یا آزاد، لکھتے وقت اُس روز کی اہم خبر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اخبار کا بنیادی منصب خبر پہنچانا ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی اُسی اہم خبر کے سہارے مسائل و امور پر روشنی ڈالی جاتی ہے جبکہ رسائل میں علمی و ادبی مسائل کے علاوہ افکار و نظریات پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ اس میں رسالے کی مجموعی پالیسی اور مختلف نظریات و میلانات پر مشتمل بحث کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کرتے ہوئے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اِن دونوں سے ذرا ہٹ کر جرائد میں مختلف قسم کے تحقیقی مضامین ہوتے ہیں۔ اس لیے عموماً مندرجات کا مختصر تعارف بھی کرا دیا جاتا ہے اور پھر مندرجات کے حوالے سے اداریہ کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ اُن کی اہمیت قاری پر واضح ہو جائے۔ اس میں ادبی رجحانات، مسائل اور انکشافات کے حوالے سے اداریہ نویس افکار و نظریات یا ممکنہ تبدیلیوں کے تئیں اپنی رائے کا مدلل اظہار کرتا ہے۔ غرض کہ اخبار، رسائل اور جرائد میں اداریہ نویس واقعات یا مضامین کے اہم نکات اور مندرجات کو مربوط شکل دے کر ایک طرح سے اُن کا مختصر ترین تعارف کراتے ہیں۔ اِن خصوصیات کی بنا پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اداریہ نویس کو باخبر، بیدار مغز، ذہین اور محتاط ہونا چاہیے۔ اُس میں وسیع النظری، مستعدی اور گہری بصیرت کے ساتھ توازن اور فوری فیصلے کی صلاحیت ہو، وہ حسِ جمال سے بہرہ ور ہو، مزاج میں اعتدال ہو، ذہن منطقی اور استدلالی ہو۔ مبصر، نکتہ رس اور تجزیہ نگار کے ساتھ ساتھ اسے تحریر کو مختصر بنانے کا فن بھی آتا ہو تبھی تو تحریر میں چھا جانے اور گھر کر لینے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اداریہ نویسی مضمون سے زیادہ اہم اور مسائل کی پیشکش کے ساتھ ساتھ مسائل کے حل کی جانب پیش رفت کرنے والی متوازن تحریر ہوتی ہے۔ اِس میں غیر جانبدارانہ اور انصاف پسندانہ رویہ اختیار کر کے اداریہ نویس ایک جانب مسائل کی مکمل آگاہی دینے میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خبر یہ عناصر کو بنیاد بنا کر حقائق کی نمائندگی اور پیش آمدہ مسائل کا حل دریافت کرنے کی جستجو میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کسی مضمون میں اس قسم کا انداز، کسی انشائیہ میں اس طرز کی نمائندگی اور کسی تخلیقی صنف میں اس انداز کی کارفرمائی نہ ہونے کی وجہ سے یہ انداز ''اداریہ'' تحریر کرنے کا غماز ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہ تصور کر لیا گیا

ہے کہ کسی سلگتے ہوئے مسئلہ پر مضمون لکھنا ہی ''اداریہ'' کی دلیل ہے جبکہ اداریہ نویسی کے تقاضے مضمون نگاری کے اصول اور طریقوں سے جداگانہ ہیں۔ اس لیے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور سماجی موضوعات اور مسائلی معاملات کی نمائندگی کرنے والی تحریر یا مضمون کو اداریہ کی حیثیت سے قبول کرنا ممکن نہیں۔ تاہم اداریہ میں مضمون نگاری کی خصوصیت، خاکہ نگاری کی جزئیات اور انشائیہ نگاری کی بے ساختگی کو بلاشبہ کافی دخل ہوتا ہے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ جس طرح ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا نہیں کہا جا سکتا ٹھیک اسی طرح کسی بھی مسائلی تحریر کو اداریہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اداریہ اسی وقت تکمیل کے مراحل میں پہنچتا ہے جب حالات و مسائل کے خبریہ انداز کو کام میں لاتے ہوئے تحریر میں مسائل کے حل کی تجویز پر خصوصی توجہ دی جائے۔ تب ہی اس قسم کی تحریر میں ''اداریہ'' کی خصوصیت شامل ہو سکتی ہے۔ ہر قسم کے مسائل کے انبار سے چند مسئلوں کو منتخب کر کے ان کے مشاہدہ جاتی جائزے کے دوران سچائی اور راست بازی کے سہارے اداریہ آگے بڑھتا ہے اور آخر میں مشوروں کے ذریعہ زبان و بیان اور اظہار کی بے ساختگی سے مالا مال ہوتا ہے۔

حقائق کی نمائندگی، سچائی کی دلکشی، حالات کی غمازی اور مسائل کے حل کے لیے منفرد فکر اور قابل قبول طریقہ کا استعمال ''اداریہ'' کی دین ہے۔ ایک عام تحریر کی طرح اداریہ لکھنے کے دوران بھی سادگی، روانی، بیساختگی اور موزوں اور مناسب الفاظ کا اظہار لازمی ہے۔ اس میں لکھی جانے والی زبان عام فہم اور دلچسپی سے مالا مال ہونے کے علاوہ تاثیر کی خصوصیات کی علمبردار ہونی چاہیے۔ اداریہ میں اکھڑا ہوا لہجہ، اظہار کے دوران کھردراپن اور ربط و تسلسل قائم نہ ہو تو ایسے اداریے نمائندگی کے معاملے میں ناکام قرار پاتے ہیں۔ اس کو ضبطِ تحریر میں لانے کے دوران اخبار کا مالک یا مدیر جس کو ذمہ داری سپرد کرے اس کے توسط سے اخبار کی پالیسی اور عوام کی نمائندگی سے وابستہ ایسی تحریر جس میں مسائل کا ذکر ہی لازم نہیں ہے بلکہ ہر قسم کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کے لیے دانشورانہ غور و فکر بھی عیاں ہو۔ دراصل قابلِ قبول حل کی نشاندہی کرنے والی تحریر ہی ''اداریہ'' کے تقاضوں کی تکمیل کہلاتی ہے۔

اداریہ کی ضرورت کس لیے پیش آتی ہے۔ جب اس معاملہ میں غور کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا

ہے کہ دنیا میں انسان سماجی اور ثقافتی زندگی گزارنے کے لیے آیا ہے۔ سماجی اور ثقافتی زندگی گزارنے کے دوران اسے نہ صرف دوسرے انسانوں سے ربط و تعلق استوار کرنا پڑتا ہے بلکہ ساتھ ہی ایک دوسرے کے احترام اور اختلاف کی صورت میں ناراضگی اور عدم مسابقت کے موقع پر نہ صرف دشمنی کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ اپنی پسند و ناپسند سے واقفیت کرانے کے لیے تحریر کو واسطہ بنانا پڑتا ہے جس میں تمام نشیب و فراز، منظر و پس منظر سمٹ آتے ہیں۔ ''اداریہ'' کے نام سے جانی جانے والی اس منظم تحریر کے ذریعے منفی و مثبت رائے کا اظہار ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اختلاف اور اس کی وجوہات کی نمائندگی بھی ممکن ہے لیکن اس کی معقول وجوہات کی نشاندہی بھی لازمی ہے۔ اداریہ کے دوران مثبت یا منفی رویے کے اظہار کے لیے دلائل اور وجوہات کا سہارا لینے کی وجہ سے اداریہ میں توازن اور تواضع کی کارفرمائی نمایاں ہوتی ہے۔ توازن سے مراد اداریہ نویس کو نہ صرف حد سے زیادہ تعریف سے پرہیز اختیار کرنا چاہیے بلکہ ناپسندیدگی کی صورت میں تذلیل کے رویہ سے احتراز کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی عمل سے اداریہ میں توازن کی خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔ خیال رہے کہ اداریہ نویس کوئی وکیل یا جج نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تحریر میں شہادتوں کا انبار لگا کر اپنی سچائی کو ثابت کرے گا بلکہ وہ تو اپنی دُور رسی، دُور بینی اور قوتِ فیصلہ کے مطابق جو بھی حق یا ناحق قرار پاتا ہے، اسے عیاں کر دیتا ہے۔ اس کی نمائندگی کے لیے اظہار کی صلاحیت اختیار کرنا اور صحافتی ضرورتوں کی تکمیل کرنے کا انداز ''اداریہ'' کہلاتا ہے۔ اداریہ میں توازن کی شرط کے بعد اس میں تواضع کی برقراری سے مراد یہ ہے کہ وحشیانہ، درندگی اور اشتعال انگیزی سے پرہیز برتتے ہوئے سنجیدہ طبعی کے ساتھ مسائل کی نمائندگی کی طرف توجہ دینے کے عمل کو تواضع سے تعبیر کیا جائے۔ اداریہ نویس کو نہ صرف اپنے دشمن کا بھی احترام ملحوظ رکھنا ہوتا ہے بلکہ مکمل صبر و ضبط کے ساتھ اظہار خیال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اندازِ بے نیازی کی وجہ سے اداریہ نویسی میں جذباتیت کے شامل ہو جانے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونے والی اس تحریر میں جذباتیت شامل ہو جائے تو ایسے اداریے نہ صرف قوتِ فیصلہ سے بے نیاز ہو جاتے ہیں بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جذباتی فیصلے کبھی مدبرانہ نہیں ہوتے۔ اس لیے اداریہ نویس کو انتہائی صبر و ضبط

سے کام لیتے ہوئے فیصلہ کی بھر پور صلاحیت کے تحت عوام کی موثر نمائندگی کی غرض سے اداریہ نویسی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ حقیقت میں تمام خوبیوں سے مالا مال نمائندگیوں کا علم بردار اور سچائی اور توازن کی خصوصیات سے وابستہ اداریہ لکھنا بلا شبہ کسی تلوار کی دھار پر چلنے سے کم نہیں قرار پائے گا۔

قیاس آرائی، بہانہ تراشی اور من مانی انداز کا اختیار کرنا کسی افسانے، قصہ یا کہانی میں تو ممکن ہے لیکن اداریہ نویسی کے دوران ممکن نہیں۔ اداریہ نویسی میں رنگ آمیزی، فسانہ طرازی اور عبارت آرائی بھی ممکن نہیں۔ اسے ضبطِ تحریر میں لانے کے دوران ادبی زبان کی موشگافیوں کا چلن بھی ممکن نہیں۔ ادبی زبان کے بجائے اداریہ لکھنے کے دوران صحافتی زبان کا استعمال لازمی ہے۔ تشبیہات، استعارات اور محاکات کی زبان استعمال کر کے اداریہ لکھا جائے تو وہ ادبیات کی تکمیل تو ضرور کر سکتا ہے لیکن صحافتی ضروریات مکمل نہیں ہوتیں۔ اس لیے اداریہ نویسی کے دوران استعاراتی، محاکاتی اور تشبیہاتی زبان کے استعمال سے پرہیز لازمی ہے۔ افسانوی انداز، کہانی کا طرز اور قصے کی جزئیات کی طرح المیہ، طربیہ یا الم طربیہ خصوصیات سے وابستہ طرز اداریہ نویسی کے دوران ممکن نہیں۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ اداریہ نویسی کا شمار نہ تو افسانوی نثر میں ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے مزاج میں افسانویت کو دخل ہے۔ اس لیے اداریہ تحریر کرنے کے دوران اشاراتی انداز، علامتی کیفیت اور دُور از کار تشبیہات کے استعمال سے ممکن حد تک پرہیز کرنا چاہیے تب ہی کسی اداریہ میں اس فن کے حسن کی کارفرمائی واضح ہو سکتی ہے۔

اداریہ لکھنے کے لیے غیر جانب دارانہ رویہ کا استعمال سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بیجا موافقت اور مخالفت کی اساس پر اداریے نہیں لکھے جا سکتے۔ موقع پرستی، مفاد پرستی اور اقربا پروری کے رجحان سے اداریہ نویسی کی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے اداریہ نویس کو ان معاملات سے اجتناب اختیار کرنا ضروری ہے۔ اداریہ کو صاف ستھرا اور ہر ایک کے لیے قابلِ قبول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے لکھنے والا غیر جانب داری کے دامن کو تھامے رکھے۔ موجودہ دور میں بڑھتی ہوئی ''زرد صحافت'' کی وجہ سے اداریہ نویسی کے دوران بے شمار

بے اعتدالیاں ظاہر ہونے لگی ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کی صحافت میں ایسے عوامل تیز رفتاری سے ترقی کر رہے ہیں اور جن ممالک کو ترقی یافتہ کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے وہاں فیشن اور سرمایہ کے بیجا استعمال کی وجہ سے توازن میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ ان تمام مسائل کا حاصل یہی ہوسکتا ہے کہ صحافت کے توسط سے لکھے جانے والے اداریہ کو غیر جانبدارانہ بنایا جائے۔ غیر جانبداری کا قطعی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اداریہ کی ساکھ کی برقراری اور اخبار یا رسالہ کے وقار کی برقراری کی خاطر ہمیشہ یکساں یا پھر مجہول رویہ اختیار کیا جائے۔ جس طرح موضوعات میں ہمہ گیری ہوتی ہے اسی طرح رویوں میں بھی لچک داری کا مظاہرہ ہونا ضروری ہے۔ سچائی کا بیان، حقائق کا اظہار اور توازن اپنی جگہ قائم لیکن اداریہ نویسی کے دوران لچکدار پالیسی کا استعمال کرنا لازمی ہے۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ لکھ دینا لچک داری نہیں۔ اس کے علاوہ بے تعلقی بھی لچک داری میں شامل نہیں۔ اداریہ میں ہر قسم کے کنرپن سے پرہیز اور کسی معاملہ میں اڑے رہنے کی صلاحیت سے دُوری اختیار کرنا لچک دار خصوصیت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اس خصوص میں اداریہ نویس کو کسی چیز کے جواز اور اس کی وجہ جواز سے بھی وابستہ ہونا چاہیے۔ جواز پیدا کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے ہی لچک داری نمایاں ہوتی ہے۔ غیر جانبداری کے دوران لچک دار خصوصیات کو اداریہ میں شامل کیا جائے تو اداریہ نہ صرف حقائق کا علم بردار اور نمائندگی کا حق ادا کرے گا بلکہ اس میں غیر جانبداری کا انداز، جواز اور وجہ جواز کی صفات پیدا ہو جائیں گی۔

اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخصی، ذاتی حملوں سے پرہیز کے علاوہ غیر پارلیمانی لب ولہجہ سے دُوری بھی اختیار کرے۔ شخصی اور ذاتی تناظر میں کسی اداریہ کی تحریر ممکن نہیں بلکہ ہر اداریہ کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ مقامی، علاقائی اور ثقافتی مسائل پر اداریہ نہ لکھا جائے۔ ہر سلگتے اور پریشان کرنے والے موضوع کو اداریہ کا وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ اداریہ کس موضوع پر لکھا جائے یہ فیصلہ اداریہ نویس کی تمیز کی دین ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اخبار کے لیے دن بھر کے اہم ترین موضوعات اور مسائل پر شائع ہونے والی خبروں میں سے کسی اہم مسئلے اور نکتے کو پیش نظر رکھ کر اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اداریہ لکھا جا سکتا ہے۔ تاہم اداریہ نویسی سے قبل قومی، ملکی اور عالمی حالات، واقعات، حادثات

اور ثقافت کے بارے میں اداریہ نویس کو باریک بینی سے مشاہدہ کرنا لازمی ہے۔ اس معاملے میں سرسری طور پر اداریہ لکھ دیا جائے تو غلط فہمیاں پھیلنے کے امکانات شدید ہو جائیں گے جس کی وجہ سے معذرت خواہی کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اداریہ لکھنے کے دوران ہر موضوع کے تاریخی، جغرافیائی اور قدرتی حالات سے واقفیت کے بعد ہی اداریہ نویسی کی تیاری کرنی چاہیے۔ اس خصوص میں انسائیکلو پیڈیا کا مطالعہ قدرتی اور جغرافیائی حالات فراہم کرنے والی کتب اور میوزیم میں دستیاب کسی عہد کے بارے میں آثار سے آگاہی کے بعد اداریہ لکھا جائے تو وہ کامیاب اداریہ کہلائے گا۔ اس سلیقہ کا استعمال نہ کیا جائے تو اداریہ کی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اداریہ کے لیے اُسی موضوع کا انتخاب کیا جانا چاہیے جس کے بارے میں اداریہ نویس کو مکمل طور پر واقفیت ہو تب ہی حقیقی معنی میں اداریہ نویسی کا حق ادا ہوگا۔

اداریہ لکھنے کے دوران فرقہ واریت، علاقائیت اور لسانی عصبیت ہی نہیں بلکہ رنگ و نسل کے فرق سے بھی بے نیاز ہونا ضروری ہے۔ عقائد کی پیش کشی کا تقاضہ تو یہی چاہتا ہے کہ اداریہ کے توسط سے ہر قسم کی بے راہ روی کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ جب ہی ممکن ہے جب کہ انسان مختلف عصبیتوں سے بلند ہو کر کام کرنے کی صلاحیت کو فروغ دے۔ اس پس منظر میں اداریہ اسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے جب کہ ہر قسم کے تعصبات سے پرہیز کرتے ہوئے حقائق کی نمائندگی کی طرف توجہ دی جائے۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ کوئی علاقائی اور فرقہ واری نوعیت کا واقعہ منظرِ عام پر آجائے تو اداریہ نویس اس سے روگردانی کرے بلکہ ضرورت کے مطابق اداریہ لکھنا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ اداریہ کا موضوع اتنا متنوع ہوتا ہے کہ اس کے توسط سے ہر چھوٹی سے چھوٹی بات سے لے کر بڑے سے بڑے مسئلے کو بھی اداریہ میں شامل کیا جا سکتا ہے البتہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور مسائل کا تعلق کسی عام انسان کی شخصیت یا پھر اس کی دلچسپیوں سے وابستہ نہ ہو بلکہ کسی خاص فرد، ملک و ملت اور تہذیب و ثقافت سے متعلق جتنے بھی موضوعات قرار پائیں گے انھیں بنیاد بنا کر اداریہ لکھا جائے تو زیادہ کارگر ثابت ہوگا۔ اگر اس معاملے میں علاقائیت منظرِ عام پر آرہی ہے تو ایسے موقعے پر بھی اداریہ نویس کو توازن کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ تاہم اس قسم کے موضوعات سے پرہیز لازم ہے جن کی وجہ سے ٹکراؤ کی

کیفیت پیدا ہو یا پھر اختلافات کے بڑھنے کا امکانات ہوں۔ کسی علاقے کی ترقی اور کسی فرقے کے فروغ کے لیے کوئی اداریہ لکھا جا رہا ہے اور انھیں جائز حقوق دلانے کے لیے اداریہ نویس جدو جہد سے دو چار ہے تو ایسے وقت علاقائی عصبیت اور فرقہ واریت سے گُریز برتنا چاہیے۔ تناؤ اور ٹکراؤ کی صورتِ حال میں شدّت پیدا کرنے کے لیے لکھے جانے والے اداریے کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں ہوتے ہیں کیوں کہ 'اداریہ' کا فرضِ اولین صحت مند رویے کی علمبرداری کا ہے۔ بے شمار ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں بیمار ذہنیت کے مالک افراد، تہذیب، تمدن، ثقافت اور رنگ و نسل کے درمیان بھید بھاؤ پیدا کرنے کے لیے جس قسم کی سیاست کا سہارا لیتے ہیں، اس سے قوم و ملت ہی نہیں بلکہ ملک کو ہونے والے نقصانات کے پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایسے موضوعات سے دُوری اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔ تنگ نظری پر مبنی اداریہ لکھنے کے وجہ سے قومی اور ملکی نقصانات کے امکانات قوی ہوتے ہیں۔

اداریہ نویسی ایک باشعور ذہن اور خلاقانہ فطرت سے وابستہ انسان کی تحریری کوشش ہوتی ہے جس کو لکھنے سے قبل اور لکھنے کے بعد بھی صاحبِ قلم کو ایک سے زائد بار اپنی تحریر پر غور کرنا چاہیے تا کہ کوئی ایسا تشنہ پہلو نہ رہ جائے کہ جس پر توجہ نہ ہونے کی وجہ سے اداریہ غیر مکمل ہونے کی دلیل بن جائے۔ بہتر تو یہ ہوتا ہے کہ اشاعت کے آخری مرحلے تک اداریہ پر نظر رکھی جائے۔ درحقیقت اداریہ لکھنا ذہن کو حاضر رکھ کر مسائل اور اس کے حل پر توجہ دیتے ہوئے تحریر کو توازن سے وابستہ کرنے کا عمل ہے۔

کسی اخبار، رسالے یا جریدے میں لکھے جانے والے اداریے درحقیقت مستقبل شناسی کی دلیل ہوتے ہیں۔ ایک دور تھا جب کہ اخبارات، رسائل اور جرائد میں شائع ہونے والے اداریے نہ صرف تہلکہ برپا کرنے کا ذریعہ ہوتے تھے بلکہ انقلابی کارناموں کا وسیلہ بھی ہوتے تھے۔ ان کے قاری نہ صرف مدیر کی تحریر کو پڑھنے کے متمنی ہوتے تھے بلکہ اداریے کے کئی جملے لوگوں کو اشعار کی طرح زبانی یاد ہو جاتے تھے۔ اس وقت ادبی اور مذہبی صحافت بھی کام کر رہی تھی اور اس کے ساتھ سیاسی صحافت کے کارنامے بھی انجام دیے جا رہے تھے۔ مقبولیت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان اداریوں میں اخلاص شامل ہوتا تھا اور اداریہ نویس موضوع سے مکمل

انصاف کرتے ہوئے تمام متعلقات کو یکجا کر کے اداریہ نویسی کا حق ادا کرتا تھا جس کی وجہ سے ہر قاری اپنی دلچسپی کے اخبار، رسائل اور جرائد کو حاصل کرتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے اداریہ پر مرکوز ہو جاتی تھی۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات سے دو چار قاری کے لیے کون سے اخبار یا رسالے کا اداریہ کس لائحہ عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ بنیادی اختصاص اس دور کی خصوصیت تھی کیونکہ اداریہ نویس خود اخبار یا رسالے کا مالک اور قوم و ملک سے لگاؤ کا علمبردار ہوتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اخبارات، رسائل اور جرائد کو سرمایہ دار طبقہ نے اپنے قبضے میں لے لیا اور یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ اخبار نویس یا مالکان نے اداریہ نویس کو بھی اپنی مرضی کے تابع بنا دیا جس کی وجہ سے حقائق پر مبنی اداریے اور ان کی تاثیر میں فرق پیدا ہونے لگا۔ کسی انسان کی توجہ جس جانب مائل نہ ہو اس موضوع کو اداریے کا وسیلہ بنانے یا پھر سیاسی جماعتوں یا قائدین کو خوش کرنے کے علاوہ اشتہارات حاصل کرنے کے مفادات جیسے جیسے اخبار و رسائل کے مدیروں کے ذہن میں پرورش پانے لگے ویسے ویسے اداریے کے وقار میں کمی آتی گئی۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ حقیقت پسند اداریے اب نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ یہ ہر دور کا تقاضہ ہوتے ہیں اور ہر دور میں اس قسم کے اداریے لکھے جاتے رہے ہیں لیکن جس طرح مختلف میدانوں میں انسان اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے گراوٹ کا شکار ہوتا جا رہا ہے اسی طرح صحافت کے توسط سے اداریہ نویسی کو خاص مزاج سے وابستہ کرنے کا رجحان بھی تیز رفتاری کے ساتھ رو بہ زوال ہے۔ ماضی بعید میں 'جام جہاں نما'، 'دہلی اردو اخبار'، 'مدینہ' اور 'پیسہ اخبار' کا اپنا دبدبہ تھا۔ 'تہذیب الاخلاق'، 'الہلال'، 'البلاغ'، 'ہمدرد'، 'زمیندار'، 'افکار'، 'الجمعیۃ'، 'صدقِ جدید'، 'ریاست' اور 'تجلی' کے اداریے کو پڑھنے کے لیے لوگ بے چین رہتے۔ اسی طرح سیاسی موضوعات کی نمائندگی کرنے والا ہفتہ وار اخبار 'بلٹز' اور 'نشیمن' کے اداریے اس قدر دل کو چھو لینے والے ہوتے تھے کہ اس قسم کے اداریے پڑھنے کے لیے لوگ ہفتہ بھر انتظار کیا کرتے تھے۔ نیاز فتح پوری نے جب اپنا ماہنامہ رسالہ ''نگار'' اور علامہ راشد الخیری نے ماہنامہ ''عصمت'' شائع کیا تو اردو کے قارئین ان کے اداریوں کو پڑھنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ اسی طرح 'ہمدرد'، 'افکار' اور 'صدقِ جدید' کے اداریے

مستند تصور کیے جاتے تھے۔اُس دور میں ''ہمایوں''، ''عالمگیر'' اور کئی دوسرے ایسے ادبی رسالے شائع ہوئے جن کی تخلیقات سے زائد اخبار نویس کے اداریے کا انتظار کیا جاتا تھا۔ صحافت کے پس منظر میں مولانا ظفر علی خاں کے رسالے ''زمیندار'' اور مولانا ابو الکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں بھی وہ تاثیر تھی کہ قاری ان کے اداریوں کا شدت سے انتظار کرتا تھا۔ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' اور ''ماہنامہ شمع'' کے اداریے سماجی اور فلمی صحافت میں اہم کردار نبھایا کرتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ان رسالوں سے وابستہ افراد خلوصِ نیت اور دیانتداری کے علمبردار تھے۔ موجودہ دور میں ادبی صحافت ہو یا مذہبی یا سیاسی صحافت اس کی صورتِ حال یہ ہو چکی ہے کہ دن بہ دن ''زرد صحافت'' فروغ پانے لگی ہے۔ اخبارات، رسائل و جرائد سے وابستہ مدیران نے خلوص کے بجائے سرمایہ کے حصول کو اپنا ذریعہ بنالیا ہے جس کے نتیجے میں ادبی صحافت بھی بے اعتدالی کا شکار ہے اور سیاسی صحافت کا تو کوئی پرسانِ حال نہیں البتہ مذہبی صحافت کی نمائندگی کرنے والے رسائل و جرائد کی صورتِ حال کسی حد تک مناسب نظر آتی ہے کیونکہ اس مرحلے میں دیانتداری کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔

صارفیت و عالم کاری کے اِس دور میں جب کہ تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی قدریں دھندھلاتی جارہی ہیں، اداریہ نویس کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ توازن، اخلاص اور دیانتداری کو نظر میں رکھتے ہوئے پیش آیند معاملات اور مسائل کو سمجھنے اور اُن کو سلجھانے کا جتن کریں۔ وہ جب اپنے تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کریں تو ایسا اظہار ہو جو غیر جانب دار، متوازن اور شخصی حملوں سے بے نیاز ہو تاکہ اداریہ مستقبل شناسی کا وسیلہ بن جائے۔ دراصل مستقبل شناسی کی نمائندگی کرنے والی تحریر میں اشتعال نہ ہونے اور خبروں کے مثبت انداز کی نمائندگی کی وجہ سے ہی 'اداریہ' صحافت کا ایک انوکھا طرزِ تخاطب اور با اثر وسیلہ بن گیا ہے جسے غیر افسانوی نثر کا ایک قیمتی وصف قرار دیا جارہا ہے۔

○

اردو میں ترجمہ نگاری کی ادارہ سازی: ضرورت اور مسائل

سہیل احمد فاروقی

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زبان کی اجمالاً تین سطحیں ہیں یعنی کاروباری، علمی اور ادبی۔ ترجمہ نگاری کے ماحصل کے اعتبار سے پہلی دو سطحوں پر حتمیت یا قطعیت ہاتھ آتی ہے تو تیسری سطح پر بے یقینی۔ ایسی بے یقینی جس میں مترجم اپنے قاری کے سامنے ایک نیا جہانِ معنی آراستہ کر دیتا ہے۔ اسی بے یقینی نے تخلیقی متون کی تفہیم میں دیگر طریقہ ہائے کار کے علاوہ نشانیات اور ہرمینیات یا شرحیات سے استفادے کے دروازے بھی کھولے ہیں اور ہمارے اذہان کو اس عمل کی ہنوز ان دیکھی جہات سے روشناس کرایا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ترجمے سے متعلق اب تک جتنے بھی مباحث سامنے آئے ہیں وہ سب شاعری یعنی تخلیقی متن کے حوالے سے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی طرف سے مختلف انداز میں عدم اطمینان کا اظہار کیا جاتا رہا۔ کسی نے اسے حقارت بخش سعی نامشکور قرار دیا تو کسی نے اسے نمک حرامی اور غداری سے تعبیر کیا۔ کہیں اس عمل کو حسن و بے وفائی تو کہیں وفاداری و بدصورتی کے امتزاج سے متصف کیا گیا۔

مقدس صحائف کے ترجمے کا معاملہ اور بھی سنگین تھا کیوں کہ ایسا کوئی بھی عمل پاکیزہ الہامی الفاظ کو آلودہ کرنے کے مترادف ٹھہرا تھا۔ اسی اعتبار سے انگریزی میں بائیبل کے اولین مترجم ولیم ٹنڈل کو جلا وطنی، پھانسی اور یہاں تک کہ آگ میں جھونک دیے جانے کا انعام ملا۔ قرآن کریم کا اردو میں ترجمہ کرنے کے بعد نذیر احمد دہلوی کے عالمانہ تقدس پر بھی حرف آیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ الہامی متن کے ترجمے میں کلامِ الٰہی کی حرمت کے مجروح ہونے کا اندیشہ اور ادبی و شعری ترجمے میں فن کی لامتناہیت اور اس سے زائیدہ عدم تکمیل کا تصور مضمر ہے۔

یہاں ایک عملی حقیقت قابلِ غور ہے۔ زبان کی ادبی سطح کے دو منطقے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تعمیری اور دوسرا تخلیقی (1)۔ تخلیقی ترجمے کے تئیں یہ رجائی رویہ بھی سامنے آیا ہے کہ تخلیق کی نزاکتیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ ایک شاعر جتنی محنت اپنے اشعار کے لیے کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ کاوشیں مترجم کو کرنی پڑتی ہیں۔ شعری ترجمے میں اچھے شعر کے تمام لوازمات اور ان کے نازک مراحل سے مترجم کو گذرنا پڑتا ہے(2)۔ رہ گیا معنی و مفہوم سے سمجھوتے کا معاملہ تو زبان کا پورا کھیل ہی سمجھوتے پر ٹکا ہوا ہے۔

ہندوستان کے تہذیبی اور تاریخی سیاق میں سوچا جائے تو ترجمے کی نارسائی کے اندیشے اور اس کے اصل کی شبیہ ہونے کا تصور بہت دور تک ہمارا ساتھ دینے والے نہیں تھے۔ کیمیا اور طبیعیات جیسے میدانوں میں ہم انیسویں صدی کے ربع اول سے ہی مغرب سے استفادہ کرتے آئے تھے اور کئی علمی تراجم مثلاً ریورنڈ چارلس کی چھ جلدوں پر مشتمل کیمسٹری۔ کا ترجمہ سید میر محمد لکھنوی اور پھر اسی انگریز مصنف کی سات جلدوں پر مشتمل کتاب کا ''ستہ شمسیہ' کے عنوان سے اردو ترجمہ میر امن نے غلام محی الدین متین حیدرابادی، مسٹر جونس اور موسیو تنڈرس کے اشتراک سے مکمل کیا(3)۔

1857 کے بعد ہماری قومی تاریخ نے کروٹ لی اور سائنسی، علمی و ادبی افق میں وسعت سے ہماری روشناسی کے نتیجے میں ہمارے سامنے جو مسئلہ پیدا ہوا وہ اپنے مشرقی علم و ادب کے سرمائے کو سنبھالنے اور مغربی افکار سے استفادے کے درمیان توازن پیدا کرنے کا تھا۔ ادبی

محاذ پر تو یہ ہوا کہ ہم ترجمے کو تقریب یا Approximation کے عمل کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے مغرب کے ادبی سرمائے کو اردو کے قالب میں ڈھالتے بھی رہے اور اس کے تئیں نا آسودگی کا اظہار بھی کرتے رہے۔ نذیر احمد دہلوی (1836-1912) کے مرأت العروس (مطبوعہ 1869)، جواہرِ منظوم (مترجم قلق میرٹھی 1864) اور 'منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم' از بانکے بہاری لال (مطبوعہ 1869) سے لے کر اب تک مغربی فکشن اور شاعری کے بے شمار تراجم ہو چکے ہیں۔ اسی طرح سائنسی اور علمی مواد کا بھی قابل ذکر ذخیرہ اردو میں جمع ہو چکا ہے۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترجمے کی سرگرمی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور نئے تقاضوں کی تکمیل کی تدابیر وضع کرنے کی ضرورت پر بھی غور و خوض کیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ جدید زندگی سے منسلک تصورات، اشیا اور مظاہر کے لیے اردو میں کون سے متبادلات اختیار کیے جائیں یا انھیں من و عن اپنا لیا جائے۔

اصل زبان کے متن کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو اس کا ترجمہ کرنے کے لیے ہمیں اصل زبان اور ہدف زبان کے لسانی نظام، اس کے تہذیبی پس منظر اور مروج اسلوب سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اس کی اصطلاحات اور تراکیب الفاظ پر ہماری پوری گرفت ہونی چاہیے جس کی عملی اعتبار سے اولین اہمیت ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو میں وضع اصطلاحات کا عمل یا تو سست پڑ گیا ہے یا رک گیا ہے۔ اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحوں کو جوں کا توں اپنا لینا چاہیے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ کسی بھی تحریر میں اصطلاحات اور اصطلاحی الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اردو عبارت میں انگریزی اصطلاحات اور اصطلاحی الفاظ کا بے دریغ استعمال عبارت کو بوجھل کر دے گا۔ اس لیے انہی انگریزی اصطلاحوں کو اپنانا چاہیے جو آسانی سے اردو میں کھپ سکیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جو وحید الدین سلیم نے تجویز کیا تھا۔ ہم یہ کہہ کر کہ اردو میں دیگر زبانوں کی اصطلاحات کو ضم کرنے کی صلاحیت موجود ہے شاید اصطلاح سازی کی ذمہ داری سے دامن کش ہونا چاہتے ہیں، جو وحید الدین سلیم کی تجویز کی روح کے منافی ہے جس کی تعبیر میں یقیناً ہم سے تساہلی ہوئی ہے۔ آپسی بول چال میں بھی ہمارا رویہ

اردو بیزاری اور انگریزی نوازی کا ہے۔اردو کے ایک شیدائی اور معروف اسکالر سے عام انتخابات کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔اس میں ایک جملہ یہ آیا کہ ان دنوں ضابطۂ اخلاق نافذ ہے تو وہ بولے کہ ''یوں کہیے کہ کوڈ آف کنڈکٹ نافذ ہے''۔اس طرح سوچنے والے افراد 'سمندری غذا' اور 'جنگلاتی مخلوقات' جیسے متبادلات کیونکر گوارا کریں گے۔

اصطلاح اور تراکیب سازی کے عمل میں رخنہ پڑنے کی ایک بڑی وجہ دیگر زبانوں کے برعکس اردو زبان کے نظام املا اور تلفظ وقواعد سے چشم پوشی ہے۔ان میں سے ایک حذفِ اضافت کا رجحان ہے۔کمپیوٹری طباعت کے عام رواج کے طفیل ہر زبان کے حروفِ تہجی کے مطابق لوحاتِ کلید فراہم ہو گئی ہیں۔تمام حروف اور اعراب کی علامات بھی مقرر اور دستیاب ہو گئیں۔ان علامات کی نشاندہی اور عبارت میں ان کا استعمال ضرور موضوعِ بحث بنا رہا ہے۔ کمپیوٹر عامل کے دل میں اردو کے تئیں سہل انگاری کا جذبہ سب سے پہلے پیدا ہوا۔اس نے مرکبِ اضافی اور مرکبِ توصیفی کے پہلے جزو کے آخری حرف پر زیر کی علامت لگانے سے بچنے کے لیے کہنا شروع کیا کہ یہ تو لگتا ہی نہیں ہے۔جبکہ ایسا ہے نہیں، اور عذرِ لنگ یہ پیش کیا گیا کہ اہلِ اردو چونکہ اضافت کے استعمال کے قاعدے سے واقف ہیں اس لیے وہ اضافت کی علامت کے بغیر بھی اس کا تلفظ کر لیں گے۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کی اعلیٰ درجات کے طلبا بھی 'ترکِ دنیا' 'چشمِ بینا' اور 'منزلِ مقصود' جیسی تراکیب پر اضافت نہ ہو تو وہ انھیں دولخت کر کے پڑھتے ہیں۔جب یہ صورتِ حال اس مصرعے میں دیکھنے کو ملے :

ع : جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

تو آپ کو دنیائے شاعری تہہ و بالا ہوتی نظر آئے گی۔

ہمزۂ اضافت کی علامت لگانے میں تساہلی کی وجہ سے 'طریقہء کار' کو ہمارے اخبارات و رسائل میں 'طریقِ کار' ہی لکھنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔اس سے زبان و املا کی تکنکی ذمہ داریوں سے وابستہ افراد کی اضافت گریزی پر روشنی پڑتی ہے۔

جب یہ یقین کر لیا گیا کہ ان کی اس اضافت کشی کی حرکت پر کہیں سے کوئی گرفت نہیں کی جا رہی ہے تو انھوں نے 'ہائے مختفی' پر ہاتھ ڈالا اور 'تنازعہ' جیسے لفظ میں 'ع' کے ساتھ

اختتامی 'ہائے مختفی' ان کے قلم پر بار گذرنے لگا اور وہ 'تنازعہ' کو 'تنازع' لکھنے لگے ہیں۔ اس امر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ 'مطالعہ' اور 'جمعہ' کو 'ہائے مختفی' کے بغیر نہیں لکھتے۔ یہ تضادِ عمل ظاہر کرتا ہے کہ یہ حضرات اصول کے کم اور خیال کی ترنگ کے زیادہ تابع ہیں۔

اضافت کے تئیں مذکورہ بالا رجحان کے ضمن میں یہ اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ اضافت کے عدم استعمال سے ایک نقصان یہ ہوا کہ مرکب اضافی کی تشکیل میں یہ الجھن پیش آنے لگی کہ زیر کی علامت مضاف کے آخری حرف پر آئے گی یا مضاف الیہ کے۔

ایک روزنامے میں ذیلی سرخی کا ایک ٹکڑا اس طرح تھا:

''وزیر برائے اطفال وخواتین فلاح کارِ عمل''

اگر اضافت بیزار حلقے کے اس مزعوم اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ قارئین اضافت کے قاعدے سے واقف ہیں اس لیے وہ علامت کے بغیر بھی اس کا تلفظ کر لیں گے تو ہم خواتین کے آخری حرف پر زیر لگائیں گے اور اس طرح مضاف اور مضاف الیہ کی ترتیب الٹ جائے گی۔

ایک اور سرخی کی عبارت تھی:

''مادر رحم میں لڑکیوں کا قتل ناقابل برداشت''

ترکِ اضافت کی روش کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ہم لفظ 'مادر' کے آخری حرف پر زیر کی علامت لگائیں۔

بات یہ ہے کہ ماضی میں زبان کے سیاست بازوں کی نیت میں کتنی بھی کھوٹ رہی ہو ان میں بلا کی قوتِ برداشت تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ جو کانٹا وہ بو رہے ہیں اس کی چبھن ڈیڑھ سو سال بعد ملک کے لسانی منظر نامے پر محسوس کی جائے گی اور وہ ایک طبقے کی نکبت وفلاکت کا سبب بنے گی جس سے ان کی تسکین کا پہلو وابستہ ہے۔ انھوں نے بڑی تدبیر سے ملک کے عوام کو یہ باور کرایا کہ انگریزی تراکیب کی ترجمہ پذیری ہندی تک ہی محدود ہے اور اردو اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات، اعلانات اور نیلام نامے اور متعلقہ اداروں اور تنظیموں کے نام بھی من وعن انگریزی میں یا ہندی میں ترجمہ شدہ حالت میں دیے گئے ہوتے ہیں۔ اس کی جزوی تصدیق روزنامہ 'انقلاب' نئی دہلی کی 10 اکتوبر کی اشاعت کے صفحات

1، 4، 5 اور 16 سے ہو جائے گی۔

انگریزی کے امپلائمنٹ نیوز کو ہندی میں روزگار سماچار کے عنوان سے شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا اور اردو میں بھی اس سلسلے کو آگے بڑھایا گیا لیکن روزگار سماچار 'روزگار خبر' نہ بن سکا۔ ظاہر ہے کہ ہ جب اہلِ اردو کا حیطۂ تصور ترکیب سازی کے عمل سے ڈیڑھ سو سال تک خالی رہے گا تو امپلائمنٹ نیوز یا روزگار سماچار کے بجائے 'روزگار خبر' بولتے ہوئے انھیں خود اپنی زبان لڑکھڑاتی محسوس ہوگی۔

آج جب ہر آن بدلتی دنیا میں ہم نہ صرف باقی رہ جانے والے ادبی اور علمی سرمائے بلکہ متعدد نو دریافت علوم کے ذخیرے کو بھی اپنی زبان میں منتقل کرنے کا عزم رکھتے ہیں تو ہمیں اپنے مروج طریقۂ کار کا محاکمہ بھی کرنا چاہیے۔

پروفیسر آل احمد سرور کا خیال ہے کہ علوم کے تراجم میں زبان یا زبانیں جاننے سے بھی مقدم اس علم سے واقفیت ہے (جس کے متن کا ترجمہ کیا جارہا ہے)۔ آگے وہ یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ ترقی اردو بورڈ کو خالص علمی کتابوں کے ترجمے میں پہلے موضوع کے ماہر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ترجمے کے معیار کو پرکھنے کے لیے ایک دوسرے ماہر کو کتاب دکھانا چاہیے جسے تراجم کا بھی تجربہ ہو۔ اس کے بعد ٹیکنکل اڈیٹر سے مدد لینا چاہیے جو نہ صرف یہ دیکھے کہ مواد کی ترتیب، اعداد و شمار، چارٹ وغیرہ درست ہیں (یہ جملہ ابہام کی نذر ہو گیا ہے)۔ آخر میں زبان کے ماہر کی نظر بھی ضروری ہے تاکہ ترجمہ زبان کی جینیس کے مطابق ہو اور الفاظ کی نشست اور جملوں کی ساخت اجنبی نہ معلوم ہو۔

میں بڑے ادب سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ترقی اردو بورڈ اور ملک کے دیگر تعلیمی اور علمی اداروں کے منصوبہ ہائے ترجمہ میں کم و بیش اسی اصول کو رہنما بنایا گیا تھا، خاصی تعداد میں تراجم یا تو ادھورے رہ گئے یا غیر معیاری ثابت ہوئے۔ مثلاً ایک کتاب کے ترجمے کے لیے موضوع کے ماہر کا انتخاب کیا گیا تو وہ ماہر ضرور تھا لیکن زبان نہیں جانتا تھا بلکہ اردو بولتا تھا اور دوسروں کو بولتے ہوئے سنتا تھا اور ہندی پڑھتا اور لکھتا تھا۔ اس ماہر نے وہ کتاب اپنے کسی شاگرد کے سپرد کر دی جس کا یونیورسٹی میں ایک مضمون اردو تھا۔ شاگرد کو اور بہت سے

کام تھے۔ ترجمہ شدہ مواد جمع کرنے کی مدت نکل گئی اور اس طرح وہ کتاب نامکمل رہ گئی۔ یہ تھی افراط وتفریط کی ایک مثال۔

چند یونیورسٹیوں میں اردو کے گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ نصاب میں ایک پرچہ ترجمے کا ہوتا ہے۔ اس پرچے کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے کہ طالبعلم کی ترجمے کے میدان میں ذہنی مشق کم سے کم ہو اور وہ ترجمے کی تاریخ، ترجمہ کیسے کریں اور ادبی یا علمی ترجمے کے مسائل کیا ہیں وغیرہ پر مشتمل مواد امتحان سے تقریباً ایک ماہ پہلے یاد کر لیں۔ انھیں معلوم رہتا ہے کہ پرچۂ امتحان میں اصل ترجمے سے متعلق صرف ایک ہی سوال آئے گا اس لیے عملی مشق میں وہ دلچسپی نہیں لیتے۔ اگر ترجمے کا پرچہ اختیار کرنے والے طلبا کو کسی مالی منفعت کی امید دلائی جائے تو شاید وہ اس طرف متوجہ ہوں۔

ترجمے مین پچھتر فیصد کام تو اس کا ہوتا ہے جس کی اسناد زبان میں ہوں اور جسے سرور صاحب نے ازراہ شفقت ماہر کہا ہے اور ترجمے کے پورے عمل میں چوتھے درجے پر رکھا ہے۔ ترجمہ طلب متن کی نوعیت سے قطع نظر ترجمہ ماہرِ زبان سے کرایا جائے۔ ترجمہ شدہ متن کا جائزہ یا ویٹنگ موضوع کے ماہر سے کرایا جائے جو یہ دیکھے گا کہ موضوع سے مخصوص اصطلاحات اور لفظیات کا استعمال ترجمے میں ہوا ہے یا نہیں۔ ان دو مراحل سے گزر کر پورا مواد نسبتاً زیادہ تجربہ کار ماہرِ زبان کے سپرد کیا جائے گا جسے جدید اصطلاح میں ریوازر یا مصلح کہتے ہیں اور جس کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ ادب ہو یا سائنس یا سماجی علوم، فن تعلیم ہو یا تربیتِ اساتذہ یا خصوصی تعلیم، فلسفہ ہو یا طب یا مذہبیات، اطلاعاتی ٹکنالوجی ہو یا ماحولیات یا تیل کی عالمی معیشت مذکورہ بالا ترتیب کو اختیار کر کے شاید ہم ہر میدان علم میں تضیع اوقات کے بغیر بہتر اور تشفی بخش تراجم پیش کر سکتے ہیں۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ علوم کے شاخ در شاخ ہونے کا سلسلہ وسیع ہوتا جائے گا۔ ہر موضوع کی مختلف ذیلی شاخوں کے لیے الگ الگ اختصاص یافتہ مترجمین دستیاب نہیں ہوں گے۔ اس لیے کوئی سائنسی اور حقیقت پسندانہ طریقۂ کار اختیار کرنا ہوگا۔

اردو کے حوالے سے اصطلاح وتراکیب سازی کے تئیں ہمارا دُہرا رویہ اردو کے حق

میں بہت مہلک ہے۔ ایک طبقہ خصوصاً اردو میں اسے تجزیاتی بنانے کی پر جوش وکالت کرتا ہے۔ اصطلاح سازی تو ایک تطبیقی یا ترکیبی عمل ہے جس کے لیے ہماری رسائی ان زبانوں کی مبادیات تک ہونی چاہیے جن سے اردو نے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ عربی اور فارسی کے ترکیبی مزاج سے واقفیت کے بغیر اردو میں اصطلاح سازی اسی طرح ناممکن ہے جس طرح لاطینی اور فرانسیسی اور سنسکرت سے واقفیت کے بغیر انگریزی اور ہندی میں، جس کی سیکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اردو میں اصطلاح سازی کو آسان تر بنانے پر اصرار کرنے والے حضرات ایسا کر کے اپنی کوتاہ علمی اور آسان طلبی کا جواز پیش کرتے ہیں۔ سائنسی اور علمی ترجمے کے تعلق سے یہ ایک غیر صحت مند رجحان پنپ رہا ہے کہ ایسے تراجم میں مقصد ادب پڑھانا نہیں ہے۔ اُن کی خدمت میں مؤدبانہ عرض ہے کہ متن کا تعلق خواہ کسی بھی میدان علم سے ہو زبان کی مروج ساخت کو مجروح نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ علم کا معیار گرتا ہے۔

فی زمانہ اچھے مترجم نہ تیار ہو پانے کا سبب ان عوامل میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ترجمے کا غیر معیاری پن اور اطمینان بخش مترجم کی نادستیابی دو الگ الگ باتیں ہیں۔ اگر دیگر مضامین کی طرح ترجمے میں بی اے آنرز اور اس سے آگے ایم اے کا نظم کیا جائے جس میں اطلاقی عنصر غالب ہو، کیونکہ ترجمیات یا مطالعات ترجمہ کے نام پر کئی بھرتی کے عناصر شامل کر دئے جاتے ہیں، تو کسی حد تک اس مسئلے کا سدِ باب ہو سکتا ہے۔

ترجمہ نگاری کے لیے درکار صلاحیت پر کپڑے کی صنعت کے 65 فیصد روئی اور 35 فیصد پالسٹر کی نسبت کے فارمولے کا اطلاق مناسب نہیں ہے۔ یہ فن اصل زبان اور ہدف زبان دونوں سے پورا انصاف چاہتا ہے۔ اس کے لیے عملی تربیت نہ صرف دو زبانوں کی قواعدی ساخت اور ان کے اسالیب بلکہ مختلف شعبہ ہائے علم کی تاریخ اور حال میں رونما ہونے والے مباحث اور علوم سے بھرپور واقفیت، ان کی لفظیات اور مخصوص واصطلاحات اور ان کے مسلسل مطالعے کا بھی تقاضہ کرتی ہے۔ اس لیے مترجم کو کسی بھی تعلیمی ادارے سے وابستہ کسی مخصوص مضمون کے استاد سے زیادہ باشعور اور مستعد بنائے جانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام کیسے انجام پائے گا اس کے لیے خاصی تعداد میں

ماہرین کو جمع کر کے ایک لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔

ہندی میں اور دنیا کی دیگر زبانوں میں اصطلاح وتراکیب سازی کا عمل جاری ہے۔ ہم اردو کی اصطلاحات وتراکیب کے صوتی تاثر کے تئیں اپنے ذاتی تحفظات سے اپنی حس لطیف کا تحفظ کم اور زبان کا نقصان زیادہ کرتے ہیں۔ اپنے لسانی سرمائے سے اگر ہم اصطلاحات وتراکیب اور محاورات کا حصہ حذف کر دیں تو ہمارے تمام جملے ابتری کی تصویر بن جائیں گے۔ ہندی کے اتباع کو مستحسن قرار دیتے ہوئے اس کے کئی سابقوں اور لاحقوں سے ہم تعمیری کام لے سکتے ہیں۔ ہندی کے بعد اردو کا براہ راست تعلق فارسی سے ہے یہ نہیں بھولنا چاہیے۔ اسلاف کے کارناموں پر نظر ثانی اس حقیقت کی روشنی میں کی جائے تو عربی آمیز تراکیب میں روانی لائی جاسکتی ہے۔ اگر ہم پہلے ہی ایسا کر لیتے تو غالباً، مثال کے طور پر، 'مقیاس الحرارۃ' کے بجائے 'حرارت پیما' ہماری زبان میں آج مستعمل ہوتا۔

تراکیب سازی کا ایک اہم گوشہ مماثلتی نمونوں یا پیٹرنز کی تشکیل ہے۔ اس کی چند مثالیں میں پیش کرنا چاہوں گا۔

ion- پر ختم ہونے والے انگریزی اسماء کے متبادلات کا قوم سے قومیانا کے محدود پیٹرن کے بجائے کرن کے متبادل لاحقے کی مدد سے مفتوح قیاسی نمونہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ جیسے 'قوم کاری'، 'آدرش کاری'، 'شہر کاری'، 'شجر کاری'، 'حسن کاری'، 'بند کاری' 'اصل کاری'، 'سرمایہ کاری'، 'پیوند کاری'۔

ed/en- کے لاحقے والے بعض الفاظ کے متبادلات ایک نمونے پر وضع کر سکتے ہیں جیسے:

Prepared/readymade تیار شدہ

Paid up ادائیگی شدہ

Oxidized تکسید شدہ

Sterilized تعقیم شدہ

Divorced طلاق شدہ

Separated علاحدگی یا خلع شدہ

Authorized مجاز شدہ

Registered اندراج شدہ

Rusticated اخراج شدہ

Discarded مسترد شدہ

Presented پیش کردہ

Forgotten فراموش کردہ

Written تحریر شدہ یا کردہ

خود اپنی زبان میں موجود نذیروں کو تلاش کر کے اور اصل زبان کے اصطلاحی الفاظ میں پنہاں تصور کی درست تفہیم پر توجہ دے کر اور الفاظ کے رنگ و آہنگ مثلاً ترقی اور فروغ کے فرق کو ملحوظ رکھ کر ہم اصطلاحات کے دیگر قیاسی نمونے یا پیٹرنز بھی قائم کر سکتے ہیں۔ انگریزی میں ایسی تراکیب ہیں کہ ان کا مستقل لفظ کی شکل کا لاحقہ اردو میں تابع لفظ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے شیر فروش (Milk seller)۔ اب اگر ہمیں Oil merchant کی متبادل ترکیب درکار ہے تو وہ ہو گی 'تیل فروش' یا 'روغن فروش'۔ اسی طرح غلہ فروش (Grain merchant) 'عمارتی سامان فروش' (Building material dealer)، 'سوختہ فروش' (Timber merchant) اور 'طعام فروش' (Caterer)۔

سخن شناسی اور نبض شناسی کی تمثیل پر درجنوں نئی تراکیب وضع کی جا سکتی ہیں مثلاً 'مامونیت شناسی' (Immunology) اور 'خاک شناسی' (Pedology)۔ اس کے علاوہ انگریزی کی کئی تراکیب میں دوسرا جز Fees یا Allowance ہوتا ہے جس کا ممکن متبادل 'معاوضہ' ہو گا۔

انگریزی میں ایسی تراکیب کی بھی کمی نہیں جن کا پہلا جز Women/Adult / Child ہو مثلاً تفویز نسواں (Women empowerment) استحصالِ اطفال (Child abuse)، نگہداشتِ بالغان (Adult care)

ہمارے علمی اور تعلیمی اداروں میں اصطلاح سازی اور ترجمے کی سرگرمی سے متعلق باہمی

معاونت اور کوآرڈینیشن کا فقدان ہے۔ ایسے کئی ادارے ہیں جو ماضی میں انجام پا چکے کاموں کا جائزہ لیے بغیر اس طرح کے کام میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ اس طرح تکرار اور عدم توازن کا قوی اندیشہ رہتا ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مختلف ادبی، تعلیمی، علمی، سائنسی اور صحافتی اصطلاحات کی فرہنگوں کو، جو کئی دہائیوں پہلے بن چکی ہیں اور جن کی تمام حلقوں میں پزیرائی ہوئی ہے، معیار بنا کر اصطلاح سازی کے کام کو آگے بڑھایا جائے اور ان میں ضروری اضافہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ این سی پی یو ایل کو ایک ڈائرکٹوریٹ کی حیثیت دیے جانے سے بھی اردو اور اردو ترجمہ نگاری دونوں کا فروغ ہوگا۔

○

حوالہ جات

1۔ تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل از پروفیسر آل احمد سرور مشمولہ ترجمے کا فن اور روایت از پروفیسر قمر رئیس، طبع ثانی، 2004، ص 43

2۔ ترجمہ اور لسانیات از پروفیسر نصیر احمد خان مشمولہ نفس مصدر، ص 127

3۔ اردو میں ترجمے کی روایت از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ مشمولہ نفس مصدر، ص 190

4۔ حوالہ ء مذکورہ از پروفیسر آل احمد سرور، نفس مصدر، ص 49

اردو کا تعلیمی اور انفوٹینمنٹ شعبوں میں رول

اکیسویں صدی میں اردو تعلیم کی صورتِ حال

(جامعات ہند کے حوالے سے)

پروفیسر ابن کنول

صدر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی 7

گزشتہ صدی میں ہندوستان کی سیاست میں ایک ایسا سانحہ پیش آیا کہ اس وسیع وعریض ملک کے ٹکڑے ہوگئے، جس کا خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا، جس سے مشترکہ گنگا جمنی تہذیب مجروح ہوگئی اور سب سے اہم بات یہ کہ جس کے بعد اردو زبان غیر ملکی سمجھی جانے لگی، شاہ جہاں آباد یعنی دلّی کے دروازے اس کے لیے بند ہونے لگے۔ شمالی اور وسطی ہندوستان میں اس کی یہ صورت حال ہوگئی کہ جیسے ہجرت کرنے والے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد کم ہونے لگی، آزادی سے قبل جن دانش گاہوں میں اردو کے شعبہ تھے وہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد محدود ہوگئی کہیں تعصب، کہیں وقت کی ضرورت کے پیش نظر اور کہیں مجبوراً اردو والوں کے بچے اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر دوسری زبانیں پڑھنے لگے یا پڑھنے کے لیے مجبور ہوئے۔ اپنے ہی گھر یا وطن

میں اردو مہاجر یعنی غیر ملکی بن گئی صرف اس سبب سے کہ ایک ایسے نئے ملک نے اسے اپنی سرکاری زبان بنالیا جہاں کے مقامی لوگوں کی زبان کچھ اور تھی۔ نئی بستی آباد ہونے اور سرکاری تحفظ کے باوجود بھی اردو وہاں کے گلی کوچوں کی زبان نہ بن سکی۔ اس لیے کہ اس کے گلی کوچے تو ہندوستان میں تھے جن میں خسرو اور ولی، میر اور غالب کی آوازیں محفوظ ہیں، انہی آوازوں کی بازگشت لوگوں کو مسحور کرتی رہی اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکیسویں صدی میں پھر اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا جن دانشگاہوں میں برائے نام اردو کے طلبہ ہوتے تھے وہاں کثیر تعداد میں طالب علم آنے لگے۔ بیسویں صدی کی آخری تین چار دہائیوں میں اردو تعلیم کی صورت حال تشویشناک تھی اور جسے دیکھ کر آزادی سے قبل پیدا ہونے والی نسل نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اردو ہمارے بعد ختم ہوجائے گی یا اس ملک میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ لیکن جس طرح تمام تعصبات کے باوجود تاج محل کی خوبصورتی کو دیکھنے اور تسلیم کرنے والوں کی تعداد کم نہیں ہوئی۔ اسی طرح اردو زبان کی شیرینی، نزاکت و لطافت کا اعتراف کرنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے تک بہت سی دانشگاہوں سے اردو کے شعبے ختم ہو گئے لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ بہت سے غیر اردو صوبوں میں اردو زبان کی تدریس کے نئے مراکز قائم ہو گئے۔ اور جن دانش گاہوں میں اردو زبان و ادب کی درس و تدریس کا شعبہ جاری رہا وہاں طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ مثلاً دہلی کی تینوں مرکزی جامعات میں آج سے تین چار دہائی پہلے اردو طالب علموں کی دسیوں درخواستیں آتی تھیں آج سینکڑوں کی تعداد میں آتی ہیں بعض افراد کو شکایت ہے کہ اردو بیشتر اسکولوں میں نہیں ہے، بے شک! زیادہ تر اسکولوں میں اردو نہیں ہے لیکن یہ بھی ایک سوال ہے کہ اگر اسکولی سطح پر اردو کی تعلیم نہیں ہے تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بچے کہاں سے اردو سیکھ کر آرہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو تعلیم کی صورت حال گذشتہ دہائیوں کے مقابلہ میں اکیسویں صدی میں بہتر ہوئی ہے، یہ اور بات ہے کہ آزادی کے قریب والی نسل کی زبان کا جو معیار تھا وہ آج نہیں ہے، یہ المیہ صرف اردو زبان کا نہیں دیگر زبانوں کا بھی ہے، آج وہ بچے جن کی خاندانی یا مادری زبان ہندی ہے، لکھنا پڑھنا تو دور کی بات ہندی بولنا بھی نہیں جانتے۔

ان باتوں کے باوجود مجھے یقین ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو کے فروغ میں جامعاتِ ہند اہم کردار ادا کریں گے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے چند اعداد و شمار پیش کرنا چاہوں گا۔ میرا تعلق شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی سے ہے، میں نے اس شعبہ میں تقریباً چار دہائیاں گزاری ہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی سے لے کر آج تک بڑی حد تک مجھے شعبہ کے معاملات کا علم ہے۔ دو دہائی قبل ایم۔ اے، ایم فل، پی۔ ایچ۔ ڈی اور دیگر کورسوں میں طلبہ کی تعداد بہت قلیل تھی لیکن اکیسویں صدی میں یہ صورت حال بہت بہتر ہوئی ہے۔ فی الوقت بڑی تعداد میں مذکورہ درجات میں داخلوں کے لیے درخواستیں موصول ہو رہی ہیں۔ امسال ایم۔ اے۔ کے لیے ایک سو چوبیس (124) بچوں نے فارم بھرے، ایم، فل۔ میں داخلے کے لیے ایک سو پچاس طلبہ نے تحریری داخلۂ امتحان میں شرکت کی اور ایک سو دو طالب علم پی ایچ ڈی میں داخلے کے خواہاں تھے۔ ان کے علاوہ ڈپلوما اِن ماس میڈیا اینڈ ٹرانسلیشن میں 36 طلبہ نے داخلہ لیا ہے۔ اردو سرٹیفکیٹ، ڈپلوما اور ایڈوانس ڈپلوما کے طلبہ کی تعداد کئی سو پر مشتمل ہے۔

دہلی یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں میں انڈر گریجویشن کی سطح پر بھی کافی تعداد میں داخلے ہوئے ہیں۔ یہی صورت حال جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اردو کی ہے۔ ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے داخلوں میں تعداد کی حد مقرر ہونے کے سبب بیشتر طلبہ داخلے سے محروم رہتے ہیں۔ دونوں جامعات میں ریسرچ اسکالرز کی بڑی تعداد موجود ہے۔ دہلی سے باہر دیگر جامعات میں اردو طلبہ کا اگر جائزہ لیں تو اردو تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد اطمینان بخش نظر آتی ہے کشمیر اور جموں کی یونیورسٹیوں کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہاں اردو کے سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے تعداد زیادہ ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے فاصلاتی نظام سے ایم۔ اے۔ کی سطح پر سینکڑوں کی تعداد میں طلبہ استفادہ کر رہے ہیں۔ جموں یونیورسٹی سے ہر سال بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالر تحقیقی مقالے جمع کرتے ہیں۔ اس صوبے کے کالجوں میں بھی اردو اساتذہ اور طلبہ کی خاصی تعداد ہے۔

اتر پردیش میں جہاں اردو تاریخ کی گذشتہ تین صدیاں بہت تابناک رہیں جہاں اردو کے نامور شعراء اور ادیب پیدا ہوئے، اردو کی حالت زیادہ بہتر نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا

جاسکتا کہ وہاں کے تعلیمی اداروں سے اردو غائب ہوگئی ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جسے اردو یونیورسٹی کا بھی نام دیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ وہاں ہر مضمون کے طالب علم کو اردو پڑھنا لازمی ہے۔مسلم یونیورسٹی میں اردو اساتذہ کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، ایم، اے۔سال اول دوم میں سو طلبہ ہیں۔ اور تقریباً اسی اسکالر پی۔ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھنے میں مصروف ہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور اس سے ملحقہ کالجوں میں بھی اردو طالب علموں کی تعداد کو اطمینان بخش کہا جاسکتا ہے۔تقریباً پچیس ریسرچ اسکالر ہیں اور سو ایم۔اے سال اوّل اور دوم میں ہیں۔ یہی صورت حال الٰہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے طالب علموں کی ہے۔ مذکورہ تینوں جامعات میں ایم۔اے، ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی سطح پر اردو طالب علموں کی تعداد دیگر زبانوں کی تعداد کے مقابلہ میں کمتر نظر نہیں آئی۔

اتر پردیش کی دوسری جامعات پر بھی اگر نظر ڈالیں تو اردو طلبہ کی تعداد کم نہیں ہے، اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے تقریباً ایک سو پچیس کالجوں کا الحاق ہے۔جن میں بی۔اے کی سطح پر تین ہزار کے قریب اردو پڑھنے والے طالب علم موجود ہیں۔ان میں دو سو سے تین سو تک ایم۔ اے۔ کی تعلیم بھی حاصل کررہے ہیں، اور بیس سے پچیس تک پی ایچ ڈی میں رجسٹرڈ ہیں۔گورکھپور یونیورسٹی سے ملحقہ ایک سو پانچ کالجوں میں سے بیشتر میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بی۔اے۔ کی سطح پر کئی ہزار اور ایم۔اے۔ میں کئی سو طلبہ موجود ہیں۔ یہاں پی۔ایچ۔ ڈی کے لیے بھی مقالے لکھے جارہے ہیں۔لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈیڑھ سو کے قریب طلبہ ایم اے کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ وہاں کے بیشتر کالجوں میں اردو ہے۔لکھنؤ کی دوسری نئی خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی میں اردو پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اسی طرح میرٹھ، آگرہ اور بریلی کی یونیورسٹیوں کا حال ہے۔

بہار کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم دیگر صوبوں سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ یہاں کی بیشتر یونیورسٹیوں میں ہر سطح پر اردو کی تعلیم اطمینان بخش کہی جاسکتی ہے۔پٹنہ، دربھنگہ، گیا، مگدھ اور مظفر پور کی یونیورسٹیوں میں خاصی تعداد میں طالب علم اردو پڑھ رہے ہیں۔ بہار کے طالب علموں کی بڑی تعداد دہلی اور دوسرے شہروں کی جامعات میں بھی زیر تعلیم ہے۔

جھارکھنڈ کی رانچی یونیورسٹی میں بھی ایم۔اے طلبہ کی تعداد 180 کے قریب ہے۔تقریباً پچاس طالب علم ریسرچ بھی کر رہے ہیں۔کلکتہ یونیورسٹی میں بھی ہر سال دس اسکالر پی ایچ ڈی میں آتے ہیں۔تیس ایم فل میں اور ساٹھ اور ستر کے قریب ایم اے سال اوّل دوم میں ہوتے ہیں۔بہار کے بعد مہاراشٹر کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں یہ صوبہ اہم کردار ادا کر رہا ہے۔اس صوبے کے بیشتر شہروں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کا انتظام نہ صرف بہتر ہے بلکہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد بھی قابل فخر ہے۔

ممبئی کے چھ کالجوں میں انڈر گریجویشن کی تعلیم کا انتظام ہے۔ممبئی یونیورسٹی میں مقررہ تعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر سال ایم۔اے سال اوّل میں پچاس طالب علموں کا داخلہ ہوتا ہے۔فی الوقت پی۔ایچ۔ڈی میں 26 اور ایم فل میں تیس اسکالر تحقیقی کام میں مصروف ہیں۔

حیدرآباد میں اگرچہ سینٹرل یونیورسٹی میں اردو طلبہ کی تعداد کم ہے اس کی وجہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی بھی ہے۔جہاں حیدرآباد یونیورسٹی کے مقابلے میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہے۔عثمانیہ یونیورسٹی میں بھی اردو کے طالب علم موجود ہیں۔

گذشتہ دہائی میں متعدد طالب علموں نے میسور یونیورسٹی اور مدراس یونیورسٹی سے بھی ایم۔اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔راجستھان کی بھی مختلف یونیورسٹیوں میں اردو کے طلبہ موجود ہیں جے پور، کوٹہ، اودے پور، جھالا واڑ، اجمیر، ٹونک، وغیرہ میں اردو کی تعلیم ہر سطح پر دی جارہی ہے۔پنجاب ایک زمانے میں اردو کا مرکز تھا اردو کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کا تعلق پنجاب سے تھا، امرت سر کی گرونانک دیو یونیورسٹی میں اگرچہ ایم۔اے اور پی ایچ ڈی میں کم طالب علم ہیں لیکن سرٹیفکیٹ کورس کے ذریعہ اردو سیکھنے والوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے یہی صورت پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، اور پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ میں ہے۔

یہ اعداد وشمار بیان کرنے کا میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اردو والوں کو مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔جامعات سے فارغ ہونے والے ان طلبہ کو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں روزگار بھی مل رہا ہے۔اردو ایسی صورت میں فروغ پارہی ہے یا زندہ ہے جبکہ پورے ملک میں

اس کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ برسوں میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ یہ بات اہم نہیں کہ کتنے جامعات ہند میں اردو کے شعبے ہیں۔ اردو شعبوں کی تعداد کو نظر انداز کیجیے۔ یہ دیکھیے کہ اس زبان اور اس کو زندہ رکھنے والوں میں حوصلہ کتنا ہے، کامیابیاں تعداد سے نہیں حوصلوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ جنگ بدر میں اگر مسلمان اپنی تعداد کو دیکھ کر ہمت ہار جاتے اسلام فروغ نہیں پاتا اور بابر اگر اپنی اور ابراہیم لودھی کی فوج کا موازنہ نہ کرتا تو ہندوستان میں مغلیہ حکومت قائم نہیں ہوتی۔ ہمارا حوصلہ اگر باقی رہے گا۔ تو یہ زبان زندہ رہے گی۔ اور فروغ پاتی رہے گی۔

○

ہندوستان میں اردو تعلیم کے احیا کے لیے وسیع تر جولان گاہوں کی تلاش

ڈاکٹر اطہر فاروقی

سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

ہر چند کہ ہندوستان میں اردو دانش وروں خصوصاً شمالی ہند کے اردو سیاست دانوں کے ذہن اردو تعلیم کے سیاق و سباق میں آج بھی جالوں سے بھرے پڑے ہیں مگر اردو معاشرے میں اس امر پر استصواب ہو چکا ہے کہ اردو تعلیم کا تحفظ صرف اور صرف اسکول کے نظام میں ممکن ہے اور اس کام کے لیے ذہن کے جالوں کو صاف کر کے ماضی سے مختلف خطوط یعنی اخبارات میں بیانات چھپوانے کی خواہش کو خیر باد کہہ کر عملی تحریک چلانی ہوگی۔

ہندوستان جیسے ملک میں مسلم لسانی اقلیت جیسے پسماندہ طبقے کی اکثریت کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ سرکاری اسکولوں کے سوا اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے کسی اور قابلِ عمل لائحۂ عمل کے ذریعے اردو تعلیم کے تباہ شدہ نظام کو استوار کر سکیں۔

یہاں میں مختصر دینی مدارس میں اردو تعلیم کے نظام کے بارے میں یہ عرض کرنا چاہتا

ہوں کہ دینی مدارس کے اپنے مقاصد ہیں اور اردو ادب ہمیشہ سے ہی مذہبی عمائدین کے لیے کفر سے مترادف رہا ہے۔ اشرف علی تھانوی نے بہشتی زیور میں ان ادبی کتابوں کی ایک پوری فہرست شائع کی ہے جن کا مطالعہ تھانوی صاحب کے مطابق مسلم عورتوں کو نہیں کرنا چاہیے۔ دینی مدارس کے نصاب میں چوں کہ اردو ادب شامل ہی نہیں ہوتا، اس لیے، وہاں کے قارئین کو اکثر صورتوں میں اردو ادب کے خلقیے اور اس کی سیکولر روایت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اردو ادب نے شروع سے ہی مذہب کے نام پر ہونے والی فروعات اور استحصال نیز واعظ اور ملّا کے کردار کی دورنگی کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھائی ہے، اس لیے، اگر دینی مدارس کے نصاب میں اردو ادب شامل بھی ہو گیا تو وہ مزید خلفشار کا سبب ہی بنے گا۔ اردو کی تو بات ہی چھوڑیے، مدارس کا چار سو برس پرانا نصاب ہی انقلابی تبدیلیوں کا متقاضی ہے، اس لیے، دینی مدارس سے اردو تعلیم کے احیا کے سلسلے میں کوئی توقع کرنا حکومت سے اسکول کے نظام میں اردو تعلیم کے نظم کی راہ ہموار کرنے کی کوششوں سے دامن بچانے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

ہمیں یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ دینی مدارس کے سیاق و سباق میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ دینی مدارس کے اپنے مقاصد تھے اور ہیں جو مذہب کے تحفظ اور مذہبی تعلیم سے جڑے ہوئے ہیں۔ تقسیم کے وقت علما کی بڑی تعداد کے پاکستان ہجرت کر جانے کی وجہ سے دینی مدارس کی سماجیات ہی تبدیل ہو گئی۔ دینی مدارس میں بھی ایسے ساتذہ کی تعداد کم سے کم رہ گئی جو عربی کے ذریعے درسِ نظامی پڑھا سکیں، اس لیے، اردو دینی مدارس کا ذریعۂ تعلیم بن گئی۔ دینی مدارس کے اساتذہ میں فارسی سے واقفیت رکھنے والوں کی تعداد بھی تقریباً معدوم ہو گئی۔ اب بڑے سے بڑے دینی مدارس کے اساتذہ فارسی سے کم و بیش ناواقف ہی ہیں۔

دینی مدارس نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر اردو رسم خط کے تحفظ میں تو اہم رول ادا کیا مگر اردو ادب کے فروغ کے لیے کچھ بھی اس لیے نہیں کیا کہ وہ ان کے ایجنڈے میں شامل ہی نہیں تھا۔ دینی مدارس سے اردو ادب کے فروغ کی توقع کرنا بھی بے جا ہی ہے۔ قدیم اردو معاشرہ جن صالح اقدار کا امین تھا اس کی تشکیل میں اردو اور فارسی ادب کا اہم رول تھا۔ تقسیم

کے بعد ہمارے معاشرے میں ادب کی جگہ مذہب نے لے لی یوں معاشرے کی نفسیاست ہی تبدیل ہوگئی۔

بالفرضِ محال اگر صوبائی حکومتیں اردو تعلیم کے نظم کے سلسلے میں کوئی پیش رفت کریں بھی تو ان کی رہ نمائی کون کرے گا؟ میرا ذہن اس سلسلے میں بالکل صاف ہے کہ اس کام میں صوبائی اردو اکادمیوں کو ملوث کیا جائے۔ ہر چند کہ صوبائی اردو اکادمیوں کو اس کا ابھی کوئی تجربہ نہیں اور وہ اپنے اپنے صوبوں میں اس اردو ادب کے فروغ کی دکان چلا کر اپنا وجود بچائے ہوئے ہیں جہاں اردو تعلیم کا کوئی نظم ہی نہیں، اس لیے، خراب سے خراب مسودے کو ہر صوبے کی اردو اکادمی اور بعض صوبوں میں دیگر سرکاری ادارے بھی مدد دینے کے لیے تیار رہتے ہیں مگر اشاعت کے بعد ان تخلیقی ادب کی کتابوں خصوصاً شاعری کے مجموعوں کو ان کے پست ترین معیار کی وجہ سے کوئی مفت میں پڑھنے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔

اردو تعلیم کے سلسلے میں دہلی اردو اکادمی کی مثال ہمارے سامنے ہے جس کے پاس اسکولوں کی تعلیم کے نظم کا کوئی مینڈیٹ نہیں مگر حکومتِ دہلی نے صوبے میں اردو تعلیم کے نظم خصوصاً اردو اساتذہ کے تقرر کی ذمے داری دہلی اردو اکادمی کے سپرد کر دی جس نے بدترین حالات میں اگر اس ذمے داری کو اپنے ذمے نہ لیا ہوتا تو دہلی کے اسکولوں میں اردو اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔ دہلی اردو اکادمی کے کارکنان اور آتے جاتے اراکین کو اسکول کی سطح پر تعلیم کے نظم کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر آہستہ آہستہ انھیں بات سمجھ میں آنی شروع ہوئی۔ یہی صورت دیگر اردو اکادمیوں کے سلسلے میں بھی ہوگی کہ اولاً وہ غلطی پہ غلطی کریں گے اور اردو کے مقامی اردو سیاست داں ذاتی مفادات کے سلسلے میں رائی کا پہاڑ بنائیں گے مگر بادشاہ تو تجزیہ ہی ہوتا ہے، اس لیے، نہ صرف صوبائی اردو اکادمیاں اسکول کی سطح پر نہ صرف اردو تعلیم کے احیا کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں سے واقف ہو جائیں گے بلکہ اگر اردو دنیا نے صوبائی حکومتوں کو دباؤ میں لے لیا تو آخرش اردو اکادمیوں کو اپنے اپنے صوبوں کے اسکولوں میں اردو تعلیم کے لیے nodal agency بنایا جا سکتا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں جب خود اردو والے اردو تعلیم کے متعلقات سے قطعاً ناواقف

ہیں، صوبائی حکومتوں سے اسکولوں میں اردو تعلیم کا احیا کرنے کی امید کرنا انتہائی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اسکولوں میں اردو تعلیم کے بغیر اردو کا احیا ممکن نہیں مگر اس کام کو کرنے کے لیے ادارے موجود ہی نہیں، ایسے میں جو موجود ہے اس سے کام چلانے کے سوا چارہ نہیں اور صوبوں میں اردو اکادمیاں، جن کا نظام کتنا ہی ناکارہ کیوں نہ ہو، سرِ دست وہ واحد ادارے ہیں، جنھیں اسکولوں میں اردو تعلیم کے احیا کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر اردو اکادمیاں اپنے اپنے صوبوں میں اردو تعلیم کے ذمے داری کیسے سنبھالیں، اس کے لیے قومی اردو کونسل کو ان کی ایک میٹنگ جلد از منعقد کرنی چاہیے۔

○

فاصلاتی تعلیم بذریعہ اردو میڈیم

(اکیسویں صدی کے تناظر میں)

ڈاکٹر محمد احسن

ریجنل ڈائرکٹر، ریجنل سینٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بھوپال

ہندوستان کو آزاد ہوئے نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے کسی ملک یا قوموں کی زندگی میں 67 سال کی مدت کم نہیں ہوتی۔ اس نصف صدی نے جہاں ہمیں محرومی کی داستانیں دی ہیں، وہیں ہم نے بہت کچھ پایا بھی ہے۔ ہم نے جو کچھ پایا ہے ان میں سب سے اہم چیز تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں تعلیم کا طریقۂ کار، اس کی ترسیل کا مکینزم، اعلیٰ تعلیم میں تبدیلی وغیرہ کی رفتار دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے سست رو رہی ہے۔ اس کی وجہ حصول تعلیم کا وہ نظام ہے جو اپنے نقطہ نظر کی رو سے Elitist ہے کیوں کہ یہ نظام طبقہ اشرافیہ اور حکمراں طبقہ کو ذہن میں رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ اس وقت تعلیم کا دائرہ محدود تھا، عوامی تعلیم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ خوش قسمت اور اونچی ذات سے تعلق رکھنے والے چند ہی لوگ تھے جو اس نظام تعلیم کا فائدہ اٹھا سکتے تھے، لیکن دوسری جنگ عظیم

کے بعد عالمی سطح پر اعلیٰ تعلیم کے طریقۂ کار اور حصول و ترسیل کے میدان میں بڑے پیمانے پر تبدیلی رونما ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کا نظام، جہاں پہلے صرف طبقۂ اشرافیہ کی رسائی تھی وہ عوام تک پہنچنے لگی۔ نتیجے کے طور پر تعلیم کے میدان میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم جو پہلے صرف بارسوخ دولت مند افراد تک ہی محدود تھی اس کا دائرہ کار وسیع ہوا اور عوام کو بھی اس سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ جمہوریت کا عمل دخل طرز حکومت کے ساتھ ساتھ طرز زندگی میں بھی بڑھا تو تعلیم کے حصول کے رجحان میں مزید پیش رفت ہوئی۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی تعلیمی صورت حال میں کافی مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ملک کی شرح خواندگی جو 1951 میں 18.3 فیصد تھی وہ 2011 میں بڑھ کر 74.4 فیصد ہوگئی۔ نتیجتاً یہاں ہر سطح پر تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

اس وقت ہندوستان اطلاعاتی اور ٹیلی مواصلاتی ٹکنالوجی، ایٹمی سائنس، بایوٹکنالوجی اور لونر سائنس کے علاوہ کئی دیگر سائنسی میدانوں میں صف اول کے ممالک میں شامل ہے۔ لیکن ان تمام ترقیات اور حصولیابیوں کے باوجود ہم اپنے ملک کی ناخواندگی کا خاتمہ اور سب کو یکساں تعلیم مہیا کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ہمارا روایتی تعلیمی نظام ضرورت کے لحاظ سے دور از کار اور ناکافی ثابت ہونے لگا تو طلبا کی کثیر تعداد کے لیے ایک نیا فاصلاتی تعلیمی نظام متبادل کے طور پر ابھرا۔ اس تعلیمی نظام میں یہ گنجائش تھی کہ ہر خاص و عام بغیر کسی رکاوٹ یا دشواری کی اپنی سہولتوں اور ضرورتوں کے مطابق تعلیم حاصل کر سکے۔ عالمی سطح پر اعلیٰ تعلیم جو پہلے بنیادی طور پر کالج / یونیورسٹی مرکوز ہدایتی نظام تھا اس کی جگہ طلبہ پر مرکوز Learner Centred Integrated Network Model نے لے لی۔ تاکہ طلبہ کے نصابی مسائل کا حل ممکن ہو، نیز انھیں سیکھنے کے وسائل تک رسائی حاصل ہو۔

ہندوستان کا اعلیٰ تعلیمی نظام چین اور امریکہ کے بعد تیسرا بڑا اعلیٰ نظام تعلیم ہے۔ آزادی کے وقت ہمارے یہاں اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نام پر 20 یونیورسٹیاں اور 591 کالج تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں اس وقت صرف 20 لاکھ طلبہ کا اندراج تھا۔ لیکن آزادی کے بعد بنیادی سہولتوں اور اداروں کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا۔ گذشتہ برسوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اچھی

تعداد میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ 12-2011 کی رپورٹ کے مطابق فی الوقت ہندوستان میں 659 یونیورسٹیاں (بشمول 43 مرکزی، 130 ڈیمڈ یونیورسٹی، 345 ریاستی اور 5 خصوصی سطح کے ادارے) 33.023 کالج، 90 پرائیوٹ یونیورسٹیاں اور پانچ خصوصی سطح کے مرکزی تعلیمی ادارے اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کے لیے قائم کئے جا چکے ہیں۔(حوالہ XII (EI Higher Education in India FICCI and Beyond 17-Five Year Plan 2012

اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تعداد میں اضافے کے باوجود بھی ہمارا روایتی تعلیمی نظام ضرورت کے لحاظ سے ابھی بھی ناکافی ہے۔ کیونکہ یہ تمام کالج اور یونیورسٹیاں مل کر بھی تمام خواہش مند طلبا کو داخلہ دینے میں ناکام ہیں۔ اس طرح موجودہ دستیاب تعلیمی انفرااسٹرکچر سے ہمارا تعلیمی نظام اپنے متعلقہ گروپ کے صرف 10 فیصد نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم فراہم کر پا رہا ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو ایک درخشاں مستقبل دکھائی پڑتا ہے۔ فی الوقت ہندوستان میں 14 یونیورسٹیاں ایسی ہیں جو صرف فاصلاتی طرز پر تعلیم فراہم کرتی ہیں۔ ان میں ایک قومی سطح کی اور 13 ریاستی سطح کی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کے نام، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، وردھمان مہاویر اوپن یونیورسٹی نالندہ اوپن یونیورسٹی، یشونت راؤ چوہان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی، مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی، کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، نیتا جی سبھاش اوپن یونیورسٹی، یو۔ پی۔ راج رشی ٹنڈن اوپن یونیورسٹی، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، احمدآباد، تمل ناڈو اوپن یونیورسٹی، پنڈت سندرلال شرما اوپن یونیورسٹی، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی اور کے۔ کے۔ ہانڈیک اسٹیٹ یونیورسٹی ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً 150 سے زیادہ نظامت فاصلاتی تعلیم کے مراکز اور اسکول و ہائر سیکنڈری سطح کی تعلیم کے لیے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اوپن اسکول (NIOS) اور لینگویج ٹیچنگ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL)، نئی دہلی جیسے ادارے کام کر رہے ہیں۔ مختلف ریاستوں نے بھی اپنے اپنے علاقوں میں ہائر سیکنڈری سطح کے فاصلاتی نصاب متعارف کر رکھے ہیں جس کی وجہ سے سیکنڈری سطح پر فاصلاتی نظامِ تعلیم مقبول ہو رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم و پیشہ وارانہ اور غیر پیشہ وارانہ

تعلیم کے فروغ میں فاصلاتی نظام طرز کے ان اداروں کا بہت اہم کردار ہے۔لیکن یہ تمام ادارے اردو ذریعہ تعلیم کی سہولت فراہم نہیں کرتے البتہ ان میں سے کچھ ادارے اردو یا تو مضمون کی حیثیت سے یا کچھ چنندہ پروگرام/کورس اردو میڈیم کے ذریعہ فراہم کرتے ہیں۔

ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کا آغاز باضابطہ طور پر کچھ برسوں پہلے شروع ہوا دراصل اعلیٰ سطح پر فاصلاتی تعلیم جسے پہلے عام زبان میں مراسلاتی کورس کہا جاتا تھا، کا آغاز دہلی یونیورسٹی سے1962 میں ہوا۔ اس کے بعد اوپن اور فاصلاتی نظام تعلیم (Open and Distance Learning) کا بتدریج فروغ ہوتا رہا۔اس طرح1980 کی دہائی میں ہی فاصلاتی تعلیم کے لیے مختص بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستان کے اس منفرد تعلیمی ادارے نے پہلی بار 'تعلیم آپ کے دروازے پر' کا نعرہ دیا اور اسے اپنا نصب العین بنایا۔

فاصلاتی طرز پر اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم فراہم کرنے والے اہم اداروں میں، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اوپن اسکول (NIOS) اور لینگویج ٹیچنگ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو کے نام سرفہرست ہیں۔ گذشتہ برس سے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی بھی اردو میڈیم سے گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ سطح کے کچھ مخصوص کورسیز فراہم کر رہی ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کیوں کہ اگنو دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ 10-12 برسوں سے قومی اردو کونسل بھی اوپن اور فاصلاتی نظام کے تحت اردو اور عربی لینگویج ٹیچنگ سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورس ملک بھر میں پھیلے اپنے کمپیوٹر مراکز کے ذریعہ بخوبی چلا رہی ہے جس سے ہر برس ہزاروں لوگ مستفیض ہو رہے ہیں۔غیر اردو داں کے درمیان اردو زبان کے فروغ میں کونسل کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج طلبہ کی ایک کثیر تعداد فاصلاتی اداروں سے مستفید ہو رہی ہے۔ کچھ ایسے طلبہ بھی ہیں جو روایتی کورسوں کے ساتھ فاصلاتی طرز میں بھی اپنا پسندیدہ اور ضرورت کے لحاظ سے کورس کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل میں ان اداروں کی فہرست دی جا رہی ہے جہاں اردو میڈیم فاصلاتی طرز پر، مکمل یا جزوی طور سے، مختلف کورسیز دستیاب ہیں۔ ان اعداد و شمار سے فاصلاتی کورس کی وسعت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مختلف یونیورسٹیوں/ اداروں میں اردو میڈیم فاصلاتی تعلیم کے کورسوں کی تفصیل

نمبر شمار	یونیورسٹی / اداروں کے نام	ڈپلومہ/ سرٹیفکٹ کورس	انڈر گریجویٹ	پوسٹ گریجویٹ	دیگر
1	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی		بی اے آنرس	ایم اے اردو	
2	ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی		بی اے، بی کام		پی ایچ ڈی اردو
3	بہار یونیورسٹی		بی اے، "بی کام"	ایم اے اردو، سماجیات، 'سیاسیات'، تاریخ'	
4	اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی		بی اے،		
5	جامعہ ملیہ اسلامیہ		بی اے"، بی ایڈ"		
6	للت نارائن متھلا یونیورسٹی		بی اے"	ایم اے اردو، سماجیات "، سیاسیات، "تاریخ"	
7	مدراس یونیورسٹی			ایم اے اردو	
8	مگدھ یونیورسٹی		بی اے"	ایم اے اردو، سماجیات "، سیاسیات، "تاریخ"	
9	مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	ڈپلومہ۔ فنکشنل انگلش، ٹورزم منجمنٹ، جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن، میچ انگلش، سرٹیفکٹ فوڈ اینڈ نیوٹریشن، اردو	بی اے، بی ایس سی، بی کام	ایم اے اردو، تاریخ، اسلامیات،	
10	نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان	ڈپلومہ فنکشنل عربک، اردو			

11	نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ				2 Level Comp & IT.Paramedical.Home Science.Primary Teachers Training. Hospitality Course
12	نالندہ اوپن یونیورسٹی			ایم اے اردو، سماجیات"،سیاسیات" رورل ڈیولپمنٹ"	
13	عثمانیہ یونیورسٹی			ایم اے اردو، سماجیات"	
14	پٹنہ یونیورسٹی		بی اے"		
15	کشمیر یونیورسٹی		بی اے"،بی ایڈ"	ایم اے اردو، ایم اے ایجوکیشن"	
16	یشونت راو چوہان مہا راشٹرا اوپن یونیورسٹی		بی اے،بی کام		

"طلبہ کو اردو میڈیم سے لکھنے کی اجازت حاصل ہے۔البتہ اردو میں کتابیں/ اسباق (SIMs) فراہم نہیں کی جاتی۔

مندرجہ بالا اعداد وشمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو فاصلاتی طریقہ تعلیم کے ذریعے تقریباً 16 سے زائد یونیورسٹیوں اور اداروں میں اردو کی تدریس کا انتظام ہے جن میں کچھ یونیورسٹیوں میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ، دونوں سطحوں پر اردو میڈیم سے تدریس کا نظم ہے۔ کچھ میں صرف انڈر گریجویٹ اور کچھ میں صرف پوسٹ گریجویٹ کی سطح تک۔ان میں سے کچھ ایسی بھی یونیورسٹیاں ہیں جو مختلف کورسز اردو میڈیم میں اسباق ومواد (SIMs) کے ساتھ اور کچھ اردو میں مواد اور اسباق (SIMs) فراہم کئے بغیر طلبہ کو اردو میڈیم

میں لکھنے کی اجازت دیتی ہیں۔ فاصلاتی طرز (Distance Mode) کی یونیورسٹیوں کے علاوہ جن روایتی یونیورسٹیوں (Campus Mode) میں پوسٹ گریجویٹ یعنی ایم اے اردو کا بذریعۂ فاصلاتی تعلیم انتظام ہے ان کی تعداد تقریباً 10 ہے۔ ان میں کشمیر یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی مظفر پور، للت نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد، مدراس یونیورسٹی، مگدھ یونیورسٹی وغیرہ اور جن یونیورسٹیوں میں انڈر گریجویٹ اردو تعلیم کا بذریعہ فاصلاتی تعلیم انتظام ہے۔ ان میں پٹنہ یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، اتکل یونیورسٹی، کیرالا یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، للت نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ، مگدھ یونیورسٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک اردو میڈیم کا سوال ہے تو انڈر گریجویٹ کورسز میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی اور بہار کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو میڈیم کی سہولت حاصل ہے۔

اردو میڈیم فاصلاتی تعلیم ہندوستان کے علاوہ برِ صغیر کے متعدد تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم کی زبان ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کا شمار جدید فاصلاتی تعلیمی اداروں میں سرفہرست ہے۔ اس کا قیام 1974 میں ہوا تھا یہ ایشیا کی سب سے پہلی اردو میڈیم اوپن یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کے سبھی کورسوں کا میڈیم اردو ہے۔ یہاں ایک ہزار سے زائد کورسز اردو میڈیم کے ذریعے فراہم کیے جا رہے ہیں۔ ان میں تمام موضوعات/ پروگرامس شامل ہیں۔ یہاں تعلیمی پروگراموں کو مختلف زمروں اور گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً بین الاقوامی تجارتی گروپ (International Marketing Group)، مطالعہ آبادی گروپ (Population Studies Group)، زبان و ادب گروپ (Language and Literature Group)، ترسیل عامہ گروپ (Mass Communication)، اسلامی مطالعہ گروپ (Islamic Studies Group)، سماجی سائنس گروپ (Social Science Group)، وغیرہ۔ یہ سارے گروپ انڈر گریجویٹ پروگرام کے تین سالہ کورس اور پوسٹ گریجویٹ کے دو سالہ کورسز پر مشتمل ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں فاصلاتی طرز پر ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم یعنی پی۔ ایچ۔ ڈی تک کا انتظام

اردو میڈیم سے ہے۔اس ادارے نے بیرونی ممالک میں خاص طور سے خلیجی اور مشرقی وسطیٰ کے ممالک میں اپنے ریجنل اور اسٹڈی سینٹر قائم کیے ہیں۔

کسی یونیورسٹی کی تشکیل کا کام بلاشبہ مشکل مرحلہ ہے لیکن اس میں بھی دشوار کن کام کسی زبان کی یونیورسٹی کی تشکیل ہے۔ وہ زبان خواہ اردو ہندی یا کوئی اور علاقائی زبان ہو، سبھی کے ساتھ نصابی مواد کی فراہمی اور ترجمے کے مسائل دامن گیر ہوتے ہیں۔ زبان جب تک وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوگی تو زندہ نہیں رہ سکتی ہے اور کوئی محض ادب وشاعری کی بنیاد پر آگے نہیں بڑھتی بلکہ اس کی بنیاد علمی ہوتی ہے۔ جو قومیں علمی بنیاد پر جتنی ترقی یافتہ ہیں ان کی زبان دوسری زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔دوسری طرف ذریعہ تعلیم کی زبان اور عام زبان میں قدرے فرق ہوتا ہے۔ذریعہ تعلیم ایک علمی زبان ہوتی ہے جس میں ہر فن سے متعلق اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں، جو کسی بھی مضمون کو بڑی تشریحات سے بچاتی ہیں۔اور اس طرح سے وہ مخصوص اصطلاحیں اپنے فن کی نمائندگی کرتی ہیں۔

فاصلاتی طرز پر اردو میڈیم سے نئے کورسیز کے آغاز میں سب سے بڑی دشواری اردو میں درسی مواد کی منتقلی ہے۔ اکثر مضامین کی کتابیں اردو میں دستیاب نہیں۔ اس لیے ان مضامین کو انگریزی یا ہندی سے ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ترجمہ کرنے کے لیے لازمی ہے کہ مترجم اپنے مضمون کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی ماہر ہو۔ترجمے کے لیے ایسے افراد کی بڑی کمی ہے جو مواد کی اصل زبان، اردو زبان اور متعلقہ مضمون پر بیک وقت دسترس رکھتے ہوں۔ سائنس، ٹکنالوجی، تحقیق، کمپیوٹر، ترسیل، زراعت، صنعت، سماجی علوم وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم کی درسی کتب کا فقدان ہے یا یہ سرے سے دستیاب ہی نہیں ہے۔ان مضامین کے مترجمین خال خال ہیں۔اس طرح درسی مواد کی تیاری میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔

مواد کی تیاری سے منسلک ایک چنوتی یہ بھی ہے کہ اس کی ترتیب کے وقت ٹارگیٹ گروپ کی سہولتوں کا دھیان رکھنا بھی لازمی ہوتا ہے تاکہ مواد کو سہل اور آسان بنایا جاسکے۔اس طرح ترجمے کا کام اور بھی دشوار کن ہوجاتا ہے۔ اردو فاصلاتی طرز تعلیم میں اردو میڈیم نصاب ترتیب دینا سب سے بڑا چیلینج ہے۔ کیونکہ مواد کی نوعیت اور اس کی پیشکش کے انداز پر اس نظام تعلیم کے طلبا کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسرے علوم کی اردو میں منتقلی ایک دشوار ترین عمل ہے۔مگر اس کے بغیر

اردو میں فاصلاتی تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔اس لیے ترجمے پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اردو میڈیم سے پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدارس کا رخ کرتی ہے۔ مدرسوں میں تعلیم پانے والے بچے ان سہولیات سے محروم رہتے ہیں جن کے توسط سے روزگار پر مبنی جدید تعلیم کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ یہی موقف عورتوں اور دیہی علاقوں کے بچوں کے لیے بھی صادق آتا ہے۔متوسط اور پسماندہ طبقات کے بچوں کی تعلیمی ضروریات اعلیٰ طبقہ کے بچوں کے مقابلے مختلف ہوتی ہیں۔متوسط اور پسماندہ سماج کے وہ طبقات ہیں جنھیں روزگار پر مبنی تعلیم کے لیے بطور خاص ہدف بنانے کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی کے اکیڈمک پیکج / پروگرام اردو آبادی کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اور ان کے پیشہ وارانہ مہارتوں کو ذہن میں رکھ کر مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے ٹارگیٹ گروپ کو بھرپور فائدہ مل سکے۔ نیز مستقبل میں اردو میڈیم کورس فراہم کرنے والے تعلیمی اداروں کو بدلتے ہوئے قومی وسماجی ضروریات کے پیشِ نظر نئے پروگرام بھی تشکیل دینے ہوں گے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں فاصلاتی نظام تعلیم کی مختلف رکاوٹوں اور دیگر مالی واقتصادی بندشوں کا ایک بہتر متبادل ہے۔ نیز ذرائع ابلاغ کی نئی تکنیکوں کی آمد سے تعلیم کے پھیلاؤ میں ایک بڑا انقلاب آیا ہے اور آج دنیا کی تمام یونیورسٹیاں خواہ وہ فاصلاتی تعلیم (Open and Distance Learning) یا رسمی نظامِ تعلیم (Conventional Mode of Learning) کی ہوں، نئی ابلاغیاتی تکنیکوں سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میڈیم سے پڑھنے والے بھی جدید ٹکنالوجی کے سہولیات سے بخوبی فائدہ اٹھائیں۔موجودہ دور میں وہی زبانیں اپنا وجود بنائے رکھ سکتی ہیں جو بازار کی طاقتوں سے مقابلہ اور مانگ کو پورا کرسکیں۔ چونکہ اردو صرف برِصغیر تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ عالمی سطح پر اس کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔اس لیے اردو میڈیم کے طلبہ کو بھی موجودہ چنوتیوں کا مقابلہ کرنے لائق بنایا جائے جس کی بدولت عالمی مارکیٹ میں اردو والے بھی اپنا حصہ حاصل کرسکیں۔

○

مشترکہ آندھرا پردیش میں اردو ڈراما اور فلم کا فروغ

پروفیسر مظفر علی شہ میری

صدر شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد

2/جون 2014 کو صوبۂ آندھرا پردیش، دو مختلف صوبوں؛ تلنگانہ اور آندھرا پردیش میں تقسیم ہو گیا۔ نتیجہ میں سابقہ آندھرا پردیش کے 23 اضلاع میں سے 10 تلنگانہ کے اور 13 اضلاع آندھرا کے حصے میں آئے۔ سرِ دست شہرِ حیدرآباد دونوں صوبوں کا دارالحکومت ہے۔ دونوں نئی حکومتوں نے فروغِ اردو کے لیے بڑے بڑے وعدے کیے ہیں۔ یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے کہ تلنگانہ سرکار نے اپنے لوگو (Logo) میں اردو کو شامل کیا ہے۔ اس سے اردو کے لیے حکومت کی حمایت کا صاف اعلان ہوتا ہے۔ اُدھر آندھرا پردیش کے چیف منسٹر چندرابابو نائیڈو نے ایک نئی اردو یونی ورسٹی اور ایک نئی اردو اکاڈمی کا اعلان کیا ہے۔ ان سارے اعلانات سے یہ اُمید بندھتی ہے کہ دونوں حکومتیں اردو کے معاملے میں سنجیدہ ہیں۔

جہاں تک اردو تعلیم اور زبان و ادب کے فروغ کا سوال ہے، وہ تلنگانہ کے چھ اضلاع، شہرِ حیدرآباد، محبوب نگر، نظام آباد، عادل آباد، کریم نگر اور ورنگل میں اطمینان بخش ہے۔ یہ دعویٰ

تو نہیں کیا جا سکتا کہ تلنگانہ میں اردو زبان وادب کی وہی صورتِ حال ہے، جو آج سے دو یا تین دہائیوں پہلے تھی، تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اردو کے تعلق سے نا اُمید ہونے کی ضرورت نہیں۔ تلنگانہ کی چار جامعات ؛ عثمانیہ یونی ورسٹی، سینٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد، مولانا آزاد قومی اردو یونی ورسٹی کے علاوہ کریم نگر کی ساتا واہنا یونی ورسٹی میں اردو تعلیم اور اردو تحقیق مختلف سمتوں میں ترقی کر رہی ہیں اور یہاں کے کئی اسکولوں اور کالجوں میں اردو بطور ایک مضمون کے پڑھائی جاتی ہے۔ اچھی بات یہ بھی ہے کہ حیدرآباد کے بعض کانونٹوں میں اردو تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ ان اداروں میں اردو زبان وادب کے علاوہ اردو ثقافت بھی فروغ پا رہی ہے۔ خاطر نشین رہے کہ دینی مدارس میں اردو کی ترقی اس سے الگ ہے۔

صوبۂ آندھرا پردیش دو بڑے علاقوں میں منقسم ہے ؛ آندھرا اور رائل سیما۔ آندھرا ساحلی علاقہ ہے جو مشرق میں اور رائل سیما جنوب میں واقع ہے۔ آندھرا کے 9 اضلاع ؛ سری کاکولم، وجے نگر، وشاکھا پٹنم، مشرقی گوداوری، مغربی گوداوری، کرشنا، گنٹور، پرکاشم اور نیلور خالص تلگو علاقے ہیں۔ یہاں اردو کم بولی جاتی ہے اور جو لوگ بولتے ہیں وہ بھی تلگو آمیز اردو بولتے ہیں، جس کا لسانی مطالعہ اردو کے ایک علاحدہ علاقائی روپ کو سامنے لاتا ہے۔ البتہ کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں کسی حد تک صاف اردو بولی جاتی ہے مثلاً نیلور اور گنٹور وغیرہ۔ یہاں اردو زبان وادب کی ترقی ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔ رائل سیما کا علاقہ چار اضلاع ؛ کرنول، کڑپہ، اننت پور اور چتور پر مشتمل ہے، جہاں اردو کی کافی ترقی ہو رہی ہے۔ ہر چند یہاں کی عام زبان تلگو ہے مگر اردو بولنے والوں کی ایک کثیر آبادی یہاں بستی ہے۔ اس وقت کرنول میں 35 ؍فی صد، کڑپہ اور اننت پور میں 20 ؍فی صد اور چتور میں 15 ؍فی صد عوام اردو بولتے ہیں۔ بایں وجہ یہاں آندھرا پردیش کے مقابلے میں اردو کی ترقی حوصلہ افزا ہے۔ سری وینکیٹیسورا یونی ورسٹی، تروپتی کے شعبے نے اردو زبان وادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ کڑپہ اور اننت پور کے کئی کالجوں میں ڈگری کی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ ہائی اسکولوں میں اردو ایک زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے اور خالص اردو کے کئی اسکول ہونے کے باوصف بعض تلگو اور انگریزی اسکولوں اور کانونٹوں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔

دونوں صوبوں میں اردو زبان وادب اور ثقافت کی صورت حال کو تمہید ا جاننے کے بعد آیئے اب ہم مشترکہ آندھرا پردیش میں اردو ڈرامے کے فروغ کا مطالعہ کریں۔ پہلے تلنگانہ۔

پروفیسر تاتارخان نے اپنے مضمون ''حیدرآباد میں اردو ڈراما اور تھیٹر'' میں جو معلومات فراہم کی ہیں اُس کے اہم نکات کچھ اس طرح ہیں۔ حیدرآباد میں پہلا ڈراما امانت کا ''اندرسبھا'' بیسویں صدی کے پہلے دہائی میں کھیلا گیا۔ ڈرامے کے شوقین نواب حمزہ حسین مدنی نے اس ڈرامے کو پیش کیا تھا جسے اہلِ حیدرآباد بہت شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ نواب صاحب نے بعد ازاں 1917-1918 میں ''دی مون پارسی تھیٹریکل کمپنی'' قائم کی جس نے 1940 تک کئی اردو ڈرامے پیش کیے۔ نواب مدنی نے آغا حشر کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی جسے اُنھوں نے قبول کرلیا۔ وہ یہاں آئے اور اپنے کچھ ڈرامے پیش کرکے حیدرآباد کے اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ دوسری کمپنیوں میں ''ماسٹر رحیم شاہ کی Domanion Theatre مانک لال کی Excelliar Theatre سیٹھ رگھوناتھ مل کی The Mahavir Photo Plays and Theatre Ltd اور منجو قمر کی Jublee Theatre وغیرہ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں''۔ (حیدرآباد میں اردو ڈراما اور تھیٹر ص 149) ان کمپنیوں نے عصری ٹکنالوجی کا استعمال کرکے اردو ڈرامے میں چار چاند لگادیے۔

ڈرامے کا شوق جب عثمانیہ یونی ورسٹی کے طلبہ میں پیدا ہوا تو اُنھوں نے ایک بزم، ''بزمِ تمثیل'' کے نام سے ترتیب دی اور ڈرامے پیش کرنے لگے۔ اس بزم کا یادگار ڈراما ''ہوش کے ناخن'' تھا جو جارج برنارڈ شاہ کے ڈرامے Vide Door House کا اردو ترجمہ تھا۔ اس ڈرامے میں مخدوم محی الدین نے ڈراما نگاری، ہدایت کاری اور اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ خاص بات اس ڈرامے کی یہ بھی تھی کہ اسے دیکھنے والوں میں سر اکبر حیدری، رابندر ناتھ ٹیگور اور سروجنی نائیڈو جیسی اہلِ نظر ہستیاں موجود تھیں۔ ڈرامے کے بعد رابندر ناتھ ٹیگور نے مخدوم محی الدین کو شانتی نکیتن آنے کی دعوت دی تھی۔ اس ڈرامے کی مقبولیت کا اثر ایسا پڑا کہ حیدرآباد میں اردو ڈراموں کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ (ایضاً ص 150) حیدرآباد میں اردو ڈرامے کے پنپنے کے اسباب میں ایک سبب بڑی اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ کہ اس

کے ناظرین اور معاونین میں شہزادے، شہزادیاں، مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری وغیرہ شامل تھے۔ ایک آدھ شو میں مولانا شوکت علی اور حضرت خواجہ حسن نظامی نے بھی شرکت کی تھی۔ ظاہر ہے اس طرح ڈرامانگاروں کے حوصلے بلند ہی ہونے تھے۔

حیدرآباد میں اردو ڈرامے کے فروغ میں منجو قمر کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ ایک نہایت ہی شریف اور سادہ مزاج انسان تھے جنھیں اداکاری کے علاوہ موسیقی اور رقص سے بھی دلچسپی تھی۔ انھوں نے ایک بزم بزم اداکاری' قائم کی تھی۔ اس بزم نے حیدرآباد میں کئی ڈرامے پیش کیے تھے۔ اُن کے چند اہم ڈراموں کے نام کچھ اس طرح ہیں: آفتاب دمشق، پہلے کے بعد، شبنم، اکیلی، ہنٹر کی تمنا، ہمراپہ چم، بولتی لاش، جھانسی کی رانی، بہادر شاہ ظفر، مرزا غالب، انوکھی بلا اور عورت کا دل وغیرہ۔ منجو قمر نے ڈراموں میں ایک نئی تکنیک ''عکسانہ'' کا احیاء کیا تھا جسے انگریزی میں Photo Play کہتے ہیں۔ اس خصوص میں اُن کے چند ڈرامے یہ ہیں: جلتی جوانی، سستا خون مہنگا ساز، ڈھلتا سورج بڑھتا سایہ، ایک دھماکہ، دھیمی آگ، کچی سکی تیز کرن، غریب کی جورو سب کی بھابی، بیگم ساحرہ، امیر علی ٹھگ، ابوالحسن تانا شاہ، کلاوتی کامنی کوشل، شرمیلی شیلا اور نیل کی ناگن۔ وغیرہ پروفیسر تاتارخان نے منجو قمر کے صاحبزادے ڈاکٹر ممتاز مہدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اُن کے والد نے ڈاکٹر عبدالعلیم کی ایما پر اپنے ڈراموں کے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخے دے ڈالے جو آج بھی ممبئی میں 'منجو قمر کلکشن' میں رکھے ہوئے ہیں۔ (ایضاً ص 151) یوں منجو قمر نے حیدرآباد میں اردو ڈرامے کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

آزادی سے ذرا قبل اور آزادی کے فوراً بعد جن اداروں نے حیدرآباد میں اردو ڈرامے کو فروغ دیا اُن میں 'نالگو برادران' اور 'بزمِ فائن آرٹس اکیڈمی' وغیرہ مشہور ہوئے۔ نالگو برادران ایک طرح کی کلچرل اکیڈمی تھی جس میں گیت، غزل اور خاکے وغیرہ پیش کیے جاتے تھے۔ اسی طرح کا ایک خاکہ 'چھوٹے نواب' تھا جو بعد میں ڈرامے کی صورت میں بہت مقبول ہوا۔ فائن آرٹس اکاڈمی سے کچھ ایسے لوگ بھی منسلک تھے جو بعد میں فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ ان میں شنکر جے کشن کے شنکر اور اوشا کھنہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ اور ناموں میں اقبال قریشی،

مجید مقبول، سعادت علی خان اور ممتاز احمد وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔اسی اکاڈمی نے 1966 میں کرشن چندر کا مشہور ڈراما 'دروازے کھول دو' نہ صرف حیدرآباد بلکہ اطراف واکناف کے شہروں میں بھی اسٹیج کیا۔(ایضاً ص152) اس اکاڈمی میں اُس وقت نئی قوت وتوانائی پیدا ہوئی جب قادرعلی بیگ اس سے وابستہ ہوئے۔

حیدرآباد میں اردو ڈرامے کی ترقی کے ضمن میں قادرعلی بیگ ایک بڑا نام ہے۔موصوف نے مذکورہ اکاڈمی سے وابستہ رہتے ہوئے، The New Theatre of Hyderabad کے نام سے ایک نئے تھیٹر کا آغاز کیا اور کئی کامیاب ڈرامے پیش کیے۔ان ڈراموں میں سا کھارام بائنڈر، جاتی نہ پوچھو سادھو دی، آدھے ادھورے، کانچن رنگ، ہم فرشتے نہیں، لہروں کے راج ہنس، محبوبِ دکن، تاناشاہ، محمدعلی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس گروپ میں اداکاروں کی حیثیت سے جن لوگوں نے کام کیا اُن کے نام اس طرح ہیں۔ پرمیلا چوہان، اوشا، پروین بانو، منورعلی، ایم اے مجید، سیدعلی، جاوید کمال، تاتارخان، چرن جیت سنگھ سلوجہ، سہیل، راجا ٹھاکر اور کہکشاں وغیرہ۔(ایضاً ص153)

حیدرآباد کے کچھ اور مشہور ڈراما نگاروں میں فضل الرحمان، محمد احمد اللہ خاں منصور حیدرآبادی، رحمان ساجد اور قدیر زماں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ڈراما نگاروں نے طبع زاد ڈراموں کے علاوہ انگریزی سے مترجمہ ڈرامے بھی پیش کیے۔فضل الرحمان نے بہت کم ڈرامے لکھے مگر جو کچھ لکھے یا ترجمہ کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ پروفیسر محمد حسن نے اُنھیں 'بڑے ڈراما نویسوں' میں شمار کیا ہے۔(ایضاً ص 153) محمد احمد اللہ خان منصور حیدرآبادی کا ڈراما 'ہند کے ہیرے' کافی مشہور ہوا۔رحمان ساجد تھے تو فارسٹ آفیسر مگر اردو ڈرامے سے اُنھیں بڑی دلچسپی تھی۔ اُن کے ڈراموں کے دو مجموعے 'پھول کھلے گلشن گلشن' اور 'بندھن ٹوٹ گئے' منظرِ عام پر آچکے ہیں۔قدیر زماں کے ڈراموں کو عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، اور شوکت اعظمی جیسے دانشوروں نے پسند کیا تھا۔(ایضاً ص 155) اُن کا طبع زاد ڈراما 'لنگڑا گھوڑا' کئی بار اسٹیج کیا گیا۔وہ رنگ دھارا تھیٹر گروپ، ڈرامٹک سرکل آف حیدرآباد سے وابستہ رہے اور اب قادرعلی بیگ فاؤنڈیشن سے جڑے ہوئے ہیں۔

قادر علی بیگ کے انتقال کے بعد، اُن کی بیسویں برسی کے موقع پر آندھرا پردیش کی آئی اینڈ پی آر منسٹری (I&PR) اور حیدرآباد کے شائقین فن وادب نے مرحوم کی یاد میں قادر علی بیگ تھیٹر فاؤنڈیشن قائم کیا۔ قادر علی بیگ کی محلِ مبارک محترمہ رضیہ بیگم کو کرسیٔ صدارت پیش کی گئی اور اُن کے چھوٹے فرزند جناب محمد علی کو (جنھیں حال ہی میں پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا ہے) یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ تھیٹر کو دوبارہ زندہ کریں، جسے وہ بہ حسن وخوبی نبھا رہے ہیں۔ تھیٹر آرٹ کو بامعنی و بامقصد بنانے کے لیے اس ادارے کے اراکین میں فلم، ڈراما اور دیگر آرٹ سے جڑی ہوئی کئی ہستیاں شامل ہیں۔ مثلاً یم۔یس۔ سیتھو، روہنی ہتانگڑی، وا ہنی گنپتی، بہاسنی منی رتنم، اُرملا منوند کر اور جاوید اختر وغیرہ۔ یہ ادارہ شب وروز ڈراما اور آرٹ کی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

پدم شری محمد علی بیگ نے اس ادارہ کو فعّال رکھا ہے۔ وہ اپنی شب وروز کی محنت سے حیدرآباد اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی اپنے ڈرامے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے پیش کردہ ڈراموں کی فہرست یہ ہے: تارامتی، تارامتی بارادری، حیدرآباد (2006)، His exalted Highness چومحلہ پیلس حیدرآباد، رات پھولوں کی، قذافی اسٹیڈیم، لاہور اور تارامتی بارادری، حیدرآباد (2008) آئینہ، قطب شاہی مقبرے، حیدرآباد (2008) ریشم کی ڈور، HICC حیدرآباد، نہرو سینٹر ممبئی، پنکھڑیاں (2010) Forty Winks فرانس کے فٹ بارن تھیٹر کی معاونت کے ساتھ (2011) یہیں کہیں بہت دور (2011) کیفیات (2011) داداصاحب پھالکے، انٹرنیشنل فلم فیسٹیول گوا (IFFA.GOA) اور فلک نما پیلیس، حیدرآباد (2012) قلی قطب دلوں کا شاہزادہ، گولکنڈہ فورٹ، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد (2013) France,Footsbarn's Herisson en Fete، نہرو سینٹر، ممبئی (2013) میں پیش کیا گیا۔ اُن کا تازہ ڈراما 'سوانحِ حیات' ہے جو حیات بخشی بیگم کی حیات سے متعلق ہے اور جسے ابھی کچھ دنوں پہلے حیدرآباد (2014) میں پیش کیا گیا۔

یہاں ضروری ہے کہ میں پدم شری محمد علی بیگ کا مختصر سا تعارف پیش کردوں۔ محمد علی بیگ کو لڑکپن ہی سے ڈرامے کے فن سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے والدِ محترم مرحوم قادر علی بیگ کی

نگرانی میں اس فن کو حاصل کیا اور اُس کے فروغ کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔ وہ ایک منجھے ہوئے اداکار ہیں اور ناظرین اُن کے مکالموں کی ادائیگی کے دلدادہ ہیں۔ اُن کی دوسری مصروفیات میں اشتہاری اور مختصر فلمیں بنانا شامل ہے۔ اشتہاری فلموں کے لیے اُنھیں اب تک 30 ایوارڈ مل چکے ہیں۔ نیز اُنھیں دوقومی اعزاز اور دو بین قومی گولڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ محمد علی نے اپنے اردو ڈراموں کے ذریعے حیدرآبادی تہذیب کو اُجاگر کیا ہے۔ ڈرامے سے اُن کے شوق کو دیکھ کر اُنھیں پوسٹر بوائے آف حیدرآباد تھیٹر (Poster Boy of Hyderabad Theatre) کہا جاتا ہے۔ مزید معلومات کے لیے دیکھیے: www baigtheatrefoundation.com۔ اسی ادارے سے پروفیسر مغنی تبسم اور قدیر زماں، لکشمی راج کے علاوہ مشہور موسیقار ایلیہ راجا بھی وابستہ رہے ہیں۔

کچھ اور ڈراما نگار جنھوں نے حیدرآباد میں اردو ڈرامے کی روایت کو زندہ رکھنے کی سعی کی ہے، اُن میں پروفیسر تاتار خان اور جاوید کمال کے نام اہم ہیں۔ ان دونوں ڈراما نگاروں نے ڈرامے بھی لکھے، اداکاری بھی کی اور ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں اب بھی فعّال ہیں۔ ان دونوں کا ساتھ نبھانے والوں میں ریکھا شرما، سورش وش، ٹھاکر، جیسوال، ربانی، چرن سنگھ، انیس الرحمان اور سید صفی اللہ وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

حیدرآباد کے بعض افسانہ نگار اور شعبۂ تحقیق و تدریس سے منسلک افراد نے چیدہ چیدہ ڈرامے لکھے اور اُنھیں اسٹیج پر پیش کیا۔ مثلاً مظہرالزماں کا ایک ڈراما 'اداس صدی کا کرب' علامتی ڈراما ہے، جسے بڑی کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا۔ پروفیسر انور معظم کے دو ڈراموں کا ذکر یہاں از بس ضروری ہے؛ 'روشنی روشنی' اور 'قتل' وغیرہ۔ (ایضاً ص 156) جاوید لطیفی نے جے اینڈ جے سوسائٹی قائم کر کے ہلکے پھلکے ڈراموں کو رواج دیا اور ڈرامائی انداز میں سماج کے ناسوروں پر گہرا طنز کیا۔ چیدہ چیدہ پیش کیے گئے کچھ اور ڈرامے یہ ہیں: دن کے چور (قمر حیدرآبادی) التباس کی روشنی (ہادی رسیل) ریت کی دیوار، دل کے رشتے، چنگاری (بدر افسر) خالد کی خالہ، آواز کا خواب، آخری خواب (قدسیہ زیدی) پنچائت (پریم چند) وغیرہ۔

پروفیسر تاتار خان نے اپنے مضمون میں کچھ خاکوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھیں ڈراموں کی شکل میں پیش کیا گیا۔ مثلاً 'غلام جیلانی نے 'شاد کا مشاعرہ' کے عنوان سے ایک تمثیلی رنگ کا مرقع پیش کیا' (ایضاً ص 157) اسی طرح اعظم شفیقی نے ایک خاکہ مرتب کیا جس میں قطب شاہی دور کے شعرا کی تمثیل پیش کی گئی۔ فی زمانہ، جاوید کمال اسی طرز پر، اردو کے معروف و مقبول شاعروں کا تمثیلی مشاعرہ پیش کرتے ہیں جسے کافی مقبولیت حاصل ہے۔ اس خصوص میں منور علی کا 'ہنگامہ' اور حامد کمال کا 'ڈیڑھ متوالے' ماسٹر شفیع کا 'داستان گول کنڈہ' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بیتن خان نے 'ادرک کے پنجے' سے حیدرآباد کے اردو اسٹیج کو سارے ہندوستان میں پہنچا دیا۔ بعد میں محمد صابر قریشی صاحب، اور جمشید نے 'ادرک کو پنجے' پیش کیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے، الانصار، حیدرآباد، جلد 5۔ 2007-08۔ کتاب: 5-6۔ صفحات 148 سے 159)

رائل سیما اب تلنگانہ سے الگ ہوکر آندھرا پردیش میں شامل ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، رائل سیما کے چاروں اضلاع میں اردو زبان، تعلیم اور ادب کا فروغ ہو رہا ہے جب کہ آندھرا کا علاقہ تلگو علاقہ ہے۔ رائل سیما کے چاروں

اضلاع میں اسکول اور کالج کی سطح پر ڈرامے پیش کیے جاتے ہیں۔ شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد کے ایک ریسرچ اسکالر محمد فیض اللہ نے اپنے یم فل کے تحقیقی مقالے رائل سیما میں اردو ڈراما (2008) میں اس کی تفصیل پیش کی ہے۔ (دیکھیے مقالے کے پہلے دو باب ؛ رائل سیما کا تہذیبی وثقافتی پس منظر، اردو ڈرامے کے حوالے سے اور رائل سیما میں اردو ڈراما) سر دست، میں یہاں رائل سیما کے چاروں اضلاع میں اردو ڈرامے کے فروغ کے بارے میں ایک سرسری جائزہ پیش کروں گا جو مذکورہ غیر مطبوعہ یم فل کے مقالے سے ماخوذ ہیں۔

ضلع کرنول میں اردو ڈرامے اسٹیج کرنے کی ایک مستحکم روایت ملتی ہے۔ یہاں یہ عرض کردوں تو بے محل نہ ہوگا کہ دکنی کے مشہور شاعر سلیمان خطیب کی طنزیہ ومزاحیہ نظموں کو ڈرامائی روپ دے کر سارے رائل سیما میں پیش کیا جاتا ہے۔ اُن کی یہ نظمیں اکثر اسٹیج پر پیش کی گئی ہیں: چھورا چھوری، لال جوڑا، پہلی تاریخ، جاہل ساس اور تعلیم یافتہ بہو وغیرہ۔ کرنول میں بھی ان کی پیش کشی کی روایت ملتی ہے۔ ان کے علاوہ کرنول میں کئی مزاحیہ ڈرامے بھی پیش کیے

گئے۔مثلاً شریف اُستاد اور شریر شاگرد، ہنگامہ، ہنسنا منع ہے، راستے کے پتھر، بلی دان، تو تو میں میں، ایک سے بڑھ کر ایک اور شری مان شری متی وغیرہ۔ ماضی میں عبدالباسط اردو ڈراموں کو اسٹیج کرنے میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔اُن کے تحریر کردہ یہ ڈرامے کافی مقبول ہوئے۔ ڈاکٹر اور مریض، داماد کی تلاش اور ایک مظلوم لڑکی وغیرہ۔(مذکورہ غیر مطبوعہ مقالہ ص 37)

ضلع کرنول کا ایک بڑا شہر ادونی ہے، جہاں کے اردو ڈراموں کی اپنی تاریخ ہے۔ انگریزی کے ایک اُستاد محبوب جم نے جو ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے، اُن میں ان چار ڈراموں کے نام آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں: جوارِ رحمت میں جگہ، دوستی کا حق، چار آنسو اور Man proposes God disposes وغیرہ۔(ایضاً ص 41) ادونی میں اردو ڈرامے کی تاریخ ادونی آرٹس اینڈ سائنس کالج کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ اس کالج کے اساتذہ نے برسوں تک کالج کے ڈراموں کی روایت کو جاری رکھا۔ ان میں ساگر کرنولی کا نام اہم ہے۔ اُنھوں نے آٹھ ڈرامے پیش کیے جن کے نام یہ ہیں: ماڈرن مغلِ اعظم، چھوٹے میاں بڑے میاں، سلطان تغلق، نیا زمانہ، فٹ پاتھ یونی ورسٹی، چھورے کو چھوری ہونا، پرائیویٹ دواخانہ، پرائیویٹ اسکول وغیرہ۔ ساگر کرنولی کے ساتھ تاریخ کے اُستاد موسیٰ میاں کا ذکر کرنا ضروری ہے جو ان ڈراموں میں اداکاری بھی کرتے تھے اور دیگر فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے۔(ایضاً ص ص 42-46)

اسی کالج سے منسلک ڈاکٹر کریم رومانی مرحوم (1936-1944) کا ذکر کرنا چاہوں گا، جو میرے ہم وطن بھی تھے اور مجھے اُن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی تھی۔ مرحوم کو ڈرامے کا بڑا شوق تھا اور ہر سال اپنے کالج میں کوئی نہ کوئی اردو ڈراما اسٹیج کیا کرتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق اُنھوں نے پندرہ سے بیس ڈرامے لکھے اور اپنے طلبا کے ذریعے اُنھیں اسٹیج پر پیش کیا۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے ڈراموں کا مجموعہ 'گڑ کی مکھیاں' ترتیب دیا تھا جو شائع نہ ہوسکا۔ اُن کے جو ڈرامے اس وقت دستیاب ہیں اُن کے نام یہ ہیں: گڑ کی مکھیاں، جورو کا بھائی، گھر کا بڑا، تنتر منتر، گفتار کے غازی، شیخ صاحب، اندر سبھا، اناتھ بچہ، بیگن کا بھرتا، جلوا اسٹوڈیو، جوڑ توڑ اور نرالا ڈاکو وغیرہ۔(ایضاً ص 93)

ادونی کے بعض ڈراما نگاروں نے اسکولوں اور کالجوں سے باہر عوامی تھیٹروں میں بھی اردو ڈرامے پیش کیے ہیں۔اس خصوص میں حافظ ادونی کا نام لینا ضروری ہے جنھوں نے پہلی مرتبہ عوام کے لیے اردو ڈراما اسٹیج کیا تھا۔موصوف کے پانچ ڈراموں کی اسکرپٹیں دستیاب ہیں۔ اُن کے نام یہ ہیں:مظلوم کی فریاد،حاسد کا انجام، کاغذ کی ناؤ، امین صاحب اور زنجیر وغیرہ۔عبدالکریم قابل ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔اُنھیں ڈرامے سے بھی دلچسپی تھی۔ اُن کے دو ڈرامے دستیاب ہوئے ہیں: شیر دل قاصد اور ترکی تپنچہ وغیرہ (ایضاً ص 54) معین نظامی نے دکنی کے طنز ومزاح نگار شاعر کے طور پر بڑا نام کمایا۔اُن کے ایک ڈرامے 'دلی کی آخری شمع' کا ذکر لوگ آج بھی کرتے ہیں۔یہ ڈراما بہادر شاہ ظفر کے دور کے مشاعروں کو موضوع بنا کر لکھا گیا تھا اور اسٹیج کرتے وقت اُس زمانے کے ادبی ذوق کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ (ایضاً ص 55) ان کے علاوہ کرنول میں حیدرآباد کے ڈراموں کو پیش کرنے کی بھی روایت ملتی ہے۔اس کے دو طریقے تھے؛ یا بالکل وہی ڈراما جوں کا توں پیش کیا جاتا تھا یا اُس میں ذرا سا مقامی رنگ بھر دیا جاتا۔یہ واضح کر دوں کہ کرنول، رائل سیما کے شمال میں حیدرآباد کے قریب واقع ہے،جس کی وجہ سے اُس پر حیدرآبادی تہذیب،اردو زبان وادب اور آرٹ وغیرہ کا اثر لازماً پڑتا ہے۔

شہرِ کڑپہ اب اردو کے ایک اہم مرکز کے طور پر اُبھر رہا ہے، جہاں اردو تعلیم کے علاوہ اردو ادب کے فروغ کی ایک روشن سبیل دکھائی دیتی ہے۔ جہاں تک کڑپے میں اردو ڈرامے کے فروغ کا سوال ہے، بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس کا مستقبل کافی روشن ہے۔ماضی میں یہاں، کئی ڈرامے اسکولوں اور کالجوں میں اسٹیج کیے گئے۔جن اساتذہ اور طلبہ نے اردو ڈراما کو فروغ دیا اُن میں سے چند اہم نام یہ ہیں: حضرت جعفر،حضرت ملک معین الدین،حضرت غلام دستگیر کوثر نوید نیلوری،ملا رشید، شیخ جانی باشاہ وغیرہ۔ان میں کچھ اساتذہ نے طبع زاد ڈرامے لکھے اور کچھ نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے اسٹیج کیا۔شیخ جانی باشاہ اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے طبع زاد ڈرامے لکھنے لگے تھے اور اُنھیں اسٹیج بھی کیا کرتے تھے۔ گریجویشن مکمل ہونے کے بعد ابھی تروپتی میں وہ ایم اے اردو کے سالِ اول میں تھے کہ

اُنھیں محکمہ پولیس میں ملازمت مل گئی۔ اُس کے بعد وہ محکمہ پولیس کے مختلف عہدوں پر فائز ہوتے رہے اور یوں وہ ڈرامے سے دور ہوتے گئے۔ اُن کے مشہور ڈراموں میں نکھ پتی، شمع اور پروانے، قانونِ قدرت، نقلِ اعظم اور ہم سب ایک ہیں وغیرہ۔ (ایضاً 71-59)

کڑپے کے جس ڈراما نگار نے اپنی زندگی اور اپنا سب کچھ لگا کر اردو ڈرامے کو فروغ دیا، اُس بزرگ ہستی کا نام ہے، یوسف صفی۔ یوسف صفی یکم جون 1945 کو ایک خاندان سادات میں حضرت جمال اللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ تعلیم ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ اُنھیں ریلوے میں ملازمت مل گئی، جو اُنھیں راس نہ آئی۔ اصل میں اُن کا طبعی میلان فوٹو گرافی کی طرف تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے ریلوے کی ملازمت کو خیر باد کہا اور فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ اس طرح اُنھیں وہ آزادی نصیب ہوئی جس کی بدولت وہ اپنے ڈرامے کے شوق کو پروان چڑھا سکتے تھے۔

یوسف صفی کو ڈرامے کا چسکا بچپن ہی میں پڑ گیا تھا۔ وہ ڈرامے اور اُن کی ریہرسلوں کو دلچسپی سے دیکھا کرتے تھے۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب وہ اپنے طبع زاد ڈرامے لکھنے لگے، اور جب اُنھیں اسٹیج کرنے کی طرف رجوع ہوئے تو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں یوسف صفی کو اردو ڈرامے کا وہ مردِ مجاہد قرار دیا ہے جس نے سخت ترین اور نامساعد حالات کے باوجود اپنی جنگ جاری رکھی۔ (دیکھیے یوسف صفی کا مطبوعہ ڈراما 'کل کی دھوپ' ص 24) اُن کے اہم ڈراموں کی فہرست یہ ہے: کٹھ پتلی، مچلتے ارماں، گھر سنسار، آخری چراغ، بٹوارہ، خواب پتھر میں، کاش کہ، بھوکے سائے، آبرو، کرفیو، روشنی کے پھول، پدم شری، انقلاب، اور مجنوں شاہ۔ وغیرہ۔ اب تک اُن کے ڈراموں کے دو مجموعے: کل کی دھوپ اور دو دِ چراغ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

یوسف صفی کے تمام ڈرامے، دو ایک کو چھوڑ کر، سب کے سب تاریخی ہیں۔ اس اعتبار سے اُن کے ڈراموں کی زبان نہایت صاف، فصیح و بلیغ ہوتی ہے۔ نیز وہ مختلف کرداروں کی اسالیبِ زبان کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ کچھ مکالمے، زباں زدِ خاص و عام ہوئے۔ وہ پلاٹ کچھ اس طرح بُنتے ہیں کہ ناظرین کی جستجو اختتامِ ڈرامہ تک برقرار رہتی ہے۔

یوسف صفی کے کئی ڈرامے اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔ان ڈراموں میں عام طور پر مقامی اردو اساتذہ کردار نبھاتے ہیں، جو محض خدمت فن کے ارادے سے ان ڈراموں میں کام کرتے ہیں۔تلگو ٹی وی سیریلوں کی اداکارہ نرگس، یوسف صفی کی دریافت ہے، جو اپنی طالب علمی کے زمانے سے اُن کے ساتھ اسٹیج پر کام کر رہی ہے۔ جہاں تک اسٹیج کے اخراجات کا سوال ہے، کہیں سے امداد مل جائے تو جائے ورنہ دامے درمے سخنے جو کچھ کرنا ہوتا ہے خود ہی کر لیتے ہیں۔اُن کے اکثر ڈرامے شہر کڑپہ کے عوامی اسٹیج پر پیش کیے گئے اور لوگوں میں کافی مقبول ہوئے۔ البتہ اُن کا ایک ڈراما خواب پتھر میں، یونی ورسٹی آف حیدرآباد کے سب سے بڑے آڈی ٹوریم D.S.TAuditorium میں پیش کیا گیا، جسے کچھ سات سو طلبہ کے علاوہ بعض عمائدینِ شہر جن میں قادر علی بیگ کے فرزندِ ارجمند پدم شری محمد علی اور ہندی، تلگو ڈرامے سے وابستہ کئی شخصیات نے دیکھا اور پسند کیا۔وہ آج بھی باوجود، ناسازیٔ طبیعت کے فعّال ہیں اور گاہے گاہے اپنے ڈرامے اسٹیج کرتے رہتے ہیں۔

کڑپے کے جواں سال ڈراما نگاروں میں سید افتخار جمال کا نام سرِ فہرست ہے۔ افتخار جمال، فرزندِ یوسف صفی اُن کے سچے جانشین ہیں۔ڈرامے کا شوق وراثت میں پایا ہے، چنانچہ کالج کے دنوں سے وہ ڈراموں میں اداکاری کیا کرتے تھے، بعد میں، طبع زاد ڈرامے لکھنے لگے۔اُن کے اکثر ڈرامے کالجوں میں اسٹیج کیے گئے ہیں۔اپنے والد کے ڈراموں کے برخلاف افتخار کے ڈرامے سماجی مسائل پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسٹیج کرنے میں زیادہ صرفے کی ضرورت نہیں ہوتی۔افتخار کے بعض ڈرامے علامتی نوعیت کے بھی ہیں۔مثلاً میں نے اُن کا ایک ڈرامہ 'کوڑا' سری وینکٹیسورا یونی ورسٹی میں دیکھا تھا، جس میں چند لڑکیوں نے علامتی انداز میں ڈرامے کا یہ مرکزی خیال پیش کیا تھا کہ انسان ہمیشہ مجبوریوں میں گھرا ہوا ہوتا ہے اور مجبوریاں بھیس بدل بدل کر اُس کے سامنے آتی رہتی ہیں۔افتخار جمال کے ڈرامے روایتی ڈراموں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔وہ ایک منجھے ہوئے ہدایت کار بھی ہیں۔اہلِ کڑپہ کو اُن سے بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

ضلع اننت پور میں اردو ڈرامے کے نقوش آزادی سے پہلے سے ملتے ہیں۔اس علاقے

کے اولین ڈراما نگاروں میں لطیف کاظم (پ 1928 کدری) کا ذکر لازمی ہے۔ اُن کا ایک ڈراما 'کسوٹی' اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ آزادی کے بعد اردو کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی اس کا موضوع ہے۔ ڈرامے میں عدالت کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے جس میں اردو کو اُس کے دستوری حق سے محروم کیے جانے پر حکومت کے کچھ ذمہ داروں پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ خاص بات اس ڈرامے کی یہ ہے کہ ڈراما نگار نے فرضی ناموں کے بجائے اُن کے اصلی نام استعمال کیے ہیں۔ مثلاً گیانی ذیل سنگھ، چودھری چرن سنگھ، جسٹس جگ موہن ریڈی، پنڈت جواہر لال نہرو، پروفیسر جگناتھ آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور نیلم سنجیوا ریڈی وغیرہ (ایضاً ص 87-86) یہ اپنے زمانے کا کافی مقبول ڈراما سمجھا جاتا ہے۔

یہاں میں اپنی یاداشت کی بناء پر کدری کے ایک مشہور ڈرامے کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ غالباً 66-1965 کی بات ہے، جب مشہور ہندی فلم 'دوستی' میرے وطن، کدری میں لگی تھی۔ میں اُس وقت شاید چھٹی یا ساتویں میں پڑھتا تھا۔ میرے کچھ سینیر طلبہ نے اسکول میں اس فلم کی کہانی کو اُس کے نغموں سمیت ڈرامے کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اندھے لڑکے کا رول عبدالحق نے ادا کیا تھا، جس کی آنکھیں بھورے رنگ کی تھیں اور اُس نے آواز بھی غضب کی پائی تھی۔ لنگڑے کا رول ہارون رشید نے بڑی خوبی سے نبھایا تھا۔ میرے ایک قریبی دوست کی ننھی منی سی بہن ممتاز نے ہیرو کی بہن کا رول ادا کیا تھا اور مومن تاج نے اُس کے بھائی کا۔ یہ ڈراما اتنا مقبول ہوا تھا کہ آج بھی اُس نسل کے لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہے۔ اُن دنوں، ہمارے اسکول میں اردو اور تلگو میں کثرت سے ڈرامے پیش ہوتے تھے۔ اسی مٹی کے ایک نامور سپوت، ڈاکٹر کریم رومانی کا ذکر ادونی کے ڈرامہ نگاروں میں ہو چکا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے آخر میں ہم ضلع چتور میں اردو ڈرامے کے فروغ کا ذکر کریں گے۔ ضلع چتور میں مدن پلّی اور وائل پاڈ کے کالجوں میں اردو ڈرامے اسٹیج کیے جاتے ہیں۔ شہرِ چتور میں 1980 یا اُس کے آس پاس ڈاکٹر کریم رومانی کا ایک ڈرامہ اسٹیج کیا گیا تھا۔ سری وینکٹیسورا یونی ورسٹی، تروپتی، اسی ضلع میں واقع ہے۔ اس قدیم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں گاہے گاہے اردو ڈرامے اسٹیج کیے جاتے رہے ہیں۔ تازہ مثال 30 جنوری 2013 کی شام کی ہے جب

وہاں کے صدر شعبہ پروفیسر عبدالستار ساحر نے اردو ناول پر سمینار کیا تھا اور شام میں ڈرامے اسٹیج کیے گئے تھے۔شعبے کی طالبات نے ایک ڈراما 'کوڑا' پیش کیا جسے ناظرین نے بے حد پسند کیا۔مہمان طالبات میں،شعبۂ یونی ورسٹی آف حیدرآباد کی دو ریسرچ اسکالر سمیہ تمکین اور ناہیدہ سلطانہ نے سلیمان خطیب کی دو نظموں کا ڈرامائی روپ پیش کیا تھا جنھیں بہت پسند کیا گیا۔(دیکھیے یوٹیوب، khanservices1) چوں کہ کڑپہ تروپتی سے قریب ہے،دونوں شہروں میں ادبی معاونت کی ایک قدیم روایت موجود ہے۔کڑپے کے شعرا اور فن کاروں نے بسااوقات تروپتی میں مشاعرے اور تفریحی پروگرام پیش کیا کرتے ہیں۔مذکورہ ڈراما 'کوڑا' کے علاوہ کڑپے کے دو فن کاروں؛ ستار فیضی اور مقبول احمد مقبول نے اپنا مزاحیہ پروگرام 'کڑپہ کامیڈی شو' تروپتی میں پیش کیا تھا۔

حیدرآباد اور رائل سیما میں اردو ڈرامے کے ان مختصر معلومات کے بعد اب آیئے ہم حیدرآباد میں ریڈیائی ڈراموں کی روایت کا مطالعہ کریں۔

حیدرآباد میں ریڈیائی ڈراموں کی ایک پوری تاریخ موجود ہے۔پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں معین امر نے یم فل کا مقالہ اسی موضوع پر لکھ کر اس کی تاریخ کو انسانی حافظے سے محو ہونے سے بچا لیا ہے۔اُن کا مقالہ 'حیدرآبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے' کے نام سے 1987 میں شائع ہو چکا ہے۔معین امر نے حیدرآباد میں ریڈیو کے آغاز کی کہانی بڑے دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔لکھا ہے کہ 1933 کے آس پاس ریاست حیدرآباد کے ریلوے سروس کے مہتمم سید محبوب علی اپنی ایک ٹیم کے ساتھ نشریاتی نظام کو سمجھنے اور اُسے قائم کرنے میں کوشاں تھے۔اس ٹیم کے ایک رکن مظفر علی تھے جو اپنے زمانے کے میٹرک پاس تھے مگر سائنسی شعور اور ذہن رکھتے تھے۔وہ کسی طرح دوسو(200) واٹس کی طاقت کا ٹرانسمیٹر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔جس کی وجہ سے ایک خانگی نشرگاہ قائم ہونے کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔شب وروز کی محنت کے بعد 1933 میں ایک نشرگاہ قائم ہوگئی،جس کی نشریات مولوی چراغ علی کے مکان 'اعظم منزل' سے جاری کی گئیں۔یہ شام کے وقت اس جملے سے شروع ہوتیں:''411 میٹر 730 کلو سائکل پر ہم محبوب علی صاحب کی خانگی نشرگاہ سے بول رہے ہیں''۔جب اس نشرگاہ کو

مقبولیت حاصل ہوئی تو حکومت نے اسے 1935 خرید لیا اور تمام کارروائیوں کے مکمل ہونے کے بعد یکم جنوری 1939 سے اس کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ریڈیو کو کامیاب طریقے سے چلانے کے لیے ریاستِ حیدرآباد نے فضل الرحمان (جن کا ذکر ڈرامے کے ذیل میں آچکا ہے) کو لندن بھیجا گیا اور اُن کی تربیت مکمل ہونے کے بعد وہ حیدرآباد آئے اور نہایت کامیابی سے ریڈیو کے مختلف پروگرام چلاتے رہے۔ (صفحات 79-72) جیسے جیسے ریڈیو کے نئے نئے پروگرام ترتیب پاتے گئے ویسے ویسے عوام اُس کے گرویدہ ہوتے گئے۔

حیدرآباد میں اردو کا ماحول اور عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے ڈراما اور ریڈیائی ڈرامے دونوں کی خوب پذیرائی ہوئی۔ جو ڈرامہ نگار اسٹیج کے لیے ڈرامے لکھا کرتے تھے، وہی ریڈیائی ڈرامہ نگاری کے میدان میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ریڈیائی ڈرامے حیدرآبادی تہذیب کا انوٹ حصہ بن گئے۔ ریڈیائی ڈرامہ نگاروں کے چند اہم نام یہ ہیں: مرزا ظفر الحسن، محمد فضل الرحمان، عصمت اللہ بیگ، شجاع احمد، انور معظم، سکندر توفیق، نذیر محمد خان، عبدالماجد، عاقل خان اور غلام جیلانی وغیرہ (ص 93) ان ڈرامہ نگاروں نے ریڈیائی ڈرامے کی نہ صرف شروعات کی بلکہ اُسے استحکام بخشنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ البتہ مقامِ افسوس یہ ہے کہ اکثر ڈرامہ نگاروں نے اپنے ریڈیائی ڈراموں کو محفوظ نہیں رکھا۔ بڑی وجہ یہ خیال تھا کہ ریڈیائی ڈرامے سننے کی چیز ہیں نہ کہ پڑھنے کی۔ بایں وجہ جب معین امر نے ان ڈراموں کو جمع کرنے کی کوشش کی تو اُنھیں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا (ایضاً) تاہم جو کچھ اُن کے ہاتھ لگا اُنھوں نے اپنی کتاب میں اُسے محفوظ کرلیا ہے۔

ذیل میں حیدرآباد کے چند اہم ریڈیائی ڈرامہ نگار اور ان کے ڈراموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محمد فضل الرحمان (پ 1910) کو لاسلکی معلومات اور اُس کے استعمال کی تربیت کے لیے لندن اور قاہرہ بھیجا گیا۔ وہ حیدرآباد واپس آکر ناظم لاسلکی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ محکمۂ تعلیمات، حکومتِ حیدرآباد کے ناظم بھی بنے۔ اُنھیں علی گڑھ یونی ورسٹی علی گڑھ کے پرووائس چانسلر کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دینے کا موقع ملا۔ وہاں سے لوٹے تو حیدرآباد ہی میں رہ کر ترقی اردو بورڈ کے پروجیکٹ انسائیکلو پیڈیا کا کام مکمل کیا۔ اُنھیں اسٹیج اور شاعری دونوں سے لگاؤ

تھا۔ اُن کے ڈرامے اسٹیج بھی کیے گئے اور ریڈیو سے بھی نشر ہوئے۔ اُن میں مشہور ڈرامے یہ ہیں: ظاہر و باطن، نئی روشنی، حشرات الارض، آئندہ زمانہ اور کارخانہ۔ (ص ص 97-96)

مرزا عصمت اللہ بیگ (1896-1954) کے والد مرزا اسداللہ بیگ مشہور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کے حقیقی چچا تھے۔ (ص 105) مرزا عصمت اللہ بیگ طنز و مزاح نگار تھے اور اُنھوں نے بچوں کے ادب پر بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ جب وہ ریڈیائی ڈرامے کی طرف آئے تو اُنھوں نے یہاں بھی کچھ ڈرامے یادگار چھوڑے۔ ان میں دو کا ذکر معین امر نے کیا ہے: دوافروش اور نیشنل پلان لون، جو ریڈیو سے نشر ہوئے۔

شجاع احمد قائد (1919-1968) یوپی میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد میں زندگی گزاری اور جب یہاں کی نشری دنیا میں داخل ہوئے تو ڈراما نگاری، اداکاری اور موسیقی کے میدانوں میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑے۔ اُن کی صاحب زادی افشاں جبیں جو آل ریڈیو سے وابستہ تھیں نے اُن کے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے 'سیاہ آنسو' 1979 میں شائع کیا۔ (ص ص 124-113)

صاحب زادہ محمد علی خاں مے کش (1916-1948) بنیادی طور پر شاعر تھے۔ جب وہ ریڈیو سے وابستہ ہوئے تو اُنھوں نے دل کھول کر اُس کی خدمت انجام دی۔ وہ ڈرامے اور فیچر وغیرہ قلم برداشتہ لکھ دیا کرتے تھے۔ اُن کے نشری ڈراموں کا مجموعہ 'کاغذ کی ناؤ' ادارۂ ادبیاتِ اردو نے شائع کیا جس میں چھ ڈرامے ہیں۔ اُن کے کچھ اور مجموعے جن کا ذکر مذکورہ مجموعے میں ملتا ہے شائع نہیں ہو سکے۔

غلام ربانی (1886-1976) متوطن بلول، ضلع گوڑگاؤں دلی، لکھنو، بھوپال، اورنگ آباد ہوتے ہوئے 1940 میں حیدرآباد آئے اور یہاں محکمہ آثار قدیمہ سے منسلک ہو گئے۔ ریڈیو کے لیے مضامین اور ڈرامے لکھے۔ اُن کا ایک مستقل فیچر 'نظارے' برسوں نشر ہوتا رہا۔ معین امر نے اُن کے 20 مشہور ریڈیائی ڈراموں کی یہ فہرست دی ہے: سینڈل، خواہ مخواہ، شادی چور، وکیل ڈاکٹر، نردوش، دو بہادر، ایک رات، پان کا بیڑا، محمود گانواں، گولکنڈہ، روپ متی، پیپل والا بھوت، ماما کی تلاش، کھانے کا مزا، ستارے، اُوپر والی، کب کہاں اور کیسے، انگوٹھی، تصویر اور نور جہاں۔ وغیرہ (ص 141)

رشید قریشی (پ 1920 حیدرآباد) بی اے کی تکمیل کے بعد ہی سے ریڈیو نشریات میں دلچسپی لینے لگے تھے۔نشرگاہ میں ملازم ہوئے تو چھ سال تک مختلف حیثیتوں سے خدمات انجام دیں۔اُن کے معروف ڈرامے یہ ہیں: سہراب رستم (بچوں کے لیے) مذاق، نارنجی رنگ، چاند بی بی، عبدالرزاق لاری، ننھی سانولی، حویلی کا چاند (محبوب)، محمد قلی قطب شاہ (بھاگ متی) تانا شاہ، جھلک، روشنی، سلگتے آنچل، اور نقش فریادی (مرزا غالب) وغیرہ (ص 147)

بھارت چند کھنہ (پ 1912 پنجاب) نے عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد سے ایم اے کا امتحان کامیاب کیا اور مختلف ملازمتوں کے سلسلے میں یہیں رچ بس گئے۔وہ بنیادی طور پر مزاح نگار تھے۔اُن کے ریڈیائی ڈراموں کی فہرست یہ ہے: اُلٹے بانس بریلی، نیلی فون، عہدہ دار کی پکار، زندہ شہید، تین بچیاں، تر پ کا پتا، کڑوی مٹھاس اور دو چمچے وغیرہ۔

محمد عاقل علی خاں (1918-1972) تاریخ اور سیاسیات کے لیکچرار کے طور پر ملازمتیں کیں۔ریڈیو اور ریڈیائی ڈراما نگاری سے خاص شغف رکھتے تھے، قلم برداشتہ ڈراما لکھ دیتے تھے۔اُن کے ڈراموں کی فہرست میں یہ ڈرامے شامل ہیں: رانی کرناوتی، روپ متی، سیب کا درخت، ایک ہاتھ کی تالی، شبھ دن، پرکاش کا وہی کمرا، انوکھی کہانی، ٹھنڈی آگ، دیدی، پہچان، دولہن، راجارانی، اور پھلجھڑیاں وغیرہ۔ان ڈراموں کے علاوہ معین امر نے اُن کے ان عنائیوں کا بھی ذکر کیا ہے: عروجِ آدم، جھولے اور رم جھم (میوزیکل فیچر) وغیرہ۔(ص 162)

سکندر توفیق (پ 1932 اورنگ آباد) پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے حقیقی بھائی اور پروفیسر ثمینہ شوکت کے شوہر تھے۔وہ دکن ریڈیو کے لیے ایک مدت تک لکھتے رہے۔اُنھیں ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔اُن کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اُن کا پہلا ڈراما 'ریڈیو کا افتتاح'' 1948 میں اورنگ آباد سے اُس وقت نشر ہوا جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔اُن کے ڈرامے اورنگ آباد اور حیدرآباد دونوں جگہوں سے نشر ہوتے رہے۔ ذیل میں اُن کے اُن ڈراموں کا ذکر کیا جاتا ہے جو حیدرآباد سے نشر ہوئے: دھنستے ساحل، بھٹکتی روحیں، روح اور چہرے، جب پریم سبھا یا جب پریمیوں کی کانفرنس، جب سہتے انسان بنے، راہی، لکیریں، ہمالیہ اور صدیاں، اور طوفان گزر گیا، یہ کیسی دنیا، جو دلوں کو

فتح کر لے (گاندھی جی پر) جوار بھاٹا، ستاروں کی بستی، یہ کوٹ، سایہ بھی نہیں جن کا ساتھی، یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ، سناٹا، محبت میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، منزل منزل اور گڑیا گھر وغیرہ۔(175-172)

نذیر محمد خاں (پ 1928 حیدرآباد) اکاونٹنٹ جنرل آفس حیدرآباد سے وابستہ تھے۔ ایک ڈراما محض تفننِ طبع کی خاطر قلم برداشتہ لکھا اور اس فن کے ایسے شیدا ہوئے کہ پھر اُسی کے ہو رہے، کچھ 35 یا 40 ریڈیائی ڈرامے تحریر کیے، جو کامیابی کے ساتھ نشر کیے گئے۔ معین امر کی تحقیق کے مطابق اُن کے کچھ اہم ڈرامے یہ ہیں: دیوتا، کھوٹے سکّے، اجنتا کے بعد، سحر ہونے تک، بازگشت، کھنڈر، محمد قلی قطب شاہ، آئینہ کیوں نہ دوں، چھوڑی ہوئی منزل، مسافر، کیمیا گر، رقصِ شرر، نجم السحر اور آواز وغیرہ۔ (ص 183) نذیر محمد خاں کو اپنا ڈراما 'پودے' بہت پسند تھا۔ افسوس کہ اُن کے یہ ڈرامے کہیں شائع نہیں ہوئے۔

پروفیسر انور معظم (پ 1928 حیدرآباد) علی گڑھ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد کے اسلامک اسٹڈیز سے وابستہ ہوئے اور یہیں سے سبکدوش ہوئے۔ مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو سے آپ کی شادی ہوئی اور دونوں نے اردو ڈرامے کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ پروفیسر انور معظم نے سو کے قریب ریڈیائی ڈرامے لکھے، جو حیدرآباد اور اورنگ آباد کے علاوہ دہلی اور اکسٹرنل سروس سے نشر ہوئے۔ اُن کے کچھ مشہور ریڈیائی ڈراموں کے نام یہ ہیں: عورت کی موت، پتھر اور پھول، ویر کنال، زنجیر، پتھر اور دیوتا، شعلہ و شبنم، اتنی سی بات، آخری شام، ملک خوش نود، مے خانہ خالی ہے، بچوں کی عدالت، بچوں کی ہڑتال، جون آف آرک اور جل سندری کب آئے گی (غنائیہ) وغیرہ۔(203-201)

غلام یزدانی (پ 1922) عثمانیہ یونی ورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد اکاونٹنٹ جنرل آفس سے منسلک ہوئے اور یہیں سے ڈپٹی اکاونٹنٹ کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ ڈرامے اور موسیقی سے فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ آپ نے دکن ریڈیو سے ڈراموں اور موسیقی کے کئی پروگرام پیش کیے۔ اُن کے کچھ ڈراموں کے نام یہ ہیں: زندگی کے کنارے، حادثۂ شوق، دوسرا سفر، شطرنج، سرنگ، پھر سہی، شادی کی سالگرہ، برخوردار، مکر چاندنی، ایک

کہانی بڑی پرانی، دو منٹ، مشینوں کی سال گرہ، خواب، امتحان، بھائی جان، امتحان کی رپورٹ اور ریل وغیرہ۔ (ص 215-214) ان میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں قسم کے ڈرامے شامل ہیں۔

غلام جیلانی (پ 1926 اورنگ آباد) عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد سے ایم ایس سی کا امتحان نہایت اعزاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ اُنھیں ڈرامے اور موسیقی دونوں سے لگاؤ تھا۔ وہ ایک کامیاب صداکار بھی تھے۔ اُن کے معروف ڈرامے یہ ہیں: روپ انوپ، دوسرا کنارا، ہم راہی، دوراہا، زندگی کی راہیں، چائے پر، طوفان کے بعد، چٹان، سبز باغ، فلم اسٹوڈیو میں، ایک سے سو تک، برکھا آئی اور گھر کیسے چلے وغیرہ (220-219)

پروفیسر مغنی تبسم (2013-1930) اردو دنیا کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ آپ ایک صاحب طرز شاعر، بالغ نظر ناقد اور دانشور تھے۔ آپ کی تصانیف اور آپ کا جاری کردہ ادبی رسالہ 'شعر و حکمت' اردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معین امر کا اطلاع کے مطابق آپ نے ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے تھے۔ ان میں 'شادی کی آخری سالگرہ' اور 'خوبی اپنی مثال آپ ہیں۔ علاوہ ازیں، فانی بدایونی پر آپ کا فیچر 'فانی کی ذات سے غم بستی کی تھی نمود' کافی مقبول ہوا تھا۔ (ص 231-230)

جیلانی بانو (پ 1936) بھی محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ وہ ایک نامور افسانہ نگار ہیں۔ اردو افسانے کے چند بڑے ناموں میں اُن کا بھی نام شامل ہے۔ معین امر نے صحیح لکھا ہے کہ یہ انکشاف کم دل چسپ نہیں ہے کہ جیلانی بانو نے لکھنے کا آغاز افسانے سے نہیں بلکہ ڈرامے سے کیا تھا۔ اُن کا پہلا ڈراما 1958 میں نشر ہوا۔ جیلانی بانو کے قابلِ ذکر ڈرامے حسب ذیل ہیں: دو بچے، بڑے لوگ، کمودنی، اکیلا، آٹوگراف، دور بین، دل کی آواز، دشت وفا، پیاسی چڑیا، آدم سے آدمیت تک، نفرت اور کھیل وغیرہ (239-238)

عوض سعید: (پ 1934 حیدرآباد) نے اردو کو کئی عمدہ افسانے دیے۔ تاہم اُنھوں نے ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں جو حیدرآباد کے علاوہ ودھ بھارتی سے بھی نشر ہوئے۔ اُن کے یہ ڈرامے اہم سمجھے جاتے ہیں: قلی قطب شاہ، رانی جھانسی، ریت کی دیوار، آگہی، دو روپ، میجک بکس، آٹھ سو چالیس، دھندلے راستے، پھول سدا مہکیں گے اور ہم زاد وغیرہ (252)

اظہر افسر (پ 1923) کا اختصاص یہ ہے کہ اُنھوں نے سب سے زیادہ ڈرامے لکھے؛ کچھ 900 کے قریب۔ نسیم بک ڈپو لکھنو نے اُن کے ڈراموں کے پانچ مجموعے، بھول ہی بھول، موج در موج، چچا غالب، نارنگی کی خوشبو، انمول نگینے اور ترقی اردو بیورو نے 'بچوں کے ڈرامے' شائع کیا۔ اظہر افسر کے چند ڈراموں کے نام یہ ہیں۔ شگوفے، غالباً مکتبِ عشق، طرم خاں کی دھارکاری، نشاطِ بے خودی، دولہا دلہن، درسِ محبت، صبحِ عید، حادثے، سوسنار کی، تم روٹھے ہم چھوٹے، حق بہ حق دار، چراغوں کی رات، اتنی ہمت، موج در موج، رشتہ، تنگ شیروانی، کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، بھول ہی بھول، مجھے سونے دو عرف دھنک، کھڑکی کا راز، پہلی بات، بڑا لڑاکا، حضرت پیمانہ، عید بھی آئی تو، معصومیت شیشے کی دیوار، سانولی، امراؤ جان ادا، غالب، ذوق، مراۃ العروس، دس کا نوٹ، جوئے حیات، عید کا پان، صدائے جاوداں، رات کا کھانا، زحمت، دھرتی کا سورگ، صاحب جی، اور تعمیرِ آرزو۔ وغیرہ (ص 321-320)

اشرف مہدی (پ 1940 حیدرآباد) کے پچاس کے قریب ڈرامے آل انڈیا ریڈیو کے نیرنگ پروگرام سے نشر ہو چکے ہیں۔ اُنھوں نے سماجی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر ڈرامے لکھے ہیں۔ چوں کہ وہ ریڈیائی ڈراموں کو اشاعت کی چیز نہیں سمجھتے، اپنا کوئی مجموعہ شائع نہیں کیا۔ اُن کے معروف ڈراموں کے نام یہ ہیں: زنانی مشاعرہ، برخود غلط، ڈپلومیٹ بھوت، ڈنڈ غفور، ہنسی ہنسی میں، پتھر کے آنسو، آسرا، اچھے نواب، خوش حالی کا پیغام، تین دن قیامت کے، اُجالوں کا راستہ، سنہری شام، لہو پکارے گا، خونِ دل، دور کے ڈھول، خلش کے رشتے، طوفان، تاریکی اور روشنی، ہاتھوں ہاتھ، پگڈنڈیاں، شیخی بری بلا ہے، احمد اسکول کیوں نہیں جاتا، سچا سب میں اچھا، راستے کے پتھر، کبوتر اور شکاری، مگرمچھ اور بندر اور سندباد جہازی وغیرہ (ص 271 -270)

جمیل شیدائی (پ 1943 حیدرآباد) کے ڈراموں کا ایک مجموعہ لبِ گفتار زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اُن کے ڈرامے شب خون، شاعر، سب رس اور شگوفہ وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ جمیل شیدائی کچھ دن فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ میں زیرِ تعلیم رہے۔ اُنھوں نے انگریزی ڈرامے کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اُن کے ڈراموں میں یہ کافی مشہور ڈرامے ہیں: واردات، کلورین کا دھواں، اعتراف، اغوا، برتر از اندیشہ، شکار، دس اولٹ کا شک شاک، نقشِ قدم، شریر،

جائیں کہاں، روشن دان، نور کی تلاش، گارتی، گھنٹے فاصلے، امتحان در امتحان، تلاش گمشدہ، ملسری کا پیڑ، انتخاب، سگریٹ برانڈی بگونہ، اپروچ، چارہ گر، تشنہ کام اور مجرم وغیرہ۔ (282-281)

قدیر زماں (پ 1933 حیدرآباد) افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے افسانوں میں ابہام کا رنگ غالب ہے۔ البتہ جو ڈرامے اُنھوں نے لکھے ہیں، اُن میں یہ اُسلوب نہیں ملتا۔ اُن کا پہلا ڈراما 'کال بیل' ہے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے مسلسل ریڈیائی ڈرامے تحریر فرمائے جو کامیابی کے ساتھ نشر کیے گئے۔ اُن کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'پنجرے کا آدمی' شائع ہو چکا ہے۔ اُن کے کچھ ڈراموں کے نام جو اس مجموعے میں شامل ہیں یہ ہیں: کال بیل، لکڑہارا، پروفیسر لنگڑا گھوڑا، حادثہ، اور بادِ خزاں وغیرہ۔ (ص288)

پروفیسر بیگ احساس (پ 1948 ورنگل) افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے افسانوں کے دو مجموعے 'خوشہ گندم' اور 'حنظل' شائع ہو چکے ہیں۔ ریڈیو کے لیے بھی افسانے، ڈرامے اور فیچر لکھے ہیں۔ اُن کے نشری ڈراموں کے نام یہ ہیں: خاموش چیخ، تاریک اُجالا، آزمائش، ٹوٹا ہوا واسطہ، روشن اندھیرا، کٹھ پتلی اور زندگی زندگی وغیرہ (ص292)

قادر علی بیگ (پ 1938) کا شمار حیدرآباد کے نام ور ڈراما نگاروں، اداکاروں اور ہدایت کاروں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اردو ڈرامے کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ مرہٹی سے واقفیت کی بناء پر اُنھوں نے کچھ مرہٹی ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اُن کے ریڈیائی ڈراموں کا ایک مجموعہ 'ریشم کی ڈور' منظرِ عام پر آچکا ہے جس میں درج ذیل پانچ ڈرامے شامل ہیں جب جب پھول کھلے، احساس کی چنگاری، دائرے ہی دائرے، آدمی کی قیمت اور ناسور وغیرہ (ص306)

عثمان شیدا (پ 1938 حیدرآباد) نہ صرف ڈرامے لکھتے ہیں بلکہ وہ کُل ہند سطح پر ڈراموں کا مقابلے بھی کرواتے ہیں۔ اُن کے تقریباً 50 ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ اُن کے کچھ ڈراموں کے نام یہ ہیں: چاندی کی دیوار، شاکیانی، نقلی چہرے، آئینہ، احساس، سچائی کی جیت، قاتل، حسرتوں کی دنیا، نجات اور تقدیر وغیرہ (ص314)

معین امر کی تحقیق 1987 کے ڈراموں کو محیط ہے، جو اُن کی کتاب 'حیدرآبادی مصنفین کی ریڈیائی ڈرامے' میں موجود ہے۔ اُس کے بعد ریڈیائی ڈراموں کا سلسلہ جاری ہے۔ تاہم

کچھ تو ٹیلی ویژن کی ترقی اور بہت کچھ ریڈیائی ڈرامہ نگاروں کی عدم دلچسپی کے باعث ریڈیائی ڈرامہ نگاری کا وہ زور دکھائی نہیں دیتا جو اس سے قبل تھا۔ آج ہم اس کی تاریخ کو مرتب کرنے کی کوشش کریں گے تو سب سے پہلی دقت یہ پیش آتی ہے کہ کسی کے پاس اُس کی تفصیلات نہیں ہیں اور ایسا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ ہم اُس سے استفادہ کر سکیں۔ تاہم میں نے اس مضمون کے لیے میرے ایک ریسرچ اسکالر جہانگیر کی مدد سے کچھ اہم ڈرامہ نگاروں اور اُن کے ڈراموں کی تفصیل حاصل کی ہے، جو کچھ اس طرح ہے: محبوب خان اصغر (ایک آنگن کئی لکیریں، وھیل چیر، بینائی روتی ہے) جمیل شیدائی (فاصلے، سازش، بزدل) رووٗف انور (دوسرا رشتہ، انجام) قمر جمالی (ریشماں، جب چاند نکل آئے، تخلیق، آنسو، تنہائی، جام تیرے لیے) سید حامد علی (شانتی، سراب، بھیگی پلکیں) پرویز یداللہ مہدی (سامان تو گیا، گھر کی مرغی دال برابر) صابر حسین (دوسرا اجنبی، آشنا اپنا) محمود حامد (نقلی کون؟) راشد آذر (یلورا) یٰسین بانو (جدائی) رفیعہ منظورالامین (سنگدل، تہمت، ضد) غلام جیلانی (بھائی بھتور تمے جائیں گے کتنی دور) جاوید کمال (جل تو جلال تو، تصویر مسکرا اُٹھی) وغیرہ۔ میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے اس سے پہلے کہ وہ چند لوگ جن کے سینوں میں یہ معلومات مخزونہ ہیں۔

حیدرآباد اب دھیرے دھیرے دکنی اردو کی فلموں کا مرکز بن رہا ہے۔ پچھلے دس بارا برسوں سے یہاں فلمیں اور ٹیلی فلمیں بن رہی ہیں۔ شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد کے ایک سابق ریسرچ اسکالر عذیر انصاری کو فلمی لائن سے دلچسپی ہے۔ میری درخواست پر اُنھوں نے حیدرآباد میں فلم اور ٹیلی فلم کے فروغ کے تعلق سے درجِ ذیل معلومات فراہم کی ہیں۔ میں اُن کے شکریے کے ساتھ ان معلومات کو اس مضمون کا حصہ بنا رہا ہوں۔

حیدرآباد کی پہلی باقاعدہ فلم 'حیدرآباد بلو' (Hyderabad Blue) ہے۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں حاصل ہوسکیں۔ دوسری فلم 'انگریز' ہے جو ایک کامیڈی فلم ہے اور نہایت سلیقے سے فلمائی گئی ہے۔ یہ فلم تھیٹروں میں نہایت کامیابی سے دکھائی گئی اور کہا جاتا ہے کہ اس نے کم سے کم 25 کروڑ کا بزنس کیا۔ فلم کی زبان دکنی اردو ہے جو حیدرآباد میں بولی

جاتی ہے۔اداکاراور دیگرفن کار حیدرآباد ہی کے ہیں۔اس فلم کے بعد جس نے دھوم مچائی وہ فن اور مستی ہے۔ جسے فلم بینوں نے بے حد پسند کیا اور سراہا۔

ذیل میں حیدرآباد میں بننے اور تھیٹروں میں دکھائی جانے والی فلموں اور اُن کے ہدایت کاروں کے نام دیے جاتے ہیں۔انگریز (2005 کنٹا نکل فلمز) چار مینار بوائیز (2006، باسط خان) حیدرآباد نوابس(2006 سری نیواس ریڈی۔بی)ہنگامہ ان دوبئی (2007 مسعودعلی) سلام حیدرآباد (2007رام) آداب حیدرآباد 2007 سنجے پنجابی)فن اور مستی (2007 شیکھر سوریا)حیدرآباد بکرا (2008 مسعودعلی)ہاف فرائی (2009 سنجے پنجابی)تھرلر (2009 عزیز ناصر) بے روزگار(2010 عزیز ناصر،انیل بوئی ڈاپو)گلو دادا رٹرنس (2010 عزیز ناصر انیل بوئی ڈاپو)زبردست 2011 عزیز ناصر)سب کی بولتی بند (2011الیکا چودھری وے ملا) فیملی پیک (2011انیل)ان کی تو ایسی کی تیسی

(2011 سکندر)جا بھائی جا(2011 سنجے پنجابی)ماموں ٹینشن نیں لینے کا(2011 حبیب ناصر) تھینک گاڈ اپنی تو نکل پڑی (2011امجد)گلوداد ا3(2012ابرارخان) ایک تھا سردار (2013 سکندر)پیسہ پوتی پرابلم (2013یس حسین)گلو دادا 4(2014ابرار خان)اور چار شانے (2014 ملک عباس) وغیرہ۔

حیدرآبادی زبان میں بننے والی بالی ووڈ فلموں کی بھی ایک تاریخ ہے۔شیام بنگل کی فلم 'انکور' پوری دکنی اردو میں لکھی اور بنائی گئی ہے۔ اسی طرح نئی فلموں میں' بابی جاسوس' اور 'دعوتِ عشق' دکنی اردو میں بنی ہیں۔

کچھ فلمیں جو DVD کی شکل میں ریلیز کی گئیں وہ یہ ہیں:اُچھلتا نیبو (2011، سکندر) کرمحنت کھا نعمت (2011،سکندر) ڈیڑھ متوالے بابا(2011،حمید عالم) سودخور کا انجام (2012،شبیر خان اور عابد رشید) ریڈی میڈ دولھا (2013،نعیم احمد وغیرہ۔ آنے والی ڈی۔ وی۔ ڈی فلموں میں 'نصیحتیں' کا چرچا ہے۔آنے والی دیگرفلموں میں انگریز 2 (کنٹا نکھل)، شیر دکن (اطہر یم خان)،چھونا ہے آسمان (اطہر ایم خان) وغیرہ۔

ان بڑی فلموں کے علاوہ حیدرآباد میں مختصر فلموں کا بھی رواج ہے جو اردو میں بنتی

ہیں۔ان فلموں میں عذیر انصاری مقدر جن کا ذکر اوپر آچکا ہے کی مختصر فلم Peace National Integerity سنہ 2013 میں بنی جو Indialogue Foundation IS Film contest University of,Communicatio &Sarojin Naidu School of Arts Hyderabad کے بیانر تلے بنایا گیا۔اپنا انڈیا (2013،دانش خان) پھنس گیا رے پوٹا (2012،تلنگانہ شارٹ فلمز) موت کا دھواں (2013،عزیز ناصر) دعا (2012،دانش خان) حیدر 2013،اوناش مفا) رودرا اوتار (2013،دانش خان، سنجے ست پتی) وغیرہ

مشترکہ آندھرا پردیش میں اردو ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، اردو فلموں اور اردو مختصر فلموں کے فروغ کے پیچھے کسی پیشہ ورانہ ذہنیت کے بجائے اردو کے لیے خلوص اور انتھک محنت کرنے کا جذبہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔جس کسی نے بھی یہ راہ اختیار کی اُس نے ایک جنون کے تحت کام کیا اور کام کر رہا ہے۔اسی جنون میں اُس کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

○

کتابیات:

الانصار، ادبی رسالہ، جلد 5، 2007-08 کتاب 6-5، اسد ثنائی (مدیر) ادارہ الانصار، حیدرآباد۔

حیدرآبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے، محمد معین امر، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد 1987

رائل سیما میں اردو ڈراما: یوسف صفی کے خصوصی حوالے سے، (غیر مطبوعہ مقالہ) شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد 2008

کل کی دھوپ، یوسف صفی، طاہر پبلی کیشنز، کڈپہ۔آندھرا پردیش۔ 2007

انٹرنیٹ:

www.baigtheatrefoundation.com

khanservices 1/you tube

اکیسویں صدی میں ہندوستانی اسٹیج اور اردو ڈراما

ڈاکٹر محمد کاظم

شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ہندوستان میں ڈراما کی ابتدا زمانہ قدیم میں ہوئی بلکہ یہ امر اب تک زیر بحث ہے کہ ڈرامے کی ابتدا سب سے پہلے ہندوستان میں ہوئی یا یونان میں۔ چونکہ یہ فیصلہ نہیں ہو سکا ہے اس لیے ہم یہ کہیں کہ ڈراما ہندوستان میں پہلے پہل کھیلا گیا تو بے جا نہ ہوگا۔ جس ملک نے نہ صرف ڈرامے کی بنیاد رکھی بلکہ ڈرامے کی تنقید کا پہلا نمونہ 'ناٹیہ شاستر' کی شکل میں پیش کیا وہاں ڈرامے کا پھلنا پھولنا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ سنسکرت ڈرامے کے زوال کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں لوک ناٹکوں کی شکل میں یہ آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر انھیں لوک ناٹکوں اور رقص و سرود کی محفلوں سے متاثر ہو کر اردو میں ڈرامے لکھے اور کھیلے گئے۔ خواہ وہ واجد علی شاہ ہو یا امانت لکھنوی، دونوں کے رہس اور ڈراموں پر اس کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

اردو ہی نہیں بلکہ تمام زبانوں میں ڈرامے کی ابتدا کھیلے جانے سے ہوئی۔ اردو کے ابتدائی ڈرامے سے لے کر پارسی تھیٹر، پرتھوی تھیٹر، اپٹا، ہندوستانی تھیٹر، نیا تھیٹر اور دلی

آرٹ تھیٹر تک کے سفر پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ڈرامے پہلے کھیلے گئے بعد میں شائع ہوئے۔ بلکہ بہت سے ایسے ڈرامے کا ذکر ملتا ہے جو بہت بار اسٹیج کی زینت بنے لیکن اسے شائع ہونے کا شرف حاصل نہیں ہو سکا بلکہ آج بھی بہت سے ڈرامے اسٹیج پر کامیابی سے کھیلے جاتے ہیں لیکن اسے شائع ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ وجہ صاف ہے کہ ناقدین ادب ڈرامے کو ادب کی پہلی صف تو دور دوسری اور تیسری صف میں بھی جگہ دینے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ڈرامے کا تجزیہ یا اس پر تنقید کرنے کے لیے اسے اسٹیج پر دیکھنا بھی ضروری ہے اور ہم اردو کے ادیب و نقاد تو ہمیشہ ایک میز پر فیصلہ صادر کرتے ہیں اور دوسری میز پر اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ یعنی ادب ایک میز سے دوسری میز کا سفر کرتا ہے جب کہ ڈرامے کے لیے یہ سفر غیر فطری ہے۔ اور اس غیر فطری عمل کو جائز ٹھہرانے کے لیے ہمارے ادیب و نقاد نے نئی اصطلاح ایجاد کی 'ادبی ڈرامے' کی۔ یہ اصطلاح صرف ڈرامے کے ساتھ کیوں مخصوص کی گئی اس پر غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ کچھ اور نہیں بلکہ اس کی وجہ سہولت پسندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ڈرامے کی تنقید اب تک نہ اس مقام تک پہنچ سکی اور نہ ہی وہ اعتبار حاصل کر سکی جو دوسرے اصناف ادب کی تنقید کو حاصل ہے۔ کم و بیش تمام تنقید نگاروں نے ڈراما کو اسٹیج پر دیکھنے کے بعد اس کا محاسبہ کرنے کے بجائے اسے کاغذی پیراہن میں دیکھ کر فیصلہ صادر کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانے تک اردو ڈرامے نے ہندوستانی ڈرامے کی نمائندگی کی ہے۔ آزاد ہندوستان میں ابتدائی تیس برسوں تک اسی کا بول بالا رہا ہے اور آج بھی ڈرامے کے فنکاروں کی تربیت کے لیے اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔

ہندوستان میں اسٹیج کے موجودہ منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانب اس کے ناظرین کی تعداد میں کمی آئی ہے تو دوسری جانب یہ دوسرے بہت سے میڈیم کی ضرورت بن گیا ہے۔ مثال کے طور پر ٹیلی ویژن اور فلم کے جن اداکاروں اور فن کاروں کا تعلق اسٹیج سے رہا ہے وہ نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ ان کی اداکاری میں حقیقت کا عنصر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں ڈرامے کے ناظرین کی تعداد کم ہونے کے باوجود اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اب ڈرامے پیش کرنے کی سہولت

میں اضافہ ہوا ہے۔ مرکزی حکومت کے ساتھ ساتھ کم و بیش تمام ریاستوں میں ڈرامے کے فروغ کے لیے اکادمی یا وزارت ضرور موجود ہے۔ اور اس کا فائدہ اردو ڈراما بھی اٹھا رہا ہے۔ اردو ڈراما کسی بھی صورت میں کسی بھی دوسری زبان کے ڈرامے سے کم تر نہیں ہے۔ وہ نیشنل اسکول آف ڈراما ہو یا ڈرامے کی دوسری تربیت گاہ، ہر جگہ اسے نہ صرف اپنایا جا رہا ہے بلکہ کسی بھی فنکار کا ڈکشن اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک وہ اردو ڈرامے کو اسٹیج پر پیش کرتے ہوئے اس سے منسلک نہ ہوں۔ ہندوستان میں منعقد شاید ہی کوئی فیسٹیول ہو جس میں اردو ڈراما نہ شریک کیا جاتا ہو۔ بلکہ کئی فیسٹیول تو خالص اردو ڈراموں کے ہی منعقد کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے کم و بیش تمام بڑے شہروں اور زیادہ تر ریاستوں میں اردو ڈرامے اسٹیج کیے جاتے ہیں اور دوسرے شہروں یا ریاستوں سے مدعو بھی کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر نیشنل اسکول آف ڈراما کے ذریعے منعقد ہونے والے انٹر نیشنل فیسٹیول میں ہر سال ہندوستان کے ساتھ ساتھ غیر ممالک سے بھی اردو ڈرامے کھیلنے کے لیے ڈراما منڈلی کو مدعو کیا جاتا ہے۔ دہلی اردو اکادمی پچھلے چھبیس برسوں سے پابندی سے ہر سال پانچ یا چھ دنوں کا اردو ڈراما فیسٹیول منعقد کرتی آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اکادمی اور ادارے اردو ڈراما فیسٹیول کا اہتمام کرتے ہیں یا اردو ڈرامے کو اپنے فیسٹیول میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور یہ دعوت اس کے معیار کو دیکھتے ہوئے ہی دی جاتی ہے بلکہ اکثر اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں اسٹیج پر پیش کیے جانے والے اردو ڈراموں پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ہندوستان کی دوسری تمام زبانوں میں کھیلے جانے والے ڈراموں سے کسی بھی سطح پر کم تر نہیں ہے۔ وہ تجربے کی سطح پر ہو یا موضوعات کی، وہ معیار کی سطح پر ہو یا فن و تکنیک کی، ہر سطح پر اپنی موجودگی کا احساس کرا رہا ہے۔ جو ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں ان میں اردو کے طبع زاد ڈرامے ہیں تو ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں کے ڈراموں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ وہ لوک ناٹک کے فارم میں کھیلے جا رہے ہیں تو کم و بیش تمام قسم کے تجربے بھی کیے جا رہے ہیں۔ ہندوستانی اور غیر ملکی ڈراموں کو اڈپٹ کیے جا رہے ہیں تو مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی طبع زاد کہانیوں اور ناولوں کو من و عن اسٹیج پر پیش کیا جا رہا ہے جسے کتھا کولاج یا کہانی کا رنگ منچ

کا نام دیا گیا ہے۔ اردو میں سولو پرفارمنس کے تراجم ہوئے ہیں تو طبع زاد بھی لکھے گئے ہیں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک میں بھی کھیلے جا چکے ہیں۔

ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر ڈرامے میں جو تبدیلی اور تجربے ہوئے ہیں اس میں اردو ڈراما کہیں بھی پیچھے نظر نہیں آتا۔ بلکہ کئی سطحوں پر تو عالمی سطح پر ہم نے متاثر کیا ہے۔ بریخت کی پوری تھیوری خالص ہندوستانی ہے۔ ہاں اسے صرف نام بریخت نے دیا ہے یعنی Theory of Alienation۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں لوک روایتوں میں فنکار اداکاری کرتے کرتے پان کھا لیتا ہے، حقہ پی لیتا ہے، انعام کے طور پر کچھ ملنے پر پرفارمنس کے درمیان ہی اس کا اعلان کرتا ہے وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں وہ اپنے کردار سے باہر نکل کر ایک عام انسان کے طور پر کرتا ہے یہی تو ہے یہ تھیوری آف الینیشن۔ ہمارے یہاں یہ عام رہا ہے ان کے یہاں یہ خاص ہو گیا۔ اسی طرح اور بھی کئی تجربے جو عالمی سطح پر Theorise کیے گئے لیکن وہ ہماری زندگی میں شامل رہا۔

اب اگر اکیسویں صدی کے منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان دنوں اردو ڈراما اور اسٹیج نے ترقی کی ہے۔ کم و بیش ہندوستان کے تمام بڑے شہروں کے سفر کے بعد جو ڈاٹا مجھے ملا ہے اس سے کہیں بھی مایوسی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہاں اردو ڈرامے کی تنقید پر نظر ڈالتے ہیں تو مایوسی ضرور ہوتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ اردو میں ڈرامے کھیلے ہی نہیں جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب کی دوسری اصناف کی مانند ڈرامے کی تنقید کے ساتھ بھی خالص اکیڈمک رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ڈرامے کا مطالعہ کرتے وقت یا اس پر لکھتے وقت ہم صرف اس کی زبان کا خیال رکھتے ہیں جبکہ ڈرامے کی زبان کا تعین اس کا پلاٹ اور کردار کرتا ہے نہ کہ ڈراما نگار کے بس میں ہوتا ہے۔ ہمارے ناقدین یہ بھول جاتے ہیں کہ ڈراما ایک ایسا فن ہے جس میں صرف بولے جانے والے بامعنی الفاظ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہمیت ان خاموشیوں اور حرکات و سکنات کی ہوتی ہے جو کردار مختلف اوقات میں اپنے مختلف احساس کے اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے۔

دوسری اہم بات جو اردو ڈراما نگاروں کے پیش نظر نہیں ہوتی وہ اس کی پیش کش ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ نہ صرف اردو ڈراما بلکہ ڈرامے کی ابتدا ہی کھیلے جانے سے ہوئی۔ اردو ڈرامے نے بھی پارسی تھیئٹر تک شائع ہونے کے بجائے کھیلنے پر اپنی تمام توجہ مرکوز کی یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں ڈراموں کے کھیلے جانے کا ذکر تو ملتا ہے لیکن تمام اسکرپٹ اب تک نہیں ملی ہیں۔ پارسی تھیئٹر کے منشیوں کو ناقدین ادیبوں میں شمار نہیں کرتے۔ وجہ صاف ہے کہ ان فنکاروں کے پیش نظر ڈراما اور اسٹیج ہوتا تھا نہ کہ اسٹیج کے بارے میں نہ جاننے والے ادیبوں اور ناقدین کے اصول۔ اردو ادب کے ایک اہم ادیب یعنی مرزا محمد ہادی رسوا نے تھیئٹر کی زبان جو دراصل کردار کی زبان ہوتی ہے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں اخلاق اثر کے الفاظ دیکھیں:

> مرزا محمد ہادی نے ڈرامے کی زبان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ مرزا محمد ہادی نے تھیئٹر کے فن کو نظر انداز کر کے اپنی پوری توجہ ادبیت پر مبذول کر دی اور ان کی تخلیق ڈرامے کے معیار پر کھوٹی ثابت ہوئی۔ نقصان صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ اردو ڈرامے کو ایک ذہین، تخلیقی اور تجربہ کار فنکار سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ ان کے تصورات نے مستقبل کے ڈراما نگاروں اور ناقدوں کو گمراہ کیا۔ فرض کر لیا گیا کہ تھیئٹر اس وقت ترقی کر سکتا ہے جب ادبی ڈرامے تحریر کیے جائیں۔ اس مقصد کے تحت نہ صرف ادبی ڈرامے تحریر کیے گئے بلکہ ڈرامے سے متعلق تنقیدی مضامین میں ڈرامے میں ادبی مضامین، ڈرامے میں ادبی محاسن کو ایک اہم ضرورت اور معیار تسلیم کیا گیا۔
>
> (اخلاق اثر، اردو ڈرامے کا مطالعہ، صفحہ 12)

اس مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے پارسی تھیئٹر کے عروج کے زمانے میں ہی بہت سوچ سمجھ کر ایک ایسا ڈراما لکھا گیا جو اس زمانے میں کیا اب تک اسے اس کی اصلی صورت میں نہیں کھیلا جا سکا ہے اور وہ ڈراما کوئی اور نہیں بلکہ ہمارے ناقدین ادب کی نظر میں شاہکار 'انارکلی' ہے۔ انارکلی نے اردو ڈرامے کو اسٹیج سے دور کرنے میں جو کارنامہ انجام دیا ہے اسے ڈرامے کے فنکار کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اگر انارکلی نہ لکھا جاتا تو اردو ڈراما اور اسٹیج کی صورت حال آج نہ صرف روشن ترین ہوتی بلکہ ہندوستان میں آج ملک و قوم کی شناخت ہوتی۔ انارکلی نے

ایسے بہت سے ادیبوں کو ڈراما نگار بنانے میں مدد پہنچائی جو ڈرامے کے فن سے واقف نہیں تھے اور مکالمے کی صورت میں لکھی جانے والی ہر تحریر کو ڈراما کی صورت میں پیش کر کے خود کو ڈراما نگار کی صف میں کھڑا کر لیتے۔ اور اس صف میں کھڑے ہر شخص کو ہمارے ناقدین نے نہ صرف اہم ڈراما نگار بنا دیا بلکہ ان کی تحریر کو شاہکار کہنے میں بھی عار محسوس نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما تحریر کرتے وقت نہ تو ان ڈراما نگاروں کو اسٹیج کا علم تھا اور نہ جاننے کی کوشش کی۔ پھر ان کے ڈراموں میں اسٹیج کے لوازمات کا خیال کہاں نظر آئے گا۔ جب ہم پچھلے دس پندرہ برسوں کے شائع شدہ ڈراموں کو دیکھتے ہیں تو ان میں کئی ڈرامے ایسے نظر آتے ہیں جن میں ڈھائی تین سو کردار ہیں اور تمام کردار ایک ہی زبان میں بولتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب ذرا کوئی مجھے بتا دے کہ اتنے کرداروں کو پیش کرتے وقت کیا ان ڈراما نگاروں نے ان کرداروں کی کردار سازی بھی کی یا صرف ان کے منہ میں مکالمے کی صورت میں کچھ بھی ڈال دیا ہے۔

محمد حسن لکھتے ہیں:

> ڈرامے میں فکری گہرائی پیدا ہونی چاہیے اور اس میں حقیقی تجربات اور جذبات ہونے چاہئیں۔ ڈرامہ میں کردار نگاری کی اعلیٰ مثالیں اور سماجی زندگی کی نمائندہ پہلوؤں کی ترجمانی ہونی چاہیے تبھی اردو ڈرامہ کو زندہ صنف ادب بنایا جا سکتا ہے۔
>
> (محمد حسن، اردو ڈراما آزادی کے بعد، آجکل ڈراما نمبر، 1959، صفحہ 29)

اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اخلاق اثر کی زبان میں کہا جا سکتا ہے:

> جن ڈراما نگاروں اور ناقدوں نے ڈرامے کو صنف ادب بنانے کی کوشش کی انھوں نے ڈرامے کو بے جان بنا دیا۔ در اصل ڈرامے کی ادبی زبان اور ڈرامائی زبان میں فرق ہے۔ ڈرامے کی ادبی زبان ڈرامے کے لیے ناموزوں ہوتی ہے اور تھیٹر کے فن میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔
>
> (اخلاق اثر، اردو ڈرامے کا مطالعہ، صفحہ 15)

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ جتنے ڈرامے شائع ہوئے ہیں سب اسی زمرے میں

رکھے جانے والے ہیں بلکہ کچھ ڈرامے ایسے بھی ہیں جو کامیابی سے کھیلے جا چکے ہیں اور شائع بھی ہوئے ہیں۔ موجودہ دور کے ان ڈراما نگاروں میں جن کے ڈرامے کھیلے جانے کے ساتھ ساتھ شائع بھی ہوئے ہیں ان میں شاہد انور، کمال احمد، ظہیر انور، اقبال نیازی، اسلم پرویز، جاوید صدیقی، نادرہ ظہیر، ایم مبین، آفتاب حسین، اشتیاق سعید، اظہر عالم، قدیر زماں، روشن تقی، نورالعین علی، سی ڈی سدھو، یوگ راج، میرا کانت، تری پراری شرما، مہیندر بھلا، نرندر موہن، ونے ورما، اوما جھن جھن والا وغیرہ جیسے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اور جن ہدایت کاروں نے موجودہ دور میں بھی اردو ڈرامے کو تیار کر کے نہ صرف عوام کے درمیان پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا بلکہ اسے عالمی سطح پر سرخ رو کیا ان میں ایم ایس ستھیو، کے ایس راجندرن، رام گوپال بجاج، موہن مہرشی، فیروز خان، نادرہ ظہیر، تری پراری شرما، اجے منچندہ، اروند گوڑ، این کے شرما، سمن کمار، دیوندر راج انکر، عبداللطیف کھٹانا، ایم سعید عالم، انورادھا کپور، انامیکا ہکسر، فیصل القاضی، بیری جان، سلیم عارف، مشتاق کاک، جاوید اختر، پرویز اختر، تنویر اختر، رجب جعفری، الطاف قاضی، انیس جاوید، مجیب خان، عنایت قاضی، وقار قادری، شیلی ستھیو، اظہر عالم، سید حیدر علی، ایس ایم راشد کے علاوہ سیکڑوں جنونی لوگ اس فہرست میں شامل ہیں۔ اور اگر اداکاروں کو بھی دیکھیں تو اردو ڈرامے کو وہ تمام بڑے اداکار ملے جن کے لیے دوسری ہندوستانی زبانوں کے ڈرامے ترستے رہے۔ ان اداکاروں میں ٹام الٹر، نصیرالدین شاہ، انوپم کھیر، شبانہ اعظمی، سنالی بندرے، فاروق شیخ، جوہی ببر، دیوان شاہ، مہیش میواتی، پیوش مشرا، پونم گردھانی، سیما اعظمی، شری وردھن، بیری جان اور اس طرح کے بہت سے نام شامل ہیں۔

ان تمام ڈراما نگار، ہدایت کار، اداکار اور دوسرے فنکاروں پر الگ الگ گفتگو کرنے کی گنجائش یہاں نہیں ہے اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ نمونے کے طور پر ان چند نئے پرانے ڈراموں کی فہرست پیش کر دی جائے جو پچھلے تیرہ چودہ برسوں میں کھیلے جا چکے ہیں:

ڈراما	ڈراما نگار/مترجم	ہدایت کار	سال پیشکش
خوبصورت بلا	آغا حشر کاشمیری	ہیما سنگھ	2001
یہودی کی لڑکی	آغا حشر کاشمیری	ہیما سنگھ	2002

سلیم الدین	وی کے	سید جمیل احمد	2006
عزیزن: سن ستاون کا قصہ	تری پراری شرما	تری پراری شرما	2008
غیر ضروری لوگ	شاہد انور	سمن کمار	2002
سوپنا کا سپنا	شاہد انور		2004
ہمارے وقت میں	شاہد انور	کے ایس راجندرن	2008
سائے ہم سائے	آصف علی حیدر	آصف علی حیدر	2009
مرزا غالب	ایم سعید عالم	ایم سعید عالم	2005
بیگ بی	ایم سعید عالم	ایم سعید عالم	2006
غالب ان نیو دہلی	ایم سعید عالم	ایم سعید عالم	2007
مولانا آزاد	ایم سعید عالم	ایم سعید عالم	2009
کے ایل سہگل	ایم سعید عالم	ایم سعید عالم	2010
1947	ایم سعید عالم	ایم سعید عالم	2011
میں راہی معصوم رضا	ونے ورما	ونے ورما	2008
حلیم بریانی	ونے ورما	ونے ورما	2010
برجیس قدر کا کنبہ		ونے ورما	2012
عصمت ایک عورت	ونے ورما	ونے ورما	2009
نیم حکیم خطرہ جان		ونے ورما	2008
سیاہ حاشیے		ونے ورما	2011
نمک کی گڑیا	اظہر عالم	اظہر عالم	2001
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے	اسماعیل چنارا	اظہر عالم	2005
منٹو نے کہا	سعادت حسن منٹو	اظہر عالم	2005
پہلے آپ		اظہر عالم	2006
سوالیہ نشان	اسماعیل چنارا	اظہر عالم	2006

اکی	اصغر وجاہت	اظہر عالم	2008
رینگتی پرچھائیاں	اوما جھن جھن والا	اظہر عالم	2014
6/8	بادل سرکار	محمد کاظم	2004
یہاں سے شہر کو دیکھو	راہل ورما	محمد کاظم	2005
اسپارٹکس	بادل سرکار	اجے منچندا	2006
The Life of Galileo		سمن کمار	2008
باغیچہ بانچھا رام کا	منوج مترا	شاہد انور	2001
زہرقند	کارلو گولدونی	شری کانت کشور	2003
اور کتنے ہیروشیما	بادل سرکار	محمد کاظم	2005
یہاں سے شہر کو دیکھو	راہل ورما	محمد کاظم	2006
وہ بھی تھے اپنے		کے ایس راجندرن	2010
پناہ گاہ		فیروز خان	2011
کانچ کے کھلونے	ٹینس ولیم	اظہر عالم	2002
شتر مرغ	گیان دیو اگنی ہوتری	اظہر عالم	2004
پت جھڑ	ٹینس ولیم "The Glass Menagerie"	اظہر عالم	2009
گینڈا	Eugene Ionesco	اظہر عالم	2011
بری پھنسی شانتا بائی	برتولت بریخت/ رنویر سنگھ	ایم کے رینا	2001
شب تار	مورس میٹرلنک/ پریم چند	بنسی کول	2003
بچھو	مولیر/ وصی خان	بھانو بھارتی	2003
سانپ سیڑھی	انوراگ ماتھر/ موہن مہرشی	موہن مہرشی	2003
انٹی گنی	سوفوکلیز/ موہن مہرشی	موہن مہرشی	2004
ہم رہیں نہ رہیں	جے بی پرشٹلے/ رنجیت کپور	رنجیت کپور	2004
مست قلندر	میگوئل دے کاروانتے/ آصف علی حیدر خان	بنسی کول	2005

نروزن وار	جان برتون اور کینیتھ کیونڈر/موہن مہرشی	جون کلارک	2005
انٹیوں کا تہہ خانہ			
عرف 13 قبرستان	جوسف اوٹو کیسرلنگ/رنجیت کپور	رنجیت کپور	2006
تاج محل	شمع فتح علی/ ہمانشو بی جوشی	ابھیلاش پلائی	2007
بی تھری	شاہد انور	سمن کمار	2007
سلسلۂ میڈیا (Waterfront Wasteland, Media Material and landscape with Argonauts)			
مولیر/ رام گوپال بجاج	اسٹفن سوئنی		2002
بڑے بھائی صاحب	پریم چند	اظہر عالم	2008
چکائیں گے نہیں	ڈاریو فو	بھانو بھارتی	2000
دیوار میں ایک کھڑکی رہتی تھی	وینود کمار شکل	موہن مہرشی	2001
دماغ ہستی دل کی بستی،			
ہے کہاں ہے کہاں،	مہندر بھلا	رام گوپال بجاج	2002
ایک وائلن سمندر کے کنارے،	کرشن چندر	سریش شرما	2002
جان من	مچندر مور	وامن کیندر	2002
ذل سبحانی	نند کشور اچاریہ	راجندر گپتا	2003
شورٹ کٹ	رنجیت کپور	رنجیت کپور	2003
کیفی اور میں	جاوید اختر	رمیش تلوار	2010
زہریلی ہوا	راہل ورما	حبیب تنویر	
خودکشی	دوستووسکی	حبیب تنویر	
پتھر گلی	ناصرہ شرما	دنیس کھنہ	16.02.2000
بغیچہ باچھا رام کا	منوج مشرا/ فیاض احمد	شاہد انور	12.02.2000
نئی صدی کی دہلیز پر	انیس اعظمی	اجے مچندہ	18.02.2000
میں منٹو ہوں	سعادت حسن منٹو	مشتاق کاک	12.02.2001

شیشے کے کھلونے	بلقیس ظفیر الحسن	نغمہ ظفیر	13.02.2001
زہر قند	فیاض احمد	سمن کمار	14.02.2001
غیر ضروری لوگ	شاہد انور	دنیس کھنہ	15.02.2001
عقل بڑی یا...	انیس اعظمی	اجے منچندہ	16.02.2001
منٹو بقلم خود	سعادت حسن منٹو	مشتاق کاک	26.12.2001
چاند کسی کا کب ہوتا ہے،	راجیش تیواری	راجیش تیواری	27.12.2001
سنجوگ	ستیش ڈے	توشار ڈے	28.12.2001
مست میگھو والیہ	ڈاکٹر سی ڈی سدھو	روی تنیجا	29.12.2001
علی بابا چالیس چور	انیس اعظمی	اجے منچندہ	30.12.2001
غالب اِن نیو دہلی	ڈاکٹر سعید عالم	ڈاکٹر سعید عالم	24.12.2003
آدھی رات کے بعد	شنکر شیش/ فیاض احمد	مشتاق کاک	25.12.2003
سوپنا کا سپنا	شاہد انور	ستیش آنند	26.12.2003
سیاہ حاشیے	سعادت حسن منٹو	مشتاق کاک	18.02.2004
کہ ہم تم چوری سے	ڈاکٹر عشرت کفیل	ڈاکٹر عشرت کفیل	19.02.2004
بجھی ہوئی کھڑکیوں	بلقیس ظفیر الحسن	محمد وسیم	20.02.2004
ناستک شہید بھگت سنگھ	ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ سدھو	روی تنیجا	21.02.2004
اور کتنے ہیروشیما	بادل سرکار	محمد کاظم	22.02.2004
کالی برف	میرا کانت	مشتاق کاک	01.02.2005
رنگ چمن لہولہو	ڈاکٹر عشرت کفیل	ڈاکٹر عشرت کفیل	02.02.2005
بوڑھے شجر کی روشنی	راجیش کمار	محمد شاہد	03.02.2005
یہاں سے شہر کو دیکھو	راہل ورما/ حبیب تنویر	ڈاکٹر محمد کاظم	04.02.2005
یہودی کی لڑکی	آغا حشر کاشمیری	احمد انجمن دہلوی	05.02.2005
امانت کی لاٹھی	ڈاکٹر سی ڈی سدھو	روی تنیجا	26.02.2007

کنجوس	مولیئر/حضرت آوارہ	مشتاق کاک	27.02.2007
1857 کی دلی	مہیشور دیال	محمد شاہد	28.02.2007
RUR	کرل چپاک/شاہد انور،	فیاض احمد	01.03.2007
امراؤ جان	مرزا ہادی رسوا/ صاحب سنگھ،	کیول دھالیوال	02.03.2007
گلی گلی میں شور ہے: بہروپیا یا چور ہے،	انیس اعظمی،	ندیم خان	27.06.2007
قصہ پنڈت کالو کمھار	ڈاکٹر سی ڈی سدھو	روی تنیجا	18.02.2008
مہمان نہیں	یوگ راج ٹنڈن	سبھاش سہگل	19.02.2008
جولیس سیزر	شیکسپیئر/محمد فہیم	ایم وسیم آزاد	20.02.2008
یہ شام عصمت آپا کے نام،	عصمت چغتائی	بھوپیش جوشی	21.02.2008
ہمارے وقت میں	شاہد انور	کے۔ایس راجندرن	22.02.2008
شہید بھگت سنگھ	انیس اعظمی	ندیم خان	30.06.2008
غالب	ڈاکٹر محمد سعید عالم	ڈاکٹر محمد سعید عالم	16.02.2009
ایک اور حادثہ	داریو فو/محمد شاہد	محمد شاہد	17.02.2009
سائے ہمسائے	آصف علی حیدر	آصف علی حیدر	18.02.2009
آگے بڑھنا سیکھو	انیس اعظمی	ندیم خان	30.06.2009
ڈاک گھر	رابندر ناتھ ٹیگور	شیخ خیرالدین	10.03.2011
تماشا اور تماشائی	پروفیسر محمد حسن	محمد وسیم	11.03.2011
دی پرپوزل	انتون چے خف	این کے پنت	12.03.2011
اس کمبخت ساٹھے کا کیا کریں،	راجیو نایک	لوکیندر ترویدی	13.03.2011
مجھ سے پہلی سی محبت			
میرے محبوب نہ مانگ،	رام جی بالی	رام جی بالی	14.03.2011
پناہ گاہ	ہادی سرمدی	فیروز زیدی خاں	15.03.2011

افسانے و ناول کی پیش کش (کہانی کا رنگ منچ)

دس روپے کی آزادی	کرشن چندر	راجیش سنگھ	2013
مہالکشمی کا پل	کرشن چندر	راجیش سنگھ	2013
کالو بھنگی	کرشن چندر	راجیش سنگھ	2013
جگا	بلونت سنگھ	دیوندر راج انکر	2001
دہلیز	ناصرہ شرما	دیوندر راج انکر	2001
کچھ سامان	رضوان الحق	دیوندر راج انکر	2002
مہاماری	شموئل احمد	دیوندر راج انکر	2003
ریل کی پٹریوں پر پڑی ہوئی کہانی	جیلانی بانو	دیوندر راج انکر	2003
اپنے مرنے کا دکھ	جیلانی بانو	دیوندر راج انکر	2003
اولاد	سعادت حسن منٹو	اظہر عالم	2007
کھول دو	سعادت حسن منٹو	اظہر عالم	2007
ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو	اظہر عالم	2007
کتھا کولاج 2 (شیلندر، سعید پریمی، مدھو کنکڑیا اور انیس رفیع کی کہانی پر مبنی)		اظہر عالم	2007
کتھا کولاج 3 (ربندرا ناتھ ٹیگور کی دو کہانیوں پر مبنی)		اظہر عالم	2008
کتھا کولاج 4 (اسماعیل چنارا اور مظفر حنفی کی کہانی پر مبنی)		اظہر عالم	2008

اس کے علاوے مجیب خان نے اپنے'' آئڈیل ڈراما اینڈ انٹرٹینمنٹ اکیڈمی کے ذریعہ پریم چند کی کم و بیش دوسو پچاس کہانیوں کو مختلف موقعے پر نہ صرف بمبئی بلکہ ملک و بیرون ملک مختلف حصوں میں پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں کی کہانیوں کو بھی کامیابی سے اسٹیج کیا ہے۔

ان ڈراما نگاروں اور ان کے ڈرامے کی فہرست کے پیش کرنے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے ڈراما گروپ کی فہرست پیش کردی جائے جو مسلسل اردو ڈرامے پیش کرتے

ہیں اور جن کے دم سے اردو ڈرامے کا ارتقا ہو رہا ہے۔ یہ تمام گروپ نہ صرف ڈرامے کھیلتے ہیں بلکہ نئے نئے تجربے بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان سے وابستہ فنکار کسی بھی سطح پر دوسری زبانوں میں پیش کیے جانے والے تھیٹر کے فنکاروں سے کم تر نہیں ہیں:

اڑیہ آرٹ، کٹک
ایکسیلیر تھیٹریکل کمپنی، حیدرآباد
اپٹا، بمبئی
ناولٹی تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی
پرتھوی تھیٹر، بمبئی
ہندوستانی تھیٹر زکلکتہ
یونائٹڈ آرٹ ایسوایشن، کٹک
اندر پرستھ تھیٹر، دہلی
سٹی۔کالج، حیدرآباد
ہندوستانی ڈرامیٹک ایسوی ایشن، مدراس
جے جے اسکول آف آرٹس، بمبئی
رویندرا بھارتی، حیدرآباد
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
ادارا حیات وممات، حیدرآباد
دہلی آرٹ تھیٹر، دہلی
کلاسادھنا مندر، دہلی
اسٹانلی گرلز اسکول، حیدرآباد
کلچر ڈراما گروپ، علی گڑھ
یاترک، دہلی
ڈرامیٹک ایسوی ایشن، کٹک

سوتر دھار، حیدرآباد
ساگر ٹاکیز، حیدرآباد
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
بزم اداکاران، حیدرآباد
الحاق کمپنی، کٹک
لٹل تھیٹر گروپ، دہلی
لکشمی تھیٹریکل کمپنی، کلکتہ
وائی۔ایم۔سی۔اے، حیدرآباد
انڈین نیشنل تھیٹر، دہلی
گاندھی بھون، حیدرآباد
نیا تھیٹر، دہلی
اردو تھیٹر، علی گڑھ
انڈین نیشنل تھیٹر، دہلی
اندر پرستھ تھیٹر، دہلی
شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
اپٹا، دہلی
آئی فیکس، نئی دہلی
نیشنل اسکول آف ڈراما، دہلی
اگروال کالج، حیدرآباد
اردو ہال، حیدرآباد

اسٹانلی گرلز اسکول، حیدرآباد
ریشما آرٹ کلب، دہلی
دہلی آرٹ تھیٹر، دہلی
کلچر کمیٹی میرس ہال، علی گڑھ
نیو تھیٹر، حیدرآباد
پدانک تھیٹر، کلکتہ
فنکار گروپ، کلکتہ
جیمنی تھیٹر، حیدرآباد
پی۔ڈی۔اے، شولاپور، مہاراشٹر
کلاسادھنا مندر، دہلی
درپن، لکھنؤ
جموں اینڈ کشمیر آرٹ اینڈ کلچرل اکادمی
شرجیل آرٹس، کلکتہ
نشاط اکادمی، شولاپور، مہاراشٹر
امیر گوہر میموریل سوسائٹی، دہلی
دِشانتر، دہلی
رُچیکا، دہلی
الراعنا کلب، دہلی
پریوگ، نئی دہلی
فن کار ایسوسی ایشن، کامٹی
کردار، بمبئی
نشانت ناٹیہ منچ، دہلی
دیاوتی مودی اکادمی، رامپور

کلاسادھنا مندر، دہلی
آردوت، دہلی
فراق آرٹس اینڈ کلچر سوسائٹی، دہلی
ہم سب ڈراما گروپ، نئی دہلی
عثمانیہ انجینئرنگ کالج، حیدرآباد
کلاسادھنا مندر، دہلی
برہتین مرر، دہلی
گیندان قطب شاہی، حیدرآباد
جاگرتی کلچرل سوسائٹی، دہلی
جاگرتی کلچرل سوسائٹی، دہلی
اسٹوڈیو ون، دہلی
رُچیکا، دہلی
پدانک، کلکتہ
آرٹ اکیڈمی آف شولاپور، مہاراشٹر
آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی، حیدرآباد
ایلورا ساؤنڈ اینڈ ویژن، رام پور
مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال
درپن، کانپور
فلمستان ڈراما پروڈکشن، بمبئی
مہاراشٹر کالج، بمبئی
آرٹسٹ گروپ، حیدرآباد
آرٹسٹس گروپ، حیدرآباد
ایلورا ساؤنڈ اینڈ ویژن، رام پور

غلام عاجز کلچرل گروپ، دہلی
شیبا آرٹ گروپ، دہلی
سریجن تھیٹر گروپ، دہلی
ضیاالاسلام پبلک لائبریری، کامٹی
یواچیتن، کامٹی، ناگپور
اسٹوڈنٹس فورم، دہلی
امیر گوہر میموریل سوسائٹی، دہلی
اپنا رنگ منچ، بمبئی
قلم کار پریشد، بھوپال
رضوی کالج، بمبئی
ودوشک تھیٹر، دہلی
نرگس میموریل سوسائٹی، دہلی
کالیجیٹ ڈراما سوسائٹی، دہلی
منچ مادھیم، دہلی
سیکنڈری ٹریننگ کالج، بمبئی
بھوپال تھیٹر، بھوپال
شامن پروڈکشن، نئی دہلی
منچ مادھیم، نئی دہلی
سیون اسٹار کلچرل گروپ، دہلی
ایڈن آرٹ اینڈ کلچرل گروپ، دہلی
کلاکش، نئی دہلی
رنگ شالا گروپ، بمبئی
تاج پروڈکشن، آسنسول

بھوپال تھیٹر، بھوپال
اردو اکادمی، دہلی
روٹری کلب آف دہلی
سپترس ناٹک منڈلی، بنارس
دیاوتی مودی اکادمی رام پور
کالجیٹ ڈراما سوسائٹی، نئی دہلی
شیبا آرٹ گروپ، دہلی
انجمن اسکول بارکپور (بنگال)
دیاوتی مودی اکادمی، رامپور
انامکا کلاسنگم، کلکتہ
ہستاکشر تھیٹر گروپ، دہلی
کہکشاں تھیٹر گروپ، نئی دہلی
جن ناٹیہ منچ، دہلی
آزاد ہند ڈراما کمپنی، کلکتہ
کلکتہ ایکشن گروپ، کلکتہ
ایکتا گروپ، کامٹی (ناگپور)
اے۔ٹی۔ایس۔گروپ، دہلی
ایکٹ ون، نئی دہلی
تمثیل آرٹ گروپ، کامٹی (ناگپور)
پریاس، نئی دہلی
شری رام سنٹر پرٹری، دہلی
ایڈن آرٹ اینڈ کلچرل گروپ، دہلی
کسمب، بمبئی

صدف آرٹ گروپ، کامٹی
لاوسکی آرٹ، کلکتہ
ثنا پروڈکشن، نئی دہلی
اِسپارک ڈراما گروپ، کلکتہ
پلیٹ فارم، بمبئی
ایکوڈرامیٹک گروپ، کلکتہ
پرتی بمب، کلکتہ
ایکتا کلچرل آرگنائزیشن، کلکتہ
فیمٹ، دہلی
وِوادی، دہلی
سواگتم تھیٹرس، حیدرآباد
دی انٹرٹینرس، دہلی
اِندرا پریہ درشنی ہال، حیدرآباد
اسمتا گروپ، نئی دہلی
نورنگ تھیٹر، دہلی
ناٹک منڈلی، کلکتہ
شمع آرٹ ڈرامیٹک گروپ، کلکتہ
بہروپ آرٹس گروپ، دہلی
اپٹا، پٹنہ
کلاسنگم، پٹنہ
پیروٹ ڈراما گروپ، دہلی
ایک جٹ، بمبئی
اردو تھیٹر اکیڈمی، کلکتہ

آکار ڈراما گروپ، دہلی
نٹ کھٹ گروپ، دہلی
ادا ڈرامیٹک ایسوسی ایشن، رانی گنج
ایڈن آرٹ اینڈ کلچرل گروپ، دہلی
ساکشی کلا منچ، دہلی
پوروا بھیاس، دہلی
تیج پال ہال، بمبئی
نئی آواز تھیٹر، حیدرآباد
نہرو یوا کیندر، نئی دہلی
اسپارک تھیٹر اکادمی، کلکتہ
کلادھرمی، دہلی
امیر گوہر میموریل سوسائٹی، دہلی
پریاس، نئی دہلی
نئی آواز، حیدرآباد
سنگم آرٹ، کلکتہ
حجوم تھیٹر، بمبئی
رنگ منڈل بھارت بھون بھوپال
لٹل تھیسپین، کلکتہ
بھارتندو ناٹیہ اکیڈمی، لکھنو
نیشنل اسکول آف ڈرامار پرٹری، نئی دہلی
موٹلے، بمبئی
اسلامیہ اسکول، کلکتہ
مہاراشٹرا اردو اکادمی

مسلم انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ　　مولانا آزاد کالج، کلکتہ

ان ڈراما گروپ سے وابستہ ڈراما نگار اور ہدایت کار کی فہرست ترتیب دی جائے تو ان میں جو نام نمایاں طور پر نظر آئیں گے انھیں یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

رجب جعفری (بمبئی)	قاسم امام (بمبئی)	رفیع گلاب (بمبئی)
سلیم عارف (بمبئی)	مشتاق زبیر (بمبئی)	الطاف قاضی (بمبئی)
انیس جاوید (بمبئی)	مجیب خان (بمبئی)	عنایت قاضی (بمبئی)
وقار قادری (بمبئی)	شیلی ستھیو (بمبئی)	فیروز خان (بمبئی)
انوپم کھیر (بمبئی)	شبانہ اعظمی (بمبئی)	جاوید اختر (بمبئی)
نادرہ ظہیر (بمبئی)	جوہی بیر (بمبئی)	نصیرالدین شاہ (بمبئی)
ساجد صدیقی (بھیونڈی)	عرفان برڈی (بھیونڈی)	مشتاق (بھیونڈی)
ڈاکٹر ابرار مومن (بھیونڈی)	سلطان قریشی (بھیونڈی)	نیاز خان (بھیونڈی)
عرفان فقیح (بھیونڈی)	اسد اللہ (ناگپور)	ضیاء اللہ لودھی (ناگپور)
آغا غیاث الرحمن (ناگپور)	راجا باغباں (شولاپور)	سید اقبال (شولاپور)
ایم اے منیار (شولاپور)	شفیق (شولاپور)	بشیر پرویز (شولاپور)
شفیع چوبدار (شولاپور)	جعفر بنگی (شولاپور)	وجاحت ستار (شولاپور)
منیر شاہ ملک (شولاپور)	سراج دلار (مالے گاؤں)	حمید شیخ (مالے گاؤں)
آصف اقبال مرزا (مالے گاؤں)	فروغ جعفری (مالے گاؤں)	شکیل بھارتی (مالے گاؤں)
اکرم خان (مالے گاؤں)	ناصر شیخ (مالے گاؤں)	شکیل شاہ جہاں (کون کن)
مبشر جمعدار (کون کن)	اقبال کنوارے (کون کن)	نورالحسنین (اورنگ آباد)
ارتقاض افضل (اورنگ آباد)	انیس رفیع (کلکتہ)	کمال احمد (کلکتہ)
ظہیر انور (کلکتہ)	سید حیدر علی (کلکتہ)	اظہر عالم (کلکتہ)
اوما جھن جھن والا (کلکتہ)	شوکت عظیم (کلکتہ)	نوشاد رضا (کلکتہ)
نوشاد عالم (کلکتہ)	شہناز نبی (کلکتہ)	قمر جاوید (رانی گنج)

صلاح الدین تاج (آسنسول)
شاہ جہاں خان (کلکتہ)
شکیل احمد خان (کلکتہ)
ایم کے رینا (دہلی)
عبدالطیف کھٹانا (دہلی)
شاہد انور (دہلی)
میرا کانت (دہلی)
کے ایس راجندرن (دہلی)
فیروز خان (دہلی)
جاوید اختر (پٹنہ)
ونے کمار (حیدرآباد)
سدھا کر ریڈی (حیدرآباد)
جلال صدیقی (لکھنؤ)
یوگل کشور (لکھنؤ)
شکیل صدیقی (لکھنؤ)
جاوید زیدی (بھوپال)
حمید اللہ مامور (بھوپال)
قمر جمالی (بھوپال)
ظفر باسط (بھوپال)
اشوک بولائی (بھوپال)

عزیز احمد عزیز (کلکتہ)
اوشا گنگولی (کلکتہ)
خورشید اکرام (کلکتہ)
انوراد ھا کپور (دہلی)
تری پراری شرما (دہلی)
یوگ راج (دہلی)
ایم سعید عالم (دہلی)
راجیش سنگھ (دہلی)
آصف حیدر خان (دہلی)
تنویر اختر (پٹنہ)
محمد علی بیگ (حیدرآباد)
معین علی بیگ (حیدرآباد)
روشن تقی (لکھنؤ)
سوریہ موہن کلشریشٹھ (لکھنؤ)
ولایت جعفری (لکھنؤ)
رفیع شبیر (بھوپال)
فرخ شیر خان (بھوپال)
اقبال مجید (بھوپال)
رئیس حسن (بھوپال)
فضل تابش (بھوپال)

انیس جاوید (مرشد آباد)
ایس ایم راشد (کلکتہ)
علی احمد (کلکتہ)
دیوندر راج انکر (دہلی)
اشوک اہال (دہلی)
نرندر موہن (دہلی)
اروند گوڑ (دہلی)
سمن کمار (دہلی)
ستیش آنند (دہلی)
پرویز اختر (پٹنہ)
قدیر زماں (حیدرآباد)
اشرف مہدی (حیدرآباد)
محسن خان (لکھنؤ)
راج بسوریہ (لکھنؤ)
نظیر قریشی (بھوپال)
بدر واسطی (بھوپال)
ارن کمار پانڈے (جبل پور)
رشید انجم (بھوپال)
سنجے مہتا (بھوپال)

یہ تو وہ فہرست ہے جہاں تک میں پہنچ سکا ہوں یا مجھے معلومات حاصل ہو سکی ہے۔ اس کے علاوہ یقیناً اس سے کئی گنا زیادہ ایسے ڈراما نگار، ہدایت کار، اداکار اور فنکار پورے ملک میں موجود ہیں جو نہ صرف اسٹیج ڈرامے لکھ اور کھیل رہے ہیں بلکہ ہمارے ڈرامے کے سرمائے

میں بیش بہا اضافہ کر رہے ہیں۔ آئندہ میری کوشش ہوگی کہ ان تمام لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ایک جدید انتھالوجی تیار کر سکوں۔

اس فہرست کو پیش کرنے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلو پر نظر ڈال لی جائے کہ کس کس صورت میں اردو ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں۔ یعنی اگر طبع زاد ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں تو ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں کے شاہکار ڈرامے کے ترجمے کو بھی یہ زبان اردو اسٹیج پر پیش کیا جا رہا ہے اور بہت سے ڈراموں، کہانیوں اور ناولوں کو اڈپٹ کر کے اسے اسٹیج کی زینت بخشی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ نہ صرف اردو کی نظموں بلکہ دوسری زبانوں کی شاعری کے تراجم کو ڈرامے کی صورت میں پیش بھی کیا جا رہا ہے۔ اور جدید دور کے پر اثر میڈیم کی بات کرتے ہیں تو نکڑ ناٹک ایک ایسے میڈیم کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے جس میں 'ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ آئے چوکھا' کی مانند بغیر کسی خرچ کے عوام کا میڈیم عوام کے درمیان جا کر ان کی بات کرتا ہے۔ انھیں ان کے مسائل سے نہ صرف واقف کراتا ہے بلکہ اس کے حل کرنے میں ان کی مدد بھی کرتا ہے۔ چونکہ زیادہ تر نکڑ ناٹک امپروائز کیے جاتے ہیں اس لیے اس کی زبان عوام سے قریب تر ہوتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کے زیادہ تر علاقے میں عوام کے Communication کی زبان اردو یا اس سے قریب تر زبان ہے۔ اس لیے زیادہ تر نکڑ ناٹک کی زبان یا تو اردو ہوتی ہے یا اس سے قریب تر۔ اور جو نکڑ شائع شائع کیے گئے ہیں ان میں سے بیشتر کی زبان اردو ہی پائی گئی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اردو رسم الخط میں بھی نکڑ ناٹک کے کئی مجموعے موجود ہیں۔ اس کے اردو کے علاوہ دوسرے رسم الخط میں شائع ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سے ایسے اداکار و فنکار منسلک ہیں جو اردو رسم الخط نہیں جانتے۔ یہی صورت حال اردو ڈرامے کی بھی ہے۔

موجودہ دور میں اسٹیج کی ایک کامیاب پیش کش کے طور پر داستان گوئی کو خاص اہمیت ملی ہے۔ محمود فاروقی کی نگرانی میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے تقریباً تمام ترقی یافتہ ممالک میں داستان گو کو مدعو کیا گیا ہے بلکہ اس کی قوت اور پیش کش کو سراہا بھی ہے۔ آج اس دوڑتی بھاگتی زندگی میں اس فارم کی کمی کا جو احساس تھا اسے جس خوبی سے پورا کیا گیا ہے وہ نہ صرف اسٹیج کی

دنیا میں اہمیت کا حامل ہے بلکہ اسٹیج پر کھیلے جانے والے فن میں اہم مقام رکھتا ہے۔ قدیم داستانوں کو اسٹیج پر پیش کیا گیا ہے تو نئی داستانیں لکھی بھی گئی ہیں۔ قدیم داستانیں مافوق الفطری عناصر سے پر ہے تو جدید داستانیں موجودہ دور کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، معاشی اور ادبی مسائل کی عکاسی کرتی ہیں۔ محمود فاروقی، انوشا رضوی اور دانش حسین کے ساتھ اب کم و بیش بیس داستان گویوں کی پوری ٹیم تیار ہو چکی ہے جو مسلسل داستان پیش کر رہی ہے۔

اب اگر موجوہ دور کے نہ صرف اردو ڈراما اور ہندوستانی تھیٹر پر نظر ڈالتے ہیں تو کم و بیش ایک جیسے مسائل نظر آتے ہیں۔ اس صارفیت زدہ سماج میں ہر شخص جلدی میں نظر آتا ہے۔ جلد سے جلد بغیر محنت کئے بلندی پر پہنچنا یا ترقی کرنا چاہتا ہے اور ڈراما یا تھیٹر نہ صرف مشق چاہتا ہے بلکہ سکون اور Patiance کا تقاضا کرتا ہے۔ دوسرے اصناف ادب کی مانند ڈراما بھی صارفیت کا شکار ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ جس طرح معیاری ادب کی کمی کا احساس شدت سے ہو رہا ہے اسی طرح ایسے ڈراما نگاروں کی کمی محسوس ہو رہی ہے جو سماج اور اسٹیج کو مدنظر رکھ کر ڈرامے تیار کر سکے اور اردو کی صورت حال تو اور بھی دگرگوں ہے۔ اس طرح اگر ڈراما اور اسٹیج کی مختلف ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر دیکھتے ہیں تو ایک جانب اچھی اور R elevent اسکرپٹ کی کمی کا احساس ہوتا ہے تو دوسری جانب ایسے اداکار و اور فنکار نظر نہیں آتے جو اردو جانتے ہوں اور ڈرامے اور اسٹیج کی شدھ بدھ بھی رکھتے ہوں۔ اب اسٹیج کی ضرورتوں میں تکنیکی جانکاری اشد ضروری ہو گیا ہے۔ خواہ وہ سیٹ ہو یا لائٹ، وہ لباس ہو یا میک اپ، وہ موسیقی ہو یا ساؤنڈ ایفکٹ، ان لوازمات کی مدد سے زیادہ بہتر اور موثر طریقے سے ڈراما پیش کیا جا سکتا ہے۔ اب بڑے بڑے اور خرچیلے سیٹ کو ان تکنیکی جانکاری کی مدد سے بہ آسانی Replace کیا جا سکتا ہے۔ تکنیک نے پردے کے استعمال کو ختم کر دیا ہے بلکہ ایکٹ اور مناظر کی تفریق سے بھی کم و بیش اوپر اٹھ چکا ہے۔ لہٰذا ان تکنیکی فنون کی جانکاری ڈرامے کے معیار کو نہ صرف بلندی عطا کرتا ہے بلکہ پیش کش میں سہولیات بھی فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح اداکار اس فن میں اول تو درک نہیں رکھتے اور جو اداکار تربیت یافتہ ہوتے ہیں ان کی بھی زبان سے متعلق معلومات بہت معمولی ہوتی ہے۔ وجہ صاف ہے کہ ان کی تربیت

میں ڈکشن پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے اور اس کی باریکیوں پر غور نہیں کے برابر کیا جاتا ہے نتیجے کے طور پر زبان کا صحیح استعمال نہیں کر پاتے ہیں اور مکالمے کی ادائیگی میں تلفظ کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ بات اردو یا ہندی کی نہیں ہے بلکہ بات کردار کے زبان کی ہے۔ بات رسم الخط کی بھی نہیں ہے کیوں کہ Performing Art کا کوئی رسم الخط نہیں ہوتا بلکہ اس کی زبان کا تعین Performance سے کیا جاتا ہے۔اس لیے کردار کی زبان کو سمجھنا اور اس کی ضرورت کے مطابق اسے برتنا اداکار کی سب سے اہم ضرورت ہے اور اس کا سامنا اردو ڈرامے کو ہمیشہ کرنا پڑتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں اردو ڈرامے کو اکثر ایسے ہدایت کار ملتے ہیں جن میں سے زیادہ تر اردو رسم الخط سے تو واقف ہونا دور اس کی تہذیب سے بھی واقفیت نہیں کے برابر ہوتے ہیں۔ ہم موجودہ دور میں ڈرامے کی تربیت دینے والے ادارے سے فارغ ہدایت کاروں کا محاسبہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کو ڈرامے کے Content سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ تکنیک ہوتی ہے۔ ایسے ہدایت کار تکنیکی سہولتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سٹ، لائٹ، لباس، میک اپ اور دوسری معاون ضرورتوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ڈرامے میں موجود مسائل اور اس کی ضرورت کا احساس نہ ہونا اور دوسرے سہولت پسندی۔ایک اچھا ہدایت کار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تھیٹر کے تکنیک کی جانکاری کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب، سماج، تہذیب وثقافت، سیاسیات، معاشیات، دنیا اور انسانی اقدار کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف ہو کیوں کہ جب ہدایت کار کسی ڈرامے کی تیاری اور اس کی پیش کش کا بیڑا اٹھاتا ہے تو وہ ڈرامے کے Content کو کامیابی اور پراثر طریقے سے پیش کرنے کے لیے نہ صرف ڈرامے کا گراف بناتا ہے بلکہ ہر کردار کا گراف تیار کرتا ہے۔، وہ نہ صرف ڈرامے کے اندرونی تصادم سے واقف ہونے کی کوشش کرتا ہے بلکہ کردار کے درمیان کے تصادم کی شناخت بھی کرتا ہے، وہ ہر اداکار کی صلاحیت سے واقف ہوتا ہے اور اداکار کی ان صلاحیتوں کو ڈرامے کی پیش کش میں کامیاب استعمال کر کے اپنے مقاصد کے حصول کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اکثر اداکار صرف اپنا کردار دیکھتا ہے لیکن ہدایت کار کو یہ

معلوم ہوتا ہے کہ کب کس کردار کو کس صورت میں پیش کر کے ڈرامے کو ایک ایسی لڑی میں پرونا ہے کہ وہ مختلف قسم اور رنگ کے موتی کے پرونے کے بعد ایک خوبصورت ہار کی شکل اختیار کر لے۔ اسے اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ کب کس کردار سے مکالمہ ادا کروانا ہے اور کب اور کتنی دیر کس کو خاموش رکھنا ہے۔ نئے ہدایت کاروں میں اس کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے اردو ڈرامے کی ہدایت کی ذمہ داری بھی دوسرے ہدایت کار کے سر ہے جو نہ صرف اپنی دلچسپی بلکہ اس زبان کی چاشنی اور قوت کی وجہ سے اسے تیار کر کے کھیلتے رہتے ہیں۔

موجودہ دور میں اردو ڈرامے ہی نہیں بلکہ ڈرامے کی پیش کش کا ایک بڑا مسئلہ تھیٹر ہال کی کمی اور اس کے حصول میں پیش آنے والی دشواری ہے۔ اول تو جو آڈیٹوریم ہیں اس کا کرایہ اتنا ہے کہ عام گروپ اس میں ڈراما کھیلنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہے اور اگر کبھی وہ ہمت کر بھی لیتا ہے تو اس کے استعمال کے لیے پرفارمنس کے لائسنس کو حاصل کرنے میں جو دشواری پیش آتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔

نہ صرف اردو ڈراما بلکہ ہندوستانی ڈرامے کے ساتھ یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اس اداکار کے میڈیم کو ہم نے ہدایت کار کا میڈیم بنا دیا ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستانی سنیما کو اداکار کا میڈیم مانتے ہیں جب کہ یہ ہدایت کار کا میڈیم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فلموں میں ہدایت کار اپنی پلاننگ کے مطابق اداکار کا استعمال کرتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے ضرورت پڑنے پر بلکہ اکثر ایک ہی شاٹ کو کئی کئی بار کرواتا ہے، بلکہ اس وقت تک کرواتا ہے جب تک اسے اپنا مقصد حاصل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد بھی ایڈیٹنگ ٹیبل پر جتنا جس انداز سے شاٹ یا سین کو رکھنا چاہے رکھے نکالنا چاہے نکال دے اس میں اداکار کا دخل نہیں ہوتا۔ گویا فلم ایڈیٹنگ ٹیبل پر بنتی ہے جب کہ ڈراما میں اس کے برخلاف رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی ریٹیک نہیں ہوتا اور نہ ہی شو کے دوران ایڈیٹنگ کی گنجائش ہوتی ہے۔ بلکہ مکمل طور پر اداکار پر منحصر کرتا ہے کہ کب کس شو میں کیا کر جائے۔ چونکہ ڈراما ہمیشہ Live Perform کیا جاتا ہے اس لیے اس کا ہر شو نیا اور مختلف ہوتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شو کے بعد دوسرے شو میں اداکار تک بدل جاتے ہیں اور ہر اداکار کردار کو اپنے طور پر محسوس کرتا ہے اور

اس سے منسلک ہوتا ہے۔ پھر اس کے اپنے تجربے اور اس کی جسمانی ساخت بھی کردار کو متاثر کرتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں سوائے بڑے اور فلم سے منسلک اداکاروں کے علاوہ تھیٹر کے دوسرے اداکاروں کو ڈرامے میں اہمیت دینے کے بجائے ہدایت کار کے نام سے ڈرامے کو یاد کرتے ہیں اور ہدایت کار کے بجائے اداکاروں کے نام سے فلموں کو پہچانتے ہیں یا اسے دیکھنے جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں ایک اور بڑے مسئلے سے اردو ڈرامے کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ مسئلہ اردو کا اپنا ہے۔ ہم اردو کے علاوہ کسی بھی ذرائع ترسیل پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے یہاں نہ صرف تہذیب و ثقافت کا بیٹ ہوتا ہے بلکہ روز اس سے متعلق خبریں اور معلومات شائع کرنے کے لیے باضابطہ کالم ہوتا ہے۔ لیکن اردو میڈیا میں Daily کالم تو درکنار ہفتہ میں بھی اس کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اگر تھیٹر یا تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھنے والا کوئی جنونی مفت میں بھی ہفتہ وار کالم لکھنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اس پر ایسی شرطیں عائد کی جاتی ہیں کہ اس کے پاس اپنا ارادہ ترک کر دینے کے بجائے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ہاں قومی آواز جب تک شائع ہوتا رہا اس میں ہفتہ میں ایک کالم ڈراما پر ضرور شامل ہوتا تھا۔ اس کے بعد اردو میں اخبار تو بہت سے شائع ہوتے ہیں لیکن اس جانب نہ صرف توجہ نہیں ہے بلکہ حوصلہ شکنی کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو ہمارے قارے کی تربیت ہو سکی ہے اور نہ ہی ہمارے ناظرین اب تک تیار ہو سکے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مراٹھی اور بنگلہ ڈرامے نہ صرف خاصی تعداد میں کھیلے جاتے ہیں بلکہ ان کے ہر شو میں ہال ناظرین سے بھرا ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ عام مراٹھی اور بنگالی لوگ اپنی ترجیحات میں ڈراما دیکھنا بھی شامل رکھتے ہیں بلکہ اس کے لیے ان کی آمدنی کا بجٹ مختص ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اردو کے ناظرین ڈرامے کو ترجیح دینا تو درکنار انھیں گھر لا کر مفت میں پاس بھی دیا جاتا ہے تو بھی ہال میں نہیں جاتے۔ یہاں تک کہ ہمارے ناقدین کی ترجیحات میں بھی ڈراما دیکھنا شامل نہیں ہے تو عوام سے کیا توقع کی جائے۔ اس کے باوجود اردو ڈرامے کی قوت اور جاذبیت ہی ہے جو عام ناظرین کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ اس کے

ساتھ ساتھ پورے ملک میں ایسے جنونی فنکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو نفع اور نقصان کے بارے میں سوچے بغیر اردو ڈرامے مسلسل کھیل رہے ہیں۔

ان نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر اردو تھیٹر کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اردو تھیٹر نہ صرف اپنی شناخت کے ساتھ موجود ہے بلکہ ہندوستان گیر سطح پر اردو تھیٹر اپنی اہمیت منوائے ہوئے ہے۔ ہندوستان کی کسی بھی زبان کے تھیٹر کے مقابلے میں کسی بھی سطح پر اردو تھیٹر کمزور نہیں ہے۔ اردو کے ڈرامے نہ صرف کھیلے جا رہے ہیں بلکہ ہندوستان میں منعقد ہونے والا شاید ہی کوئی فیسٹیول ہو جہاں اردو ڈراما شامل نہ رہتا ہو بلکہ بعض اوقات اردو ڈرامے کافی تعداد میں شامل ہوتے ہیں۔ ہم اس بات سے واقف ہیں کہ فیسٹیول میں صرف چنندہ ڈراموں کا انتخاب ہوتا ہے یا مدعو کیا جاتا ہے۔ چوں کہ منتظمین کو اپنے فیسٹیول کے معیار کی فکر رہتی ہے اس لیے وہ صرف معیاری ڈرامے ہی کو شامل فیسٹیول کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف نیشنل اسکول آف ڈراما کے ذریعہ ہر سال منعقد عالمی سطح کے بھارت رنگ مہوتسو کو ہی ذہن میں رکھیں تو پائیں گے کہ اب تک تیرہ فیسٹیول ہو چکے ہیں اور ان میں سے ہر فیسٹیول میں پانچ سے آٹھ اردو ڈرامے شامل رہے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس فیسٹیول میں شامل ہونے کے لیے پہلے ڈرامے کی DVD منگوائی جاتی ہے۔ ان DVD کو اکسپرٹ کمیٹی دیکھتی ہے، اس پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے اور تب جا کر کسی ڈرامے کو اس فیسٹیول کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اگر ایسے میں اردو ڈرامے شامل فیسٹیول ہوتے ہیں تو اس سے اس کے معیار اور تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے ناقدین اب تک اردو ڈرامے کے وجود کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور اردو ڈرامے کے وجود سے انکار تک کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی نظر میں کاغذ پر چھپی ہوئی مکالمے کی شکل میں موجود تحریر ہی ڈراما ہے۔ جب کہ ان میں سے زیادہ تر تحریروں میں ڈراما کے فنی لوازم کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وجہ صاف ہے کہ ہمارے ناقدین ڈراما کو اب تک نہ تو ڈرامے کے فن اور اس کے فنی ارتقا سے واقفیت ہوئی ہے اور ہو بھی کیسے وہ نہ تو کھیلے جانے والے ڈرامے پڑھتے ہیں اور نہ ہی تھیٹر میں جا کر ڈرامے دیکھتے ہیں۔ جب کہ دوسری زبانوں کے ساتھ معاملہ اس کے برخلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اردو ڈرامے کی تنقید ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکی ہے جہاں اسے ہونا چاہیے۔اب بھی موقع ہمارے پاس ہے کہ اول تو ان جنونی فنکاروں کی حوصلہ افزائی کریں اور ڈرامے کو پیش کرنے میں ان کا تعاون کریں، وہ کسی ادارے یا تنظیم سے مدد دلوانی ہو یا خود آڈیٹوریم تک جا کر ڈراما دیکھنا، وہ ڈراما نگاروں کے لیے ڈراما نگاری کے فنون سے واقف کرانے کے لیے ورک شاپ کا انعقاد ہو یا دوسرے فنکاروں کی تربیت کا، ان کے لیے آڈیٹوریم فراہم کرانا ہو یا میڈیا کے ذریعے اس کو مشتہر کرنا، وہ ناقدین ڈراما کے لیے مواقع فراہم کرنا ہو یا اخبار و رسائل میں ڈرامے کی سرگرمیوں کی خبریں اور اس پر تنقید و تبصرہ شائع کرنا اور سب سے اہم بات یہ کہ ہم اردو زبان میں کھیلے جانے والے ڈرامے کو اردو کہنے پر مجبور کریں ورنہ وہ دن دور نہیں جب اردو ڈرامے تو خاصی تعداد میں کھیلے جائیں گے لیکن ان کو اردو ڈراما کہنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

○

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اکیسویں صدی میں اردو فروغ اور امکان



مرتب: خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 372
قیمت: -/163 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)



مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 170 روپے

اُردو میڈیا



مرتب: خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 398
قیمت: -/105 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)



مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 162 روپے

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت

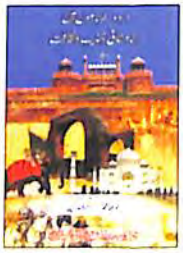

مرتب: خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 494
قیمت: -/166 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)



مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 372
قیمت: -/112 روپے

₹ 235/-

ISBN: 978-93-5160-061-9



राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025